علم الانسان ما لم یعلم
۱۳۳۹
کتب خانہ
جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی
شعبہ
شمارہ
عدد داخلہ
A H Faruqi

Regd.No.A20
فروغ اردو
لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۰ لائی سنس نمبر ۵۷/۲۴۹۲ ٹیلیفون نمبر ۲۱۳۵

اُردو زبان کی بقا اور اسکے تحفظ کا علمبردار

یہ اقدام زبان اُردو پہ خاص احسان کر رہا ہے
فروغ اُردو فروغ اُردو کا ساز و سامان کر رہا ہے
نظر نظر سے ادب نمایاں قدم قدم پہ شعور فطرت
نفس نفس کو حیاتِ نو کا لطیف عنوان کر رہا ہے

ماہنامہ فروغ اُردو لکھنؤ

مارچ۔ فروری، اپریل سنہ ۱۹۶۱ء

جگر نمبر

مدیر اعزازی
ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ایم اے پی ایچ ڈی (ڈی لٹ)

مرتبین
سید احتشام حسین رضوی
ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ایم اے پی ایچ ڈی

قیمت جگر نمبر چھ روپیہ (۶ر)

سالانہ چندہ۔ دو روپے (۲ر)

فی پرچہ۔ چار آنے (۴ر)

--- ترسیل زر کا پتہ ---

(۱)

۳۷۔ امین آباد پارک لکھنؤ (ہندوستان)

(۲)

مبارک بکڈپو ڈینسو ہال بندر روڈ
بالائے نیشنل بینک کراچی (پاکستان)

اعتذار

ہم نے انتہائی کوشش کی کہ جگر نمبر وقت پر شائع ہو۔ لیکن بعض اہم مضامین کے انتظار میں تاخیر ہوتی گئی۔ جو خریداران وہمدردان فروغ اردو کے لئے بےچینی اور برہمی کا سبب بنی۔ فروری کے دوسرے ہفتہ سے شکایتی خطوط کی بھرمار ہوگئی۔ ان میں سے اکثر خطوط کا لب ولہجہ انتہائی غیر شریفانہ ہے۔ ہم ان سب کی خدمت میں معذرت کرتے ہوئے یہ عرض کردینا ضروری سمجھتے ہیں کہ فروغ اردو جس وقت سے جاری کیا گیا ہے۔ پابندی کیساتھ نکل رہا ہے۔ اسکا مقصد مالی منفعت ہوتا تو برائے نام چندہ رکھا جاتا اور اتنے ضخیم نمبر نکالے جاتے یہ پرچہ فروری مارچ اپریل پر مشتمل ہے۔ اب مئی ۶۱ء میں پرچہ شائع ہوگا

شمارہ نمبر ۱۰، ۱۱، ۱۲ | مارچ سنہ ۱۹۶۱ء | جلد نمبر ۷

ترتیب

سید انصار حسینی پرنٹر و پبلشر نے سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے چھپوا کر دفتر فروغ اردو ونفت روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

اپنی باتیں

جگر کی موت نے ایک بار پھر یہ یقین دلا دیا کہ ہمارے اہم شعراء میں سے جس کسی کی جگہ خالی ہوتی ہے وہ خالی ہی رہتی ہے۔ اس کا نعم البدل تو کیا بدل بھی پیدا نہیں ہوتا۔ گذشتہ ستمبر میں حضرت جگر نے اُردو شاعری کا ایوان سونا کر دیا۔ وہ رسیلی اور دلگداز آواز جس نے تقریباً تیس سال تک بڑے سے بڑے مجمع کو مسحور رکھا تھا ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی، وہ زبان جو عشق و محبت کے پردے میں انسانیت کی ایک جیتی بلندیٔ نفس اور سرافرازی کے گیت گاتی تھی ابد تک کے لئے خاموش ہو گئی۔ ان کے لئے بھی اقبال کے الفاظ میں تغیر کر کے کہا جا سکتا ہے ؎

اس طرح کھیے گا حسن و عشق کی تفسیر کون		اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

غزل کی دنیا میں جگر نے اپنے لئے جو مقام بنا لیا ہے اس کا صحیح تعین مستقبل ہی کا مورخ کر سکے گا لیکن اتنی بات تو اس وقت بھی کہی جا سکتی ہے کہ دورِ جدید میں غزل کا احیا بہت کچھ ان کے ہاتھوں بھی ہوا اور اس کے مرتبہ کو بلند کرنے میں ان کی پرخلوص کوشش کو بھی دخل تھا۔ انہیں باتوں کو مدنظر رکھ کر ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ نے اپنے رسالہ فروغ اُردو کا جگر نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ خراج عقیدت ادا کرنے کی رسم پوری

کی جائے بلکہ ایسا مواد مہیا کر دینا بھی ہے جس سے آیندہ کے مورخ کو جگر کے حالات
لکھنے اور ان کی خصوصیات شاعری کا تجزیہ کرنے میں آسانی ہو۔ اسی خیال سے ہماری
کوشش یہ رہی ہے کہ ایسے حضرات سے مضامین حاصل کئے جائیں جو کسی نہ
کسی حیثیت سے جگر سے واقف ہیں۔ اگرچہ اس میں ہمیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی
کیونکہ ہم مرحوم کے سوانح حیات پر کوئی مبسوط مقالہ حاصل نہ کر سکے لیکن اس کی
تلافی ان تاثراتی مضامین سے ہو گئی ہے جن میں ان کی شخصیت کے بہت سے
پہلو بے نقاب ہو جاتے ہیں اور جن سے ان کی شاعری کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔
جہاں تک تنقیدی حصے کا تعلق ہے اس کے بارے میں ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے
ہیں کہ ان میں جگر کی شاعری کے اکثر پہلو زیر بحث آگئے ہیں۔ ہمیں اس کا احساس
ہے کہ بعض مضامین میں تکرار ہو گئی ہے اور ایک ہی قسم کی باتیں دہرائی گئی ہیں
لیکن جب مختلف لوگ ایک ہی موضوع پر لکھ رہے ہوں تو ایسا ہونا ناگزیر ہے
ہم نے اس طرح کے کئی مضامین اس لئے شامل کر لئے ہیں کہ ان کے انداز
الگ الگ ہیں۔ اس مجموعہ کو مکمل بنانے کے لئے ہم نے صرف جگر کی غزلوں کا انتخاب ہی اس
میں شامل نہیں کر دیا ہے بلکہ ان کے بعض ایسے مضامین نثر بھی یکجا کر دیئے ہیں جن سے ان کے
نظریہ شاعری اور اصول فن کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ آیندہ جو شخص جگر پر لکھنا چاہے گا
ہمارا خیال ہے کہ اسے ایک ہی جگہ اتنا مواد کہیں اور دستیاب نہیں ہو سکے گا اور یہی اس نمبر کے
پیش کرنے کا جواز ہے۔ ہم ان تمام ادیبوں، شاعروں اور ہمدردوں کے ممنون احسان ہیں جنھوں
نے ہمیں اپنے مضامین اور اشعار سے اور کبھی اپنے مشوروں سے ہمیں سرفراز کیا۔ ہم انھیں یقین دلاتے
ہیں کہ یہ اظہار تشکر رسمی نہیں ہے بلکہ ہمارے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہے۔ ہم ممنون ہیں
رضی احمد منیجر ماہنامہ فروغ اردو اور منظر سلیم صاحب جرنلسٹ کے کہ جن کے تعاون سے ہمارا بہت کچھ کام

"یادِ جگر"

مرزا احسان احمد ایڈوکیٹ

آج دنیا خاص طور پر اس حیثیت سے جگر کا ماتم کر رہی ہے کہ ایک دردمند دل کے پر سوز نغموں سے اہل ذوق ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے اور اب صحیح معنوں میں کوئی رئیس المتغزلین کے لقب کا مستحق نہیں رہا۔ اس حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن اس وقت میرا احساس غم کچھ مختلف ہے عام نگاہیں صرف اس جگر کو دیکھ رہی ہیں جس کے پر کیف ترانوں سے بزم سخن کی تمام فضا مسحور ہو جاتی تھی۔ لیکن میری نظر کے سامنے وہ شریف النفس جگر ہے جس کی ذات سے میرا ایک خاص قلبی تعلق تھا آج اس تعلق کے انقطاع دائمی سے میرا دل ملول ہے۔

اس تعلق کی ابتداء ۱۹۱۹ء سے ہوئی یہ وہ زمانہ ہے جب جگر صاحب گونڈہ میں اصغر مرحوم کے چشمے کے کارخانے میں ایجنٹ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اپنی اسی کاروبار کے تعلق سے ایک مرتبہ اعظم گڈھ آئے اور میرے مکان سے متصل ایک سرائے میں ٹھہرے کچھ لوگوں نے اطلاع دی کہ ایک چشمے کے ایجنٹ آئے ہوئے ہیں اور نہایت خوش الحانی کے ساتھ شعر پڑھتے ہیں اور خود اپنے کو شاعر ظاہر کرتے ہیں۔ ذوق سخن نے ملاقات پر آمادہ کیا دو چار غزلیں سننے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ یہ شخص محض خوش لہجہ مغنی نہیں ہے بلکہ ایک خاص شاعرانہ استعداد اور صلاحیت بھی رکھتا ہے جس سے آئندہ اُردو تغزل کے عامیانہ انداز بیان کی

اصلاح اور ترقی کی بہت کچھ امید کی جا سکتی ہے۔

چند روزہ لطف صحبت کے خیال سے میں نے جگر صاحب کو غریب خانہ پر قیام کی دعوت دی جس کو انھوں نے بخوشی قبول کر لیا۔ کچھ دنوں کے بعد اس رسمی تعارف نے ایک مستقل قلبی تعلق کی شکل اختیار کر لی جس کی ذمہ دار زیادہ تر جگر صاحب کی وہ انسانی فطرت تھی جس میں بجز خلوص و محبت کے کسی قسم کی ریا یا منافقت کا کوئی شائبہ نہ تھا ایک کافی مدت تک غریب خانہ جگر صاحب کا قیام گاہ رہا اور اب ان کی حیثیت مہمان کی نہ رہی بلکہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ خاندان میں ایک اور مخلص عزیز کا اضافہ ہو گیا ہے جس کی کسی ادا سے کبھی کوئی بیگانگی یا غیریت ظاہر نہیں ہوئی جگر صاحب نے اس چالیس سال سے زائد قدیم تعلق کو جس خلوص کے ساتھ اپنی وفات تک برابر قائم رکھا وہ دراصل ان کی بلند نظری کا شرافت نفس کا بہت بڑا ثبوت ہے عالم سرگشتگی میں بھی جب ان کی آمد و رفت کچھ کم ہو گئی تھی ان کا دل میری یاد سے کبھی غافل نہیں رہا ان کی ایک قدیم غزل کا مقطع اس موقع پر بے اختیار یاد آ گیا فرماتے ہیں۔

میں جگر لاکھ ہوں آوارہ و سرگشتہ مگر
دل ہر ایک حال میں ہے حضرت احساں کے قریب

یہ محض شاعری نہ تھی بلکہ ایک حقیقی احساس کا اظہار تھا جس کی تائید ہمیشہ ان کے طرز عمل سے ہوتی رہی حقیقتاً یہ ہے کہ جس تعلق کی بنیاد خلوص و محبت پر ہوتی ہے وہ ہر حال میں قائم رہتا ہے۔

غرض جگر صاحب کو نہایت قریب سے دیکھنے جانے اور پہچاننے کا مجھکو

کافی موقعہ ملا۔ میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ وہ شاعر سے زیادہ ایک قابل قدر انسان تھے جن میں کچھ ایسی اخلاقی خوبیاں تھیں جو اس دور میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ وہ سراپا محبت تھے۔ اسی کے سوز و گداز سے ان کا دل ہمیشہ آتش فشاں رہتا تھا۔ یہی وہ جلا تھی جس نے ان کے آئینہ حیات کو بغض و عناد، رشک و حسد، غرور و تمکنت سے کبھی غبار آلود ہونے نہیں دیا۔ وہ کسی انسان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ان کے دل میں انسان کا غم تھا۔ مردم آزاری جس سے بڑھ کر اور کوئی اخلاقی معصیت نہیں ہو سکتی ان کے دست و بازو میں اس کی مطلق قوت نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں تک ان کی ذات کا تعلق تھا کوئی ان کا کوئی مخالف نہ تھا۔ ذاتی اغراض رکھ کر بظاہر دوستانہ تعلقات پیدا کرنا ان کی مخلصانہ فطرت کے بالکل منافی تھا۔ غرض ان کی زبان حال سے ہم تو ظہوری کے اس شعر کی صدائے پرکیف سنتے رہے۔

شدست سینۂ ظہوری پر از محبت یار
برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

ہر وہ شخص جس کو کچھ دنوں جگر صاحب کے ساتھ رہنے کا موقع ملا ہو ان کے اس وسیع احساس محبت کی پوری تصدیق کر سکتا ہے۔ ان کے قال و حال میں کوئی تضاد نہ تھا۔ ہمارے نزدیک انسان کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے جس کے فقدان نے اس وقت انسانیت کے معیار کو بہت زیادہ پست کر دیا ہے۔

انسان کی زندگی کا عہد شباب اخلاقی آزمائش کا نہایت سخت زمانہ ہے۔ بہت کم ایسے لوگ ہیں جو آخر وقت تک نفسانی ترغیبات سے مغلوب

میں ہوتے ورنہ ہر شخص سے عام طور پر کچھ لغزشیں سرزد ہو جاتی ہیں۔ جگر صاحب بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ میری نظر سے ان کا وہ دور زندگی بھی گزرا ہے جب وہ بہت کم ہوش میں رہتے تھے۔ اس وقت بظاہر امید نہ تھی کہ اس ذوق سرمستی کو وجدانِ سلیم کبھی راہ راست پر بھی لا سکے گا۔ لیکن بالآخر احساس غیرت کو تحریک ہوئی۔ آنکھیں کھلیں، دل بیدار ہوا، عالم ہوش میں آئے اور اس عزم و استقلال کے ساتھ آئے کہ پھر کبھی مدہوش نہ ہوئے۔ اور آخر دم تک دین و ایمان کا احترام قائم رہا۔ یہ انقلاب دراصل قوت ارادی کا ایک حیرت انگیز کرشمہ تھا جس کی در پردہ معاون کچھ توفیق الٰہی بھی تھی جو ہر بندۂ سرمست کو عطا نہیں ہوتی۔ اس انعام بے بہا کے لئے کچھ فطری صلاحیت و استعداد بھی درکار ہے۔ ابر کرم کی گہر پاشیوں سے بنجر زمین لالہ زار نہیں بن سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے جگر صاحب کو ایک مرد مومن کی اصلاح پذیر فطرت عطا کی تھی وہ منگلور ضلع سہارنپور کے ایک خاص بزرگ کے مرید بھی تھے ایک کافی مدت تک اصغر ایسے راز آشنا اور پاکیزہ اخلاق انسان کی صحبت بھی حاصل رہی ظاہر ہے کہ یہ روحانی اثرات بیکار نہیں جا سکتے تھے ان سے جو نتیجہ عمل ظاہر ہوا اس پر مجھکو آج تک حیرت ہے۔

باوجود عالی نسبی اور خاندانی اعزاز و وجاہت کے جگر صاحب نہایت منکسر المزاج لیکن اسی کے ساتھ غیور و خود شناس بھی تھے اس لئے ان کے انکسار و تواضع کی سرحد پستی اور ابتذال سے کبھی ملنے نہیں پاتی تھی۔ ہر حال میں خودداری کی شان قائم رہتی تھی۔ جس میں رعونت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا تھا۔ لوگ

ان کو قدر و عزت کی نگاہ سے اس لئے دیکھتے تھے کہ وہ خود اپنی عزت کرتے تھے لیکن اس طرح کہ ملنے والے کو یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ یہ شخص قصداً اپنی بزرگی کا سکہ جمانا چاہتا ہے۔ وہ کچھ اس طرح ملتے تھے کہ دل خود بخود ان کی اخلاقی عظمت سے متاثر ہو جاتا تھا اور ان کی کوئی ادا گراں نہیں گذرتی تھی اس کی ایک خاص وجہ ان کے مزاج کا وہ حسن سادگی تھا جو تکلف اور تصنع کے داغ سے کبھی داغدار نہیں ہوا۔

طبیعت نہایت بے نیاز کشادہ اور فیاض واقع ہوئی تھی۔ کسب زر کرتے تھے لیکن دولت پرست نہ تھے۔ یہی ان کی عالی ظرفی اور بلند نظری کا اصلی راز تھا اور وہ ان لوگوں میں تھے جو اپنے سرمایہ کسب میں دوسرے حاجت مندوں کا بھی حق سمجھتے ہیں۔ ✓

میں اب تک جگر صاحب کے ذاتی محاسن کے متعلق کچھ اپنے دلی تاثرات کا اظہار کر رہا تھا اور خیال تھا کہ یہیں قلم روک دوں لیکن ان نغموں کو کیسے بھول جاؤں جن کی صدائے ترنم ریز سے چالیس سال قبل ایک مدت تک میرے گھر کے دیوار و در برابر گونجتے رہے۔

میں اکثر طرحی مشاعرے منعقد کرتا تھا جن کے علاوہ دیگر ارباب ذوق کے دارالمصنفین کے ارباب علم و بصیرت بھی شریک ہو کر جگر صاحب کی نغمہ سنجیوں سے لطف اندوز ہوتے تھے اگرچہ اعظم گڈھ سے تعلق پیدا ہونے کے بہت قبل ان کی شاعری کی ابتدا ہو چکی تھی لیکن اس وقت تک ملک کے مشہور شعرا کی صف میں ان کا کوئی خاص مقام نہیں تھا اور نہ عام طور پر ان کی شاعرانہ

صلاحیت نمایاں ہوئی تھی۔ یہ گمنامی ان کی بے پروایانہ اور غیر مستقل طرز زندگی کا نتیجہ تھی۔ حالانکہ اس وقت بھی ان کا انداز کلام کچھ عامیانہ مذاق سے مختلف تھا۔ وہ عام غزل گو شعرا کی محض لفظی بازیگری نہ تھی بلکہ اس کی تہ میں کچھ جذبات کی شرر فشانیاں بھی تھیں۔ کم از کم ان کے شاعرانہ احساس میں وہ ابتدال نہ تھا جس کا دوسرا نام لکھنویت ہے وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ یہ کاخ حسن ادب کا مقام ہے جہاں ذوق ہوس کو گستاخیوں کی اجازت نہیں مل سکتی۔

غرض کچھ دنوں جگر صاحب کا کلام بغور سننے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اس جوہر قابل کو اب منظر عام پر آنا چاہیئے تاکہ لوگوں کو یہ محسوس ہو کہ حضرات لکھنؤ نے اب تک جو غزل سرائی کی تھی اور جس پر مذاق عامہ وحد کر رہا تھا اس میں اہل نظر کے لئے دراصل ذوق و لذت کا کوئی سامان نہ تھا چنانچہ سب سے پہلے "اہالیان دہلی و لکھنؤ کے لئے ایک خوان ادب" کے عنوان سے میں نے ایک مختصر مقالہ سپرد قلم کیا تھا جس کو مولانا تاجور نجیب آبادی نے ایک خاص نوٹ کے ساتھ جنوری ۱۹۲۰ء کے مخزن میں شائع کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایک عام خیال پھیلا ہوا تھا کہ غزل کے میدان میں شعرائے لکھنؤ کا کوئی حریف مقابل نہیں۔ مضمون مذکورہ بالا سے جگر صاحب کا اہل ذوق سے تعارف کرانے کے علاوہ کچھ اس غلط فہمی کا ازالہ بھی مقصود تھا میری اس ناچیز سعی قلم کا محرک صاحب کلام کا ذاتی تعلق نہ تھا بلکہ خود کلام کے محاسن کا تقاضا تھا کہ جس نے مجھکو ایک خاص ادبی فرض کے ادا کرنے پر آمادہ کیا تھا۔

میں نے جگر صاحب کی خصوصیات شاعری پر ریویو کرتے ہوئے ان کے

محبت کا عالمِ جنوں کا زمانہ ، حسرت سنہ ۱۹۱۰ء میں
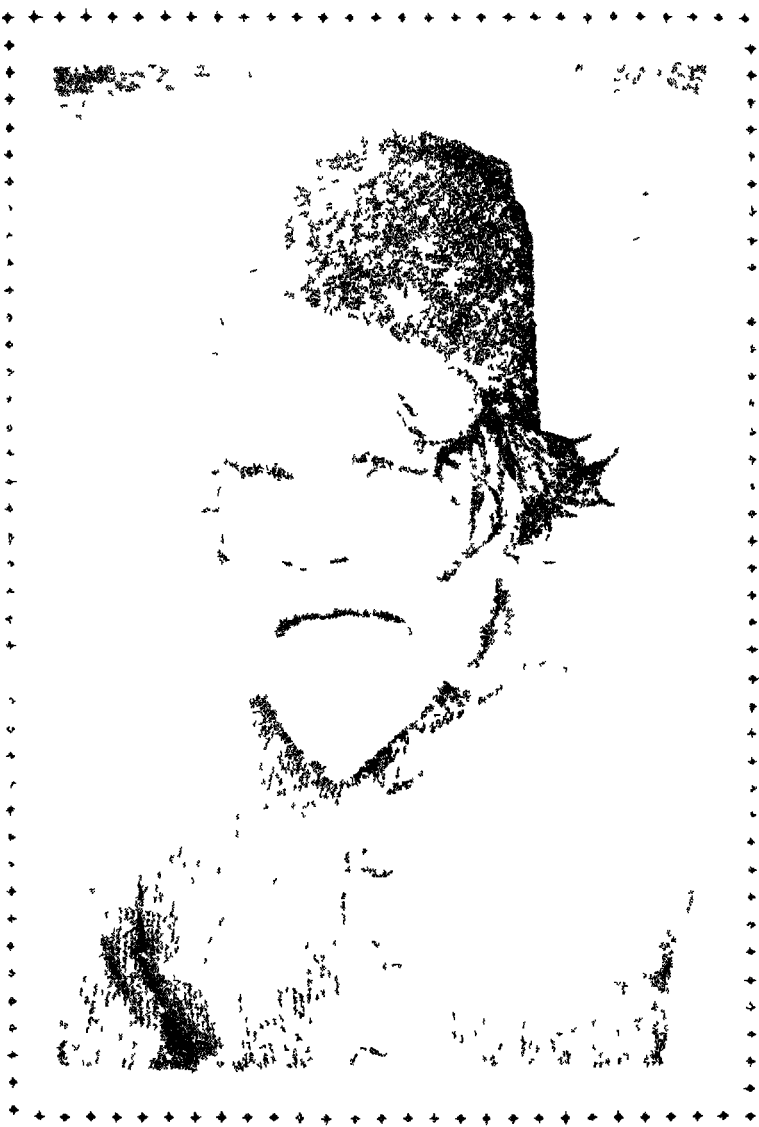
سو حشر اک سکوت میں پنہاں کئے ہوئے

۲۹ ستمبر ۱۹۵۶ء میں حضرت جگر مشاعرہ امر سنگھ کالج سری نگر کشمیر میں اپنا کلام سنا رہے ہیں۔
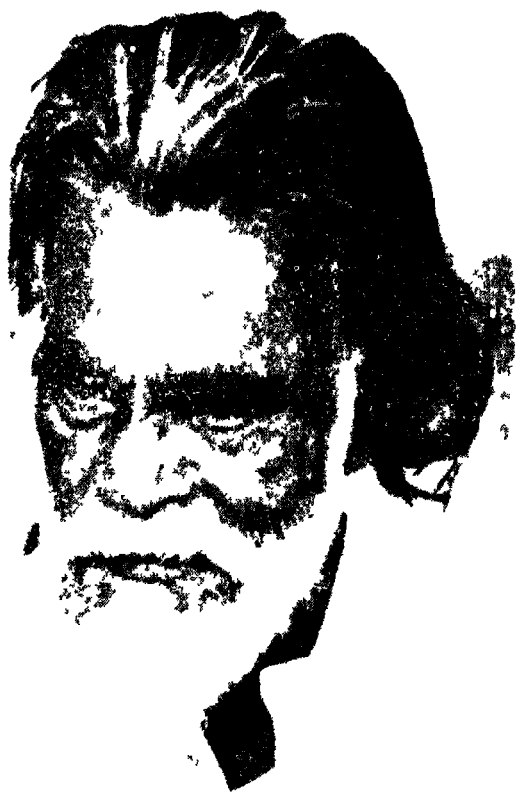
کِس کا خیال کون سی منزل نظر میں ہے (حضرت جگر سنہ ۱۹۶۱ء میں)

اکثر اشعار نقل کئے تھے جن میں سے کچھ کی داد مولانا تاجور نے خاص طور پر دی تھی جس سے مجھکو ایک گونہ اطمینان ہوا تھا کہ جگر صاحب کی شاعرانہ قابلیت کے متعلق میرا اندازہ کچھ غلط نہ تھا یعنی میں نے ایک ایسا شاعر پیش کیا تھا جس کے سوزِ جگر کے جلوؤں کو ان نگاہوں کے سامنے آنا ضروری تھا جو محض لفظی طلسم کاریوں سے خیرہ ہو رہی تھیں، اس موقع پر ناظرین کچھ اشعار بھی سن لیں جن کی بنا پر میں نے جگر صاحب کا اہلِ اردو سے روشناس کرانے کی کچھ بے جا ہمت نہیں کی تھی۔

ہر قدم پر، ہر روش پر، ہر ادا پر، ہر جگہ
دیکھنا پڑتا ہے اندازِ نگاہِ یار کو

اس چشمِ مے فروش سے کوئی نہ بچ سکا
سب کو بقدرِ حوصلۂ دل سرور تھا

کچھ کھٹکتا تو ہے پہلو میں مرے رہ رہ کر
اب خدا جانے تری یاد ہے یا دل میرا

اللہ اللہ دردِ ہجر کی بے تابیاں
جو ہوک اٹھتی تھی وہ اک مستقل افسانہ تھی

تیرے جلوؤں کے تصدق لیکن
تیرے جلوے کو کدھر دیکھوں میں

زمیں بھی نہ اٹھائے گی مری خاک کا بار
گرا دیا مجھے تم نے اگر نگاہوں سے

لحظے بھر جل لئے پروانے تو کیا حاصل ہے
شمع جس شان سے جلتی ہے بہت مشکل ہے

دشتِ جنونِ عشق کی گلکاریاں نہ پوچھ
ڈوبا ہوا ہوں سر سے قدم تک بہار میں

ان اشعار سے ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ چالیس سال قبل بھی جگر صاحب کے کلام کا جو رنگ تھا اس میں آئندہ چمکنے کی بہت کچھ صلاحیت موجود تھی۔ اسی زمانہ کا مجھ کو اس وقت ان کا ایک شعر یاد آ گیا جس کی داد ان کے حقیقی استاد و رہبر اصغر نے خاص طور پر دی تھی۔ ملاحظہ ہو۔

حیراں ہوں کہ یہ آخر کیوں بیچ میں حائل تھا
میرا ہی ارادہ تو بے واسطۂ دل تھا

اس وقت کے عام غزل گو شعرا غالباً اس خیال کی بلندی اور لطافت کو سمجھ بھی نہیں سکتے تھے ناظرین غور کریں۔ اس غیر معمولی شاعرانہ صلاحیت و استعداد کی نمود یوں ہی ناقدری و گمنامی کی نذر ہو رہتی تو کیا تاریخ شاعری کا ایک افسوسناک واقعہ نہ ہوتا اس کی ذمہ داری خود مجھ پر بھی کچھ ہوتی کہ قلب و روح کی گہرائیوں کو تڑپا دینے والا ایک مطرب خوش نوا مجھ کو ملا اور میں نے اہل ذوق کو اس کے نغموں سے بے خبر رکھا۔

میں نے جو کچھ لکھا تھا اس سے جگر صاحب کا تعارف تو ہو گیا تھا اور لوگ کچھ غالباً جو اب تک بھی اُکھڑے تھے کہ ایک ایسا شاعر ابھی موجود ہے جو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی مستقل شاعرانہ حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے یہ مختصر مضمون کافی نہ تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ ان کا کچھ کلام بھی مستقل دیوان کی صورت میں اہل ذوق کے سامنے آ جائے تاکہ اس کا اندازہ ہو سکے کہ میں نے جس ادعا کے ساتھ قلم اُٹھایا تھا وہ کس حد تک حق بجانب تھا۔ چنانچہ مضمون مذکورہ بالا کے بعد ہی غالباً دو سال کے اندر مجکو اس وقت جگر صاحب کا جو کلام مل سکا اس کا مجموعہ داغ جگر کے نام سے ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ مطبع معارف دارالمصنفین اعظم گڈھ میں چھپوا کر شائع کیا۔ اس موقع پر سخت احسان فراموشی ہوگی اگر میں اپنے محترم عزیز سر اقبال احمد سابق چیف جسٹس ہائی کورٹ الہ آباد کے دست کرم کو بھول جاؤں جس نے طباعت کی تمام مالی مشکلات حل کر دی

تھیں۔ وہ اس وقت ہائی کورٹ میں وکالت کرتے تھے۔ جب کبھی اپنے وطن اعظم گڈھ آتے تھے اور جگر صاحب غریب خانہ پر مقیم رہتے تھے تو ان کی خوش نوائی سے وہ خاص طور سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ میرے محترم بزرگ کو شاید اس وقت اپنی یہ ادب نوازی یاد بھی نہ ہو غرض جس فیاض ازل نے جگر صاحب کو ایک صحیح امذاق شاعر پیدا کیا تھا اسی نے ان کی مستقل شاعرانہ حیثیت کے قیام کے لئے مناسب سامان بھی مہیا کر دئیے اور اب وہ لالۂ صحرائی نہیں رہے کہ ناقدری کی باد سموم کے جھونکوں سے مرجھا کر رہ جاتے۔

میرا مقدمہ جو انھیں مطبوعہ صفحات پر مشتمل تھا جن میں علاوہ ذاتی حالات کے میں نے جگر صاحب کی خصوصیات شاعری پر نہایت تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا تھا۔ اور ایک گستاخی بھی میرے قلم سے سرزد ہوگئی تھی یعنی حسرت، جوش اور ثاقب جو اس وقت اقلیم سخن کے جمشید سمجھے جاتے تھے ان کی چند غزلوں کے مقابلے میں جگر صاحب کی ہم ردیف و قافیہ غزلیں بھی میں نے پیش کر دی تھیں تاکہ اہل ذوق دیکھیں اور انصاف کریں کہ جدت طرز بیان، جدت ادا، حسن خیال، شدت احساس، وسعت تخیل، سوز و اثر وغیرہ شاعری کی ان تمام خصوصیات کا جلوہ گاہ کس کا کلام ہے۔ اور ایک زندہ اور بیدار دل کی آتش نفس نیاں کس طرف نظر آرہی ہیں۔

اس گستاخی کے علاوہ میں نے مقدمہ کی آخری سطور میں یہ دعویٰ بھی کر دیا تھا کہ نفس تغزل کے لحاظ سے اس وقت جگر کا کوئی ہمسر نہیں۔ میری اس بےباکانہ جنبش قلم کے خلاف مختلف گوشوں سے کچھ صدائیں بلند ہوئیں

کہ ایک رند لاابالی کو بے وجہ اچھا لگتا ہے۔ میں نے اس مخالفت اور استہزاد کا جواب دینا پسند نہیں کیا۔ خاموش رہا مجھکو یقین تھا کہ جگر صاحب کی شاعرانہ صلاحیت آئندہ اہل سخن کے سامنے مجھکو نادم ہونے نہیں دے گی اور کب وہ وقت آئے گا جب بزم تغزل کے مسند نشینوں کو اس رند سرست کے لئے صدارت کی جگہ خالی کرنا ہوگی۔ بالآخر وہ وقت آگیا۔ اور اہل ذوق نے دیکھا کہ داغ جگر جو چالیس سال قبل نمایاں ہوا تھا کسی شکستہ مزار کا ٹمٹماتا ہوا چراغ نہ تھا بلکہ اس میں شعلۂ طور و آتش گل کے تڑپتے ہوئے جلوے بھی پوشیدہ تھے جن کی پرتوسے عرصہ گاہ تغزل جس پر ایک مدت سے بد مذاقی کی تیرگی چھائی ہوئی تھی ایک دفعہ پھر وادیٔ ایمن بن گیا اور بقولِ جگر" کا ،یگرانِ شعر" کو اپنے طلسم باطل کی شکست کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔

یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ جگر صاحب کوئی متبحر عالم یا کوئی بڑے حکیم و فلسفی تھے یا ان کی حیثیت ایک ایسے پیرو مرشد کی تھی جس نے سلوک و معرفت کے تمام منازل طے کئے ہوں ان کی تحصیل علمی یقیناً محدود تھی لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ایک کامیاب غزل گو شاعر کے لئے جو اوصاف درکار ہیں وہ سب قدرت نے ان کو عطا کئے تھے ورنہ دنیا آج ان کو رئیس المتغزلین شہنشاہ تغزل کے لقب سے یاد نہ کرتی بہت کم ایسے اہل سخن گذرے ہیں جن کو زندگی میں اتنی عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی ہو اور مرنے کے بعد اس کثرت سے اہل ذوق اور ادبی انجمنوں کی طرف سے خراج عقیدت پیش کیا گیا ہو اور تحسین

وآفرین کی صدائیں بلند کی گئی ہیں یہ سب ان کے قابل اور درد آشنا دل کے شریفانہ احساس محبت کا فیض تھا جس کے بغیر غزل سرائی ایک سعی لاحاصل ہے اسی احساس کی بنا پر ان کی زبان قلم سے یہ شعر نکلا تھا۔

کاریگران شعر سے پوچھے کوئی جگر
سب کچھ تو ہے مگر یہ کمی کیوں اثر میں ہے

محض طبل تہی کے شور وغل سے بے آہنگ کو نغمۂ تغزل سمجھنے والے حضرات اس کا کیا جواب دے سکتے تھے؟ یہ دراصل اس حقیقت کی طرف شاعر کا در پردہ اشارہ تھا کہ غزل کی صنف لطیف لفظ پرستوں کے دست ستم کا تحمل نہیں کر سکتی اس کو وہی شوریدہ مزاج ہاتھ لگا سکتا ہے جس کے دل سے بقول اصغر یہ صدائے مستانہ بلند ہو سکتی ہو۔

مزہ الم میں ہے کچھ لطف خستگی میں ہے
غرض کہ نشو نمائے روح کی اسی میں ہے

ہر شاعر کے ابتدائی نقوش قلم میں کچھ خامیاں ضرور ہوتی ہیں۔ جگر صاحب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔ تاہم چالیس سال قبل ان کی شاعرانہ صلاحیت کا رخ کس طرف تھا اور اس سے تنگنائے غزل کو آئندہ کس وسعت اور ترقی کی امید ہو سکتی تھی، اس کا اندازہ ناظرین داغ جگر کے چند حسب ذیل اشعار سے کر سکتے ہیں ملاحظہ ہوں

بھرے ہوئے ہیں نگاہوں میں حسن کے جلوے
یہ کیا مجال جہاں میں ہوں اور بہار نہ ہو

سو جانیں ہوں تو لذتِ آزار پہ نثار
باز آئے چارہ سازئ دردِ نہاں سے ہم

خزاں نہ تھی چمنستانِ دہر میں کوئی
خود اپنا ضعفِ نظر پردۂ بہار رہا

محبت ابتدا سے انتہا تک ضبط میں گذری
نہ جب فریاد کرتے تھے نہ اب فریاد کرتے ہیں

اثر لینا تھا ہم کو ہر ادائے حسن سے ان کی
مگر لازم نہ تھا رسوا سرِ بازار ہو جانا

زباں گو چپ ہوئی دل میں تلاطم ہے وہی برپا
نہ آیا آج تک محوِ خیالِ یار ہو جانا

قفس کا اور یکایک اس طرح جنبش میں آ جانا
مگر معلوم ہوتا ہے کہ گلشن میں بہار آئی

اشارہ خود جو نہ وہ بہر جستجو کرتے
مجال کیا تھی ہماری کہ آرزو کرتے

نہ صدائے بلبلِ خوش بیاں نہ سرودِ بزمِ پری رخاں
جو بھرا ہے نغمہ درد سے میں وہ ایک تارِ رباب ہوں

یہ شاعری نہیں بلکہ حقیقت تھی۔ افسوس ہے کہ اس تارِ رباب کی شعلہ ریزیاں نظر نہ آئیں گی۔ ایک شعر اور ملاحظہ ہو، جس کی داد اقبال سہیل ایسے غیر معمولی سخن سنج اور نقادِ فن نے خاص طور پر دی تھی۔

جلوؤں کو ترے دیکھ کے جی چاہ رہا ہے
آنکھوں میں اتر آئے مرا کیفِ نظر بھی

—— اس قسم کے اور بھی اشعار ہیں طوالت کے خوف سے قلم انداز کرنا پڑتا ہے۔

قدرت کا بابِ فیض بند نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ دنوں کے بعد پھر کوئی عندلیب آتش نوا پیدا ہو جائے۔ لیکن فی الحال غزل گوئی کا وہ دور جس نے اصغر ایسا صاحبِ کمال پیدا کیا تھا۔ جگر کی وفات سے یقیناً ختم ہو گیا۔

"افسوس کہ قبیلۂ مجنوں کسے نماند"

اب کون ایسا گلشن پرست ہے، جس کا جذبۂ محبت کانٹوں سے بھی نباہ کر سکے۔

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

اب کون ایسا طالب صادق ہے، جو بغیر دوست کی معیت کے زندگی کو معصیت سمجھتا ہو۔

دل زندگی گذار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

اب راہ طلب کا کون ایسا گرم رو اور تیز گام مسافر ہے جس کی گرد کو بھی مہر و ماہ پا نہ سکیں

یہ مہر و ماہ رہے میرے ہم سفر برسوں
پھر اس کے بعد میری گرد کو بھی پا نہ سکے

اب کون ایسا رند باخبر ہے جو واعظ کے سامنے یہ دعویٰ کر سکے۔

کدھر سے برق چمکتی ہے اے واعظ
میں اپنا ساغر اٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا

اب کون ایسا ادب شناس محبت ہے، جو محبوب کو اس وقت مدعو کرے جب اس کی خلوت غم صحیح معنوں میں خلوت غم ہو یعنی دل کے دھڑکنے کی بھی آواز محسوس نہ ہو۔

آ جاؤ کہ اب خلوتِ غم خلوتِ غم ہے
اے دل کے دھڑکنے کی بھی آواز نہیں ہے

عمر فانی کے گلہ مند دل کو اب کون اس حقیقت سے آشنا کرے

ارے وہ شکوہ سنج عمر فانی
یہ فانی زندگی ہی کم نہیں ہے

اب کون ایسا رمز شناس شوریدہ مزاج ہے جو دل کی رونق حیات، غم کو حاصل کائنات سمجھ سکے۔

دل گیا رونقِ حیات گئی
غم گیا ساری کائنات گئی

آفریں ہے اس قلم پر جس نے ان دو سادہ اور مختصر مصرعوں میں عالم کی دو وسیع اور بسیط حقیقت بے نقاب کی ہے جس کو کچھ محرم اسرار کے محرمان خاص ہی سمجھ سکتے ہیں نوحہ گروں کو یہ صلاحیت کہاں نصیب ہو سکتی ہے؟

جگر کے سحر نگار قلم کو ایک دن ہمیشہ کے لئے خاموش ہونا تھا آج بالآخر خاموش ہو گیا لیکن اس نے جو نقوش آبدار چھوڑے ہیں ان سے صحیفۂ تغزل ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔

اوروں کا جو بھی خیال ہو لیکن مجھکو کچھ یقین سا ہے کہ جس وقت جگر کا پیکر جسمانی سپرد خاک کیا جا رہا ہوگا ان کی زبان حال سے یہ صدا ضرور بلند کی ہو گی۔

سالہا گوش جہاں زمزمہ ما خواہد بود
زیں نواہا کہ دریں گنبد گردان زدہ ام

اس صدا کا بلند کرنے والا اب خائف کوئی نہیں رہا اور شاید اب شاید ایسے نغمے سننے میں آئیں گے۔ جن کو روح سنائے اور روح سنے جو دل سے نکلیں اور دل میں بیٹھ جائیں اور جن سے کیف، سرور کی وہ لہریں اٹھیں کہ پھر کسی ضعف، شکستگی کا احساس نہ ہونے پائے۔

جگر صاحب اگرچہ خالص ایک غزل گو شاعر تھے لیکن ان کی نظر محض ایک خیالی چمن کے لالہ و گل تک محدود نہ تھی مادیت کے ستم زدہ موجودہ دنیا جن آلام، مصائب میں گرفتار ہے ان سے وہ بے خبر نہ تھے آزادی کے بعد انسانی دل کی قلبی شقاوت بے دردی اور ظالمانہ سفاکی کا وہ منظر بھی انھوں نے دیکھا تھا جس سے جنگل کے وحوش و بہائم بھی شرمندہ ہو کر رہ گئے تھے اس عبرتناک

صورت حال پر بھی انھوں نے اپنے درد کا اظہار کیا ہے جو در اصل ان کے اس وسیع جذبہ محبت کا تقاضہ تھا جس کا وہ پیغام دیتے رہے گرو تیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے

"میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے"

یہ کوئی معمولی پیام نہ تھا یہ اہل سیاست کی کوئی منافقانہ صدا نہ تھی اور نہ کوئی تنگ نظر اور خود پرست انسان یہ روح پرور پیام دے سکتا تھا کاش طلسم مادیت کا فریب خوردہ انسان اس کو سنتا سمجھتا اور اس پر عمل کی توفیق بھی ہوتی تو آج اس کا نظام زندگی اس قدر بے کیف اور پراگندہ نہ ہوتا اور نہ اس کے قلب و روح کی لطافتیں اس طرح برباد ہوتیں کہ اس کو صحیح معنوں میں انسان کہنا مشکل ہو جاتا۔

جگر کا یہ مخلصانہ پیام جس پر خود ان کا زندگی بھر عمل رہا معلوم نہیں کہ اس وقت کہاں تک پہونچا اور آئندہ کس حد تک پہونچ کر اثر انداز ہو گا؟ لیکن جس حقیقت کو سمجھ کر انھوں نے یہ پیغام دیا تھا منکرین زمانہ بھی اس کو یاد رکھیں یعنی انسانیت کے اخلاقی و روحانی امراض کا صحیح اور قطعی علاج صرف صہبائے محبت ہی کے جرعہائے آتشیں سے ہو سکتا ہے یہی وہ صیقل ہے جس سے خاک زر بن جاتی ہے۔ یہی وہ اکسیر ہے جو بقول نظیری کفر کو ایمان بنا دیتی ہے۔

ہیچ اکسیر بہ تاثیر محبت نہ رسد
کفر آوردم و در عشق تو ایماں کردم

قلم کی روانی اس موضوع کو کچھ اور پھیلانا چاہتی تھی لیکن کافی دیر ہو چکی وہ

اب قلبی تعلق جگر کی خواب گاہ ابدی کے سامنے مجھکو غائبانہ کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ کھڑا تو ہوں مگر ایک پیکر خاموش سے کہا کہوں بجز اس کے کہ پر درد سکوت کے ساتھ ایک مشت خاک جس پر اشک محبت کے کچھ نورانی قطرے بھی ٹپکے ہیں اس مجسمۂ شرافت انسانی پر ڈال کر رخصت ہو جاؤں ایسے لوگوں کا ماتم کیا کیا جائے جو مر کر مرتے نہیں بلکہ زندہ رہتے ہیں اس لئے کہ وہ اپنے قول و عمل کی کچھ ایسی یادگاریں چھوڑ جاتے ہیں جو زبان حال سے ہمیشہ پکارتی رہتی ہیں۔

"ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"

راز مرادآبادی

مکتوبِ راز (جگر کی شخصیت کے چند پہلو)

برادرم - السلام علیکم[1]

یاد دہانی کا شکریہ۔ مجھے اپنے وعدہ کا احساس ہے اور تھا۔ ایفائے وعدہ کی خاطر میں نے کئی مرتبہ اس بات کی کوشش کی کہ مضمون ڈاک کے سپرد کر دوں لیکن استاذی جگر صاحب قبلہ سے بے اندازہ محبت اور مرحوم سے تعلق خاطر نے میری ہر کوشش ناکام بنا دی جب بھی قلم کاغذ لیکر بیٹھا۔ الفاظ اور جملوں کے بجائے آنسوؤں سے کاغذ بھر گیا ہر مرتبہ دل بھر آتا تھا اور یوں محسوس ہونے لگتا تھا جیسے کوئی میرا گلا گھونٹ رہا ہو۔ جگر صاحب کو مرحوم کہنے کی ابھی مجھ میں ہمت نہیں ہو سکی ہے۔ معلوم نہیں لوگ کسی کے مرتے ہی اس کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کرنے کس طرح بیٹھ جاتے ہیں اور ہر جملے میں یہ تاثر بھی دیتے جاتے ہیں کہ مرحوم سے انھیں کس درجہ محبت تھی اور مرحوم کس طرح ان کے علاوہ کسی سے پیار نہیں رکھتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ شاید ایسے حضرات کے دل مجھ سے زیادہ مضبوط ہوتے ہوں۔

مجھے سخت شرمندگی ہے کہ اس ذات گرامی کے بارے میں، جس نے ہمیشہ مجھے اپنے فرزند عزیز کی طرح چاہا، جس نے مجھے شعور شعری بخشا، جس نے اپنی لاابالی فطرت

---

[1] بنام ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

کے باوجود، نہایت خلوص سے میری تربیت شعری فرمائی۔ اور جس نے میرے بارے میں حاضر و غائب ہمیشہ یہ فرمایا کہ راز میرا شاگرد ہی نہیں میرا بیٹا ہے، میں چند سطور بھی لکھنے سے معذور ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ صورت حال محض وقتی ہے ابھی صدمے سے اوسان بجا نہیں ہیں جب یہ بادل چھٹ جائیں گے تو انشاء اللہ مجھ میں یہ ہمت ضرور پیدا ہو جائے گی کہ میں استاذی جگر صاحب کے شایان شان کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں گا۔ فی الحال تو مجھے یہ یقین ہی نہیں آتا کہ جگر صاحب، ہم بدنصیبوں سے اتنی دور چلے گئے ہیں کہ اب ہم انھیں کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ مجھے تو اکثر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ آج بھی زندہ ہیں اور محض ویزا کی پابندیوں کے باعث ہم ایک دوسرے سے دور ہو کر رہ گئے ہیں۔ مجھے اپنے تعلقات کا ڈھول پیٹنے کی عادت نہیں ہے۔ میں خاموش محبت کو اصل محبت سمجھتا ہوں۔ میں نے جگر صاحب کی حیات میں بھی ہمیشہ احتیاط برتی اور ان کی شخصیت کو بیوپار نہیں کیا اور نہ میں ان کی موت کے بعد، اس فعل کو شریفانہ طریق کار تصور کرتا ہوں۔ مجھے ان سے کتنی محبت تھی، کیوں تھی، وہ مجھے کس قدر عزیز رکھتے تھے میرا، ان کا ذاتی معاملہ ہے، بقول خود

نہ محرم ہے، نہ کوئی راز داں ہے
محبت میرے ان کے درمیاں ہے

اس سے دوسروں کا کیا تعلق ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جگر صاحب قبلہ کو شاید اپنے دوستوں اور اپنے شاگردوں میں اس درجہ تعلقِ خاطر کسی اور سے نہ تھا جتنا مجھ سے وہ جب میرا ذکر فرماتے تو ان کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھتا، جب وہ میرا نام لیتے

تو اُن کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو جاتی ۔ مجھے احساس ہے کہ میرے علاوہ اگر
انھیں کسی سے خلوص اور تعلق خاطر تھا تو برادرم دوار ہاشمی کانپوری سے ۔ اور
کبھی کبھی میرے سامنے اور مجھے چھیڑنے کی خاطر کہتے بھی تھے کہ راز ، دوار میرا
اصلی شاگرد ہے، تم شاگرد ہو مگر بس یونہی اور جب اس جملے سے میں کبیدہ خاطر
ہو جاتا تو بے تاب ہو جاتے اور مجھے سیکڑوں طریقہ سے مناتے اور فرماتے ،
پٹھان کی عقل ٹخنے میں ہوتی ہے۔ بات سمجھے بغیر یہ قوم چراغ پا ہو جاتی ہے
اور راز اپنی قوم کا صحیح نمائندہ ہے، تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ان تعلقات کے
باعث، میرا دل یہ ماننے کے لئے ابھی آمادہ نہیں کہ جگر صاحب واقعی اس طرح
مجھ سے دور ہو گئے کہ اب میں ان کی صورت کبھی نہ دیکھ سکوں گا ۔ ان کا محبت بھرا
چہرہ، مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور ہو گیا، اور یہی باعث مجھ میں ابھی اتنی
سکت نہیں پیدا ہو سکی ہے کہ ان کے بارے میں کوئی مضمون سپرد قلم کر سکوں۔ میں
آپ سے سخت شرمندہ ہوں۔ اُمید ہے آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔ لیکن اس خط
کے ضمن میں، دو چار غلط فہمیاں دور کرتا چلوں ۔ پہلی غلط فہمی جو، خود جگر صاحب
قبلہ کے عمل سے بھی پیدا ہوئی یہ ہے کہ اُستاذی حضرت جگر، حضرت اصغر گونڈوی
کے شاگرد تھے یہ بات سراسر غلط ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ دو عظیم شخصیتوں پر
بہتان ہے، جگر صاحب چونکہ نہایت شریف النفس اور باادب انسان تھے اور
چونکہ حضرت اصغر کے ان پر احسانات تھے، اس لئے اپنی زندگی میں مرحوم نے
اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کبھی کوشش نہیں فرمائی۔ میں جگر صاحب کی خدمت میں
خاصہ گستاخ تھا اور جس طرح کوئی بیٹا اپنے باپ سے خاندانی حالات دریافت

کرنے میں تامل نہیں کرتا۔ اسی طرح میں بھی اکثر جگر صاحب قبلہ سے اس قسم کے سوالات کرتا رہتا تھا۔ جگر صاحب نے صاف طور پر مجھ سے فرمایا تھا کہ حضرت اصغر سے مجھے شاعرانہ عقیدت نہیں ہے، بلکہ وہ بزرگ شخصیت ہیں۔ نہایت بست کرنے والے، مہربان اور میرے محسن اسی لئے میں نے ان کی شان میں یہ مقطع کہا ہے۔

حریم حُسنِ معنی ہے جگرؔ کاشانۂ اصغرؔ
جو بیٹھو باادب ہو کر، تو اٹھو باخبر ہو کر

نہ معلوم ہمارے ناقد اور اخبار والے کس قسم کے لوگ ہیں کہ اس کھلے ہوئے حضرت کے باوجود مجھے ان کا شاگرد کہتے ہیں تو میں نے کہا آپ اجازت دیں تو میں علیگڈھ میگزین میں (جس کا میں ایڈیٹر بھی تھا) ایک مضمون لکھ کر اصغر صاحب اور آپ کے تعلقات کی وضاحت کر دوں تو فرمانے لگے نہیں میں! آپ میرا کیا نقصان ہے، اگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں حضرت اصغر کا شاگرد ہوں تو انھیں خوش ہو لینے دو۔ حضرت اصغر اور جناب جگر کے درمیان نہایت برادرانہ تعلقات تھے۔ یہ تعلقات اس زمانے کی پیداوار تھے، جب جگر صاحب مذہب اور زندگی دونوں سے بیزار تھے، شراب نوشی اور وہ بھی بے اندازہ شراب نوشی ان کا ضابطۂ حیات تھی۔ اس عالم میں جگر صاحب کہیں اصغر صاحب سے جا ٹکرائے، جناب اصغر ایک صاحب دل انسان تھے، روحانیت اور مذہب سے ان کا گہرا تعلق تھا، انھوں نے جگر صاحب کی یہ حالت دیکھی تو نہایت پیار و محبت سے انھیں اپنے پاس رکھا، اور ان کی روحانی اصلاح فرمائی

پھر اپنے پیر و مرشد، سیدی حضرت شاہ عبد الغنی صاحبؒ کے دست حق پرست پر انھیں بیعت کرایا، اور اپنی چھوٹی سالی صاحبہ سے ان کی شادی کردی اور ہر حال میں جگر سے محبت فرمائی۔ یہ واقعات ایک حساس انسان کو شاگرد کیا غلام بنا سکتے تھے، اور پھر جگر صاحب تو ذاتی طور پر شریف النفس۔ حلیم اور باوضع انسان تھے، اور ایک ایسے شریف گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جہاں تعلیم ہی یہ دی جاتی تھی کہ اپنے محسن اور مربی کا احسان مانو بزرگوں کی عزت کرو۔ چھوٹوں سے محبت کرو۔ ایسی صحبت میں اور اس تعلیم کے بعد جگر صاحب سے اس سے زیادہ اور کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی وہ اُسے اس آسانی سے کس طرح دور کر سکتے تھے۔ وہ کسی کے جذبات کو ٹھیس پہونچانے کے اہل نہ تھے، اصغر صاحب قبلہ تو ان کے محسن۔ مربی اور قریبی عزیز بھی تھے، وہ تو ایسے لوگوں کے جذبات کا بھی احترام فرمانے تھے جنھیں خالص دنیا دار اور پورے تصور کرتے تھے میں جگر صاحب سے ۱۹۳۲ء سے واقف ہوں اور نہایت قریب سے میں نے ان کا مطالعہ کیا ہے، مجھے علم ہے کہ بارہا وہ بعض حضرات سے بیزار ہوتے تھے۔ ان کی صحبت ان پر گراں گذرتی تھی، لیکن وہ صاف طور پر نہ ان حضرات سے یہ کہتے تھے کہ آپ مجھ سے نہ ملیں اور نہ کسی کو یہ کہنے دیتے تھے۔ جگر صاحب کی شخصیت کچھ اس طرح ڈھلی تھی کہ وہ چھوٹی بات کی تردید کرتے جھجکتے تھے، البتہ ایک مرتبہ میرے کہنے پر اُنھوں نے حضرت سیماب اکبرآبادی کے اس دعوے کی تردید ضرور کی تھی کہ جگر صاحب ان کے شاگرد ہیں، اور وہ بھی بڑی مجبوری کے ساتھ۔ اس معاملے کو بھی وہ یہ کہکر ٹال دینا چاہتے تھے کہ جانے دیجئے

تک کس قدر پامالی ہے۔ سیماب صاحب اگر کہتے ہیں تو کہنے دو۔ دنیا جانتی ہے
کہ میں ان کا شاگرد نہیں ہوں۔ میرا انداز شعر ان سے مختلف ہے۔ میں ان سے
زیادہ مشہور ہوں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جب میں نے اُن سے یہ کہا کہ مدد کی تو آئندہ
آنے والا مورخ ادب یہ باتیں نہیں جانے گا اور وہ آپ کو داغ۔ اصغر
اور امیر اللہ تسلیم کے علاوہ سیماب صاحب کا بھی شاگرد بتائے گا تو وہ مجبور
ہوگئے اور انھوں نے میرے کہنے سے رسالہ میں ایک تردیدی خط شائع کرایا۔

دوسری غلط فہمی جگر صاحب کے بارے میں یہ ہے کہ جگر صاحب کے
شاگردوں کی تعداد خاصی طویل ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ جگر صاحب استادی
شاگردی کی رسم کہنہ سے سخت بیزار تھے بلکہ اس پیشہ ورانہ ذہنیت کو سخت
نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے، اکثر فرماتے تھے "میاں بلبل کو چہکنا کس نے سکھایا
ہے کہ کوئی کسی کو شعر کہنا سکھائے۔" چونکہ بامروت اور خلیق انسان تھے اور
ابتدائی دور میں خمریات سے گہری دلچسپی تھی، چنانچہ جہاں لوگ ان کی اس
سادگی و مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر اُن کے بٹوؤں اور بوتلوں پر ہاتھ صاف
کرتے رہتے تھے ان کی غزلیں اپنے نام سے پڑھ دیتے تھے، اسی طرح اکثر
نام نہاد شاگرد بھی اُن سے منسلک ہو جاتے تھے اور وہ غریب ان بالجبر
شاگردوں کو "تک تک دیدم۔ دم نہ کشیدم" کی مصداق دیکھتے اور گھٹتے تھے۔
کبھی کسی محرم راز سے کہہ دیتے تھے، خدا کے لئے ان شاگردوں سے مجھے
بچاؤ۔ انھوں نے میری زندگی تلخ کر دی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے
میں ایسے شاگردوں کی رفتار ذرا تیزی سے بڑھ گئی تھی اس کی وجہ یہ تھی

کہ شاعر زیادہ ہونے لگے تھے (song publicity) اور جنگی مشاعروں میں
شعرا کو خرچی ملنے لگی تھی، خرچی کا لفظ میں نے جان کر لکھا ہے، مختانہ اور
معاوضہ بھی لکھا جا سکتا تھا، سفر خرچ بھی کہا جا سکتا تھا، لیکن واقعہ یوں ہی
ہے کہ اس زمانے میں جس طرح طوائفوں کے ذریعہ پیسے جمع کئے جا رہے تھے،
اہل جنگ کے لئے شاعروں سے بھی اسی طرح چندہ اکٹھا کیا جا رہا تھا اور ہمارے
شعرا کو بالکل طوائفوں کی طرح پیسے دیے جا رہے تھے تو اس زمانے میں
دو چار نوعمر اور کم حیثیت قسم کے شاعر جگر صاحب کو لپٹے رہتے تھے کہ حضور جہاں
آپ جائیں، میں بھی چلوں گا اور جگر صاحب انھیں اپنے ساتھ بن بلائے
مہمان کی طرح لے جاتے تھے، بعض جگہ اور بعض حضرات کے ساتھ یوں بھی ہوا
کہ جگر صاحب کو جو مصارف خرچ ملے، وہ حضرات اسی رقم کے ذریعہ آئے گئے
اور مشاعرہ والوں نے انھیں ایک پیسہ نہیں دیا۔ تو خیر یہ غلط ہے کہ جگر صاحب
کے شاگردوں کی تعداد طویل ہے۔ البتہ ایک شخص جسے جگر صاحب نے بخوشی
شاگرد بنایا اور جس سے انھیں ہر حال میں محبت رہی وہ برادرم دوّر ہاشمی
کانپوری ہیں۔ دوّر کا اٹھان ایسا تھا کہ اگر وہ لہو و لعب میں نہ پڑ جاتا تو یقیناً
جگر صاحب کا صحیح جانشین وہی ہوتا، لیکن وہ شراب اور افیم کی نذر ہو گیا
جس کا جگر صاحب کو تادم آخر افسوس رہا۔ شارق کانپوری نے بھی چند دن
جگر صاحب کو اپنا کلام دکھایا ہے، اور انھیں بھی جگر صاحب پسند فرماتے تھے،
میں ان کا شاگرد ہی نہیں بیٹا ہوں۔ میرے والد اور جگر صاحب بچپن کے ساتھی
ہیں۔ دونوں کی ساتھ بسم اللہ ہوئی اور ایک بزرگ حافظ قاری عبدالرشید صاحب

کے آگے دونوں نے زانوئے تلمذ طے کیا۔ حضرت قاری صاحب ہماری خاندانی مسجد میں درس دیا کرتے تھے اور جگر صاحب کے والد محترم نے قاری صاحب کی شہرت اور لیاقت کے باعث جگر صاحب کو ان کے حضور پیش کیا تھا۔ میرے والد صاحب سے جگر صاحب کو بے حد محبت تھی اسی بنا پر وہ مجھ سے حد سے زیادہ مانوس تھے اور پیار سے مجھے "پٹھان بیٹا" کہکر پکارتے تھے۔ حالانکہ مراد آباد جگر صاحب کا وطن تھا۔ ان کے قریبی عزیز وہاں مقیم تھے لیکن یہ فخر اور سعادت میرے ہی غریب خانے کو حاصل تھی کہ وہ مہینوں وہاں جلوہ فرما رہتے۔ ہمارے ہاں پردے کا سخت ترین رواج تھا لیکن مجھ سے چھوٹی بہنیں جو ابتدا میں دو دو تین تین سال کی جگر صاحب کے سامنے تھیں جب بڑی ہوئیں تو ان کا پردہ جگر صاحب سے نہیں کرایا گیا۔ وہ گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے ہمارے غریب خانے پر تشریف لاتے اور جب تشریف لے جاتے تو ان کا یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا۔

جسے رونق ترے قدموں نے دے کر چھین لی رونق
وہ لاکھ آباد ہو، اس گھر کی ویرانی نہیں جاتی

جگر صاحب کے شاگردوں کے سلسلے میں، میں ایک ایسے صاحب کا نام لینے والا ہوں جسے سن کر اکثر لوگ چونک اٹھیں گے۔ یہ حضرت علی گڈھ میں ہمارے ساتھی تھے۔ خاندانی نواب تھے کبھی بنک ورس پر ہاتھ ڈال لیتے۔ کبھی افسانہ نما خط لکھتے، کبھی نظمیں لکھتے، کبھی چپ ہو جاتے۔ ان کا نام نواب زادہ راحت سعید خاں چھتاری ہے یہ نواب سر احمد سعید خاں چھتاری کے بڑے صاجزادے ہیں، ان حضرت کو جگر صاحب کی شاگردی کا شوق تھا اور جگر صاحب اس پیشے سے بیزار اور پھر

نواب راحت قسم کے لوگوں سے بھی کچھ اس درجہ انھیں لگاؤ نہ تھا، راحت میرے دوست تھے اور نہایت خلیق ملنسار انسان، انھوں نے مجھ سے اپنی اس آرزو کا ذکر کیا تو میں نے کہا، یہ آرزو مشکل سے نکلے گی، البتہ ایک صورت یہ ہے کہ تم جگر صاحب کے پاس آیا جایا کرو۔ میں انھیں راحت منزل بھی لاؤں گا۔ اگر وہ تم سے مانوس ہو گئے تو پھر اظہار مدعا تم کرنا اور سفارش میں کروں گا، غرض یہ سلسلہ کئی سال بعد طے ہوا اور شاید سنہ ۱۹۵۳ء میں راحت کی یہ مراد بر آئی۔

میرے ایک اور دوست ہیں، بشیر درانی، یہ حسن پور ضلع مراد آباد کے رہنے والے ہیں، شاید وہ بھی جگر صاحب کے شاگرد ہیں۔ برادرم شکیل بدایونی مجروح سلطان پوری اور خمار بارہ بنکوی نے بھی گاہے گاہے جگر صاحب سے استفادہ فرمایا ہے، اور نواب شمس الحسن صاحب لکھنوی کو بھی یہ سعادت حاصل ہے، نواب صاحب کا نام آتے ہی مجھے ان کا ایک شعر یاد آ گیا۔ جگر صاحب مرحوم اکثر اس شعر کی بے حد تعریف کرتے تھے بلکہ جب میں ریڈیو لکھنؤ تبدیل ہو کر آیا "بھوپال ہاؤس" لکھنؤ کے دوران قیام میں جگر صاحب سے ملنے گیا تو انھوں نے نواب صاحب سے میرا تعارف کرایا اور یہ شعر سنایا تھا۔

رات بھر اُن کو خواب میں دیکھا

عمر بھر محو خواب رہنا تھا

تقسیم کے بعد ہندوستان میں کن کن حضرات نے ان کا دامن پکڑا۔ کس کس طرح شاگرد ہوئے اس کا تو مجھے علم نہیں، البتہ ایک صاحب کے بارے میں انھوں نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا کہ یہ تمھارے معنوی بھائی ہیں

بے حد سعید ہیں، میری علالت کے دوران میری خط و کتابت کے فرائض انھیں کے سپرد ہیں، البتہ مختصراً میں چند سطور لکھ رہا ہوں اور تفصیلی حالات یہ صاحب لکھیں گے۔ مجھے سر دست ان کا نام یاد نہیں، لیکن یہ کہہ دینا کافی ہے کہ یہ وہی صاحب ہیں جنھوں نے ان کی علالت کے دوران ان کی طرف سے خط و کتابت کی شرطیں ... کے حوالے ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں ایک صاحب ساحر صدیقی مرحوم تھے، جن کے بارے میں نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ

حوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

زندگی نے اس کے ساتھ وفا نہ کی، نہایت منکسر المزاج۔ خاموش طبع۔ خوش خلق خوش آواز اور سعادت مند نوجوان تھے، مشرقی پنجاب سے آئے تھے، لاہور میں مقیم تھے، پچھلے سال اللہ کو پیارے ہوئے اور مجھ جیسے اپنے قدر دانوں کو سوگوار چھوڑ گئے۔ جگر صاحب سے ان کی ملاقات ۱۹۵۶ء میں کراچی کے ایک مشاعرہ میں ہوئی تھی، جہاں چند بر خود غلط حضرات نے انھیں جگر صاحب کے حریف مقابل کے طور پر پیش کرنے کی جرأت کی تھی، اور بعض آواز کے بل پر، لیکن یہ سعید نوجوان، ان موقعہ پرست دنیا ساز لوگوں کے چنگل میں نہ پھنسا، اور از خود جگر صاحب کی خدمت پر مامور ہو گیا۔ ساحر مرحوم کی یہ ادا جگر صاحب کو بے حد پسند آئی۔ چنانچہ جب بھی جگر صاحب پاکستان آتے اور مشاعروں میں جاتے اور ساحر بھی مدعو ہوتے تو ساحر جگر صاحب قبلہ کی خدمت اسی طرح کرتے جیسے کوئی فرض شناس بیٹا اپنے باپ کی خدمت کرتا ہے۔ اور اس کا صلہ انھیں اس طرح ملا کہ وہ جگر صاحب کے بے حد قریب ہو گئے، جگر صاحب نے ان کی غزلوں پہ اصلاح کی

اور مجھ سے کہا کہ تمہارے بھائیوں میں ایک اور چھوٹے بھائی کا اضافہ ہو گیا ہے، ان کا خیال رکھا کرو۔

اس کے علاوہ جگر صاحب کی مروت اور اخلاق کی بدولت ان کے سیکڑوں دوست اور سیکڑوں شاگرد ہیں، جگر صاحب کی ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ خط بہت عمدہ لکھتے تھے، اور ہر آدمی کو جواب دیتے تھے، جس طرح وہ اپنے ملاقاتی کو یہ احساس نہ ہونے دیتے تھے کہ وہ اس کو نہیں پہچانتے اور اس سے واقف نہیں ہیں، بلکہ بعض اوقات اسے پسند تک بھی نہیں کرتے، اسی طرح وہ خطوں کے لب و لہجہ میں بھی احتیاط نہ برتتے تھے اور اکثر ایسے پیارے خط لکھ دیتے تھے کہ

ہر شخص کو گماں ہے مخاطب ہمیں رہے

جگر صاحب نہایت خلیق، ملنسار، شریف اور سراپا محبت تھے۔ وہ کسی کا دل دکھانے کے اہل نہ تھے۔ انھوں نے تو خود ہی کہا ہے

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے

چنانچہ اپنے خطوط اور اپنے ملنے جلنے کی بدولت، انھوں نے بہت سے ایسے دوست احباب چھوڑے ہیں جن سے وہ ہمیشہ ملتے رہے لیکن ان کا دل اُن سے کبھی نہیں ملا۔ خدا کے لئے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ جگر صاحب منافقانہ طور پر لوگوں سے ملتے تھے، ہرگز نہیں۔ وہ اپنی طرف سے جن سے ملتے تھے، خلوص اور محبت سے ملتے تھے، لیکن بعض حضرات بلکہ زیادہ تر حضرات اُن سے محض فائدہ اٹھانے کی غرض سے ملتے تھے، کوئی ملازمت کے لئے سفارش کرانے آیا ہے تو کوئی کسی مشاعرہ میں بلائے جانے کے لئے خط لکھوا رہا ہے تو کوئی یہ کہنے بیٹھا ہوا ہے

کہ اہل و عیال کی کثرت اور معقول آمدنی نہ ہونے کے باعث وہ پریشان ہے اور جگر صاحب اسے الگ کمرہ میں لیجا کر کچھ دے رہے ہیں اور خود بھی شرمندہ ہوتے جا رہے ہیں کہ بھئی اس میں تکلف نہ کرو۔ مجھے ضرورت ہوگی میں آپ سے لے لوں گا۔ اس وقت آپ کام چلالیں وغیرہ وغیرہ۔ تو اصل بات یہ ہے کہ جگر صاحب کی محبت سب کے لئے یکساں تھی لیکن اس محبت میں وسعت اور گہرائی اس وقت پیدا ہوتی جب اس کا جواب دوسروں کی طرف سے بھی ملتا تھا۔

یہ چند سطور تو میں نے محض خط کے طور پر لکھدی ہیں، مجھے امید ہے کہ ان سے جگر صاحب کی شخصیت کے چند پہلو ضرور واضح ہو سکیں گے۔ لیکن مضمون کے بارے میں میرا وعدہ برقرار ہے۔ انشاء اللہ یہ غم ہلکا ہو لے تو ضرور آپ کے پرچے کے لئے کچھ لکھوں گا۔ جگر صاحب کے بارے میں تو ایک دفتر لکھا جا سکتا ہے۔ میں جگر صاحب کے خود ساختہ دوستوں کے بارے میں بھی بشرطِ فرصت کچھ لکھوں گا۔

خاکِ پائے جگر
راز

اشتیاق احمد عباسی بیرسٹر

آئی جو اُن کی یاد!

میری پرورش اور پرداخت میرے ماموں چودھری شفیق الزماں صاحب مرحوم کے ہاتھوں اور ان کے گہوارۂ شفقت میں ہوئی۔ مرحوم لکھنؤ کے بہت مشہور و معروف اور ہر دلعزیز روسا میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کے اوصاف حمیدہ کے ساتھ ساتھ اُن کا اخلاق اور مروت جو از میں ضرب المثل تھی ان کی مروت کا یہ حال تھا کہ ریاض خیرآبادی نے اس کا حوالہ اپنے اس شعر میں دیا ہے ؎

ریاض ان حسینوں نے دولت تو لے لی
مروت نہ لی کچھ شفیق الزماں سے

ماموں صاحب مرحوم مغفور بجد علم دوست اور ادب نواز بھی واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ ہمارے یہاں اکثر شعر و سخن کی صحبتیں گرم رہتی تھیں اور اس وقت کے مشہور و معروف شعرا۔ جیسے مرزا ثاقب قزلباش حضرت صفی حضرت ریاض خیرآبادی ان صحبتوں میں برابر شریک ہوتے رہتے تھے۔ اور اکثر حضرت اصغر گونڈوی بھی شرکت فرماتے تھے۔ اسلئے اصغر صاحب ہمارے

ذاتی تعلقات اور مراسم بہت دوستانہ اور مخلصانہ تھے۔ ہم لوگ ان کی سنجیدہ طرز شاعری کے بہت دلدادہ اور گرویدہ تھے۔ ان کی شاعری مفکرانہ اور فلسفیانہ طرز و انداز کی ہوتی تھی۔ اس میں دعوتِ فکر و نظر کے عنصر نمایاں ہوتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک خاص طرز اشارات اور کنایات کی بے پناہ چاشنی اور لطافت پائی جاتی تھی۔ زبان کی نفاست اور سلاست بھی ان کے کلام کی خصوصیت تھی۔ نمونے کے لئے یہ ایک شعر ہی کافی ہونا چاہیئے

آ گئی کون سی حسرت دل سوزاں کے قریب
ایک دھواں سا ابھی اٹھا تھا گریباں کے قریب

مگر ذکر تو حضرت جگر مرحوم کا ہے۔ ہے تو لیکن ان کے تذکرے میں اصغر صاحب کا ذکر آ جانا بھی ضروری تھا۔ اور وہ تمہید جو اوپر لکھی گئی ہے اس کا مقصد یہ بتانا تھا کہ جب جگر صاحب کا عروج شروع ہوا تو وہ قحط الرجال کا زمانہ نہ تھا۔ بلکہ اس وقت متقدمین اور نامی گرامی اساتذۂ شعر و سخن موجود تھے۔

بہرحال اصغر صاحب سے قربت اور وابستگی کے ساتھ جگر صاحب سے سابقہ پڑنا تو گویا لازمی ہی تھا، اور جگر صاحب سے واقفیت ہونے کے بعد یہ بھی لازمی بات تھی کہ آدمی ان سے ذاتی دلچسپی اور وابستگی محسوس کرتا۔ چنانچہ میری ان سے ذاتی واقفیت اور عقیدت مندی تقریباً اسی وقت سے شروع ہو گئی تھی جب سے وہ اور ان کی والہانہ اور وجدانہ شاعری بے جھومتے ہوئے، لہراتے ہوئے اس جوار میں ان کی شہرت اور ان کی شاعری کی ہر دلعزیزی اور دلپذیری کی بنیادیں ڈالیں پس دیکھتے ہی دیکھتے ان کا خاص طرز تغزل

اور انداز غزلخوانی فضائے ادب پر چھا گیا۔ اور ان کی شخصیت نے ایک انتہائی درخشاں اور تاباں سیارہ بن کر علم و ادب کے آسمان پر چمکنا اور جگمگانا شروع کر دیا۔

شروع شروع جب ان سے ملاقات ہوئی تو وہ ایک عجیب و غریب قسم کی مستی اور سرشاری کے عالم میں رہا کرتے تھے لیکن ان کی سرشاری جب مدہوشی اور بدمستی کے حدود کو پہونچ جاتی اس وقت بھی اس میں ایک تعجب انگیز اخلاقی اور ادیبانہ ہوشمندی اور نفاست مزاج شامل اور نمایاں رہتی تھی۔ الغرض اس حال میں ان کو دیکھنے کے باوجود یہ ناممکن تھا کہ کوئی ان کی قدر دانی اور عزت نہ کرتا۔ ان سے ذاتی انس اور محبت نہ محسوس کرتا۔ حضرت جگر صاحب انتہائی عالی ظرف۔ عالی ہمت اور غیور آدمی تھے۔ ان کے اخلاق۔ مروت اور سخاوت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ دوستی اور دوستداری ان کی مخصوص خصوصیات میں سے تھیں جنھوں نے گویا ایک جانکاہ مرض کی صورت اختیار کر لی تھی کہ اس سے وہ مرتے مرتے بھی جانبر نہ ہو سکے۔

لیکن ان کی ان تمام صفات اور محاسن کے متعلق اتنا کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے کہ اس کو دہرانا بالکل غیر ضروری سی بات ہے۔ ان کی ذاتی زندگی اور شاعری کی بابت کوئی اچھی بری بات کہنے کو شاید ہی رہ گئی ہو۔ بہر حال میں تو یہ کرنے سے رہا کہ ان کی پیدائش کی تاریخ سے شروع کر کے ان کی زندگی کے لمحہ بہ لمحہ حالات۔ اور ان کے ہر دور زندگی و دور شاعری کے ضروری اور غیر ضروری تفصیلات بیان کرنے بیٹھوں۔ میرے نزدیک شاعر کی ساری شخصیت اور کارنامے

اُس کے اشعار ہوتے ہیں۔ اُنھیں میں اس کو دیکھا اور پایا جا سکتا ہے۔ ان کے باہر اُسکو ڈھونڈھنا اور تلاش کرنا پولیس کی تفتیش کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اور پھر میرا مقصد اس وقت صرف ان کو یاد کرنا ہے۔ ان کو اپنے ذاتی خراج عقیدت کا نذرانہ پیش کرنا ہے۔ چنانچہ میں صرف اسی قدر کہنے کو تیار ہوں کہ ان کی شخصیت ایک غیر معمولی شخصیت تھی۔ ایک غیر معمولی درجہ اور مرتبہ رکھتی تھی۔ جہاں وہ اپنے رنگ میں تنہا اور یکتا نظر آتے تھے۔ حضرت جگر جتنے بڑے آدمی تھے اُس سے کہیں بڑے شاعر تھے۔ اور وہ جتنے بڑے شاعر تھے اُس سے کہیں زیادہ برتر اور بہتر انسان تھے۔ انسان ہونا ہی کتنا بڑا کام اور کارنامہ ہوتا ہے۔ اس کے متعلق مرزا غالب آنجہانی کا فرمودہ حرف آخر تھا اور رہیگا۔ یعنی یہ کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ جگر صاحب اپنی ذاتی خصوصیات اور عنوان طبیعت اور مزاج ہی کی وجہ سے اتنے بڑے شاعر اور اتنے ہر دلعزیز انسان تھے ان کی شاعری اُس مخصوص طرز و ادا کی تھی کہ جو صرف انھیں کی ذات سے منسوب کی جا سکتی تھی۔ انھوں نے بہت ہی حساس۔ دھڑکتا ہوا۔ تڑپتا اور تلملاتا ہوا دل پایا تھا۔ اسی لئے ان کے دل کی دھڑکنوں سے نکلے ہوئے اشعار دلوں کی دھڑکنوں میں پیوست ہو جاتے تھے۔

اب رہا ان کا شاعرانہ مقام اور مرتبہ اور ان کے کلام کے متعلق کوئی تنقیدی تبصرہ یا جائزہ تو صاحب میں نہ اُس کی استعداد و قابلیت رکھتا ہوں۔

نہ اُس کی ہمت کر سکتا ہوں۔ صرف ان کے کلام کی دلفریبی اور اس کے ذاتی تاثرات کی بابت یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں ان سے بیحد متاثر ہوا۔ ہوتا رہوں گا۔ اور یہ کس کے بس کی بات ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے احساسات اور تاثرات کو کامیابی کے ساتھ دوسروں کو بتا سکے یا اُن کو محسوس کرا سکے۔

کسی شاعر کی شخصیت اور کلام کے پرکھنے اور جانچنے کی بابت ایک ہی کلیہ کہا جا سکتا ہے کہ اُس کی خوبیوں اور برائیوں کا اندازہ بقدر اپنے ذاتی حوصلے اور ظرف ہی کے کیا جا سکتا ہے۔ شاعر کے مرتبہ کی تصدیق اور سند صرف اس کے کلام ہی سے ہو سکتی ہے۔ وہی اس کی سوانح عمری بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ جگر صاحب کے شاعرانہ مرتبے اور درجے کو خود ان کے اشعار ہی ظاہر کرتے ہیں۔ وہی کر سکتے ہیں۔ ان کی شاعری کے متعلق میں مختصراً صرف اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کا مخصوص طرز تغزل اور شاعرانہ تجسیم کرنے دار ہوا تو گویا نظام غزل گوئی بدل گیا۔ مجھے ایک مشاعرہ کی کیفیت آج تک بھولی نہیں ہے۔ اور میرے علاوہ بھی لوگوں کو بھولی نہ ہوگی۔ وہ غالباً پہلا موقع تھا جب میں نے ان کو مشاعرہ میں پڑھتے سنا تھا۔ یہ مشاعرہ لکھنؤ یونیورسٹی کا تھا اور جگر صاحب وہاں اس عالم میں لائے گئے تھے کہ گویا وہ کچھ پڑھ ہی نہ سکیں گے۔ لیکن ان کی باری آئی تو وہ ذرا سنبھلے اور انھوں نے اپنی غزل شروع کی۔ اور جب انھوں نے لہرا کر یہ شعر پڑھا کہ ؎

اس نے شانوں پہ زلف برہم کی
خیر یارب نظام عالم کی

تو سارا مشاعرہ جھوم گیا۔ پھر نظام عالم پر کیا گزری اس کو تو نظام عالم ہی نے جانا ہوگا۔ مگر سامعین کی جو حالت تھی اور نظام مشاعرے پر جو گزری تھی وہ یاد ہے۔ ہمیشہ یاد رہے گی۔

جگر صاحب کی شاعری کا صحیح مقام کیا تھا اُس کو صاحبانِ علم و دانش جانیں۔ اُس کو صاحبانِ نظر و بصیرت جانچیں اور پرکھیں۔ میں صرف اس قدر جانتا ہوں کہ کوئی صاحبِ دل اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ میرے نزدیک وہ ایک نئی اور انوکھی شاہ راہ تغزل کے بانی اور موجد تھے۔ اُن کے کلام کا کسی اور کے کلام سے موازنہ کرنا یا مناسبت دنیا ان کے ساتھ سخت ناانصافی کی بات ہوگی۔ وہ فنا اور لامتناہی حرماں نصیبی اور نامرادی کے شاعر نہیں تھے وہ بنیادی طور پر زندگی اور خاص کر شباب کے شاعر تھے۔ اور ان کے کلام میں یہ خصوصیات ان کے بڑھاپے اور مرتے دم تک قائم رہیں اور اسی طور پر باقی رہیں گی جب تک ان کا کلام باقی رہے گا۔ وہ فنا ہو جانے کے بعد بھی زندگی ہی کے شاعر گنے جائیں گے۔ وہ حسن و عشق کی تمام صالح اور صحت مند کیفیات اور جذبات کے مصور اور مغنی تھے۔ ان کے کلام میں تمام حقیقی جذباتی سرشاریوں اور اولوالعزمی کے خزانے بھرے پڑے ہیں۔ ان کے کلام میں زندہ جان تابشیں اور تنومندی کی توتیں مخفی ہیں۔ ان کے غم واندوہ میں بھی تبسم پنہاں معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے کلام میں خلقی اور قدرتی سرور اور رندانہ شوخی اور جرارت پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام میں عاشق بھی محبوبیت کی شان رکھتا ہے۔ مگر ان کے حساس دل کی جرارت اور شوخیوں میں گستاخی۔ بدمذاقی

پستی اور بازاریت دخل انداز نہیں ہونے پاتی تھی۔ عوامی سطح پر گرنا تو درکنار ان سے بعید تھا کہ وہ اس کو جھک کر دیکھتے بھی۔ حالانکہ اُن کے طرز کلام میں اس کی بہت گنجائش تھی۔ اُس کا بہت اندیشہ کیا جا سکتا تھا۔

یہ نہیں کہ حسن و عشق کی پُر سرور مسرتوں اور ان کے دل کی جراحتوں نے نے مل جل کر اُن کے کلام میں سوز و گداز نہ پیدا کر دیا ہو۔ مگر اس ربط نے ان کی شاعری کو والہانہ شاعری بنا دیا تھا۔ اُس کو جاذبیت عطا کر دی تھی۔ اس نے ان کے کلام کو وجدانہ موسیقی بنا دیا تھا۔ اور یہ ترنم ان کے کلام کی تمام کروٹوں اور راہوں میں تڑپتا۔ تھرتھراتا محسوس ہوتا ہے۔

پھر آپ ہی بتائیے کہ جگر صاحب کا ہمارے درمیان سے گذر جانا۔ ان کے تمام مخلصین اور عقیدتمندوں کے لئے کس قدر ناقابل تلافی خسارہ اور نقصان کی بات سمجھی جانا چاہیئے؟ مگر ان کے اس شعر سے تسلی حاصل کیجئے ؎

مرگ جگر پہ کیوں تری آنکھیں ہیں اشک ریز
ایک سانحہ سہی۔ مگر اتنا اہم نہیں

حالانکہ یہ سانحہ صرف اہم ہی نہیں بلکہ بدترین اور سخت ترین حادثہ سمجھا جا سکتا اگر اس دنیا کی تمام چیزیں فانی نہ ہوتیں اور موت کو ارتقائے روحانی سمجھنے کی گنجائش نہ ہوتی۔ جگر صاحب کا دل مومن کا دل تھا اور مومن کی موت ارتقائے روحانی ہوتی ہے۔ بہرحال جگر صاحب کا کلام تو فنا ہو جانے والی چیز نہیں اور اس کے ساتھ جگر صاحب بھی غیر فانی کہے جا سکتے ہیں۔ ایک

پہلو تسلی کے لئے اور بھی ہے۔ جیسا کہ ثاقب قزلباش نے فرمایا ہے ؎

موت وہ اچھی کہ جس کے بعد مل جائے حیات
جو سبب ہو موت کا وہ زندگی بے کار ہے

اب رہا غم کرنا اور رونا تو صاحب وہ بشریت کا تقاضہ ہوتا ہے۔ صاحبانِ سوز و ساز اسی کے سہارے جیتے ہیں۔ اس لئے جگر کا یہ کہنا بھی درست تھا کہ ؎

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

یہ اس لئے حقیقت ہے کہ اپنے کلام میں پیمانے کو جو کیفیت اور سرور جگر نے بخشے تھے وہ تو ختم ہی ہو گیا۔

لیکن جگر کا کلام زندہ کلام تھا۔ جیتا جاگتا کلام تھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ جس قدر زمانہ گذرتا جائے گا اُس کی زندگی اور قدر و منزلت بڑھتی جائے گی۔ زندہ ہوتی جائے گی۔ جو لوگ جیتے بچے ہیں۔ جیتے ہوں گے وہ حضرت جگر کی شخصیت اور شاعری کے متعلق یہ شعر یاد ہی رکھیں گے ؎

میرا مقام عشق مقام فنا نہیں
دنیائے زندگی ہے جدھر دیکھتا ہوں میں

شاد سلطانپوری

کاشانۂ اصغر کی ایک شام

اگر ولی دکنی کو اردو ادب کا چاسر (Chaucer) کہا جائے تو غالب کو ملٹن (Milton) کا درجہ ملنا چاہیے کیونکہ غالب نے اردو ادب کو کلاسیکی شاعری (classic poetry) عطا کی ہے جتنی خصوصیات کسی کلاسیکی شاعری کے لئے ضروری ہیں وہ غالب کے کلام میں موجود ہیں۔ غالب غزل گو شاعر تھے انہوں نے غزل کو اپنی لڑکی کی طرح پالا پوسا اور بڑا کیا۔ اردو غزل کی نس نس میں غالب کا خون چمکتا ہے اور اردو غزل کے دل کی دھڑکنوں میں غالب کے دل کی دھڑکنیں سنی جا سکتی ہیں۔ غالب کے گھر یہ لڑکی جوان ہوئی۔ اس کا بدن نکھرا اور ایک حسین دیوی کی طرح اٹھکھیلیاں کرنے لگی۔ پھر اس کے چہرے پر سنجیدگی نظر آنے لگی۔

اسی دور میں غالب کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا اور اس کے بعد اردو غزل کی یہ حسین دیوی ایک یتیم لڑکی کی طرح سارے ہندوستان میں ماری ماری پھرتی رہی۔ رات دن، ہر پل، ہر گھڑی وہ کسی کا انتظار کرتی رہی،

لیکن اس کو سہارا دینے والا نظر نہ آیا۔ اس پر ایک دور ایسا بھی گذرا جب اس کی عزت و آبرو بھی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اس برے وقت میں اس بدنصیب اور یتیم دیوی کا ہاتھ جس نے پکڑا اور جس نے اس کی آبرو اور عزت کو اپنی آبرو اور عزت سمجھنے کی قسم کھائی اور اس کی مانگ میں سیندور بھرا وہ مرحوم علی سکندر۔ جگر مرادآبادی تھے۔

میں یہاں پر جگر صاحب کی شاعری پر کوئی تنقیدی مضمون نہیں لکھنا چاہتا کیونکہ اس کام کے لئے ہندوستان میں بہت سے نقاد موجود ہیں اور میرا خیال ہے وہ جگر اور ان کی شاعری کے ساتھ انصاف کریں گے۔ میں یہاں پر ایک شام کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو میں نے کاشانۂ اصغر (اسی مکان میں پہلے اصغر گونڈوی رہتے تھے۔ ان کے مرنے کے بعد جگر صاحب وہیں رہنے لگے) میں گذاری تھی آج سے تقریباً تین سال پہلے کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا۔ تقریباً ساڑھے چھ بجے تھے میں "کاشانۂ اصغر" پہنچا۔ جگر صاحب باہری صحن میں ایک پلنگ پر بیٹھے تھے۔ "بھئی وعدے کے پکے نکلے آؤ۔ ادھر میرے پاس بیٹھو یا کرسی نکال لو۔ میں نے کمرے سے کرسی نکالی اور ایک کنارے بیٹھ گیا میرے پاس ہی کئی لوگ کرسیوں پر پہلے ہی سے بیٹھے تھے مجھے یاد ہے ان لوگوں میں سے ایک تو شمس الدین (تحصیلدار صاحب تھے (جو حیات جگر نام کی کتاب شائع کرنے والے ہیں۔ یہ بات جگر صاحب نے خود مجھ سے کہی تھی) اور دوسرے کرشن چندر۔ حیرت گونڈوی تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے لوگ وہاں موجود تھے مگر ان کے نام مجھے یاد نہیں ہیں۔

میں کچھ دیر بیٹھا رہا کچھ باتیں ہوتی رہیں ۔
"بھئی کچھ گرما گرمی ہونی چاہیئے میں اس طرح کی محفلوں کو پسند نہیں کرتا۔ چائے منگوائی جائے ۔۔۔ آپ صاحبان کا کیا خیال ہے ؟ ۔۔۔ جگر صاحب نے کہا۔

اور اس سے پہلے کہ کوئی اپنی رائے ظاہر کرے انھوں نے خانساماں کو بلوایا اور چائے کا آرڈر دے دیا۔
جب سب چائے پی چکے تو کہنے لگے ۔
"چائے کیسی تھی ؟"
"بہت اچھی تھی۔ سب ہی نے کہا
"یہ چائے والا میرے لئے بہت اچھی چائے بنا کر بھیجتا ہے۔ وہ جانتا بھی ہو کہ میں کیسی چائے پسند کرتا ہوں اور جب میں چائے منگواتا ہوں تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ مہمان آئے ہوں گے۔ وہ میرے مہمانوں کو اپنا مہمان سمجھتا ہے" ۔۔۔ جگر صاحب نے کہا۔
"مگر گھر کی چائے میں کچھ اور ہی بات ہوتی ہے" تحصیلدار صاحب نے کہا۔
"بھئی ہمارے گھر کی چائے اس سے خراب ہی بنتی ہے۔ اچھی نہیں بن سکتی"
"کیوں ؟" تحصیلدار صاحب نے پوچھا۔
"دودھ اچھا نہیں ہوتا" جگر صاحب نے جواب دیا۔
"اگر دودھ اچھا نہیں ہوتا تو اس کی وجہ دودھ والا ہے۔ اسے بدل دیجئے میرے گھر کا دودھ والا خالص دودھ دیتا ہے"

تو اس سے کہہ دو کہ میرے گھر بھی شام کو دودھ دے جایا کرے ۔"
اور سویرے کون دودھ دے گا۔ آخر ضرورت تو سویرے بھی ہوتی ہی ہوگی
تحصیلدار صاحب نے کہا۔
سویرے تو وہی دودھ والا دے گا" جگر صاحب نے کہا
میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب وہ خراب دودھ دیتا ہے تو آپ اس سے دودھ کیوں لیتے ہیں" تحصیلدار صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔
بھئی تمہیں نہیں معلوم۔ میں بتاتا ہوں۔ اس نے ایک بھینس خریدنے کے لئے مجھ سے دو سو روپے ایڈوانس لے لئے ہیں۔ اب دو سو روپے کا دودھ تو لینا ہی پڑے گا۔"
اور سب یہ سن کر ہنس پڑے۔
اور اس کے بعد جگر صاحب میری طرف مخاطب ہوئے۔
ارے بھئی میں تمہارا تعارف کرانا تو بھول ہی گیا تھا۔ آپ ہیں درگا پرشاد شاد۔ ٹھیک ہے نا ۔ بھوپال سے آئے ہیں۔ نوجوان شاعر ہیں۔ اچھا کہتے ہیں
پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگے۔ شاد تم نے کوئی آٹم (Atom) ڈھالا ہے"
میں نے سنا تو ضرور کہ جگر صاحب نے کچھ آٹم کے بارے میں پوچھا ہے لیکن اس وقت مطلب نہ سمجھ سکا۔ میں نے سمجھا کہ شاید جگر صاحب نے آٹم (Atom) کے بارے میں پوچھا ہے کیونکہ میں سائنس کا گریجویٹ ہوں۔ (انھیں دنوں ایٹم کا تجربہ بھی ہوا تھا) مگر میں نے عقلمندی کی اور چپ رہا۔ کیونکہ اس محفل میں آٹم

کا ذکر کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا تھا۔
مجھے چپ بیٹھے دیکھ کر وہ سمجھ گئے اور کہنے لگے: بھئی آٹم (Atom) سے میرا مطلب غزل سے تھا۔ کوئی غزل کہی ہے۔ میں غزل کو آٹم (Atom) ہی کہتا ہوں کیونکہ غزل آٹم (Atom) ہی کی طرح دل پر فوراً اثر کرتی ہے نظم میں وہ بات کہاں۔"
میں نے دل میں سوچا اچھا ہوا جو چپ رہا۔ اور میں نے فوراً ہی کہا: جی ہاں ایک نئی غزل کہی ہے۔"
"غزل نہیں ــــ کہو ایک آٹم ڈھالا ہے۔"
میں کچھ ہچکچایا۔
"کہو جی ــــ میں نے ایک آٹم ڈھالا ہے۔"
اور جب میں نے یہ بات کہہ دی تب کہنے لگے: اب سناؤ۔"
میں نے مطلع پیش کیا۔

میں خود جلوں گا سر بزم روشنی کے لئے مجھے قبول ہے مرنا بھی زندگی کے لئے

کہنے لگے" اچھا ہے۔"
دوسرے شعر پر بالکل خاموش رہے۔ اور اسی غزل کا میں نے تیسرا شعر سنایا

چلو چلیں اُسی محفل میں زخم کھانے کو ترس گئے ہیں یہاں زندگی بے رُخی کے لئے

بھئی بہت خوب کہا ہے۔" اللہ دوسروں کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے دیکھا کتنا اچھا شعر ہے۔
میں بہت خوش ہوا اور اسی رو میں چوتھا شعر بھی میں نے پڑھا۔

ایک ایسی بزم کی تنظیم چاہتے ہیں ہم جہاں کوئی بیگانہ تفریق ہو کسی کے لئے

میاں اس شعر کی تعریف میں نہیں کروں گا۔ ہاں اگر سردار جعفری صاحب ہوتے تو ضرور پسند کرتے۔ اگر کہیں مل جائیں تو انھیں یہ شعر ضرور سنانا اور سب لوگ ہنسنے لگے۔ مجھے بھی کچھ ہنسی آئی۔

کہنے لگے :"تم پر بھی ترقی پسندی کا بھوت سوار ہو رہا ہے ۔ ذرا ہوشیار رہنا :"

میں چپ رہا اور اس کے بعد سب ہی نے اپنی اپنی غزلیں سنائیں۔ مجھے یاد نہیں ہے اس لئے میں یہاں پر وہ اشعار لکھنے سے قاصر ہوں جو جگر صاحب نے پسند کئے تھے۔

آخر میں خود ہی کہنے لگے "اب میں بھی سناتا ہوں "

اور انھوں نے اپنی غزل کا یہ مطلع جھوم کر پڑھا

حسن جس رنگ میں ہوتا ہو جہاں ہوتا ہے

اہل دل کے لئے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

پوری غزل جھوم جھوم کر سنائی۔ پھر کہنے لگے ایک نیا مطلع کہا ہے اگر آپ لوگ اجازت دیں تو سناؤں۔

"ارشاد" سبھی نے ایک آواز ہو کر کہا۔

اور جگر صاحب نے یہ مطلع پڑھا۔

کم نہیں ظلمت بھی کچھ اہل نظر کے لئے
کون رہی منتظر نور سحر کے لئے

اور سب لوگ جھومنے لگے ـــــ ان کا پڑھنے کا وہ خاص انداز، وہ تیور، وہ ترنم جب یاد آتا ہے تو میرے سامنے اُن کی تصویر ناچنے لگتی ہے اور میری عجیب سی حالت ہو جاتی ہو میں جگر صاحب کو اس دور کا غالب مانتا تھا، مانتا ہوں، اور مانتا رہوں گا

قیسی الفاروقی ایم۔اے

"حیاتِ جگر" کا ــــــ ایک باب

حضرت جگر کی اصلاح خود اپنے کلام پر

کہنے کو اہل علم کی کوئی کمی نہیں
لیکن خود اپنی فکر خود اپنی نظر کہاں — جگر

"جب آتش گل" کو ادارہ "الفرقان" میں چھپنے کے لئے دیا گیا تو حضرت جگر نے مجھ سے فرمایا کہ میں نے "آتش گل" پاکستان ایڈیشن پر نظر ثانی کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس ایڈیشن میں اس کی تصحیح کردی جائے میں نے حضرت جگر کی وہ کتاب لے لی جو ان کے پاس رہتی تھی اور اسے دیکھ کر قلمزد اشعار اور ترمیمات کی ایک فہرست بنائی مگر لکھنؤ ایڈیشن نصف سے زائد طبع ہو چکا تھا اور اصلاح بہت کم عمل میں آئی۔ پاکستان ایڈیشن کا وہ نسخہ جو حضرت والا نے مجھے دیا تھا اس میں سے میں نے تمام اصلاحات لکھ لیں۔ کتاب دیکھنے سے پتہ چلا کہ حضرت جگر نے کتاب چھپنے کے بعد اپنی ہر غزل کے ہر شعر پر نظر ثانی کی ہے اور اس پر نشانات لگائے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والا کا یہ قول کہ "شاعری بغیر محنت کے ترقی نہیں کر سکتی" کس قدر صحیح ہے اور وہ خود بھی اپنی غزلوں پر قوت صرف کرتے رہتے ہیں اور اب بھی کرتے ہیں۔ یہی صورت میں نے ان کی بیاضوں میں بھی دیکھی ہے جن میں ایک ایک مصرع کو کئی بار بدلا ہے اور اکثر اشعار جو

ظاہر درست ہیں مگر معنویت کے اعتبار سے بلند نہیں ہیں انھوں نے اپنی غزل میں شامل نہیں کیے ہیں۔ محترمی حبیب احمد صدیقی صاحب کے نام خطوط میں بھی حضرت والا نے بہتیرے ایسے اشعار انھیں لکھے ہیں جو بعد میں "آتش گل" میں شامل نہیں کیے۔ پاکستان ایڈیشن کے "آتش گل" کے قلمزد اشعار یہ ہیں۔

نزاکت ہائے احساس محبت، اے معاذ اللہ
کہ اب اک اک گھڑی اک ایک عالم ہوتی جاتی ہے

نظر سے ان کی پہلی ہی نظر یوں مل گئی اپنی
حقیقت میں تھی جیسے مدتوں سے دوستی ان کی

رگ رگ میں اس طرح وہ سما کر چلے گئے
جیسے مجھی کو مجھ سے چرا کر چلے گئے

یہ عمر عشق یوں ہی کیا گنوائی جاتی ہے
حیات زندہ حقیقت بنائی جاتی ہے

ادائے عشق ادائے یار بھی ہے
بہت سادہ بہت پرکار بھی ہے

عشق ہے اس مقام پر کہ جہاں
زندگی نے شکست کھائی ہے

یوں تو وہ شکوہ سنج رسوائی
اور در پردہ ہمت افزائی

چھپتا ہے کہیں بائی بیداد کا عالم
ہونٹوں پہ تبسم ہے کہ فریاد کا عالم

دیکھ اے نگہ شوق یہیں تک نہ ٹھہرنا
اک اور بھی ہے حسن خداداد کا عالم

آنکھیں ابھی کچھ اور بھی ہیں منتظر جگر
چھپا کی قتل گاہ کا منظر لیے ہوئے

نظم "آوازیں"

گرانیاں اس طرف وہ ارزاں ادھر یہ افلاس و تنگدستی
مگر حکومت کا ہے یہ عالم ذرا نہیں شرمسار اب بھی

"اعلان جمہوریت"

عروس و محبت اہل چمن یہ ہے موقوف
کہ شاخ خشک میں بھی پھر برگ و بار آئے

جنونِ عشق ہو صالح اگر تو ممکن ہے
کہ پھر اس اجڑے گلستاں میں بھی بہار آئے

"آتش گل" پاکستان ایڈیشن میں اصلاحات"

اب ہوس محبت کی جگر کیوں نہیں جرأت
وہ سامنے ہیں گرم ہے بازارِ محبت

اصلاح "دربارِ محبت"

غم

یہ تو نہیں کہ عرض درخورِ اعتنا نہیں
حسن کو لیکن اسے جگر فرصتِ اسوا نہیں

(اصلاح: یہ ان دنوں)

حسنِ عمل

خلوصِ شوق، نہ جوشِ عمل نہ دردِ وطن
یہ زندگی ہے خدایا کہ زندگی کا کفن

(کتابت کی غلطی) منزل تو

ہر گام پر ہے منزل تو جستجو طلب
جاتا ہے سر اُٹھائے ہوئے بے خبر کہاں

یہ صحن و روش، یہ لالہ و گل ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں

گلستاں

تخریب جنوں کے پردے میں، تعمیر کے ساماں ہوتے ہیں

ہے جو

یہ خون جو ہے مظلوموں کا ضائع تو نہ جائے گا لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرفِ بہاراں ہوتے ہیں

چھوٹے

کام ادھورا اور آزادی
نام بڑے اور تھوڑے درشن

یہ ہے عشق کی کرامت یہ کمالِ شاعرانہ
کہ جو بات منہ سے نکلی وہی بن گئی فسانہ

وہی منہ سے بات نکلی ابھی ہو گئی فسانہ

مجھے چاک جیب و دامن سے نہیں مناسبت کچھ　　یہ جنوں ہی کو مبارک رہ و رسم عامیانہ

زلف گرہ گیر

ہر وہ حلقہ جو تری کاکل شب گیر میں ہے　　گوشۂ امن بلا خانۂ زنجیر میں ہے

سبزۂ و گل، موج و دریا، انجم و خورشید و ماہ　　اک تعلق سب سے ہے لیکن رقیبانہ مجھے

کہاں تھی یہ روح میں لطافت، کہاں تھی کونین میں یہ وسعت

حیات ہی جیسے سو رہی تھی کسی کی پہلی نظر سے پہلے

لطیف

بہت حسین مناظر بھی حسن فطرت کے　　نہ جانے آج طبیعت پہ کیوں گراں گزرے

سراپا　　خیام و حافظ　　رفتار نازک

گفتار شیریں، رفتار نازک　　خیام و حافظ، تسنیم و کوثر

قحط بنگال

سیاست

تعمیر کے پردے میں یہ انداز حکومت　　تخریب بہ عنوان دگر دیکھ رہا ہوں

اعلان جمہوریت

خمیر

دلوں کی کھوٹ ہو جس کی ضمیر میں شامل

نہ آتی ہے وہ سیاست نہ ساز گار آئے

"ساقی" رفاقت

ترے جو حق رقابت کا تقاضا کچھ بھی ہو لیکن　　تجھے لازم نہیں ترک منصب و نعمت ساقی

خود

وہی انسان جسے سرتاج مخلوقات ہونا تھا　　وہی اب سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی

"آتش گل" میں اضافۂ اشعار

ختم ہوا انعام فراق آ ہی گیا پیغام طلب

ان دو اشعار کا اضافہ ہے اس زمین میں کوئی غزل نہیں ہے۔

جرم جنوں کی اس سے زیادہ ہوگی کیا تعزیر
وحشت کھینچے اپنی جانب پاؤں پڑے زنجیر

اہلِ زمانہ اور زمانے بھر کی یہ تحقیر
آپ ہی اس میں عیب نکالیں اپنی ہی تصویر

ہونے کو یوں تو روشنیاں ہیں بہت مگر ہر روشنی دلیل موئے سحر نہیں

دل اپنے ہی تیروں کا خود ہی شاید کہ نشانہ ہے ہمدم
اس حسن سراپا عصمت پر الزام ہو جو الزام نہیں

کیسی نظر کہاں کی نظر کیا نظر میں ہے جب تم نہیں تو خاک میری چشم تر میں ہے
ہر اشک رازِ حسن ہے جو چشم تر میں ہے اے دل سنبھل کہ بات ابھی گھر کی گھر میں ہے
خوشا جلوے ہی جلوے ہیں چار سو رقصاں فغاں کہ فرصت نظارگی بہت کم ہے

حضرت جگر کے شعر کہنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے وہ مصرعۂ طرح سے مناسبت پیدا کرتے ہیں اور جب ذہن اس مصرع کی طرف مائل ہو جاتا ہے تو اشعار زبانی کہتے جاتے ہیں۔ دو چار اشعار کے بعد کسی نوٹ بک میں لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ دراصل دو ایک شعر ہو جانے کے بعد ہی پھر اشعار کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان کی نوٹ بک بھی ایک خصوصیت کی حامل ہوتی ہے۔ اول تو نوٹ بک

بہت دیدہ زیب اور اس کا کاغذ بہت عمدہ ہوتا ہے پھر وہ چند سادے اوراق چھوڑ کر کسی صفحہ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا طغرا نہایت اہتمام سے بناتے ہیں پھر اشعار لکھنا شروع کرتے ہیں اگر ایک مصرع بھی کاٹ دیتے ہیں تو پھر دو تین سادے اوراق چھوڑ کر پھر نئے صفحہ پر طغرا بنا کر پھر اشعار لکھنا شروع کرتے ہیں۔ اس طرح ایک غزل کئی کئی جگہ لکھی جاتی ہے اور اشعار کی تعداد بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ پانچ سات صفحات پر اس طرح لکھنے کے بعد غزل پوری ہوتی ہے۔ اور اسے پھر آخری بار صاف اور خوش خط لکھتے ہیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر ایک دو لفظ کی ترمیم کی ہے تو اس لفظ کو بیل بوٹوں میں تبدیل کر دیتے ہیں اور اگر الفاظ یا پورے مصرع پر قلم چلانے لگے تو وہ چار منٹ میں ایک گلدستہ سا بنا دیتے ہیں اور اسے مکمل کر کے پھر ورق اُلٹ دیتے ہیں۔

جو نوٹ بک اس وقت میرے پیش نظر ہے اس میں ایسے درجنوں بیل بوٹے بھی ہیں چڑیاں بھی ہیں اور مچھلیاں بھی ہیں۔ دو صفحات پر الگ الگ خط ماہی میں "جگر" اور "انقلاب" بھی لکھا ہوا ہے۔ اس نوٹ بک میں سو اوراق ہیں اور اس میں ۱۴ اوراق میں ایک غزل "ہر نگہ کو طبعِ نازک پر گراں سمجھا تھا میں" ہے اور ۱۵ اور ۱۶ نمبر پر "ہر لحظہ اک سرودِ میسر لئے ہوئے" ہے، ۱۷ پر "داغِ دل کیوں کوئی مجروحِ پذیرائی ہو" ہے اور ۱۸ اور ۱۹ پر "بیٹھے ہیں وہ شاہد و ساغر لئے ہوئے" کے چند اشعار ہیں۔ اور ورق نمبر ۲۰ سے ۳۰ تک "راز جو سینۂ فطرت میں نہاں ہوتا ہے" غزل ہے پھر ۳۲ ورق تک

سادہ ہے اور ۴۳ پر "یک لحظہ خوشی کا جب انجام نظر آیا" غزل شروع کی ہے۔
اور ۵۳ پر پرانی غزل "تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی" پوری غزل
ہے ورق نمبر ۳۷ پر "آج بھی یوں تو ہر اک رند جواں ہے ساقی" کے چند اشعار
ہیں اور ۳۹ پر پھر "یک لحظہ خوشی کا جب انجام نظر آیا" غزل ہے جس کا سلسلہ
ورق نمبر ۴۰ تک ہے۔ پھر ۴۱ سے ۴۳ تک "ناز جو سینۂ فطرت میں نہاں ہوتا
ہے" کے ۲۳ اشعار مع قطعات کے ہیں اور ورق ۴۴ پر "ہر ادائے حسن کی ڈوبی ہوئی
تاثیر میں ہے" شروع ہوکر ورق ۴۵ پر صاف ہوئی ہے۔ ورق ۵۶ سے نظم
"بنگال" شروع ہوئی ہے اور غیر مکمل ہے ورق ۵۸ پر "دل پر ہزار طرح کے
اوہام چھا گئے" شروع کیا ہے اور ورق نمبر ۶۰ پر یہ غزل صاف لکھی گئی ہے۔
ورق ۶۱ پر "تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی" پھر پوری غزل ہے
اور ۶۲ پر "زندگی ہے مگر پرائی ہے" پوری غزل صاف لکھی ہوئی ہے۔ درمیانی
اوراق پر بیل بوٹے ہیں اور ۶۶ پر پوری غزل "ابھی نہ روک نگاہوں کو پیر مینا"
صاف لکھی ہوئی ہے۔ اور پھر یہی غزل نمبر ۶۸ پر ہے جس میں ۱۲ اشعار ہیں۔
درمیانی اوراق سادہ ہیں اور پھر "ابھی نہ روک نگاہوں کو پیر مینا نہ" پوری غزل
مگر الفاظ میں ردوبدل بہت ہے۔ اور اسی غزل کا سلسلہ ورق نمبر ۷۵ تک ہے۔ اس
غزل کو لکھتے وقت نوٹ بک کے بائیں جانب سے غزل شروع کی ہے یعنی ورق نمبر ۷۳
سے شروع کرکے ورق ۶۶ پر غزل صاف کی ہے۔ ورق ۸۰ پر چند مصرعے ہیں جن میں
ایک یہ بھی ہے "فکرِ جمیل خواب پریشاں ہے ان دنوں" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
"فکرِ جمیل خواب پریشاں ہے آج کل" کی فکر اسی ورق سے شروع ہوئی ہے۔

کہنے کی ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اسی کے سامنے کے صفحہ پر حضرت جگر نے "انقلاب" نہایت خوش خط، خطا ہی میں لکھا ہے۔ اس وقت نظم آگے نہیں بڑھی اس لئے کہ شاعر کا ذہن انقلاب کی طرف منتقل ہو گیا اور میرا خیال ہے کہ وہ غیر شعوری طور پر اس لفظ کی تشکیل و تکمیل میں لگ گئے ورق ۸۴ پر "غم عشق میں ایک ہیں قرب و دوری" حضرت تسکین قریشی کی پوری غزل ہے۔ ورق نمبر ۸۸ کے سامنے دو اشعار ہیں

دہ یار رہ برد ہو تو نظر میں کیا سمائے ۔۔۔ وہ زمین دیر و کعبہ کہ جو ہو چکی پرانی
یہ وفا کوئی وفا ہے، مجھے ان کا بھی گلہ ہے ۔۔۔ جو ستم کئے ہیں تو نے بہ ہزار مہربانی

اور ورق ۸۸ پر حضرت تسکین قریشی کی غزل "چھپ چھپ کے ان کی بزم میں جاتا رہا ہوں میں" ہے

اس کے بعد ورق ۹۴ تک کچھ پتے درج ہیں، پھول پتیاں ہیں۔ کلیاں ہیں بیل بوٹے ہیں۔ اس طرح تقریباً دو سو صفحات کی نوٹ بک میں کل ۲۰ غزلیں ہیں۔ حضرت جگر اپنے اشعار سے جلد مطمئن نہیں ہوتے اس کی وجہ سے ایک ایک مصرعے پر پوری قوت اور توجہ صرف کرتے ہیں۔ مجھ سے بارہا فرمایا کہ مصرع خود بتا دیتا ہے کہ اب شعر مکمل ہو گیا۔ شعر سے مطمئن نہیں ہونا چاہیئے۔ ہر شعر کے ترقی کرنے کے امکانات باقی رہتے ہیں جو محنت نہیں کرتا وہ شاعر ترقی نہیں کر سکتا

ایک اور نوٹ بک میرے سامنے ہے۔ یہ بھی ۲۰۰ اوراق کی ہے اور اس میں موجودہ دور کی بھی غزلیں ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد ۸ ہے۔

۱۔ غم میں بھی جس کو اک سرور نہیں

۲۔ بے غم عشق و بے دل آگاہ

۳۔ لب ترستے ہیں التجا کے لئے

۴۔ محبت زندگی ہی زندگی ہے

۵۔ وہ سبزہ ننگ چمن ہے جو لہلہا نہ سکے

۶۔ یہ لالہ و گل یہ صحن و روش ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں

۷۔ جب تک کہ غم انساں سے انساں کا دل معمور نہیں

یہ غزلیں بھی اسی طرح لکھی گئی ہیں جیسا کہ پچھلی بیاض کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ پچاس کے قریب اوراق سادے ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ نوٹ بک حضرت والا کے پاس پاکستان میں بھی رہی ہے۔ اس لئے کہ رمی کی ہار جیت کے اعداد و شمار ۱۰ اوراق پر درج ہیں اور ان میں چند نام نمایاں ہیں۔ جگر، نظر، فضلی۔ اور دوسرے ناموں کے حروف بھی ہیں۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ جگر صاحب زیادہ تر ہارے ہیں۔

اب ان اشعار کو پیش کرتا ہوں جن پر حضرت والا نے شعر پورا ہو جانے کے بعد اصلاح کی ہے۔

ہر نگہ کو طبع نازک پر گراں سمجھا تھا میں	وہ بھی کیا دن تھے جب ان کو بدگماں سمجھا تھا میں

"ان کو" کے بجائے "اسکو" کیا ہے

بے حجابی کو حجاب درمیاں سمجھا تھا میں	سامنے کی بات کو راز نہاں سمجھا تھا میں

دوسرے مصرعے کو یوں کہا ہے "سامنے کی بات تھی لیکن کہاں سمجھا تھا میں" جس سے شعر میں زیادہ تاثر پیدا ہوا ہے۔

یہ شعر قلمزد کر دیا ہے

رفتہ رفتہ مرکزِ فکر و توجہ بن گئی اپنی بربادی کو حسنِ رائیگاں سمجھا تھا میں

"آتش گل" میں بھی یہ شعر نہیں رکھا ہے۔ مطلع میں رائیگاں کا قافیہ بہت بہتر انداز میں فرمایا ہے۔

"عشق کی بربادیوں کو رائیگاں سمجھا تھا میں بستیاں نکلیں جہاں ویرانیاں سمجھا تھا میں"

دوسری غزل کے مندرجہ ذیل اشعار قلمزد ہیں۔

یادش بخیر پھر ہے اسی رہگذر کی یاد گذرے تھے ہم جہاں سے کبھی سر لئے ہوئے

پھر عشق سادہ لوح کو دعوی ضبط ہے ہر ہر نفس میں شورش محشر لئے ہوئے

تو خود ہی عین ذات ہے خود جلوہ صفات پھرتا کہاں ہے شوق کا دفتر لئے ہوئے

جس کی شفا محال ہے جس کی دوا حرام اے چارہ گر وہ زخم ہوں دل پر لئے ہوئے

یارب کہاں گیا وہ زمانہ کہ عشق میں اک دل تھے ہم بھی دل کے برابر لئے ہوئے

یہ شعر جو آتش گل میں چھپا تھا اور بعد میں حضرت جگر نے قلمزد کر دیا ہے بیاض میں قلمزد ہے۔

"آنکھیں ابھی کچھ اور بھی ہیں منتظر جگر پھیرا کے قتل گاہ کا منظر لئے ہوئے"

یہ شعر بیاض میں ہے مگر اسے غزل کے ساتھ نقل نہیں کیا ہے

جن کو خبر نہیں کہ ہے رنگ زمانہ کیا بیٹھے رہیں وہ شاہد و ساغر لئے ہوئے

یہ اشعار عامیانہ مضامین کے حامل ہیں۔ تیسرے شعر کی ذات و صفات "کو ایک دوسرے شعر میں بہت خوبی سے بیان فرمایا ہے۔

"غم ہے کیا زینۂ صفات و ذات غم نہیں ہے تو آرزو نہ حیات"

تیسری غزل "آتش گل" پاکستان ایڈیشن میں صفحات ۱۱۴ و ۱۱۵ پر ہے اس کے مندرجہ ذیل اشعار بیاض میں قلمزد نہیں ہیں مگر آتش گل میں نہیں ہیں یعنی بالفاظ دیگر حضرت والا نے یہ اشعار چھوڑ دیئے ہیں۔

آج سے ترک ملاقات بھی تسلیم مجھے — توبہ توبہ کہ ترے حسن کی رسوائی ہو
کوئی اپنا نہیں عرفاں نہ اگر ہو اپنا — سب شناسا ہیں اگر خود سے شناسائی ہو

پہلے شعر میں رسوائی کا مضمون عامیانہ تھا۔ دوسرے شعر کے شناسائی کا قافیہ مطلع میں آچکا تھا، جو اس شعر سے کہیں بہتر ہے۔

عمر بھر روح کی اور جسم کی یکجائی ہو — کیا قیامت ہے کہ پھر بھی نہ شناسائی ہو

چوتھی غزل بھی اس کے قبل والی غزل کی طرح دو غزلہ ہے اور پاکستان ایڈیشن کے صفحات ۱۶۱ سے ۱۶۴ تک میں ہے بیاض میں ۱۲ اشعار قلمزد ہیں۔

اس کے بعد یک لحظہ خوشی کا جب انجام نظر آیا" پوری غزل ہے۔ بیاض کا یہ شعر

"آخر دل دیوانہ کچھ کام تو کر آیا — دنیا بھی سنوار آیا اور خود بھی سنور آیا"

آتش گل صفحہ ۱۶۴ پر نہیں ہے اور آتش گل کے آخری دونوں اشعار بعد میں ہوئے ہیں اس لیے کہ بیاض میں نہیں ہیں۔

گلشن کی تباہی پر کیوں رنج کرے کوئی — الزام جو آنا تھا دیوانوں کے سر آیا
یہ محفل ہستی بھی کیا محفل ہستی ہے — جب کوئی اٹھا پردہ میں خود ہی نظر آیا

اس کے بعد کی غزل کا مطلع پہلے یوں ہوا تھا۔

گو شۂ امن بلاخانۂ زنجیر میں ہے — ہر وہ حلقہ جو تری کاکل شب گیر میں ہے

دو تین صفحات پر لکھنے کے بعد اس مطلع کے پہلے مصرع کو دوسرا اور دوسرے کو پہلا کیا ہے

پھر آتش گل پاکستان ایڈیشن کے بعد "کاکل شب گیر" کے بجائے "زلف گرہ گیر" کیا ہے جس سے کو ستے اس کی اور وضاحت ہوتی ہے۔

اسی طرح   "دیکھنا جبر مشیت کہ بتقید زندان
پاؤں زنجیر سے باہر ہے نہ زنجیر میں ہے

کئی صفحات پر اس طرح ہے۔

اُف یہ توہین گرفتاری و آزادی شوق
پاؤں زنجیر سے باہر ہے نہ زنجیر میں ہے

آخری شعر بیاض میں یوں ہے

"چھپ کے پردوں اُسے او دیکھنے والے یہ بتا
مجھ میں کیا بات نہیں جو مری تصویر میں ہے"

آتش گل میں "او" کے بجائے "اے" ہے اور یہی درست بھی ہے۔
اس کے بعد کی غزل ہے "شرما گئے لجا گئے دامن چھڑا گئے" جو آتش گل کے صفحہ ۱۶۰ پر ہے اور اس میں صرف ۷ اشعار ہیں۔ بیاض میں ۹ اشعار ہیں۔
اس کے بعد کی غزل ہے "زندگی ہے مگر پرائی ہے" بیاض میں یہ شعر قلمزد کر دیا گیا ہے

توبہ زاہد، ہم اور توبہ مئے   مفلسی وجہ پارسائی ہے

اس کے بعد کی غزل ہے "ابھی نہ روک نگاہوں کو پیر میخانہ" اس کا ایک شعر یوں تھا۔

"گراں ہے روح پہ ذکر شراب و میخانہ
یہ کس نے چھیڑ دیا زندگی کا افسانہ

پہلے مصرع کی اصلاح یوں کی ہے "حدیث حسن، نہ شغل شراب و پیانہ" اصلاح کے بعد شعر کی کیفیت ہی کچھ اور ہو گئی ہے۔ اس غزل کے تین اشعار متروک ہیں جن میں ایک یہ ہے "نظر کو فرصت نظارگی نہیں نہ سہی
یقیں تو ہے کہ وہ آئے تھے بے حجابانہ"

حضرت والا نے "فرصت نظارگی" کو اس بہتر انداز میں اس شعر میں فرمایا ہے

خوشا کہ جلوے ہی جلوے ہیں چار سو رقصاں
فغاں کو فرصت نظارگی بہت کم ہے

دوسری بیاض کی غزلوں پر اصلاحات بھی اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت والا اپنے اشعار پر توجہ اور فکر برابر کرتے رہے ہیں اور انھیں تابانی بخشتے رہے ہیں۔ چنانچہ پہلی غزل کے چار اشعار یوں درست کیے ہیں۔

"دل ہی وہ کیا جو ناصبور نہیں — اس میں کچھ آپ کا قصور نہیں"

دوسرے مصرعے کی یوں تصحیح کی ہے — "تو نہ شرما ترا قصور نہیں"

دوسرا شعر یوں کہا تھا

"آج کیا بات ہے مرے ساقی — پی رہا ہوں مگر سرور نہیں"

پہلے مصرع کو یوں درست کیا ہے "مجھکو شکوہ ہے چشم ساقی سے"

تیسرا شعر تھا

"میں ہوں اور شام غم کا سناٹا — کوئی آواز دور دور نہیں"

اس شعر کی اصلاح یوں کی ہے

"دل عبارت ہے سوز پیہم سے — دل کی معراج برق و طور نہیں"

یہ غزل "آتشِ گل" لکھنؤ ایڈیشن کے صفحہ ۲۵۷ پر ہے۔

بیاض کا یہ شعر متروک ہے

"کوئی منزل ہو کوئی مرحلہ ہو عشق کی دسترس سے دور نہیں

ہر اصلاح نے شعر کو آگے بڑھایا ہے۔

اس کے بعد کی غزل ہے "بے غمِ عشق وبے دل آگاہ"۔ جو "آتشِ گل" لکھنؤ کے صفحہ ۱۳۵ پر ہے۔

بیاض کا یہ شعر متروک ہے

"ترے جلوے تو بیکراں ہیں مگر کم نہیں عشق کا بھی ظرفِ نگاہ"

بیاض میں تیسری غزل کا ایک شعر یوں تھا "آتشِ گل" لکھنؤ ایڈیشن صفحہ ۱۳۵

آپ نے کس قدر اُٹھائی ہیں زحمتیں خاک زیرِ پا کے لئے

مگر فکر و توجہ نے اس شعر کو نئی زندگی بخش دی۔

"آسماں کو ہیں گردشیں کیا کیا اک اسی خاک زیرِ پا کے لئے"

بیاض کی چوتھی غزل ہے "محبت زندگی ہی زندگی ہے"

یہ غزل "آتشِ گل" لکھنؤ ایڈیشن کے صفحہ ۲۵۸ پر ہے۔ بیاض کا یہ مطلع قلمزد ہے

"نظر جب سے کسی نے پھیر لی ہے بہت برہم مزاجِ زندگی ہے"

اس کے علاوہ پانچ اور اشعار ہیں جو متروک ہیں۔

اس کے بعد غزلوں میں اصلاح نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی اور نوٹ بک میں غزلیں لکھی گئی ہیں اور اس بیاض میں نامکمل درج ہیں۔

حضرت جگر نے بمبئی سے حبیب احمد صدیقی کو ایک خط کا نمونہ لکھا تھا جو انھیں

آخر ۱۹۴۲ء یا شروع ۱۹۴۳ء میں ملا تھا۔ اس میں حضرت والا نے لکھا تھا "رنگین و حسین الفاظ میں بھی استعمال کر سکتا ہوں لیکن مجھے اس طرح کی صناعیوں سے کبھی لگاؤ نہیں رہا اور نہ ہو سکتا ہے جس میں صداقت کا شائبہ تک نہ ہو۔ یا اگر ہو تو محض برائے گفتن۔ بطور نذر ایک غزل تازہ حاضر کرتا ہوں ملے جلے تاثرات ہیں چاہتا ہوں کہ دونوں غزلوں کو مزاج کی سالمیت کے ماتحت علیحدہ علیحدہ کر دیا جائے۔ میری مرضی کے خلاف مطلع بہت سے ہو گئے ہیں۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ آورد اور تصنع سے پاک ہیں۔ سیاسی تاثرات شعریت کے ماتحت ادا ہو گئے ہیں۔

اس کے بعد وہ غزل ہے جس کا مطلع ہے

راز جو سینۂ فطرت میں نہاں ہوتا ہے

سب سے پہلے دلِ شاعر پہ عیاں ہوتا ہے"

جو اشعار اس خط میں ہیں آتش گل میں ان کے علاوہ ۲ اشعار اور بھی ہیں۔

دل کو بیدرد محبت میں تبانے والے ۔۔۔ دل ہا ہمدرد زمانے میں کہاں ہوتا ہے

انقلابات سے کیا خوف کہ ہر عزم جگر ۔۔۔ اسی آغوش میں پلتا ہے جواں ہوتا ہے

اس خط میں حضرت جگر نے اپنی غزل کی ایک بہت بڑی خوبی کا ذکر کیا ہے اور وہ ہے اشعار میں صداقت اور محض لفظی صناعی سے گریز۔

پھر ایک اور خط گونڈہ سے حضرت جگر نے صدیقی صاحب کو ۱۹ر جون ۱۹۴۳ء کو لکھا۔ اس میں لکھا ہے کہ میں اس زمانے میں صرف چند اشعار کہہ سکا ہوں وہ حاضر کرتا ہوں۔ اس غزل کا مطلع ہے۔

"کیا اجیاری کیسی اندھیری ۔۔۔ دن ہے نہ تیرا رات نہ میری

یہ غزل آتشِ گل" لکھنؤ ایڈیشن میں صفحہ ۱۹۸ پر ہے۔ اس میں ایک شعر میں ترمیم بھی ہے۔ صدیقی صاحب کو یہ شعر یوں لکھا تھا۔

کالے طوفاں چڑھتے آئیں کھیلتی جائے کشتی میری

آتش گل میں یوں ہے

"چڑھتے آئیں کالے طوفاں کھیلتی جائے کشتی میری

دو اشعار خط میں اور ہیں جو آتش گل میں نہیں ہیں

مدت گذری یاد ہے اب تک تیری گلی کی ہیرا پھیری
دشمن سمجھیں جس کے قابل کیا ہوئی اے دل غیرت تیری

میری سمجھ میں یہ دونوں اشعار حذف کر دینے کے لائق تھے۔

گونڈہ سے ۳ مارچ سنہ ۵۴ء کو ایک اور خط حضرت جگر نے حبیب احمد صدیقی صاحب کو اناؤ لکھا تھا جس میں انھوں نے تحریر فرمایا تھا "آپ کو میں صرف ایک بلند کردار، خوش مزاج و خوش مذاق انسان اور ایک بہت بلند مرتبت شاعر ہی نہیں تصور کرتا بلکہ اپنا ایک شریف النفس اور مخلص دوست بھی۔ حسب دستور اس زمانے کا حاصل صرف ایک غزل، تین اشعار اور ایک ناتمام نظم آپ کی امانت سمجھکر آپ کے پاس پیش کیے دیتا ہوں۔ کبھی کبھی اپنے افکار تازہ سے بھی ضرور محظوظ فرمایا کیجئے۔

نظم کا عنوان ہے "غالب مرحوم" اور نوٹ ہے "ناتمام" یہ بعد میں "نذر غالب" کے نام سے "آتش گل" لکھنؤ ایڈیشن میں صفحہ ۲۴۲ پر چھپی ہے۔ اس نظم کے دو اشعار "آتش گل" میں نہیں ہیں۔

عرفی و نظیری و ظہوری و فغانی
تیرا کوئی ہمسر نہ ترا کوئی ہم آہنگ

تھے ملک سخن میں ترے ہمسر ہزاروں
تنہا تھی تری ذات مگر صاحب اورنگ

"آتش گل" میں تین اشعار کا اضافہ ہے۔

ہر پھول ترے باغ کا فردوس بدامن
ہر خار ترے دشت کا انگشت شفق رنگ

اک گوشۂ دامن میں ترے دجلہ و جیحون
اک موج نفس میں تری تمثال چمن و گنگ

لاریب کہ اس رمز سے واقف تھی تری ذات
افسانہ ہمہ رنگ و حقیقت ہمہ بے رنگ

اوپر کے دو متروک اشعار میں جو بات کہی گئی ہے اسے بغیر فارسی کے کسی شاعر کا نام لئے ہوئے کس خوبی سے ایک شعر میں بیان کر دیا ہے کہ فارسی اور اردو دونوں ہی میں تھا
تیرا کوئی ہمسر نہیں تھا بقیہ دونوں اشعار بھی بیش قیمت اضافہ ہیں۔

اسی خط کی دوسری غزل ہے جس کے صرف چار اشعار لکھنؤ ایڈیشن کے صفحہ ۲۰۵ پر درج ہیں۔ صدیقی صاحب کے نام خط میں جو غزل بھیجی ہے اس میں ۱۱ اشعار ہیں مگر مطبوعہ غزل میں صرف دو اشعار ہیں۔

رہ عرفاں میں، کیا ایسا بھی مقام آتا ہے
ہر یقیں بڑھ کے جہاں وہم و گماں تک پہونچے

میرے اشعار میں جو آگ دبی ہے اے کاش
تجھکو راس آئے ترے عزم جواں تک پہونچے

مطبوعہ شعر میں "جو آگ بھری ہے" ہے

دو اشعار کا اضافہ ہے

کیا خبر تجھکو کہ دنے جسے بھڑکا یا تھا
وہی اک شعلۂ نمناک کہاں تک پہونچے

اُف وہ کیفیت غم آنکھ جسے دیکھ سکے
ہائے وہ درد کی لذت جو زباں تک پہونچے

ایک یہ شعر جو حضرت جگر کے پیام محبت کا حامل ہے انتخاب سے رہ گیا۔

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے

اسی خط کی ایک اور غزل ہے جس کا مطلع ہے

ہمت جو ہے بلند تو کچھ اس سے کام لے ساقی کا انتظار نہ کر بڑھ کے جام لے

"آتش گل" لکھنؤ میں صفحہ ۱۹۹ پر چار اشعار کا اضافہ ہے۔ اس غزل کے نیچے حضرت جگر نے ایک اور شعر لکھا ہے جو "آتش گل" میں نہیں ہے۔

یاں ہر نگہ سوال وہاں ہر ادا جواب اپنا معاملہ تو کچھ اس سے سوا نہیں

"آتش گل" لکھنؤ ایڈیشن کے بعد میرے سامنے حضرت جگر نے جو غزلیں کہی ہیں ان کی تعداد پانچ ہے۔ یہ سب غزلیں گونڈہ کی ہیں اور اس کتاب میں شامل ہیں۔ ان غزلیات میں بھی ترمیم و تصحیح حضرت والا نے میرے سامنے کی ہے۔

جون ۱۹۵۸ء میں کرشن بیدر حیرت صاحب کے یہاں طرحی مشاعرہ تھا۔ اس میں ذوالنورین صاحب ڈپٹی کمشنر بھی شریک ہوئے تھے۔ حضرت جگر نے چند اشعار کہے تھے جس کا مطلع تھا

کم ہیں ظلمت بھی کچھ اہل نظر کے لئے
کون رہے شب نشیں نور سحر کے لئے

حضرت جگر نے پہلے "کون رہے منتظر" لکھا تھا۔ بعد میں "منتظر" کے بجائے "شب نشیں" کی دلکش ترکیب کا اضافہ کیا۔

جولائی ۱۹۵۸ء میں ذوالنورین صاحب کے بنگلے پر طرحی مشاعرہ ہوا۔ حضرت جگر نے ۹ اشعار کی غزل کہی تھی۔ اس مشاعرہ میں ۱۔ فنا نظامی بھی شریک ہوئے تھے

حضرت جگر کی غزل کا مطلع تھا

"محبت کا بالآخر رقص بیتابانہ کام آیا
نگاہِ نرگسیں اٹھی سلام آیا پیام آیا"

روزانہ ایک دو اشعار سناتے تھے ایک دن فرمایا "میں تو سمجھتا تھا کہ اب شعر نہ کہہ سکوں گا مگر اب مناسبت ہوتی جاتی ہے۔ اس غزل کی صرف ایک ترمیم مجھے یاد ہے۔ پہلے یہ مطلع یوں کہا تھا۔

" جہادِ زندگی میں جب کوئی نازک مقام آیا
جنوں ہی نے قیادت کی، یہ دل کمبخت کام آیا

بعد میں "یہ دل کمبخت" کے بجائے "خلوصِ غم ہی کام آیا" کیا

اگست ۱۹۵۸ء کے طرحی مشاعرہ میں بھی حضرت والا نے ۹ اشعار کہے تھے یہ مشاعرہ رام لال گپتا صاحب ایڈوکیٹ کے مکان پر ہوا تھا۔ اس غزل کا مطلع تھا

مدت میں جو اس شوخ کا دیدار ہوا ہے　　تا دیر سنبھلنا مجھے دشوار ہوا ہے

یہی غزل ۱۱ اگست کو حضرت والا نے مظفر شاہجہاں پوری کے پاس بمبئی "جشن جگر" کے لئے بھیجی تھی اور لکھنؤ کے دوران قیام "نیا دور" کے لئے بھی صباح الدین عمر صاحب کے اصرار پر دی تھی۔ اس کا ایک مطلع تھا جس کی اصلاحات مجھے یاد ہیں۔ پہلے یہ مطلع یوں کہا تھا۔

"جس نے بھی سنا دل سے وہ سرشار ہوا ہے
افسانہ کہیں ختم سرِ دار ہوا ہے"

دوسرے دن میں نے دیکھا کہ حضرت جگر نے اول مصرع کاٹ کر اس کے بجائے یہ مصرع

لکھ دیا تھا "ہر دور میں منصور نمودار ہوا ہے" تیسرے دن میں نے دیکھا کہ "نمودار" کاٹ کر حضرت والا نے "بیدار" لکھ دیا تھا۔

مارچ ۱۹۵۹ء میں حیرت صاحب اور میں یہ محسوس کر رہے تھے کہ حضرت جگر نے عرصے سے کوئی غزل نہیں کہی ہے خانگی تفکرات اور عوارض نے اس کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ ایک دن حضرت والا نے مجاز مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے ایک شعر سنایا اور ان کی جواں مرگی پر اظہار تاسف کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اصغر گونڈوی مرحوم کو تو وہ اپنا روحانی رہنما مانتے ہیں مگر اپنے زمانے کے اور شعرا میں جو قدر و منزلت وہ فانی مرحوم، حسرت موہانی مرحوم اور مجاز مرحوم کی کرتے ہیں اور جس محبت و احترام سے ان کا ذکر کرتے ہیں اور کسی کے لئے ایسے الفاظ ان کی زبان سے میں نے نہیں سنے۔ حضرت جگر نے مجاز کے یہ اشعار سنائے۔

ابھی اُٹھ جاؤں کیا بزم طرب سے ابھی تو آنکھ بھی پُرنم نہیں ہے

مری بربادیوں کا ہم نشینو تمھیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے

فرمایا کہ یہ مجاز ہی کہہ سکتے تھے۔ حضرت جگر کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے میں نے اور حیرت صاحب نے گذارش کی کہ عرصے سے آپ نے غزل نہیں کہی ہے۔ اگر مناسب سمجھیں، تو اسی زمین میں غزل کہیں اور ایک طرحی مشاعرہ اسی ماہ میں کیا جائے۔ تین چار دن بعد حضرت جگر اشعار کہنے لگے۔

کوئی مشاعرہ تو نہیں ہوا مگر حضرت والا نے غزل پوری کر لی۔ اس غزل کے یہ دو اشعار حضرت والا نے اپنی غزل سے نکال دیئے۔

یقینِ عشق اگر محکم نہیں ہے کوئی عالم بہ ہر عالم نہیں ہے

ابھی ناکام ہے دردِ محبت ابھی تک دم بدم پیہم نہیں ہے

بعد میں نانپارہ کے آل انڈیا مشاعرہ کے لئے بھی یہی طرح "ابھی تو آنکھ بھی پُرنم نہیں ہے" دیدی گئی تھی مگر حضرت والا اور دیگر حضرات جنھوں نے غزلیں کہہ لی تھیں شریک نہیں ہو سکے تھے۔

اپریل ۵۹ء میں "جشنِ میر" بمبئی کے طرحی مشاعرہ کے لئے بھی حضرت والا نے غزل کہی تھی جس کا مطلع ہے

کیا چیز غمِ عشق کی دیوانہ وشی ہے روناہے تو رونا ہے ہنسی ہے تو ہنسی ہے

گونڈہ سے حضرت والا جب بمبئی تشریف لے جا رہے تھے تو میں اسٹیشن پر موجود تھا۔ اس وقت یہ غزل حضرت والا کہہ رہے تھے۔ ان کی سُرخ نوٹ بک میرے ہاتھ میں تھی۔ فرسٹ کلاس میں ان کا بستر لگا دیا گیا تھا۔ نوٹ بک ان کے پاس رکھ کر میں ان کے لئے سگرٹ لینے کے لئے گیا۔ واپس آیا تو حضرت والا نے نوٹ بک مجھے دی اور فرمایا کہ ایک اور شعر ہو گیا اس وقت تک بیار پانچ اشعار ہوئے تھے جس شعر کی طرف اشارہ فرمایا تھا وہ یہ تھا

شاید میرا مقصد ہی میری تشنہ لبی ہے اک عالمِ حیرت ہے نہ غم ہے نہ خوشی ہے

ایک اور شعر اس طرح تھا۔

آساں نہیں منزلِ عرفاں سے گذرنا ہر گام یہاں مرحلۂ خود شکنی ہے

حضرت جگر جب بمبئی سے واپس ہوئے تو میں نے یہ نوٹ بک پھر دیکھی اور مندرجہ بالا اشعار میں یہ اصلاح پائی

اک منزلِ بے نام نہ حسرت نہ تماشا اک عالمِ حیرت کہ نہ غم ہے نہ خوشی ہے

آساں نہیں جہدِ مسلسل سے گذرنا ہر گام یہاں مرحلۂ خود شکنی ہے

اور مطلع کے پہلے مصرع پر ایک اور شعر بھی تھا

بجھتی ہی نہیں اب کسی ساغر سے مری پیاس
شاید مرا مقصد ہی میری تشنہ لبی ہے

جبتک میرا ساتھ رہا میں نے حضرت جگر کو اپنے کلام پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے دیکھا ہے اگر میں نے ان کا کوئی شعر پڑھا ہے جس پر وہ کوئی ترمیم کر چکے ہیں تو فوراً مجھے بتاتے تھے کہ اسے یوں پڑھئے۔ وہ صرف مشورہ ہی نہیں دیتے بلکہ اس اصول پر عمل پیرا بھی ہیں کہ ہر شعر میں ترقی کی گنجائش رہتی ہے۔ اور اس پر ہمیشہ توجہ اور فکر صرف کرنی چاہئیے۔ کسی کی اچھی غزل پر وہ غزل کہنا پسند نہیں کرتے کہ ایک شاعر نے اپنی پوری قوت صرف کر کے غزل پیش کی ہے اور اگر اس نے اس کا حق ادا کر دیا ہے تو دوسروں کا غزل کہنا بے سود۔

ایک دن میں نے ان سے پوچھا "حضرت! کیا کبھی غزل کہنے کے لئے آپ کو کسی خاص ماحول یا محرک کی ضرورت پڑتی ہے"

جواب ملا "صاحب یہ عجیب سوال ہے۔ شعر کہنے کی خود ایک کیفیت ہوتی ہے جو ماحول کا محتاج ہوگا وہ شعر کیا کہے گا"

حضرت جگر اپنے اشعار کے انتخاب میں بھی کاوش فرماتے رہے ہیں۔ میرے سامنے ایک پرانی بیاض ہے جس میں تقریباً ۰۶ صفحات پر ۴۶ غزلیں ہیں اور پانچ غیر مطبوعہ اور دو مطبوعہ نظمیں ہیں۔ مطبوعہ نظموں میں "تجدید ملاقات" اور "یاد" ہیں۔ "تجدید ملاقات" علی گڈھ میں کہی گئی ہے اس میں ۲۵ اشعار ہیں اور

مطبوعہ نظم میں ۲۲ اشعار ہیں اور "یاد" سوری اور بھوپال میں کہی گئی ہے اس بیاض میں ہر غزل اور ہر نظم کے شروع میں مقامات بھی لکھے ہوئے ہیں۔ "یاد" میں ۱۰ اشعار ہیں اور مطبوعہ نظم میں ۱۳ اشعار ہیں۔ غیر مطبوعہ نظموں میں "ایک ناظم موزوں زادہ کے نام" "عید" "مبارکباد" "سہرا" اور "تکیہ" ہیں۔ یہ نظمیں فرمائش پر لکھی گئی ہیں اور وقتی تاثرات کی حامل ہیں۔ اسی لئے مطبوعہ کلام میں شامل نہیں کی گئی ہیں۔ پہلی اور دوسری غزل کو چھوڑ کر بقیہ تمام غزلیں "آتش گل" پاکستان ایڈیشن میں چھپی ہیں۔ غزلیات کے حوالے کے لئے مطلع کا پہلا مصرع درج کر رہا ہوں۔

(۱) "مجھکو خدائے عشق نے جو بھی دیا بجا دیا"۔ یہ غزل رامپور اور بھوپال میں ہوئی اس میں ۱۲ اشعار ہیں۔ "شعلۂ طور" لاہور ایڈیشن میں صفحہ ۲۹۲ پر ۱۹ اشعار ہیں۔ "شعلۂ طور" حیدرآباد ایڈیشن میں یہ غزل نہیں ہے۔

(۲) "عشق کمال ہوش ہے، ہوش سے ننگ و عار کیا"

دہلی میں کہی گئی اور اس میں ۱۱ اشعار ہیں۔ "شعلۂ طور" لاہور ایڈیشن میں صفحہ ۲۹۴ ۔۔۔ اشعار ہیں۔ حیدرآباد ایڈیشن میں یہ غزل نہیں ہے۔

(۳) "گداز عشق نہیں کم جو میں جواں نہ رہا"

یہ غزل گونڈہ میں کہی گئی۔ اس میں ۱۰ اشعار ہیں آتش گل صفحہ ۵۸ پر ۷ اشعار ہیں۔ ایک شعر

لطیف طبع کو لازم ہے سوز غم بھی لطیف
چمن میں آتشِ گل کا کبھی دھواں نہ رہا

اختاں میں صفحہ ۱۸۵ پر ہے۔

(۴) "ہر حقیقت کو باندازِ تماشا دیکھا" یہ غزل مین پوری میں کہی گئی۔ اس میں ۷ اشعار ہیں آتش گل صفحہ ۵۵ پر بھی ۷ اشعار ہیں۔

(۵) "جو دل کا راز تھا اسے کچھ دل ہی پا گیا" یہ غزل مین پوری کی ہے اس میں سات اشعار ہیں۔ آتش گل صفحہ ۵۶ پر بھی ۷ اشعار ہیں۔ ترتیب میں فرق ہے۔

(۶) "شعر و نغمہ رنگ و نکہت جام و صبا ہو گیا" اس غزل میں ۹ اشعار ہیں اور آتش گل صفحہ ۶۰ پر ۹ اشعار ہیں۔ اس شعر میں

وہ حسن میں جس روش سے ہو کے گذرے بے نقاب
دیر تک ہر ایک گل کا رنگ گہرا ہو گیا

مطبوعہ کلام میں "دیر تک" کے بجائے "دفعتًہ" کیا ہے۔

(۷) "دل کو سکون روح کو آرام آ گیا" اس غزل میں ۹ اشعار ہیں۔ آتش گل صفحہ ۵۹ پر بھی ۹ اشعار ہیں۔

(۸) "محبت میں یہ کیا مقام آ رہے ہیں" یہ غزل مراد آباد کی ہے۔ اس میں ۱۱ اشعار ہیں آتش گل میں صفحہ ۹۳ پر ۷ اشعار ہیں۔

(۹) "یہ تو نہیں کہ مرضِ غم در خور اعتنا نہیں" یہ غزل مراد آباد کی ہے۔ اس میں ۱۵ اشعار ہیں۔ آتش گل میں صفحہ ۸۴ پر ۱۱ اشعار ہیں۔ مطلع کا مصرع یوں تھا "عالم حسن کو مگر فرصت ماسوا نہیں" آتش گل میں یوں چھپا ہے

"حسن کو لیکن اے جگر فرصتِ ماسوا نہیں"

مطبوعہ غزل پر یوں اصلاح کی ہے "حسن کو شایدان دنوں فرصتِ ماسوا نہیں"

(۱۰) "جز عشق معتبر کسی کو خبر نہیں" یہ غزل بھوپال کی ہے۔ اس میں ۸ اشعار ہیں
آتش گل میں بھی ۸ اشعار ہیں۔ ایک شعر حذف کردیا ہے اور اس مقطع کا اضافہ ہے

"بھوپال گرچہ خلد بدامن ہے اے جگر
دل کیا شگفتہ ہو کہ نسیم جگر نہیں"

(۱۱) "اس رخ پہ اژدہامِ نظر دیکھتا ہوں میں" یہ غزل بہرائچ اور گونڈہ کی ہے
اس میں ۱۴ اشعار ہیں اور آتش گل میں صفحہ ۱۹ پر ۱۱ اشعار ہیں۔

(۱۲) "مقامات ارباب جاں اور بھی ہیں" یہ غزل گونڈہ کی ہے اس میں ۱۳ اشعار
ہیں اور آتش گل صفحہ ۸۵ پر ۱۱ اشعار ہیں۔

(۱۳) "جو مسرتوں میں خلش نہیں جو اذیتوں میں مزا نہیں" یہ غزل گونڈہ کی ہے۔
اس میں ۱۲ اشعار ہیں۔ آتش گل میں صفحات ۸۹ — ۹۰ پر ۱۱ اشعار ہیں۔
بیاض کی غزل میں ایک مصرع یوں ہے "جسے میں بھی خود نہ بتا سکوں، مرا راز دل ہو وہ راز دل"
اسے بعد میں "جسے میں بھی خود نہ بتا سکا" کیا ہے

(۱۴) "ان کی جفا پہ ترک وفا کر رہا ہوں میں" یہ غزل لکھنؤ میں کہی ہے اس میں ۵
اشعار ہیں اور آتش گل صفحہ ۱۸۶ پر صرف ۲ اشعار ہیں۔

(۱۵) "دنیائے دل تباہ کیے جا رہا ہوں میں" یہ غزل گونڈہ کی ہے۔ اس میں ۱۴
اشعار ہیں۔ اور آتش گل صفحات ۸۶ و ۸۷ پر ۱۳ اشعار ہیں۔

(۱۶) "بے کیف دل ہے اور جیے جا رہا ہوں میں" یہ غزل گونڈہ کی ہے اس میں ۶
اشعار ہیں آتش گل صفحہ ۸۸ پر بھی ۶ اشعار ہیں۔

(۱۷) "جس میں رفعت جس میں وسعت ہی نہیں" یہ غزل گونڈہ کی ہے۔ اس میں ۱۲ اشعار

ہیں آتش گل صفحہ ۱۰۰ پر ۷ اشعار ہیں۔ مذکورہ مطلع بھی متروک ہے۔

(۱۸) "کہاں کے غنچہ و گل کیا بہار توبہ شکن" اس غزل میں ۱۵ اشعار ہیں۔ آتش گل صفحات ۹۴ و ۹۵ پر ۱۷ اشعار ہیں۔ بیاض کی غزل کے دو اشعار پر اصلاح بھی ہے اور ان دو مصرعوں میں لفظی رد و بدل بھی ہے۔ مطلع کے "غنچہ و گل" کے بجائے "لالہ و گل" کیا ہے اور "بروز حشر یہی جرم زندگی نکلا" کے بجائے "حضور دوست یہی جرم زندگی نکلا" کیا ہے۔

۱۔ یہ مرحلہ بھی تا کجا مرحلہ کہ اے ہمدم بہار میرے لئے اور میں تہی دامن

اصلاح "یہ مرحلہ بھی مری حیرتوں نے دیکھ لیا"

۲۔ یہ ہوش باش کہ طوفان ہے اٹھنے کو میں سن رہا ہوں دل سنگ و خشت کی دھڑکن

اصلاح۔ یہ ہوش باش کہ وہ انقلاب آ پہونچا

(۱۹) "وہی اس نظر میں ہے کہ چھپا نے والے" یہ غزل دہلی میں کہی گئی۔ اس میں ۱۴ اشعار ہیں آتش گل صفحہ ۱۳۲ پر ۸ اشعار ہیں۔

(۲۰) "محبت کار فرمائے دو عالم ہوتی جاتی ہے" یہ غزل مرادآباد میں کہی گئی۔ اسمیں ۲۲ اشعار ہیں۔ آتش گل صفحات ۱۲۴-۱۲۶ پر ۲۰ اشعار ہیں۔

(۲۱) "وہ ان کی بے رخی وہ بے نیازانہ ہنسی اپنی" یہ غزل لکھنؤ اور بھوپال کے درمیانی سفر میں کہی گئی ہے۔ اس میں ۱۶ اشعار ہیں۔ آتش گل صفحات ۱۳۰ و ۱۳۱ پر ۱۸ اشعار ہیں اور ایک شعر بعد میں قلمزد کیا گیا ہے۔

(۲۲) "شب فراق ہے اور نیند آئی جاتی ہے" یہ غزل گونڈہ کی ہے۔ اس میں ۱۴ اشعار ہیں آتش گل صفحات ۱۴۴ و ۱۴۵ پر ۱۱ اشعار ہیں جن میں ایک شعر بعد میں قلمزد کیا گیا ہے۔

(۲۳) "محبت صلح بھی پیکار بھی ہے" یہ غزل گونڈہ کی ہے۔ اس میں ۱۵ اشعار ہیں اور آتش گل میں ۱۴ اشعار ہیں صفحات ۱۴۹ و ۱۵۰ پر یہ غزل ہے۔ ایک شعر بعد میں قلمزد کیا گیا ہے۔

(۲۴) "آنکھوں میں بس کے دل میں سما کر چلے گئے" یہ غزل بھوپال کی ہے۔ اس میں ۱۵ اشعار ہیں اور صفحات ۱۳۴ و ۱۳۵ پر آتش گل میں ۱۳ اشعار ہیں۔ اس کا ایک شعر بعد میں قلمزد کیا گیا ہے۔

(۲۵) "یوں پرسش ملال وہ فرما کے رہ گئے" یہ غزل بھوپال کی ہے اس میں ۸ اشعار ہیں اور صفحہ ۱۳۹ پر "آتش گل" میں صرف ۶ اشعار ہیں۔

(۲۶) "وہ جو روٹھیں یوں منانا چاہیئے" یہ غزل بھوپال کی ہے۔ اس میں ۶ اشعار ہیں "آتش گل" صفحہ ۱۳۶ پر ۶ اشعار ہیں۔

(۲۷) "جلوہ بقدر ظرفِ نظر دیکھتے رہے" یہ غزل سورمی اور گونڈہ کی ہے۔ اسمیں ۸ اشعار ہیں "آتش گل" صفحہ ۱۴۷ پر ۸ اشعار ہیں اور ترتیب بھی وہی ہے۔

(۲۸) "آئے ہیں پھر وہ عزم دل و جاں کیے ہوئے" یہ غزل مراد آباد کی ہے۔ اسمیں ۱۹ اشعار ہیں "آتش گل" صفحات ۱۴۰ و ۱۴۱ پر ۱۵ اشعار ہیں۔

(۲۹) "طبیعت آکے پھر تا حدامکانی نہیں جاتی" یہ غزل لکھنؤ دہلی بھوپال کی ہے اس میں ۱۸ اشعار ہیں۔ "آتش گل" صفحات ۱۲۸ و ۱۲۹ پر ۱۵ اشعار ہیں۔

(۳۰) "واعظ نے اور نہ زاہد شب زندہ دار نے" یہ غزل بھوپال کی ہے اور نوٹ ہے "برائے ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ۔ اس میں ۱۱ اشعار ہیں اور آتش گل صفحہ ۱۴۳ پر ۶ اشعار ہیں۔

(۳۱) "برابر سے بچ کر گذر جانے والے" یہ غزل لکھنؤ کی ہے۔ اس میں ۵ اشعار ہیں اور آتشِ گل میں صفحہ ۱۲۷ پر بھی ۵ اشعار ہیں۔

(۳۲) "نہ اب مسکرانے کو جی چاہتا ہے" اس غزل میں ۱۰ اشعار ہیں۔ "آتش گل" میں ۹ اشعار ہیں۔ اس غزل کا ایک شعر ہے

کوئی آستاں سر کے قابل نہیں ہے

مگر سر جھکانے کو جی چاہتا ہے

"کہیں" کاٹ کر حضرت جگر نے "مگر" لکھا ہے اور یہ شعر جدید ڈگر کا مقطع کہا ہے۔

(۳۳) "دلِ شاعر اگر شائستۂ اسرار ہو جائے" اس غزل میں ۹ اشعار ہیں۔ اور "آتش گل" پاکستان ایڈیشن میں ۱۰ اشعار ہیں۔ مطلع میں "دلِ شاعر" کے بجائے "دلِ انساں" کیا ہے۔

(۳۴) "کیا کشش حسنِ بے پناہ میں ہے" اس غزل میں ۵ اشعار ہیں اور آتش گل صفحہ ۱۲۷ پر ۶ اشعار ہیں۔ مقطع کا اضافہ ہے۔

(۳۵) "مانا کہ ہم پہ جور و جفا کیجئے گا آپ" یہ غزل مراد آباد کی ہے۔ "شعلۂ طور" لاہور ایڈیشن میں صفحہ ۲۹۵ پر ۱۲ اشعار ہیں۔ بیاض میں ۱۳ اشعار ہیں۔

(۳۶) "دنیا کے ستم یاد، نہ اپنی وفا یاد" یہ غزل بھوپال کی ہے اس میں ۱۰ اشعار ہیں اور آتش گل صفحہ ۹۶ پر ۹ اشعار ہیں۔ دو اشعار متروک ہیں اور آٹھویں شعر کا اضافہ ہے۔

(۳۷) "ذروں سے باتیں کرتے ہیں دیوار و در سے ہم" یہ غزل جھانسی کی ہے۔ اس میں ۸ اشعار ہیں۔ "شعلۂ طور" لاہور ایڈیشن میں صفحہ ۲۹۶ پر ۷ اشعار ہیں۔

(۳۸) "اللہ رے اس گلشن ایجاد کا عالم" یہ غزل جونپور اور الہ آباد کی ہے۔ اس میں ۱۱ اشعار ہیں اور آتش گل صفحہ ۷۷ پر ۸ اشعار ہیں۔ صفحہ ۱۸۶ پر جو دو اشعار ہیں وہ بعد میں کتاب میں قلمزد کر دیئے گئے ہیں۔

(۳۹) "جنوں کم جستجو کم تشنگی کم" اس غزل میں ۷ اشعار ہیں اور آتش گل صفحہ ۸۰ پر ۹ اشعار ہیں۔ بیاض کا ایک شعر حذف کر دیا گیا ہے اور مطبوعہ اشعار میں تیسرا چھٹا اور آٹھواں شعر اضافہ ہے۔

(۴۰) ایک شعر ہے " رندی کے لئے ہے نہ عبادت کے لئے ہے
انسان محبت ہی محبت کے لئے ہے

تین اشعار اور ہیں۔ جن میں ۲ آتش گل صفحہ ۱۸۵ پر ہیں۔

"کیا کرے گا وہ کسی اور کا شیدا ہو کر"
جس نے اپنے کو نہ سمجھا کبھی اپنا ہو کر"

یہ شعر متروک ہے۔

(۴۱) "سینے میں اگر ہو دل بیدار محبت" اس غزل میں ۲۳ اشعار ہیں۔ "آتش گل" صفحات ۶۶ و ۶۷ پر ۱۲ اشعار ہیں۔

(۴۲) "تو ہین عشق دیکھ نہ ہو اے جگر نہ ہو" یہ غزل بھوپال کی ہے۔ اس میں ۱۲ اشعار ہیں اور آتش گل صفحہ ۱۱۶ پر ۷ اشعار ہیں۔

(۴۳) "عمر بھر روح کی اور جسم کی یکجائی ہو" یہ غزل دہلی کی ہے۔ اس میں ۱۲۴ اشعار ہیں۔ آتش گل صفحات ۱۱۴ و ۱۱۵ پر ۷ اشعار ہیں۔

(۴۴) "غم ہے کیا زینۂ صفات و ذات" اس غزل میں دس اشعار ہیں۔ آتش گل صفحہ

۸، پر یہی دس اشعار اسی ترتیب سے ہیں۔

(۴۵) "وہ احساس شوق جوان اول اول" اس کے سامنے بنا تمام لکھا ہوا ہے۔ اس میں ۵ اشعار ہیں اور "آتشِ گل" صفحہ ۶، پر ۹ اشعار ہیں۔ چوتھے، ساتویں آٹھویں اور نویں شعر کا اضافہ ہے۔

(۴۶) "حسن کا فرِ شباب کا عالم" اس غزل میں ۱۱ اشعار ہیں۔ اور "آتشِ گل" صفحہ ۸، پر ۱۲ اشعار ہیں۔ اس شعر کا اضافہ ہے۔

"ہمہ نور و سرور کی دنیا ہمہ حسن و شباب کا عالم"

حضرت تسکین قریشی نے از راہ نوازش مجھے "آتش گل" کا وہ مسودہ بھی عنایت فرمایا ہے جس سے پاکستان ایڈیشن مرتب ہوا ہے۔ زیادہ تر اوراق کاتب کے نذر ہو گئے ہیں۔ مگر چالیس پچاس صفحات میں حضرت جگر نے جو اصلاحات کی ہیں وہ نقل کرتا ہوں۔

(۱) صفحہ ۵۵ پر "کوئی شائستہ و شایانِ غمِ دل نہ ملا
ہم نے جس بزم میں دیکھا اسے تنہا دیکھا"

مسودہ میں "یعنی جس" کو کاٹ کر "ہم نے جس" کیا ہے۔

(۲) صفحہ ۶۶ پر "سینے میں اگر ہو دل بیدار محبت" میں ۱۲ اشعار ہیں۔ مسودہ میں ۲۴ اشعار ہیں جن میں ۱۲ قلمزد ہیں۔

(۳) صفحہ ۹۶ پر "دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد" میں ۹ اشعار ہیں۔ مسودہ میں ۱۱ اشعار ہیں۔ دو قلمزد ہیں۔

(۴) صفحہ ۴۷ پر "محبت میں جگر گذرے ہیں ایسے بھی مقام اکثر" میں دوسرا شعر ہے

کہاں حسن تمام یار و تکلیف کرم کوشی بدل دیتی ہے دنیا اک نگاہ نا تمام اکثر

سودہ کے مصرعۂ اولیٰ میں "تکلیف کرم کوشی" کے بجائے "تکلیف کرم اے دل" تھا جسے درست کیا گیا ہے چوتھے شعر کے مصرعہ اولیٰ میں "محبت نے اسے آغوش میں بھی پالیا آخر" میں "میں بھی" کے بجائے یوں تھا "محبت نے اسے آغوش ہی میں پالیا آخر"۔ مقطع میں مصرعہ اولیٰ میں "جگر ایسا بھی دیکھا ہے کہ ہنگام سیہ مستی" میں "دیکھا ہے" کے بجائے "وقت آیا ہے" تھا۔ دوسرے مصرع کے "نظر سے چھپ گئے ہیں" کی رعایت سے دیکھا ہے زیادہ بہتر ہے۔

(۵) صفحہ ۱۸۶ پر دو اشعار ہیں۔ سودہ میں پانچ اشعار ہیں جن میں ۳ قلمزد ہیں قلمزد اشعار معیاری نہ تھے اور ان کی حیثیت "برائے گفتن" کے علاوہ کچھ نہ تھی۔

(۶) صفحہ ۱۰۵ پر غزل ہے جس کا ایک شعر ہے

"آتش عشق وہ جہنم ہے
جس میں فردوس کے نظارے ہیں"

سودہ میں مصرعہ ثانی یوں تھا "جس میں جنت کے بھی نظارے ہیں" اس مصرع سے "بھی" نکل جانے سے شعر صاف اور مصرعۂ اولیٰ کا ہم پلہ ہو گیا ہے۔

(۷) صفحات ۱۰۹ و ۱۱۰ پر "کوئی یہ کہہ دے گلشن گلشن" کے ۲۰ اشعار ہیں۔ سودہ میں ۲۵ اشعار ہیں۔ جن میں ۵ قلمزد ہیں۔ قلمزد اشعار میں ایک یہ بھی ہے

"ناز تھا جس پر بلبل و گل کو سوکھ چلی وہ شاخ نشیمن

یہ زبان اردو کے متعلق تھا مگر شاید "سوکھ چلی" پسند نہ آیا۔ یہ الفاظ خط کشیدہ

ہیں یہ غزل گونڈہ کے ایک طرحی شاعرہ کی ہے۔

(۸) صفحہ ۱۱۱ پر غزل ہے جس کا مقطع ہے

"مرگِ جگر پہ کیوں تری آنکھیں ہیں اشک ریز
اک سانحہ سہی، مگر اتنا اہم نہیں"

مسودہ میں مصرعہ اولیٰ یوں تھا "مرگِ جگر پہ کیوں تری آنکھیں ہوں گلفشاں" مرگ پر آنکھوں کا گلفشاں ہونا نامناسب معلوم ہوا ہوگا۔ گلفشاں کاٹ کر "اشکبار" کیا پھر "اشک ریز" کیا۔ مسودہ میں "آنکھیں ہوں" ہے۔ کتاب میں "آنکھیں ہیں" چھپا ہے۔

(۹) صفحہ ۱۳۰ پر جو غزل ہے اس میں ۸ اشعار ہیں، مسودہ میں ۱۹ اشعار ہیں ۱۱ قلمزد ہیں جن میں ۸ مطلعے تھے۔

اس کے علاوہ بہت سی غزلیں جن میں ایک ایک دو دو شعر قلمزد ہیں جو یا تو معنویت کے اعتبار سے کمتر درجے کے تھے یا محض قافیہ پیمائی تک رہ گئے تھے اس مطالعہ سے یہ امر پایۂ یقین تک پہونچ جاتا ہے کہ حضرت جگر اپنے اشعار پر مسلسل نظر ثانی کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ "آتشِ گل" کے کتابی شکل میں آجانے کے بعد بھی جاری رہا ہے اور ہر اصلاح سے شعر نے ترقی کی ہے۔

ایم۔ این کول

جگر کے دل میں ہے سب کی عزت

شرافت۔ انسانیت۔ پاکیزگی اور نفاست یہ ایسی صفات ہیں جو قدرت کسی ایک ہستی کو سالہا سال کے بعد عطا کرتی ہے۔ حضرت جگر مرادآبادی کو بھی انھیں صفات سے نوازا گیا تھا۔

زمانہ طالب علمی میں ہی جگر صاحب کا نام اتنا سنا کہ کئی بار اس نامور ہستی کو قریب سے دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کی خواہش دل میں گھر کرتی گئی۔ ان کے بارے میں جب بھی سنا یہی سنا کہ بڑے با اخلاق۔ بڑے ہنس مکھ اور بڑے فراخ دل ہیں۔ شاعر بھی اچھے ہیں اور سچے انسان بھی ہیں۔ چھوٹوں کی عزت کرتے ہیں اور بڑوں کے احترام میں کوئی بات اٹھا نہیں رکھتے ہر شخص جس نے ان سے بات چیت کی اس نے یہی محسوس کیا کہ جگر صاحب اس کو ایک مدت سے جانتے ہیں چاہے وہ ان سے پہلی بار ہی ملا ہو۔ یہ ایسی خصوصیات تھیں جنھوں نے مجھے جگر صاحب کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ میں ان کا کلام بڑے شوق سے پڑھتا اور خواہش ہوتی کہ ان سے باتیں کروں اور ان کا کلام انھیں کی زبانی سنوں کبھی کبھی میں یہ سوچنے لگتا تھا کہ کہیں یہ خواہش بھی ایسے ارمانوں کی طرح تو نہیں ہے جو زندگی میں گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔

اسی طرح نہ جانے کتنے سال بیت گئے۔ آخر ملازمت کے سلسلے میں مجھے ریڈیو میں آنا پڑا۔ یہاں میری ملاقات بڑی بڑی نامور ہستیوں سے ہوئی۔ ایسے شاعروں۔ ادیبوں اور فن کاروں سے ملنے اور بات چیت کرنے کا موقع ملا جن کو دیکھنے کا ارمان بہت سے لوگوں کے دلوں میں رہ جاتا ہے۔ مگر جگر صاحب سے ملنے کا موقع ابھی نہیں ملا تھا۔

سنہ ۱۹۵۸ء کے آخر میں میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر آگیا۔ یہاں مجھے جگر صاحب کی علالت اور مرض کے دن بدن بڑھنے کی خبریں ملیں۔ اتفاق سے یہاں مجھے اپنے محکمے کی طرف سے جگر صاحب کا انٹرویو ریکارڈ کرنے کے لئے گونڈہ جانے کا حکم ملا یہ واقعہ غالباً جون سنہ ۱۹۵۹ء کا ہے۔ میں اس ذمہ داری سے بہت خوش ہوا۔ انٹرویو جگر صاحب کے کلام اور ان کی شخصیت سے متعلق تھا۔ جگر صاحب کی طرف سے کسی بھی دن گونڈہ پہونچ جانے کی اجازت آگئی اور ہم لوگ جگر صاحب کی خدمت میں گونڈہ پہونچ گئے۔ دیکھا تو بڑی مایوسی ہوئی جگر صاحب مسلسل بیماری سے اتنے کمزور اور لاغر ہو گئے تھے کہ ایک نظر میں انھیں پہچاننا مشکل تھا۔ ہزاروں کے مجمع میں جادو کر دینے والی آواز بے درد بیماری نے ختم کر دی تھی۔ نقاہت کی وجہ سے ان سے بات بھی نہیں کی جا رہی تھی۔ لیکن چہرے پر وہی رونق وہی نورانی پن اور مسکراہٹ میں وہی دلکشی موجود تھی جو خدا کے نیک بندوں میں دیکھی گئی ہے۔ شدید بیماری اور تکلیف کے باوجود جگر صاحب کو ہمارے ٹھہرنے۔ اٹھنے بیٹھنے۔ کھانے پینے اور آرام و آسائش کا خیال تھا۔ میں نے دوسری جگہ ٹھہرنے کا خیال

ظاہر کیا مگر جگر صاحب نہ مانے۔ ان کے اس انکار میں میں نے اس بزرگانہ شفقت اور محبت کی جھلک دیکھی جو بچپن میں اپنے بزرگوں سے ملتی تھی جن دنوں ہم لوگ ریکارڈ کرنے پہونچے تھے۔ نسبتاً جگر صاحب کی حالت کچھ اچھی تھی۔ لیکن ان کی کمزوری کی حالت دیکھ کر یہی سمجھ میں آتا تھا کہ ریکارڈ کئے بغیر واپس چلا جائے۔ اور جب صحت کچھ ٹھیک ہو جائے تھوڑی بہت طاقت آجائے تب پھر آیا جائے۔ لیکن جگر صاحب کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ انٹرویو کے لئے تیار ہو گئے۔ نقاہت کا یہ عالم تھا کہ پوری بات منھ سے نکل نہیں پاتی تھی۔ کچھ دیر بات کرتے تو تھک جاتے تھے۔ آنکھیں بند کر لیتے اور کچھ دیر تک بالکل خاموش رہتے۔ پھر سنبھلتے اور ہم لوگوں کو ریکارڈنگ کے لئے کہتے تھے۔ اس طرح کل تیرہ یا چودہ منٹ کی ریکارڈنگ میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ ریکارڈنگ کے ختم ہونے پر جگر صاحب بہت خوش تھے۔ اس لئے کہ ہم لوگوں کا کام بن گیا تھا اور ہم جگر صاحب کے در سے ناکام اور مایوس نہیں لوٹ رہے تھے۔ یہ ایک ایسی مثال ہے جو مشکل سے ملے گی۔

ہم لوگ واپس ہوئے تو جگر صاحب خدا حافظ کہنے کے لئے باہر تک آئے۔ ہم لوگوں نے منع بھی کیا کہ آپ تکلیف نہ کریں مگر انھوں نے ایک نہ مانی۔ ہم ان کے پاس صبح کے وقت پہنچے تھے اور اسی روز شام کو وہاں سے چل پڑے تھے۔ مگر اس تھوڑے عرصے کے قیام کے بعد ہم گونڈہ سے لوٹے تو جگر صاحب کی شرافت۔ انسانیت۔ مروت اور محبت کے اتنے گہرے نقوش اپنے دلوں میں لیکر واپس ہوئے

جو زندگی کے آخری دم تک قائم رہیں گے۔ ہمارے واپس آنے کے کچھ ہی مہینوں بعد جگر صاحب علاج کے لئے لکھنؤ آ گئے۔ یہاں میں ان کی مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا۔ ۳ر نومبر ۱۹۵۹ء کے مشاعرے کی تاریخی غزل

جان کر منجملہ خاصان میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

کی ریکارڈنگ بھی میری موجودگی میں ہوئی۔ جانے اس غزل کی ریکارڈنگ کے بعد دل میں یہ بات کیسے بیٹھ گئی کہ اب جگر صاحب کا سنبھلنا مشکل ہے۔ پھر کچھ دنوں بعد جگر صاحب گونڈہ واپس چلے گئے۔ اخباروں کے ذریعہ اور کچھ دوسرے لوگوں سے صحت کی اطلاع ملتی رہتی تھی۔ کبھی معلوم ہوتا کہ بہتر ہیں اور کبھی پتہ چلتا کہ حالت مایوس کن ہے۔ اسی طرح ایک دن یہ خبر بھی آ گئی کہ حافظ ہند اور رئیس المتغزلین کے خطابات سے یاد کئے جانے والے جگر کو قدرت کی طرف سے مرحوم کا خطاب بھی عطا کر دیا گیا اپنے پیر و مرشد اور استاد حضرت اصغرؔ گونڈوی کے وطن میں ابدی نیند سو گئے۔

جان ہی دیدی جگرؔ نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(از زائرِ حرم حمید صدیقی لکھنوی)

حضرت جگر کے ساتھ

آدمی کو ایسی باتیں بہت کم بھولتی ہیں، جن کا اسکے احساس پر گہرا اثر پڑا ہو، جن کی موت گوارا نہیں ہوتی اُس کے مرنے کا یقین بھی جلد نہیں آتا!

حضرت جگر نے دماغوں ہی میں نہیں، دلوں کی گہرائیوں میں اپنی جگہ بنالی تھی کیسی پُرکشش اور جاذب قلوب ہستی تھی، جہاں گئے، بہاریں ساتھ لیتے گئے۔ مشاعروں اور انجمنوں میں ادب ان کے لئے جگہ خالی کرتا، کیسی محبوب شخصیت تھی، اور کیسی باغ و بہار طبیعت پائی تھی، مشرقی تہذیب کا بڑا دلپسند نمونہ تھے ؎

چمن تو چمن تھا بہارِ چمن سے — چلے آپ رونق چلی انجمن سے

شرفِ ملاقات کا وہ نقشِ اوّلیں نہیں بھولتا، کیسی مبارک و دل نواز تھی وہ ساعت۔ سنہ ۳۶ء میں لکھنؤ کے کمپنی باغ میں نمائش کا مشاعرہ تھا، میں حضرت جگر صاحب کا کلام سننے کے اشتیاق میں مشاعرے گیا۔ سب سے آخر میں جب جگر کیف و مستی کے عالم میں نغمہ سنج ہوئے ؎

آ، کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

تو اُس وقت میں ہمہ شوق و تمنا اور سراپا گوش بن گیا، اور ہر طرف سے میری توجہ سمٹ کر ایک مرکز پہ آگئی وہ اپنے خاص والہانہ انداز میں مجمع سے بے نیاز ہوکر ترنم ریز تھے۔ اور اپنا یہ عالم کہ "اِک رنگ آ رہا ہے، اِک رنگ جا رہا ہے" سُنتے سُنتے جب یہ شعر سامعہ نواز ہوا کہ ؎

حُسن کو کیا دشمنی ہے عشق کو کیا بَیر ہے
اپنے ہی قدموں کی خود ہی ٹھوکریں کھاتا ہوں میں

تو بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اور میں دل تھام کر رہ گیا، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جگر صاحب یہ شعر جیسے مجھی کو سُنا رہے ہیں، یا میرے ہی لئے فرمایا ہے۔ اُس بھرے مجمع میں میں ہی سمجھ رہا تھا کہ جگر صاحب نے میرے ہی موجودہ حالات و کیفیات کی ترجمانی کی ہے۔ "از دل خیزد، بر دل ریزد" شاید اسی کو کہتے ہیں، کہ یکایک جگر صاحب کی نظر بھی تمام مجمع سے ہٹ کر میری ہی طرف منتقل ہوگئی۔ اور گویا اب میں مرکزِ توجہ بن گیا تھا، ادھر میری آنکھوں سے دریا بہہ رہا تھا۔ اُدھر وہ بار بار شعر کی تکرار فرما رہے تھے، اور پڑھتے پڑھتے جب وہ مقطع سے پہلے اس شعر پر پہونچے ہیں ؎

میری خاطر اب وہ تکلیفِ تجلی کیوں کریں
اپنی گردِ شوق میں خود ہی چھپا جاتا ہوں میں

تو مجھے بالکل ہوش نہ تھا کہ میں کس عالم میں ہوں، اور کہاں ہوں، مگر وہ برابر میری ہی طرف دیکھے گئے۔ غزل ختم ہوتے ہی اربابِ شوق نے ان کو گھیرا۔

مگر وہ مجمع کو چیر پھاڑ کر میری طرف بڑھے، مجھ سے میرا نام و پتہ پوچھا۔ اور فرمایا کل شام کو میں آپ کے ساتھ چائے پیوں گا۔
مجھ پر دن بھر ایک عجیب کیفیت طاری رہی، اور کانوں میں وہی آواز گونجتی رہی۔

میری خاطر اب وہ تکلیف تجلی کیوں کریں   اپنی گردِ شوق میں خود ہی چھپا جاتا ہوں میں

دوسرے روز سحر ہی سے شام کا بے چینی سے انتظار، با حسب وعدہ بعد مغرب جگر صاحب تشریف لائے۔ ان کو دیکھتے ہی گذری ہوئی کیفیت کی تجدید ہونے لگی، چائے نوشی کے درمیان میں بڑی محبت آمیز باتیں کرتے رہے، باتیں بھی بڑی پُر لطف و دل آویز ہوا کرتی تھیں ؎

پھول برسائے وہ تکلّم سے   بجلیاں بھی کبھی تبسّم سے

چائے کے بعد بڑی محبت و شفقت سے فرمایا کہ "سندیلہ" کے مشاعرے کے لئے تازہ غزل ہو رہی ہے، چند شعر ہوئے ہیں۔ آپ کو خاص طور سے سنانے کو جی چاہتا ہے۔ اپنی نااہلیت کے احساس سے میری گردن شرم سے جھک گئی، وہ ترنم ریز ہوئے ؎

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ مجھے کام اپنے ہی کام سے
ترے ذکر سے تری فکر سے تری یاد سے ترے نام سے

پُر درد آواز و پُر سوز الفاظ کا دل سے ٹکرانا تھا کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت جگر کے کلام کی کشش اور اثر آفرینی محتاج بیان نہیں ؎

صد نالۂ شب گیر سے صد صبح بلاخیز ے   صد آہِ شرربار سے یک شعرِ دل آویز سے

کلام منظوم وہ گوشت پوست کی رگوں پر زخم زن ہوتا ہو، یا واردات قلبیہ
اس میں بیان ہوئے ہوں مجھ پر یکساں اثر انداز ہوتا ہے شعر و نغمہ میں ساز باز ہو جائے
تو دل کی دنیا تہ و بالا کر دیں، شورش دل ہمیشہ ستاتی رہی، رلاتی رہی، جان حزیں
گھلتی رہی، سرمایۂ درد لٹتا رہا۔
دوسرا مطلع ارشاد فرمایا ؎

اُسے حال و قال سے واسطہ نہ غرض مقام و قیام سے
جسے کوئی نسبت خاص ہو ترے حسن برق خرام سے

اب میرے دل کی دھڑکن تیز تیز تھی اور میں مہر بلب تھا۔ غرضکہ پانچ شعر سنانے
کے بعد کچھ دیر تک بہت مفید و کار آمد باتیں کرتے رہے۔ اُسکے بعد رخصت ہوئے
میرے دونوں شانوں پہ اپنے ہاتھ رکھ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر عجیب محبت
و شفقت سے فرمایا ؎

ہر اک داغ فرقت کا دھونا پڑے گا　　تمھیں بھی میرے ساتھ رونا پڑے گا

خدا جانے کس عالم میں فرمایا تھا کہ ایسا ہو کر رہا، اور پھر نہ پوچھئے کیسی کیسی
عنایتیں اور نوازشیں ان کی رہیں آخر آخر تک بے پایاں اخلاص و محبت سے
نوازتے رہے۔

ایک بار بتاکید ارشاد فرمایا کہ تم کبھی "اُس عالم" میں میرے سامنے نہ آنا،
یعنے اُس کیف و مستی کی حالت میں۔ کچھ دنوں کے بعد ایک مرتبہ مجھے علم ہوا کہ کہیں
باہر سے لکھنؤ تشریف لائے ہیں میں اشتیاق دید میں بھوپال ہاؤس گیا۔ قاری
احمد علیخاں میرے ہمراہ تھے، نواب شمس الحسن صاحب سے دریافت کرنے پر

معلوم ہوا کہ جگر صاحب فلاں کمرے میں ہیں، میں لاعلمی و بے خیالی میں قیام گاہ پر پہونچ گیا، دیکھا تو جگر صاحب اپنے اُسی خاص کیف و سرشاری کے عالم میں بیٹھے ہوئے ہیں، اور ایک طرح کا کرب طاری ہے، مجھے دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر برہمی کے انداز میں فرمایا کہ "میں نے تو تم کو منع کیا تھا کہ اس عالم میں میرے سامنے نہ آنا کیوں آئے۔ اور چشم تر فرمایا کہ "اب اگر اس وقت ان سے (قاری احمد علی خاں صاحب کیطرف اشارہ کرتے ہوئے) قرآن پاک سُننے کو دل چاہے تو ایسی حالت میں میں کیسے سُنوں، اور تم سے نعت کیسے سُنوں" میں سہم گیا، اور دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا، اسی حالت میں احمد علیخاں صاحب نے قرآن کریم کی چند آیتیں قرأت سے پڑھیں اور وہ بصد ادب و احترام دو زانو بیٹھ کر سنتے رہے۔ اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

ایک سال مسوری سے حاجی محمد اصطفا خاں صاحب نے مجھے خط لکھا کہ مسوری کے مشاعرے کے لئے جگر صاحب کو جہاں کہیں بھی ملاش و جستجو کے بعد ملیں اپنے ہمراہ ضرور لاؤ، میں جگر صاحب کی تلاش میں، مُرادآباد گیا، مرادآباد سے کلیر شریف گیا۔ (آج تک اس کی خوشی ہے کہ مرحوم کی تلاش کے سلسلے میں کلیر شریف کے آستانۂ عالیہ پر حاضری کا شرف حاصل ہو گیا) کلیر شریف سے پھر "مین پوری" واپس آیا، وہاں وہ مل گئے، منشی اصغر حسین صاحب وکیل کے یہاں قیام پذیر تھے، میری استدعا پر مسوری تشریف لے جانا منظور فرما لیا، دوسرے روز وہاں سے سیدھے بریلی روانہ ہوئے، بریلی سے دیرہ اکسپریس رات کو ۱۲ بجے کے قریب

ملتا تھا، اور تقریباً چار گھنٹے کا وقفہ تھا، مجھے سفر خرچ کے لئے مزید روپے کی بھی ضرورت تھی، اسلئے ان کو ویٹنگ روم میں بٹھا کر میں شہر اپنے ایک مخلص سے روپے لینے چلا گیا، اتفاق سے وہ اپنے مکان پر ملے نہیں مجبوراً متفکر و متردد اسٹیشن واپس آیا اور واپس آ کر عجیب عالم دیکھا کہ "ویٹنگ روم" میں ایک میز پر شراب کی بوتلیں رکھی ہیں اور شراب سے بھرے ہوئے جام، میز کے ارد گرد چار پانچ رند بیٹھے ہیں جگر صاحب سے شدید اصرار ہو رہا ہے جگر صاحب انکار کر رہے ہیں اُدھر سے شکست توبہ کا اصرار ہے اور ادھر سے بے پروائی و بے نیازی کا مظاہرہ ہو رہا ہے، بالآخر شکست دینے والوں ہی کو ندامت کے ساتھ شکست ہوئی اور جگر صاحب کو فتح حاصل ہوئی، فرمایا، مری توبہ ایسی تو نہیں ہے کہ اب ٹوٹ جائے، گاڑی کے آنے کا وقت بھی قریب تھا، مجھے دیکھتے ہی فوراً اٹھ کھڑے ہوئے، میں نے خرچ کی کمی کی وجہ سے اپنے لئے تھرڈ کلاس کا اور ان کے لئے سکنڈ کلاس کا ٹکٹ لے لیا تھا، گاڑی کے آتے ہی پہلے میں نے انھیں سکنڈ کلاس میں بٹھایا، اور خود تھرڈ کلاس کیطرف جانے لگا تو مجھے اپنے پاس بٹھانے پر مجبور کیا، میں نے وجہ بیان کی تو فرمایا۔ یہ نہیں ہو سکتا، میں بھی تھرڈ ہی میں چلوں گا اور یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ تھرڈ میں آ کر بیٹھ گئے، اور ساتھ ہی ساتھ سفر کیا، مسوری پہونچ کر جب میں نے ان واقعات کو اراکین مشاعرہ سے بیان کیا ہے تو سب کے سب متحیر و دم بخود ہو گئے۔

اپنے سے بڑوں کا بڑا ادب و احترام کیا کرتے تھے، میں نے دیکھا ہے کہ احسن مارہروی اور مولانا حسرت موہانی اگر ساتھ ساتھ ہیں تو ان سے آگے آگے

نہ چلتے، اپنے قدم پیچھے پیچھے ہی رکھتے تھے۔ اسی طرح مشاعرے میں آسن مارہروی اور مولانا حسرت کے بعد اپنی غزل نہیں سناتے تھے، حفظ مراتب کا خیال بہت رکھتے تھے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ مسوری کے مشاعرے میں جب غزل پڑھنے کے لئے میری باری آئی تو دعا کرتے کہ میں ٹھیک سے غزل پڑھ لوں، یہ اس لئے کہ اُس مشاعرے میں بے پردہ خواتین بھی مردوں کے دوش بدوش شریک ہوا کرتی تھیں۔ اور میں طبعاً مرعوب ہو جایا کرتا تھا۔

حالانکہ مسوری کا جیسا سنجیدہ اور پاکیزہ مشاعرہ اور کہیں دیکھنے میں نہ آیا، صرف تین گھنٹے کی نشست ہوا کرتی، اور چیدہ چیدہ شعرا شریک ہوا کرتے، اور نہایت متانت و سنجیدگی کے ساتھ ارباب شوق سنتے۔

دوسرے سال مجھے پھر خاں صاحب قبلہ نے جگر صاحب کے لئے تحریر فرمایا اس سال تلاش و جستجو کے بعد ناکام رہا، اور کافی پریشانی اُٹھائی، مسوری پہونچنے کے بعد دوسرے روز شب کو خواب میں دیکھا کہ جگر صاحب نہایت خراب و خستہ حالت میں میرے قریب تشریف لائے ہیں اور بچشم نم فرما رہے ہیں کہ تم کو میری وجہ سے بہت تکلیف ہوئی، تم بہت پریشان ہوئے، میری ندامت سے گردن جھک گئی، اور آنکھ کھل گئی۔

۱۹۳۸ء میں "زائرانِ حرم کی آمد پر" میں نے ایک نظم کہی تھی جس میں دعائیہ اشعار کے سلسلے میں بے ساختہ بایں الفاظ ایک شعر دل کی گہرائیوں سے نکل کر زبان پر آگیا، سے

حاضر و ناظر نہیں پہ جگر تھی ہوں اسے خدا آنکھوں میں جوشِ اشکِ ندامت لئے ہوئے

یہ نظم پہلی بار ہمت و جسارت کر کے بغرض اصلاح جب پیش کی، تو مندرجۂ بالا شعر کو پڑھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ رونے لگے اور فرمایا یہ دل دکھانے کی چیز نہیں، ورنہ دکھاتا کہ تمھاری اس پرخلوص محبت کا کتنا اثر ہوا ہے اور اس کے بعد دُعائیں دینے لگے۔

کلام یہ اصلاح ڈرتے ڈرتے پیش کی تھی۔

مجھے اپنی علمی بے بضاعتی و نااہلیت کے احساس و تصور سے شرم آتی تھی، کہ جگر صاحب کو اصلاح کی زحمت دوں، چنانچہ میں اپنے مجموعۂ "گلبانگ حرم" میں "حرفِ گفتنی" کے سلسلے میں عرض کر چکا ہوں، کہ "حقیقی رہنمائی کے بعد اُس اصطلاحی رہنمائی کو بھی میں کیونکر نظر انداز کر سکتا ہوں جو مُربّی و مخدومی اُستاذی حضرت جگر مرادآبادی مدظلہ العالی نے فرمائی، فنی اعتبار سے اگر اس مجموعہ میں آپ کو کچھ ملے، تو اُسے محض فیضانِ جگر سمجھئے میں ایک وجدان کے ماتحت فن سے بے نیاز ہو کر اپنی دھن میں نہ جانے کیا کہہ جاتا، اور دُنیا اُسے کیا سمجھتی مگر حضرت جگر نے اس رمز کو سب کے سمجھنے کے قابل بنانے میں ہر قدم پر میری رہنمائی فرمائی۔

شادم حمید این فیضِ جگر ہست نازم بہ طبعِ جادو نگارے

الحمدللہ کہ مجھ کو حضرت جگر کی غلامی پہ فخر و ناز ہے۔

مسکین حسن می گوید ت اے وقتِ عشاق تو خوش
گر من از ایشاں نیستم در کار ایشاں کن مرا

مسوری میں جگر صاحب جب کبھی مشاعرے کے سلسلے میں تشریف لیجاتے قیام حاجی محمد اصطفا خاں صاحب ہی کی کوٹھی میں ہوتا، اس طرح خلوت و جلوت میں جگر صاحب کے ساتھ رہنے کا شرف حاصل ہو جاتا، اور بہت پر لطف دن گذرتے شعر و شاعری کے نغموں سے فضا گونجتی رہتی۔ ایک روز صبح طلوع آفتاب کے بعد میں ایک خاص عالم کے عالم میں اپنے بستر پر بیٹھا ہوا گنگنا رہا تھا کہ

"لاگی نیر یا میں سوئے گئی انگنا تیاں دوارے سے پھر گئے"

اور میری یہ کیفیت ہر اُس روز ہوتی جس دن فجر کی نماز قضا ہو جایا کرتی، مجھے اس کا مطلق احساس نہ تھا کہ پاس ہی کے دوسرے کمرے میں جگر صاحب آرام فرما رہے ہیں، اور میں ایک خاص جذبے کے عالم میں گنگنا رہا تھا۔ یکایک کانوں میں آواز آئی یہ جگر صاحب کو چائے دے آؤ" یہ سنتے ہی میں خاموش ہو گیا، اور چادر اوڑھ کر لیٹ گیا تھوڑی دیر کے بعد خاں صاحب کی بچی میرے پاس آئی اور کہا کہ حمید صاحب جو آپ پڑھ رہے تھے، پھر پڑھئے۔ کان میں کہا کہ آپ پڑھ رہے تھے اور جگر صاحب رو رہے تھے۔ مجھ سے کہا ہے کہ تم اپنی طرف سے جاکر کہو کہ وہ پڑھیں"

۱۹۵۱ء میں ایک بار مدینۂ طیبہ سے الحاج مولانا محمد عبدالغفور شاہ صاحب نقشبندی مجددی مہاجر مدنی مدظلہ العالی کا والا نامہ عزت افزا ہوا جس میں جگر صاحب سے متعلق ایک مخصوص خواب کا حال تحریر فرمایا گیا تھا، اور ہدایت تھی کہ راقم سطور یہ خواب بیان کر کے جگر صاحب کو مبارکباد پیش کرے۔

حضرت کے بھتیجے الحاج مولانا عبدالوہاب صاحب مہاجر مدنی نے ایک

شب مدینۃ الرسولؐ میں خواب میں دیکھا کہ ایک سرسبز و شاداب کھجوروں کے باغ میں ایک صاحب چارپائی پر بیٹھے ہوئے چہرے پر بال بکھرے ہوئے، آشفتہ و بیقرار آنکھیں عجیب سرمستی کے عالم میں والہانہ انداز سے جھوم جھوم کر اشعار پڑھ رہے ہیں اور گرد اہل مدینہ کا مجمع ہے۔ سامنے گنبدِ خضرا جلوہ گر ہے۔ اور وہ صاحب دو تین اشعار پڑھنے کے بعد قبۂ نور کی طرف ہاتھ اٹھا کر عرض کر رہے ہیں کہ یا رسول اللہ کچھ مجھے بھی اپنی رحمت کے صدقے میں عطا فرمائیے۔"

خواب دیکھنے والے نے سامعین میں سے کسی ایک بزرگ سے دریافت کیا۔ یہ کون صاحب ہیں؟ اُن بزرگ نے جواب میں کہا تم ان کو نہیں جانتے؟ یہ مشہور شاعر جگر مرادآبادی ہیں" اسکے بعد ان کی آنکھ کھل گئی۔ اور اس خواب کا حال عمِ محترم مولانا عبدالغفور شاہ صاحب قبلہ سے بیان کیا، حالانکہ مولانا عبدالوہاب صاحب نے اب تک جگر صاحب کو دیکھا بھی نہ تھا۔

حضرت کا مکتوب پڑھ کر حسب ہدایت میں جگر صاحب کی خدمت میں بھوپال ہاؤس حاضری دینے گیا، قیام گاہ پر جاکر دیکھا تو جگر صاحب اُسوقت آرام فرما رہے تھے، تھوڑی دیر بیٹھا تھا کہ جگر صاحب بیدار ہو گئے، سلام و مزاج پرسی کے بعد میں نے حضرت کا مکتوب گرامی جیب سے نکال کے پڑھ کر سنایا، خواب کا حال سنتے ہی اشکبار ہو گئے، اور فرمایا۔ ابھی اسی قسم کا عالم مجھ پر طاری تھا۔ اور ایک طرح کا کرب محسوس کر رہا تھا۔

میں نے عرض کیا، "جگر صاحب آپ کی وہ نعتیہ غزل یقیناً مقبول بارگاہ رسالت ہے۔"

اک رند ہے اور مدحتِ سلطانِ مدینہ ہاں کوئی نظر رحمتِ سلطانِ مدینہ ؐ
تو صبحِ ازل آئینۂ حُسنِ ازل بھی اے صلِ علیٰ طلعتِ سلطانِ مدینہ ؐ
اے خاکِ مدینہ تری گلیوں کے صدقے تو خلد ہے، تو جنتِ سلطانِ مدینہ ؐ
اک ننگِ غمِ عشق بھی ہے منتظرِ دید صدقے ترے اے صورتِ سلطانِ مدینہ ؐ
کونین کا غم، یادِ خدا، وردِ شفاعت دولت ہے یہی دولتِ سلطانِ مدینہ ؐ
ظاہر میں غریب الغربا پھر بھی یہ عالم شاہوں سے سوا سطوتِ سلطانِ مدینہ ؐ
اے عالمِ تکوین ترے اسرارِ حقیقت منجملۂ یک آیتِ سلطانِ مدینہ ؐ
اس اُمتِ عاصی سے نہ منھ پھیر خدایا نازک ہے بہت غیرتِ سلطانِ مدینہ ؐ
اے جانِ بلب آمدہ ہشیار خبردار وہ سامنے ہیں حضرتِ سلطانِ مدینہ ؐ

کچھ اور نہیں کام جگر مجھ کو کسی سے
کافی ہے بس اک نسبتِ سلطانِ مدینہ ؐ

مجھے آج تک یاد ہے، کہ ۱۹۵۴ء میں جب چوتھی بار اُس دیارِ محبوبی میں حاضری و حضوری نصیب ہوئی ہے تو ذوالحلیفہ میں اُس مقام پر پہونچ کر جہاں سے قبۂ نور کا پہلا نظارہ ہوتا ہے، صلوٰۃ و سلام کے بعد میرے زبان پر جگر صاحب کی اس غزل کا ایک شعر جاری تھا ؎

اے جانِ بلب آمدہ ہشیار خبردار وہ سامنے ہیں حضرتِ سلطانِ مدینہ ؐ

اور اہلِ قافلہ زار و قطار رو رہے تھے۔ مشہدِ عثمان رضؓ میں جہاں میرے ایک رفیقِ سفر قیام پذیر تھے ظہر کی سعادت حاصل ہوئی چودھویں رات کا چاند قبۂ نور کے کلس کے مقابل نظر آ رہا تھا جیسے گنبدِ خضرا سے کسبِ ضیا کر رہا ہے ماہِ رسالت ؐ

کی ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی دل و دماغ کی تاریکی دور کر رہی ہے۔ دریائے رحمت جوش و خروش کے ساتھ خفتگانِ بخت کو چھینٹے دے دیکر جگا رہا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ہر طرف سے پیام نو لا رہی ہے۔ ہر جھونکے میں صلّوا علیہ وسلموا تسلیما" کی آواز آ رہی ہے۔

مشہد عثمان رضی کی چھت پر ہم سب بیٹھے ہوئے گنبدِ خضرا کے نظارہ سے دیدہ و دل کو منور کر رہے تھے۔ عالم سکوت طاری تھا حرم پاک کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ ایسی پُر سکون فضا میں جبکہ اپنی سانسوں کی آواز کے علاوہ کوئی اور آواز نہ سنائی دے رہی تھی رفقائے سفر کا اصرار کہ حمید اس وقت کوئی نعت پڑھو۔ دل کی دھڑکن اور تیز تیز ہوگئی میرے مسلسل انکار پر اصرار سے پیہم اصرار ہوتا گیا تو بہر کیف کپکپاتی اور تھرتھراتی آواز میں حضرت جگر کی وہی نعت پڑھی۔

"ہاں کوئی نظر رحمتِ سلطانِ مدینہؐ"

اور پڑھتے پڑھتے جب اس شعر پر پہونچا ہوں تو سننے والوں کے منھ سے بے ساختہ ایک چیخ نکل گئی۔ اور خود مجھ پر کیا گذری۔ اللہ ہی علیم ہے، اللہ اللہ

نگاہوں میں اب تک لئے پھر رہا ہوں

سنہ ۵۳ء میں حضرت جگر کو مدینۂ منورہ کی حاضری و حضوری نصیب ہوئی تو دوران قیام میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ "اصطفا منزل" میں قیام تھا، ایک روز مخلص مکرم اسلم میاں کے ماموں الحاج سید منظور علی صاحب جو خود ایک درویش صفت صاحب دل بزرگ تھے جن کا انتقال اسی دیارِ قدس

میں ہوا، فارسی کے کچھ اشعار والہانہ انداز میں سُنا رہے تھے، اور جگر صاحب اس حالت میں سُن رہے تھے کہ چائے کے پانی کی کیتلی ہاتھ میں تھی، اشعار سنتے سُنتے ایسی محویت و سرشاری کا عالم طاری ہوا کہ چائے دانی کے بجائے کیتلی کا سب گرم پانی اپنے پیر پر ڈال لیا۔ اور اُن کو اُس وقت مطلق احساس نہ ہوا، بعد میں تکلیف کا احساس ہوا۔ لیکن پوری ٹانگ جل جانے پر ایسا ضبط و تحمل کہ منھ سے اُف تک نہ نکلی۔ اہل مدینہ سعودی ہسپتال لے گئے، تو وہاں کے مریضوں کی چیخ و پکار کی وجہ سے ٹھہر نہ سکے اور فرمایا کہ مجھے حریم نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے سامنے "اصطفا منزل" ہی میں لے چلو۔ مجھے ہسپتال کے بجائے وہیں آرام ملے گا چنانچہ مقررہ تاریخ روانگی مدینۂ طیبہ کے بعد اس اچانک حسین حادثہ کے بہانے ۲۹ دن تک حضور اکرم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مزید مہمان رہے، سچ فرمایا۔ ؎

وہ عشق ہی نہیں ہے، وہ دل ہی نہیں جگر　　لبیک خود کہا نہ جسے حُسنِ یار نے

۱۹۵۵ء میں جگر صاحب کی حاضری کے دوسرے سال جب اس حقیر کی حاضری ہوئی ہے تو اہل مدینہ جگر صاحب کی حاضری کا بڑی محبت سے ذکر کرتے تھے، اور یاد فرماتے تھے۔

جناب محمد اسمٰعیل صاحب مہاجر مدنی جو خود اہل دل اور صاحب ذوق بزرگ ہیں اور حضرت جگر کے شیدائی اور سخن سنج ہیں فرماتے تھے کہ ہم نے جگر صاحب کے ذوق و شوق اور محبت و استغراق کی حالت مدینۂ منورہ میں ڈیڑھ ماہ تک مسلسل دیکھی وہ عجیب آشفتگی و بیقراری کی حالت میں اور نہایت ادب و احترام کے ساتھ حرم رسالت میں حاضر ہوا کرتے تھے، بعض مرتبہ میں نے صحنِ حرم

میں ان کو ان کے اس شعر کا سراپا حال پایا، ؎

بیٹھے ہیں بزمِ دوست میں گم شدگانِ حُسنِ دوست
عشق ہے اور طلب نہیں نغمہ ہے اور صدا نہیں

اور مواجہ شریف میں وقتِ صلوٰۃ و سلام ان کو سر جھکائے اسی عالم میں دیکھا اور پایا گیا ہے۔

استادہ بہ پیش بارگاہ ہست پیرے بہ رُخ آستیں کشیدہ
شاید جگرِ حزیں ہمیں است از بارِ گنہ کمر خمیدہ

اپنے پیر و مُرشد سے رابطۂ قلبی و حُسنِ عقیدت و محبت کا یہ عالم تھا کہ جگر صاحب کے ایک مخلص دوست نے (جو خود بھی بزرگ و محترم تھے اور بہترین شاعر بھی تھے اور ان سے جگر صاحب کو محبت بھی تھی) کئی بار جگر صاحب سے فرمایا کہ میرے پیر سے تجدید بیعت کر لیجئے، سُن کر ٹال دیا کرتے تھے، ایک روز پھر انھوں نے اسی طرح زور دیا، تو جگر صاحب نے نہایت برہمی کے انداز میں فرمایا کہ "آپ بار بار کیا کہتے ہیں۔ مجھے اپنے پیر کی جہنم گوارا ہے اور آپ کے پیر کی جنت بھی نہیں گوارا۔

ایک دفعہ اجمیر شریف عرس کے موقع پر ایک نعتیہ مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے جگر صاحب کی معیت میں راقم سطور کی بھی حاضری ہوئی اور درحقیقت اُن کی رفاقت و معیت، ایک نعمت ہوا کرتی تھی جس مشاعرے جس محفل میں ان کی معیت حاصل ہوتی تھی۔ دل کو تقویت رہتی اور ایک طرح کا فخر و ناز ہوا کرتا۔ ان کی بدولت ہم سے بھی لوگ محبت سے پیش آتے، اور عزت کرتے، محسوس ہوتا کہ جیسے ہمارے پہلو میں بھی دل ہے۔ جگر صاحب جہاں قیام فرماتے، اس حقیر کو بھی

اپنے ساتھ رکھتے ۔ چنانچہ مشاعرے کے دوسرے روز ایک پیر صاحب نے خصوصی طور پر جگر صاحب کو اور ان کے ہمراہیان کو اپنی قیام گاہ پر محفل سماع میں شرکت کرنے کے لئے مجبور کیا، شب کو جگر صاحب اپنے ہمراہ لیکر ان شاہ صاحب کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔ کھانا کھانے کے بعد محفل سماع منعقد ہوئی ۔ بریلی کے مشہور قوال نے پہلے تو حضرت جامی اور حضرت حافظ شیرازی کی غزلیں سنائیں، اور قوال کی تمام تر توجہ اس "حافظ ہند" کیطرف رہی جگر صاحب کلام سے کیف اندوز ہوتے رہے ۔ اسکے بعد قوال نے اردو کی دو غزلوں کے بعد ایک ایسی غزل شروع کی جس کا قافیہ تھا، صبا، ادا، خوشا، اور ردیف تھی، "کیف" مثلاً ع دل پر کے چھایا ہو جو اے باد صبا کیف"
مطلع سننے کے بعد جگر صاحب کا پر معنی تبسم قابل دید تھا ۔ اب ہر شعر سننے کے بعد جگر صاحب میری طرف دیکھ لیتے ہیں اور "لاحول ولا" پڑھنے لگتے ہیں ۔ الغرض تین چار شعر سننے کے بعد بے ساختہ فرمایا کہ حمید صاحب اب تو اسکے بعد "الم ترکیف" ہی ہوگا "
ہاں اور اُدھر جناب شاہ صاحب قبلہ جگر صاحب کو ہر شعر پر توجہ دلا رہے تھے، کہ جگر صاحب یہ شعر ملاحظہ ہو۔ یہ شعر خصوصیت سے ملاحظہ ہو۔ جگر صاحب کو احساس بھی نہیں ہوا کہ یہ غزل خود شاہ صاحب قبلہ کی ہے ۔ چنانچہ قوال نے جب مقطع سناتے ہوئے کہا کہ حضور ملاحظہ ہو، جگر صاحب کیطرف ہمہ تن متوجہ ہوکر اور شاہ صاحب کیطرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، حضرت ارشاد فرماتے ہیں، یہ سنتے ہی جگر صاحب نے میرے چٹکی لی اور کہنی ماری اور آہستہ

سے دبی ہوئی آواز میں فرمایا، کہ بس اب چپکے سے اٹھ کر کسی طرح بھاگ چلو،
ارے یہ تو شاہ صاحب ہی کی غزل سُنا رہا ہے، اور شاہ صاحب نے میرے
تنقیدی انداز کو دیکھ لیا ہے اور "اُلّو تمہ کیف" والے فقرے کو سُن لیا ہے غضب
ہوا، وہ اپنے دل میں کیا کہیں گے، بہرحال اُسی وقت محفل سے اُٹھ کر شاہ صاحب
سے بغیر رخصت و اجازت لئے ہوئے، اپنی قیام گاہ پر چلے آئے، اب دوسرے
روز صبح اُٹھتے ہی یہ فکر کہ کس طرح اب شاہ صاحب کی خدمت میں جا کر معافی
مانگی جائے، شاہ صاحب کی آزردگی دل کا شدید احساس اور الجھن۔

بار بار رات کے واقعہ کو دہراتے اور مضطرب و پشیمان ہوتے۔ اسی
روز جے پور کو بھی روانگی تھی۔ شاہ صاحب کی قیام گاہ پر کوشش کرنے کے
باوجود نہ پہونچ سکے اور جے پور کو روانہ ہو گئے ٹرین پر بھی تھوڑی تھوڑی دیر
کے بعد اسی احساس ندامت، کا اظہار کرتے رہے جے پور کے اسٹیشن پر گاڑی رکی گاڑی سے
اترتے ہی دیکھا کہ شاہ صاحب کے صاحبزادے بھی پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔
اُس وقت جگر صاحب کی سراسیمگی و بدحواسی قابل دید تھی۔ لیک کر اُن صاحبزادے صاحب
سے ملے۔ اور ان سے واقعہ کے ندامت کا اظہار خیال کرکے معذرت پیش کرنے
لگے، کہ مجھے مطلق علم نہ تھا کہ وہ غزل شاہ صاحب قبلہ کی تھی اور میں نے لاعلمی
میں اظہار خیال کر دیا، آپ میرا طرف سے بصد ندامت شاہ صاحب کی خدمت
میں معذرت پیش کر دیجئے۔

ایک بار بمبئی سے واپسی پر ایک خاص تاثر کے عالم میں بیان فرمایا۔ کہ
"کاروار فلم" کی جانب سے ایک شاعر کے ذریعے کسی فلم کے لئے "دس غزلوں"

کے لئے شدید اصرار کیا گیا اور میری آزاد طبیعت کے ماتحت غیر مشروط طریقے پر وعدہ لے لیا گیا کہ مجھے اختیار ہے میں جب چاہوں غیر معینہ مدت میں وہ غزلیں کہہ کر دیدوں۔ ایک عزیز دوست کے اصرار پر میں نے وعدہ کر لیا، اور مجھے بطور پیشگی پانچ ہزار روپے بھی دیدیئے گئے۔ دوسرے روز شب کو عجیب و غریب خواب دیکھا، دیکھا کہ ایک چھوٹا سا غلیظ کا پہاڑ ہے، اور اس پہاڑ پر ایک شیر بیٹھا ہے۔ اور پہاڑ کے دامن میں بہت سے لوگ جمع ہیں، اور وہ شیر اپنے دونوں پنجوں سے چاروں طرف غلیظ اُچھال رہا ہے۔ اور اس غلیظ کو لوگ اپنے دامن میں لے رہے ہیں۔ چنانچہ میرے دامن میں بھی وہ غلیظ آیا ہے" اسی قدر دیکھنے کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ دل نے اسی وقت خواب کی تعبیر دی، اور میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی، کہ یہ جو فلم کے لئے غزلوں کا کنٹریکٹ ہوا ہے یہ میرے لئے کسی طرح مناسب نہیں ہے، چنانچہ میں نے فوراً توبہ کی، اور پانچ ہزار روپے اسی روز کاردار فلم کو واپس کرا دیئے۔

ایک حساس دل رکھنے والے کے لئے خواب اور خواب کی تعبیر کس قدر معنی خیز ہے سینما دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ تماشا شروع ہونے سے پہلے فلم کا ٹریڈ مارک پہلے دکھایا جاتا ہے، جنہیں ایک حلقے میں ایک شیر کی گردن نظر آتی ہے اور نیچے فلم کمپنی کا نام درج ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ بھوپال ہاؤس میں میں جناب جگر کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ تھوڑی دیر میں ایک مشہور شاعر بدمست و مخمور تشریف لائے اور آتے ہی انھوں نے طنز آمیز لہجے میں فرمایا کہ جگر صاحب دُنیائے اسلام کو اب آپ کی بہت ضرورت

ہے۔ اب تم کو چاہیئے کہ "صحاح ستہ" کو نظم کر ڈالو۔ دنیائے اسلام میں تمہاری دھوم ہو جائے گی۔ حضرت جگر نے بے ساختہ جواب میں فرمایا کہ، جب تک آپ موجود ہیں دنیائے اسلام کو میری ضرورت رہے گی۔" یہ جواب سنتے ہی وہ شاعر صاحب اپنا سا منھ لے کر رہ گئے، اور بس اسی قدر کہا کہ بھئی جگر تم نے تو مجھے شیطان بنا دیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت جگر شراب سے توبہ کر چکے تھے۔ اور شاعری میں تصوف کی چاشنی بڑھنے لگی تھی۔ کہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ترک مے کے بعد شاعری کا موڑ شروع ہو گیا تھا۔

حضرت جگر صاحب ایک خاص کیفیت میں اپنے پیر و مرشد حضرت قاضی عبدالغنی شاہ صاحب منگلوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مجلس بابرکت اور فیوض و برکات کا ذکر فرماتے تو دیر تک ایک خاص عالم طاری رہتا۔ پہلے پہل جب پیر و مرشد کی خدمت میں بیعت کی غرض سے حاضری ہوئی ہے، اور جس صورت سے ہوئی ہے، اس کا ذکر بڑے لطف و کیف سے کرتے، فرماتے، پہلی بار جب حضرت اقدس نے مجھ کو ایک کمرے میں تنہا بند کرا دیا تھا اور ... ر زہریت خود سے جو "اللہ اللہ" کی صدا آ رہی تھی، وہ آج تک یاد ہے۔ وہ عالم پھر دوبارہ نصیب ہوا، کاش ایک بار پھر وہ عالم طاری ہو جاتا!

لکھنؤ جب کبھی تشریف لاتے تو ہر مرتبہ ملنے پر اس حقیر کے غریب خانے پر ضرور تشریف لاتے، اور کبھی کبھی کھانا بھی تناول فرماتے اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے کھانے پر نہ پہونچ سکتے، تو بعد میں تحریر فرماتے۔

عزیزی محترمی و صدیقی! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ آپ کو

میری ذات سے کس قدر تکالیف پہونچتی رہتی ہیں، مجھے اس کا پوری طرح اندازہ اور احساس ہے لیکن کیا کروں طبیعت و مزاج بدل نہیں سکتا لیکن اس قدر اعتماد و یقین رکھیے کہ میں اپنے احباب و مخلصین کے لئے ہمیشہ بیقرارانہ دُعا گو رہا کرتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ کئی ماہ سے ایک کرہ گر گیا ہے۔ بارش قریب اور قریب تر اندیشہ ہے کہ مکان کے ملحقہ حصّے متاثر نہو جائیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ویسے ہی کاہل انسان واقع ہوا ہوں۔ اہتمام و انتظام سے دُور کا بھی واسطہ نہیں، اور یہی کام کرنا پڑ رہا ہے اس کی مشکلات اور دقتوں کا سمجھنا بھی آسان بات نہیں ہے۔ میرے دماغ و دل کی پریشانیوں کا آپ اندازہ تک نہیں کر سکتے۔

حمید صاحب! میں آپ کو خصوصیت کے ساتھ حد درجہ عزیز رکھتا ہوں اپنی صحیح معذرت کے باوجود آپ کی ذہنی اذیتوں سے خود بھی انتہائی حد تک متاثر ہوں۔ خدارا معاف کر دیجئے۔ بچوں کو دُعائیں۔ جگر

اسی طرح ایک مرتبہ اور حسب وعدہ کھانے کے وقت پر نہ پہونچ پانے سے شدید احساس و تاثر کے عالم میں تحریر فرمایا۔

"عزیزی و حبیبی، حمید صاحب! السّلام علیکم

کل کا پروگرام آخر کار ناکام رہا یعنی علاء الدین صاحب نے کہنے کے باوجود اُمیدی میں رکھا، اور اب دس بج چکے ہیں، تمازت شروع ہے۔ میرے ساتھ بھوپال ہاؤس سے ایک صاحبزادے جنھوں نے کبھی سفر نہیں کیا تھا وہ "چل رہے ان کے لئے "سرونٹ ٹکٹ" کی ضرورت تھی چنانچہ میرا سکنڈ کلاس کا ٹکٹ، اسی ضرورت کے ماتحت ایک صاحب اسٹیشن لے گئے ہیں

ان کا انتظار ہے، دیکھئے کب واپس ہوتے ہیں۔ آپ کو انتظار کی تکلیف ہوگی لیکن " ع پائی کسی نے ہم سے نہ راحت ایسے اذیت کوش ہوئے "
بہرحال اپنے دل کو یہ کہہ کر سمجھائے لیتا ہوں کہ بہرحال اس قسم کی تکالیف کاش حصۂ اغیار میں نہ ہوں بلکہ صرف احباب کے لئے مخصوص رہیں۔

والسّلام جگر عفی عنہٗ

اپنے نعتیہ مجموعۂ کلام پر تقریظ لکھنے کے سلسلے میں بہت عرصے کے بعد ایک بار یاددہانی کے طور پر میرے عریضے پر جواب میں تحریر فرمایا۔

برادر عزیز سلمہ اللہ تعالیٰ۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔
محبت نامہ ملا۔ یقین کیجئے کہ آپ کو آپ کے خلوص محبت کو میں کسی حال میں بھی فراموش نہ کر سکا لیکن میں جن آفتوں اور بلاؤں میں گھرا ہوا ہوں آپ ان کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ مختصراً یہ کہ شعر کہنا بھی بھول سا گیا ہوں، توجہ یکسو ہونے ہی نہیں پاتی، پھر جس پڑھی لکھی جاہل و بے بصیرت اندھی مقلد اور سفاک سوسائٹی سے تعلق ہے اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس نے غم والم غصہ و درد کی دنیا بنا دیا ہے۔ نظر کی وسعتوں اور مزاجی نزاکتوں کا عذاب مزید براں سوسائٹی کو نہ چھوڑا جا سکتا ہے اور نہ قبول کیا جا سکتا ہے۔ غم و غصہ جو کچھ ہے اپنی ہی جان پر ہے ؎
اور بھی عاشق فنا سے بڑھ گئی ایذائے فکر جس طرف اب دیکھتا ہوں میں ہی میں باد ہوں

آپ کا دیوان میں نے کلیجے سے لگا کر رکھا ہے۔ خود میری چیزوں کا یہ عالم ہے کہ لکھنے کی کاپی سے لے کر عینک، کپڑے، بٹن، بستر تک لوگ چرا لیجاتے ہیں

اللہ تعالیٰ انھیں بھی معاف فرمائے، اور ہم سب لوگوں کو اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ شملہ جانے کا قصد کر چکا ہوں، وہاں پہونچ کر مجھے توقع ہے کہ اطمینان کا سانس لے سکوں گا۔ آپ کا دیوان زیر طباعت ہے، یقین کیجئے کہ اوّلین فرصت میں مع مقدمہ حاضر کروں گا۔ آپ کی پہلی تحریر مجھے نہیں مل سکی، شمس الحسن صاحب کا بھی خط آیا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ آپ کو میری تلاش میں تکلیف مالا یطاق ہوئی۔ اب بتائیے آپ سے کیا کہوں؟ شملہ کے پتے پر خط و کتابت جاری رکھئے تو نہایت بہتر ہو، مخلص "جگر"

ایک بار بہرائچ سے نعتیہ مشاعرے کے سلسلے میں ایک دعوت نامہ میرے نام آیا جس میں مجھے صدارت کے لئے مجبور کیا گیا تھا۔ میں نے نفی میں معذرت نامہ لکھ کر بھیج دیا۔ مولوی محفوظ الرحمٰن صاحب نے جگر صاحب کو لکھا کہ وہ مجھے صدارت کے لئے حکم نامہ تحریر فرمادیں چنانچہ اپنے مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا ہے۔

"حبیبی و محبی زاد لطفہٗ۔ دعائے دلی۔ میں ان تمام حضرات کے خلوص اور ان کی بے لوث محبتوں کا دل سے معترف ہوں اکثر و بیشتر یاد کر لیا کرتا ہوں۔ ایک جانب مشاعروں کے متعلق خط و کتابت، دوسری جانب علالت، اور سب سے بڑی چیز میری کاہلی اکثر احباب سے مجھے پشیمانی ہونے پر مجبور کر دیا کرتی ہے۔ ورنہ میں تو فطرتاً احباب پرست واقع ہوا ہوں۔ ہاں مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نے بہرائچ سے مجھے آپ کے متعلق لکھا ہے۔ ان کی تحریر بجنسہ روانہ کر رہا ہوں۔ میری تمنا ہے کہ آپ اس مشاعرے میں ضرور شریک ہوں اور انھیں ذریعہ تحریر جلد از جلد مطلع کر دیں، مشاعرہ آپ کی صدارت میں ہوگا۔ اس سے انکار

ہرگز نہ کیجئے۔ اللہ تعالیٰ اگر عزت کے مواقع بہم پہونچاتا ہے تو شکر کے ساتھ انھیں لبیک کہنا چاہیئے، البتہ اپنے نفس سے باخبر رہنا ضرور دیا ہیئے "نفس" کی نزاکتیں خدا کی پناہ، انسان اگر مبتلائے غفلت۔۔ رہے تو یقیناً اسی دنیا میں اُس کے لیئے ترقی کی راہیں کھل کر رہیں گی۔ عزیزہ صابرہ کو بہت بہت دُعائیں۔

دُعاگو۔ جگر مراد آبادی۔

ایک زمانے میں میری مالی دشواریوں کا اندازہ فرما کر اپنے ایک مکتوب مکرم میں تحریر فرمایا۔

"عزیزی ومحبی وحبیبی سلمہ اللہ تعالیٰ، حمید صاحب! آپ یقین کریں کہ اس پورے عرصے میں آپ مسلسل طور پر یاد آتے رہے، میں اسطرح کی باتیں کیا نہیں کرتا لیکن بے اختیارانہ کہہ رہا ہوں کہ آپ سے صحیح منوں میں تعلق خاطر ہے، اور آپ سے بہت قریب ہوں۔ زمان تو زبان ہے آپ کے لئے دل سے دعاگو رہتا ہوں۔

اللہ کے نیک بندوں پر اکثر اس طرح کے بھی اوقات گذرتے رہتے ہیں۔ امتحان غیروں کا اور بزدلوں کا نہیں لیا جاتا، بلکہ جن پر اعتماد زیادہ ہوتا ہے، یا جنھیں اپنا سمجھا جاتا ہے، آپ کی حالت سے اکثر پریشانیوں کا تو اظہار ہوا لیکن آپ نے خود کبھی نہیں کہا۔ یہ بات، اگرچہ آپ کے علونفس، اور خود داری طبیعت کی دلیل ہے، لیکن مقامات کی تبدیلی سے حالات بھی بدل جایا کرتے ہیں، وہی چیز ایک محل پر صحیح دوسرے محل پر غلط۔ میرا مقصد یہ ہے کہ آپ مجھے اس قابل سمجھیں کہ مجھ سے اپنا کوئی ذاتی معاملہ نہ چھپائیں، "احباب" اگر صحیح معنوں

میں احباب ہوں تو انھیں اسی دنیا میں اپنے خلوص و محبت کا ثبوت دینا چاہیئے
میں اپنے احباب کو کبھی معاف نہیں کرتا لیکن وہی احباب جنھیں میں اپنا مخلص
سمجھتا ہوں۔

رات کا وقت ہے، کام بہت زیادہ اس لئے کہ کل روانگی ہے ہفتوں
کی ڈاک تشنۂ جواب ہے۔ ۲۹ر کی صبح کو یا تو بھوپال ہاؤس میں ملوں گا، اور
یا عزیز قریبی مُہتدا میاں سلمہٗ کے مکان پر آپ کا منتظر رہوں گا، انشاءاللہ
آپ سے تفصیلی ملاقاتیں رہیں گی۔ "جگر"

تا سحر تو نے نہ چھوڑی وہ بھی اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

کون سا دل ہوگا جو جگر کے لئے بیتاب نہ ہوگا۔ آج بھی آسمان ادب پر
ہزاروں ستارے جگمگا رہے لیکن حسرت و اصغر کے بعد "چاند" سوائے جگر کے
کوئی نہ تھا، غزل کے نام سے جو اُردو رسائل کے ہزاروں صفحے سیاہ ہوتے ہیں
لیکن انصاف سے دیکھا جائے، کیا حقیقتاً وہ چیز "غزل" ہوتی بھی ہے؟
میں بُرائی نہیں کر رہا ہوں وہ چاہے غزل سے کوئی بہتر چیز ہوتی ہو، مگر غزل تو نہیں،
اگر صحیح معنوں میں کوئی غزل دیکھنے یا سننے میں آجاتی تھی، اور جو کانوں سے
اُتر کر روح کو چھو لیتی تھی وہ صرف جگر کے دم و قلم کا عطیہ ہوتی۔

حضرت جگر کی موت سے اُردو ادب کا جو نقصان ہوا، وہ تو ظاہر ہی
ہے مگر مجھے تو ایک شریف النفس، بے ریا انسان، ایک محبوب القلوب ہستی
ایک باوضع شخصیت اور ایک مخلص وجود کی رحلت کا صدمہ ہے، سنجیدگی

کے ساتھ مجھے یہ خطرہ ہے کہ خبر نہیں کب تک اس طرز کا کوئی غزل گو، اور اس سج دھج کا کوئی انسان سامنے آئے۔

ابھی نہیں کچھ دنوں کے بعد جب اس مست قلندر کی یاد ستائے گی تو اُن جیسا نہ پاکر کفِ افسوس ملیں گے اور تلافی تو کیا کچھ بھی نہ کر سکیں گے رحمۃ اللہ علیہ مرحوم و مغفور جہاں شعر و ادب میں ایک رفیع المنزلت شخصیت کے حامل تھے، وہاں ایک بلند مرتبہ انسان بھی تھے، اور اپنے سینے میں ایسا بہترین دل رکھتے تھے، کہ دل کہلانے کا مستحق تھا، اس قدیم تہذیب کا نمونہ اور یادگار تھے جس کے افراد کے اخلاص مندانہ مراسم و روابط، شریفانہ تعلقات کی دُنیا میں قابلِ رشک درجہ رکھتے ہیں۔

ان کی وفات دُنیائے شعر و ادب اور اس انسانی سوسائٹی کا جو شرافت و آدمیت کے زریں جواہر سے مُرصع ہے، ایک زبردست نقصانِ عظیم ہے:

ان کے سانحۂ ارتحال پر میں جو صدمہ اور غم آگیں کیفیات محسوس کر رہا ہوں، زبان قلم سے ان کا اظہار ممکن نہیں، اللہ پاک بطفیل صاحب لولاک صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم حضرت مرحوم کو جنّت الفردوس میں درجات عالیہ سے سرفراز فرمائے، آمین۔

ایسے انسان کی یاد جس نے دُنیا کو موہ لیا ہو، اور اللہ پاک نے بھی اپنے اچھے بندوں میں داخل کر کے نوازا ہو، ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کیسی بصیرت افروز حقیقت کو ظاہر کر رہی ہیں۔

کارگاہِ حیات میں اے دوست — یہ حقیقت مجھے نظر آئی
ہر اُجالے میں تیرگی پائی — ہر اندھیرے میں روشنی پائی

جگر

سید صدیق حسن کرڑوی
(آئی، سی، ایس)

کوئی تیس ۳۰ برس کی بات ہے فرخ آباد میں میری تعیناتی تھی وہیں نثار حیدر زیدی نہٹور والے ڈپٹی کلکٹر تھے۔ جگر، سیماب، ساغر زیادہ تر ساتھ آتے اور وہیں ٹھہرا کرتے۔ جگر سے سب سے پہلی ملاقات انھیں کے یہاں ہوئی تھی۔ وہ جگر تھے "نہرا سے پی گیا" والے جگر جہاں تک یاد پڑتا ہے یہ غزل جگر نے انھیں کے دولت کدے پر کہی تھی اکثر و بیشتر شام کو نشست ہوتی اور ان حضرات کی تازہ ترین غزلیں سننے میں آتیں۔

اس پہلی ملاقات کا واضح اور ان مٹ خاکہ اب تک لوحِ دل پر ثبت ہے گو ایک "خاکے" کی حیثیت سے اس کے خطوط دھندلے پڑ گئے ہیں۔ تفصیلات مٹی مٹی سی ہیں مگر ایک مجموعی نقشہ اب بھی متعین ہے۔ روپ ریکھا اب بھی روشن ہے۔ اب بھی ایک چھریرے بدن کا نوجوان اپنے نغموں میں سنگیت کا رس بھرے آنکھوں سے محبت کی شراب چھلکاتا دلوں کو "ہر لینے والے برتاوے" سے ہر موافق اور مخالف کو رام کرتا اپنی موسیقیت کی دھرے بکھیرتا "حسین دل اور متبسم نگاہ" لئے آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

معلوم نہیں آپ نے آتشِ گل کے شروع میں جو جگر کی تصویر دی اس نظر

سے دیکھی ہے یا نہیں نہ دیکھی ہو تو اب دیکھئے۔ نگاہوں کے تبسم و چہرے کی طفلانہ معصومیت کے پیچھے سے عین دل آج بھی جھانک رہا ہے۔

یہ نوجوان ہی نہیں اخلاق و انکسار کا مجسمہ بھی ہے۔ ہر ذہنی، دماغی اور علمی سطح کے لوگ اس کے پاس آتے ہیں۔ غزل کی فرمائشیں کرتے ہیں وہ بلا تکلف ہر شخص کا کہا کرتا ہے کسی کو اس کا احساس نہیں ہونے دیتا کہ وہ غزل سخن فہم کو سنا رہا ہے یا سخن دشمن کو۔

یہ وہ زمانہ تھا جب جگر عالم بسیط پر چھا کے پی جانے والوں میں سے تھے مگر اس زمانے میں بھی یہ بات یاد رکھنے کی ہے۔ کہ جگر کی لغزشیں محض ذاتی اثر رکھتی تھیں ان میں کوئی بھی ایسی نہ تھی جس کے اثرات ان کی ذات سے گذر کر دوسروں تک پہونچتے ہوں۔ یا جس سے دوسروں کی دل آزاری ہوتی ہو" وہ لعل بدخشاں" جو انسان کے "گوہر" کو ادیبے آتا ہے۔ جگر یا مرنجانہ مرنج طبیعت کو ہمیشہ ابھارتا رہتا تھا۔ ایک صاحب کا بیان ہے کہ جگر بیخماری کے عالم میں ایک جگہ گئے وہاں ایسے لوگ موجود تھے جن کی موجودگی جگر کے لئے باعث اذیت تھی مگر جیسے ہی نظر پڑی بلا کچھ کہے جگر الٹے پیروں واپس آئے۔ دل ٹوٹ گیا۔ مگر زبان پر شکایت کا لفظ نہ آیا۔

وہ کون سا انسان ہے جس نے کوئی لغزش نہیں کی۔ بے راہ روی نہ سہی نہیں کجروی بھی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ اگر کوئی غلطی نہیں کرتا تو انسان نہیں کچھ اور ہے۔ آپ اسے ما فوق البشر کہہ سکتے ہیں۔ فرشتے کا لقب دے سکتے ہیں لیکن آپ کے ساتھ میں اسے انسان کہنے کے لئے تیار نہیں،

دیکھنا یہ ہے کہ ایک شخص کی مجموعی شخصیت کیسی ہے؛ لغزشوں اور خامیوں کے باوجود اس کا اخلاق کیسا ہے؛ اور وہ انسانیت کے کس مقام پر ہے؟ اس معیار پر جگر کو جانچنے کی میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے۔ اور انھیں ہر موقع پر ایک اچھا انسان پایا ہے۔

جگر میں کمزوریاں تھیں اور میرے نزدیک ان کی سب سے بڑی کمزوری ان کی مروت اور دل جوئی تھی۔ وضعداری کا یہ عالم تھا کہ جس سے جو تعلقات ایک بار قائم ہو گئے وہ آخر عمر تک نباہے۔

جگر لکھنؤ آتے تو بھوپال ہاؤس میں ٹھہرا کرتے۔ ملک کے بٹوارے کے بعد بھوپال ہاؤس کے زیادہ تر افراد پاکستان چلے گئے اور اس کا بڑا حصہ سرکاری قبضہ میں آ گیا۔ صرف ایک چھوٹی سی جگہ پسماندگان کے حصے میں رہ گئی۔ کوئی تین سال کا ذکر ہے مجھے معلوم ہوا کہ جگر لکھنؤ آئے ہوئے ہیں بیمار ہیں اور بھوپال ہاؤس میں ٹھہرے ہیں۔ میں خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں بھی آپ کی دوستی کا شرف رکھتا ہوں۔ غریب خانے پر ٹھہریئے۔ کہنے لگے۔ میں اس گھر میں نہ جانے کب سے ٹھہرتا چلا آیا ہوں۔ یہاں سے چلا جاؤں گا تو ان حضرات کی دل شکنی ہوگی، اور یہ میں کسی قیمت پر گوارا نہیں کر سکتا۔ چونکہ ان کی طبیعت ان دنوں ناساز تھی میں چاہتا تھا کہ وہ زیادہ آرام و سکون سے رہیں ان کو آمادہ کرنے کے لئے نہ جانے کتنی دلیلیں پیش کی گئیں۔ کس کس طرح سمجھایا گیا مگر وہ نہ مانے۔ بالآخر اس پر راضی ہوئے کہ اب کی مرتبہ جب آئیں گے تو حبیب صاحب کے یہاں یا میرے یہاں ٹھہریں گے،

خیال خاطر احباب" اس درجہ ملحوظ تھا کہ ہر وہ کام جس سے اس "آبگینے" کو ٹھیس لگنے کا احتمال ہوتا ناپسندیدہ نہ تھا حالانکہ احباب میں ایسے بھی تھے جو۔

دیکھا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں کی قطاریں نظر پڑیں

کے مصداق تھے۔ لاہور کے سفر میں ایک ایسے ہی دوست جگر کے ساتھ تھے دوران سفر میں جگر کا پرس جس میں کافی رقم تھی۔ ان حضرت نے نکال لیا۔ جگر نے دیکھا مگر چشم پوشی کی تانگہ سے اترے تو تعجب اور شرمندگی کے لہجے میں کہنے لگے کہ میرا پرس کہیں رہ گیا ہے اگر آپ کے پاس پیسے ہوں تو قرض دیدیجئے کہ کرایہ ادا کردوں۔ ایک اور صاحب بھی جگر کے ہمرکاب تھے ان کے تیور دیکھ کر جگر صاحب کھٹکے اور علحدہ لے جا کر ان سے کہا کہ خبردار اس کا تذکرہ کسی سے نہ کیجئے گا نہیں تو میں خودکشی کر لوں گا۔ بات بہرکیف پھیل ہی گئی اور اب یہ ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ایسے نہ جانے کتنے واقعات لوگوں کے دلوں پر نقش ہیں دانستہ کسی کا دل دکھانا تو بہت دور ہے۔ ان سے نادانستہ بھی کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہوتا تھا جس سے کسی کے دل کو ٹھیس پہونچے۔ وہ اس معاملہ میں انیس کے ہم زبان ہیں ؎

خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

ان کے احباب میں وہ بھی شامل تھے جن کے رویہ سے جگر کو کافی اذیت

پہنچتی مگر وہ پھر بھی ان کی دل جوئی ہی کرتے۔ وہ صرف پھولوں کے طلبگار نہ تھے۔ بلکہ کانٹوں کے بھی قدر دان تھے ؎

کانٹوں کا بھی حق ہے کچھ آخر — کون چھڑائے اپنا دامن

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

اور اسی قسم کے نہ جانے کتنے شعر جگر کے اصل روپ کو ظاہر کرتے ہیں اخلاق اتنا وسیع تھا کہ کوئی بھی پرسان حال دن یا رات میں کسی وقت بھی پہنچ جائے تو ممکن ہی نہ تھا کہ وہ بلا خاطر مدارات کے اُسے واپس جانے دیں۔ پچھلی بیماری میں ان پر قلب کے کئی شدید دورے پڑے تو لکھنؤ میڈیکل کالج میں داخلہ لینا پڑا۔ جب طبیعت کچھ اچھی ہونے لگی تو آنے جانے والوں کا ایک تانتا بندھ گیا دن کا بیشتر حصہ اور رات کے ابتدائی حصے میں لوگ آتے اور جگر ہر آنے والے سے بلا تفریق ملتے۔ خوش آمدید کہتے۔ شکریہ ادا کرتے اور دلی خواہش رہتی کہ کچھ نہ ہو تو چائے ضرور ہی پلا دی جائے۔ بیگم جگر ساتھ ہی وارڈ میں مقیم تھیں پان بناتے بناتے بیچاری کے ہاتھ تھک جاتے۔ سگرٹ تو بازار سے آتا تھا اور پیکٹ کے پیکٹ "یاران مکتہ داں" کے لئے رکھے رہتے۔ مگر پان تو بیگم جگر ہی کو بنانا پڑتے تھے۔ رہی چائے تو اس کا بھی کوئی وقت نہ تھا بسا اوقات چائے کے ساتھ اور لوازمات بھی ہوتے۔

اسی دوران میں اسکاٹ لینڈ کی شاعرہ MRS NAOMI MITCHISON

لکھنؤ آئی ہوئی تھیں۔ جگر سے ملنے میڈیکل کالج گئیں اب جگر کافی رو بصحت ہو گئے تھے۔ جگر نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ ایک قطعہ اپنے ہاتھ سے لکھکر ہدیہ کیا۔ اور ایک ٹوکری مٹھائی کی ساتھ کی۔

آج بھی میرے پاس "آتش گل" کا وہ نسخہ موجود ہے جس کے سرورق پر ۱۶ راکتوبر ۱۹۵۹ء کو جگر نے چار پانچ سطریں اپنے قلم سے لکھیں اس دن دل کا سخت دورہ پڑا تھا بڑے اضطراب اور کرب کی کیفیت تھی اس حالت میں بھی جگر آتش گل کا یہ نسخہ ایسا معلوم ہوتا ہے کسی کو ہدیتہً بھیج رہے تھے۔ پوری عبارت پڑھنے میں نہیں آتی صرف شروع کے دو چار الفاظ پڑھے جا سکتے ہیں۔ عبارت کچھ اس طرح ہے :-

"حقیر جگر اپنی آخر ـــــ بزرگ محترم ـــــ خدمت میں ـــــ جگہ جگہ پر صدمہ ـــــ مرحلہ در پیش ہو ـــــ اور تبارک تعالی ـــــ اس وقت میں ملے گی ـــــ میری تمام تر دعا کے ساتھ۔

ایسی سخت بے چینی کی حالت میں بھی جگر کے دل و دماغ میں پیش پیش جذبہ کسی مخلص دوست کو اپنی آخری کوشش نذر کرنا تھا۔

جگر اپنی کمزوریوں سے واقف تھے۔ مگر اپنی لغزشوں کے لئے حیلۂ شرعی تلاش نہ کرتے تھے۔ انھیں اپنی "رندی" کے اقرار میں تکلف نہ تھا۔ اور نہ انھیں یہ کہنے میں باک تھا کہ :-

فرد عمل سیاہ کئے جا رہا ہوں میں

یہ محض ایک رسمی یا شاعرانہ اظہار خیال نہ تھا بلکہ جو دل کا معاملہ تھا وہ

برملا زبان پر تھا۔

ضمیر اور کردار کی ہم آہنگی ظاہر و باطن کی یک رنگی ما فی الضمیر کا بے لاگ اظہار یہ ہمہ جہتی صداقت جگر کے کیریکٹر کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے انھوں نے اپنے جذبات کو منافقت کے پردے میں چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ جو محسوس کیا وہ ببانگ دہل کہا اور جو کہا وہ ان کے اندرونی احساس کا صحیح اور سچا اظہار تھا۔ انکی بلا غل وغش یہ نہ صرف ان کے انفرادی کردار پہ اثر انداز تھا بلکہ سماجی اور معاشرتی۔ سیاسی اور مذہبی ہر پہلو پہ جاری وساری تھا۔ اسی لئے لوگوں کو ان پہ مختلف گوشوں سے اعتراض کرنے کا وسیلہ بھی ہاتھ آیا۔ پروپگنڈے کے رسیاؤں نے کوئی دقیقہ اس معصوم اور بے لوث فرد پہ طعنہ زنی اور خردہ گیری کا اٹھا نہ رکھا۔ اچھے اچھوں کو اس سے بدظنی ہوئی۔ کسی نے "رندہزار شیوہ" کہہ کر خانقاہ بدر کیا۔ کسی نے وطن دشمن کہہ کر فہرست غداران میں داخل کیا۔ بڑے بڑے منصف مزاج بھی اس سیلاب میں بہہ گئے اور ان کی نظم :— بھاگ مسافر بھاگ — میرے چمن سے میرے وطن سے بھاگ، کو ان کی وطن دشمنی کے ثبوت میں پیش کیا گیا۔ مگر ان کو یہ بات معلوم نہ تھی اور شاید انھوں نے معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ جگر ایکبار نہیں کئی بار پاکستان بلائے گئے۔ پاکستان میں جگر کے لئے جو مواقع حاصل تھے یا ہو سکتے تھے ان کا اندازہ کرنے کے لئے کسی باریک بین نگاہ کی ضرورت نہیں۔ کیا کچھ نہ پاکستان کے دوران قیام میں جگر کے سامنے پیش کیا گیا ہوگا۔ مگر انھوں نے کبھی اس طرف

ذرہ برابر توجہ نہیں کی۔ وہ پھر اسی "چمن" کی طرف بار بار لوٹ کر آئے
جہاں ایک "نشیمن" لاکھ بلاؤں کا جواب تھا۔ وہ جانتے تھے اور اچھی طرح
محسوس کرتے تھے کہ وہ "جنبشِ خفی" جو ان کے بال و پر میں تھی صیاد کی نگاہ میں
نشتر سے کم نہ تھی۔ مگر وہ اتھاہ محبت جو انہیں اپنے چمن کے ساتھ تھی وہ
سینکڑوں کمینگاہوں کا مقابلہ کھلے دل سے اور بے تیر و تفنگ محض خلوص
کی سپر سے کر سکتی تھی۔ یہ بھرپور صداقت ہمیشہ اور ہر دور میں جگر کا
طرۂ امتیاز رہی ہے۔

پچھلی بیماری کے دوران میں جگر اسلم رضوی صاحب کے یہاں فروکش
تھے۔ لکھنؤ ریڈیو نے درخواست کی کہ جگر کا ریڈیو سے معاہدہ ہو جائے جس
میں ان کی غزلیں نشر ہونے پر ایک متعین معاوضہ فی شعر کے حساب سے
طے کرے۔ جگر نے بلا تامل اس پیش کش کو رد کر دیا۔ ان کے نزدیک یہ بات
ان کے مقام اور شعر گوئی کے منصب کے خلاف تھی۔ آخر کار حبیب صاحب
کی وساطت سے یہ معاملہ طے پایا۔

جگر کو بیماری کے زمانے میں روپیہ کی خاصی ضرورت تھی۔ مگر یہ ضرورت
بھی انہیں اس پر آمادہ نہ کر سکی کہ وہ کوئی ایسا قدم اٹھائیں جس سے
ان کی خودداری کو ٹھیس لگے۔

"آتشِ گل" کی طباعت ہو چکی تھی۔ اس کی جلدیں میرے پاس رکھی ہوئی
تھیں میں نے دو ایک دوستوں سے مشورے کے بعد طے کیا کہ کوئی پچاس
جلدوں پر جگر اپنے دستخط کر دیں تاکہ یہ نسخے زیادہ قیمت پر بک سکیں۔

میں جگر کی خدمت میں کافی گستاخ تھا۔ چنانچہ ایک سہ پہر کو جب میں نے دیکھا کہ جگر بہت ہی اچھے موڈ میں ہیں میں نے نہایت بے تکلفی سے کہا کہ کچھ نسخوں پر دستخط کر دیجئے کہنے لگے کیا کیجئے گا؟ میں نے کہا کروں گا کیا جہاں اور نسخے بکیں گے انھیں بھی بیچ دوں گا اور شاید مصنف کے دستخطوں کی وجہ سے ان کی قیمت اچھی آجائے یہ سن کر مسکرا دیئے۔ کہنے لگے۔ میں اپنے دستخط بیچوں؟ جی نہیں۔ میں نے ہر چند اصرار کیا۔ مگر جگر کو اس پر آمادہ نہ کر سکا۔

بیماری کے ایام میں ہم لوگوں کی خواہش ہوئی کہ صوبائی حکومت کو توجہ دلائی جائے اور علاج کے لئے ایک رقم کی درخواست کی جائے۔ جگر کا عندیہ لیا گیا وہ کوئی درخواست دینے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ یہ ہماری حکومت کی فراخ چشمی تھی کہ درخواست کے بغیر ہی اس نے ایک معقول رقم علاج کے لئے منظور کر دی۔

۱۹۵۳ء میں جگر حج کے لئے گئے تو ساتھ میں ان کی بیگم صاحبہ اور عزیز اور آزاد صاحب ساتھ تھے۔ مظفری جہاز پر سفر تھا۔ جہاز میں ندوۃ کے مولانا ادریس نگرامی سے جگر کی کافی بے تکلفی ہو گئی جہاز جب جدہ پہنچا تو سعودی حکومت کے افسران جگر کو لینے بندرگاہ پر آئے اور شاہی دعوت نامہ دیا۔ جگر نے کہا کہ میرے ساتھ یہ سب حضرات بھی ہیں ان کو چھوڑ کر جانا گوارا نہیں شاہی افسران نے گذارش کی کہ یہ سب حضرات بھی شاہی مہمان ہوں گے۔ آپ ذرا انتظار کریں تو ہم دعوت نامے لے کر ابھی آتے ہیں جگر نے مجبوراً رضامندی کا اظہار کیا۔ آدھ گھنٹے تک انتظار کرنے کے بعد جگر سب

حضرات کے ساتھ رباط حیدرآباد میں مقیم ہو گئے۔ بعد میں دعوت نامے آجانے پر بھی جگر نے رباط سے منتقل ہونا گوارا نہ کیا۔ یہ استغنا ایک صاحب کردار ہی کا شیوہ ہو سکتا تھا۔

وہ اپنے منصب اور مقام سے کما حقہ واقف تھے اور مختلف مواقع پر رنگارنگ پہلوؤں سے اس کا اظہار بھی لطیف پیرایہ میں کرتے رہتے تھے۔

مجھ سے لگے ہیں عشق کی عظمت کو چار چاند
خود حسن کو گواہ کئے جا رہا ہوں میں

بڑے زعم اور بڑے کلے ٹھلے سے جگر کہتے تھے اور یہ محض تعلی نہ تھی بلکہ اپنے عمل سے بارہا انھوں نے اس کا ثبوت دیا ہے۔ شروع شروع میں جب جگر نہ رئیس المتغزلین تھے نہ شہنشاہ تغزل تھے مشاعروں کے مخالف معرکے انھوں نے محض اپنی خود اعتمادی کی بنا پر سر کئے۔

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں   ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں

اس بے پناہ اعتماد کا برمحل اظہار تھا۔

جگر بنیادی طور پر مذہبی آدمی تھے۔ اس زمانے میں بھی جب وہ رند بلا نوش تھے یہ اندرونی جذبہ اُن کے کردار میں برابر ابھرتا رہا۔ مجنوں گورکھپوری کے حوالے سے ایک واقعہ سننے میں آیا ہو کہ جگر گورکھپور کے ایک مشاعرے میں گئے تھے شاعروں کی خاطر مدارات مجنوں کے ذمہ تھی۔ ایک صبح کو مجنوں پہونچے تو دیکھا کہ جگر لحاف میں بیٹھے لیٹے لا الہ الا اللہ کا ذکر بڑے شوق سے کر رہے ہیں۔ مجنوں نے پوچھا کہ شام کو شراب پی تھی کہ نہیں؟ کہنے لگے پینا کیسا میں تو شراب میں نہایا تھا۔ یہ اس حادثہ

کی طرف اشارہ تھا کہ بوتل اتفاقاً ٹوٹ جانے سے تمام بستر تر ابور ہو گیا تھا۔ شاہ کا یہ "رندِ درد آشام" دم صبح "اس مناجات کے عالم میں تھا جہاں" فرش سے تا عرش "" انوار" برس رہے تھے۔

مذہب کی یہ رو ہمیشہ سے جگر کی فطرت میں تھی شروع شروع میں ایک زیریں لہر کی شکل میں بعد کو ایک ابلتے ہوئے چشمہ کے روپ میں

کوئی بیس برس اُدھر کی بات ہے کہ میرے دوست ڈی۔ آئی۔ سی۔ ایس کو اردو شاعری کا شوق ہوا میں نے جگر کا کلام پڑھنے کی سفارش کی یہ شعلۂ طور کا زمانہ تھا۔ کچھ دنوں بعد مجھ سے ملاقات ہوئی اور جگر کی شاعری پر گفتگو ہونے لگی۔ میں نے جگر کے ہلکے پھلکے اشعار پیش کئے کہنے لگے جگر یہ نہیں ہو جگر یہ ہے۔

وہ یوں دل سے گذرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

یہ تھی وہ عرفان محبت کی موج تہ نشیں جو بعد میں

لے بر تو نثار شرم عصیاں — اے بر تو فدا دلِ تپیدہ
یک گوشۂ چشم التفاتے — بر اُمتیانِ غم رسیدہ
رحمت بہ اشارۂ تو جوشاں — جنت بہ نگاہت آرمیدہ
ایستادہ بہ پیش بارگاہت — پیر بہ رخ آستیں کشیدہ

رکیے جوش مارتے ہوئے طوفان میں ظاہر ہوئی۔

جگر نے خم کدۂ عرفاں میں نہ صرف میکشی کی بلکہ "دردآشامی" بھی خدا کرے محرم نگاہ و ساقی نہ رہے ہوں —— خدا رحمت کند این "دردنوش" پاک طینت را

خمار بارہ بنکوی

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

حضرت جگر مرادآبادی اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن ان کی یاد باقی ہے اور ان کا کلام زندہ ہے۔ جگر صاحب کے بارے میں شاعر کی حیثیت سے بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور لکھا جائے گا۔ مگر میرے پیش نظر ان کی محبوب شخصیت کی کچھ ایسی جھلکیاں ہیں جن سے مرحوم کی شگفتہ مزاجی اور مزاح پسندی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ جگر صاحب ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں راولپنڈی (پاکستان) تشریف لے گئے تھے۔ میں بھی اس مشاعرہ میں مدعو تھا۔ ہم دونوں بجری سید صاحب اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان کی کوٹھی پر مقیم تھے۔ بیگم سید کو جگر صاحب کے معمولات کا قطعاً علم نہ تھا۔ جگر صاحب کا معمول یہ تھا کہ صبح و شام جب باتھ روم جاتے تھے تو حوائج ضروری سے فراغت کے بعد کافی دیر تک غرارہ (کلی) کرتے تھے اس کے بعد غسل فرماتے تھے اس میں کسی طرح گھنٹہ پون گھنٹہ سے کم وقت نہیں لگتا تھا۔ پہلے ہی دن دوپہر کے کھانے کے بعد جگر صاحب سو گئے اور رات کو آٹھ بجے کے قریب بیدار ہوئے۔ ڈنر کا وقت ہو چکا تھا۔ اُدھر جگر صاحب باتھ روم میں داخل ہوئے اِدھر بیگم سید صاحب نے اس یقین کے ساتھ کہ مرحوم دس پندرہ منٹ میں باتھ روم سے فارغ ہو جائیں گے میز پر کھانا لگوا دیا۔ جب آدھ گھنٹہ تک جگر صاحب باتھ روم سے باہر نہیں نکلے اور کھانا بھی ٹھنڈا

ہونے لگا تو بیگم صاحبہ نے مجھ سے فرمایا: "خمار صاحب! جگر صاحب ابھی تک باتھ روم سے نہیں نکلے۔"

میں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا: "دیکھئے اب کب نکلتے ہیں؟"

محترمہ نے کہا: "کیوں؟"

میں نے عرض کیا کہ آپ کو علم نہیں ہے جب سے جگر صاحب نے شراب نوشی ترک کی ہے اکثر اپنی پچھلی زندگی کو یاد کرکے رونے لگتے ہیں اور گھنٹوں روتے رہتے ہیں۔ اس عادت نے دورہ کی سی شکل اختیار کرلی ہے آج بھی وہی گریہ کا دورہ پڑ گیا ہے۔

بیگم صاحبہ سن کر بہت متاثر ہوئیں فرمانے لگیں: "اللہ جگر صاحب کتنے پیارے انسان ہیں۔" اتنے میں باتھ روم سے جگر صاحب کے غرارہ کرنے کی آواز آئی بیگم صاحبہ تڑپ اٹھیں کہنے لگیں: "ہائے اللہ رو تو رہے ہیں۔" اب کوٹھی بھر میں ایک سناٹا سا چھا گیا ہر شخص کو اس کا یقین ہو گیا کہ جگر صاحب پر گریہ کا دورہ پڑ گیا ہے۔ دوبارہ پھر جب مرحوم کے غرارہ کرنے کی آواز آئی تو بیگم صاحبہ مجھ سے فرمانے لگیں: "خمار صاحب خدا کے لئے جا کر جگر صاحب کو چپ کرآئیے میرا تو دل امڈا آرہا ہے۔" میں نے عرض کیا: "بیگم صاحبہ میری دلجوئیوں کا کوئی اثر نہ ہوگا آپ اول تو میزبان ہیں دوسرے عورت بھی ہیں۔ اگر آپ دلاسا دیں تو مجھے یقین ہے کہ جگر صاحب ضرور اثر قبول فرمائیں گے۔" بیگم صاحبہ میری باتوں میں آگئیں فوراً باتھ روم کے دروازہ پر پہنچ گئیں اندر جگر صاحب پورے خلوص کے ساتھ غرارہ کرنے میں مصروف تھے۔ بیگم صاحبہ

فرمانے لگیں: "جگر صاحب نہ روئیے اپنی جان ہلکان نہ کیجیے خدا ضرور آپ کو بخش دے گا۔"

دروازہ بند ہونے کے باعث بیگم صاحبہ کی آواز جگر صاحب تک نہ پہنچ سکی مختصر یہ تھک کر واپس آ گئیں اور کہنے لگیں: "واقعی بڑا شدید دورہ پڑا ہے!"

تھوڑی دیر بعد جگر صاحب تولیا سے منہ پونچھتے ہوئے باہر نکلے اور کھانے کی میز پر آ کر بیٹھ گئے کھانا شروع ہوا۔ جگر صاحب نے لقمہ اٹھایا ہی تھا کہ بیگم صاحبہ بولیں: "جگر صاحب یہ دورہ آپ پر کب سے پڑتا ہے؟" جگر صاحب بوکھلا سے گئے کہنے لگے: "جی دورہ کیا!" بیگم صاحبہ نے پھر کہا: "یہی گریہ کا دورہ" جگر صاحب کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا فرمانے لگے: "بیگم صاحبہ یہ آپ کیا فرما رہی ہیں گریہ۔ دورہ۔ یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہیں!" اب بیگم صاحبہ سے رہا نہ گیا کہنے لگیں کہ خمار صاحب سے معلوم ہوا کہ ترک شراب کے بعد آپ اکثر گریہ فرمانے لگتے ہیں چنانچہ ابھی جب آپ باتھ روم کے اندر زور زور سے رو رہے تھے تو میں باہر سے کافی دیر تک آپ کو چپ کرانے کی کوشش کرتی رہی یہ سنتے ہی جگر صاحب برس پڑے: "لاحول ولا قوۃ میں رو رہا تھا یا غرارے کر رہا تھا۔" اب تو سب پر بجلی سی گر پڑی فوراً ہی جگر صاحب کی نظریں میری طرف مڑیں ان نظروں میں برہمی بھی تھی اور محبت بھی۔

ایک مرتبہ لاہور میں جگر صاحب بیگم عرفان اللہ کے مہمان تھے۔ میں اقبال صفی پوری کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا معمول یہ تھا کہ روزانہ ناشتہ وغیرہ سے فراغت کے بعد میں اقبال صفی پوری اور شوکت تھانوی جگر صاحب کے پاس پہنچ جاتے تھے،

اور رمی کھیلتے رہتے تھے ایک روز جب جگرؔ صاحب کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ مرحوم کے رشتہ کے ایک بھتیجے جن کا قیام پشاور میں تھا۔ جگرؔ صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ پاکستان میں جگرؔ صاحب کے عقیدت مندوں میں ایک چھوٹے موٹے تاجر تھے۔ ان کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جب تک جگرؔ صاحب کا قیام پاکستان میں رہتا تھا وہ اپنا کاروبار چھوڑ کر ہمہ وقت جگرؔ صاحب کے ساتھ رہتے تھے یہاں تک کہ مرحوم کا روپیہ پیسہ اور بکس کی کنجیاں وغیرہ سب اپنے ہی پاس رکھتے تھے تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد میں جگرؔ صاحب کے بھتیجے کو الگ تنہائی میں لے گیا اور ان سے کہا کہ بڑا اچھا ہوا کہ آپ آگئے آپ کے چچا کو یہ آدمی خوب لوٹ رہا ہے اب آپ اس سے حساب فہمی کیجئے اور سارا روپیہ پیسہ اپنے پاس رکھئے انھوں نے بڑی خوشی سے اس بات پر آمادگی کا اظہار کیا اور مجھے یقین دلایا کہ وہ اسی دن جگرؔ صاحب کے ان عقیدتمند کو نکال باہر کریں گے ان کی طرف سے مطمئن ہو کر تھوڑی دیر بعد جگرؔ صاحب کے ان عقیدتمند کو ایک طرف تنہائی میں لے گیا۔ میں نے پوچھا کہ یہ جگرؔ صاحب کے بھتیجے کون ہیں؟ میں نے تو آج تک کسی بھتیجے کو نہیں دیکھا وہ بولے خمارؔ صاحب میں خود پریشان ہوں صبح سے جب سے آئے ہیں۔ برابر چچا چچا کی رٹ لگائے ہیں۔ حالانکہ جگرؔ صاحب نے کبھی اپنے کسی بھتیجے کا تذکرہ نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ محض جگرؔ صاحب کی شہرت کے باعث یہ انکے بھتیجے بن بیٹھے ہیں۔ وہ بولے خمارؔ صاحب آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ مجھے تو یہ آدمی بدمعاش معلوم ہوتا ہے۔ آپ دیکھتے نہیں۔ اُس کی

آنکھیں مجرموں جیسی ہیں۔ میں نے ان کی تائید کی ان سے کہا اس آدمی پر نظر رکھیے گا
اور ہوشیار رہیئے گا ایسا نہ ہو کہ پکڑے سے بھاگے اس کے بعد میں اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا
تھوڑی دیر رمی کھیلی اور پھر دوسرے دن آنے کا وعدہ کرکے جگر صاحب سے رخصت
ہوگیا۔ دوسرے دن جب بیگم عرفان اللہ صاحبہ کی کوٹھی پر پہنچا تو جگر صاحب کے
کمرے [illegible] زور زور کی آوازیں آتی سنائی دیں میں باہر ہی کھڑا ہو گیا اتنے
میں جگر [illegible] کہا "[illegible] تو ہاتھا پائی کرنے کی کیا ضرورت تھی" میں ہنسی
روک [illegible] کمرے میں داخل ہوا اور بالکل انجان ہو کر دریافت کیا کیا
[illegible] مجھ پر برس پڑے فرمانے لگے: "کچھ نہیں آپ کی ستم ظریفیاں
[illegible] تو [illegible] آپ کے فریب میں آکر ایک دوسرے کو چور
سمجھ بیٹھے [illegible] بھی دونوں میں مارپیٹ ہوگئی" میں اپنی ہنسی
نہ روک سکا اور جگر صاحب بھی میرے ساتھ ہنسنے لگے۔

بمبئی میں جے۔ بی۔ ایچ واڈیا نامی ایک پروڈیوسر ڈائرکٹر ہیں موصوف
کو بڑے بڑے آرٹسٹوں کی فلمیں بنانے اور اپنے پاس محفوظ رکھنے کا شوق ہے
بمبئی میں ایک مشاعرہ تھا جگر صاحب شرکت فرمانے والے تھے۔ میں نے اور
شکیل بدایونی نے واڈیا صاحب کو جگر صاحب کی فلم بنانے پر آمادہ کیا خدا خدا
کرکے مذکورہ فلم بننے کا دن آگیا۔ میں اور شکیل جگر صاحب کو لے کر اسٹوڈیو
پہنچے واڈیا صاحب نے اپنے دوسرے معزز مہمانوں سمیت مرحوم کا شاندار
استقبال کیا بعد میں جگر صاحب کو سیٹ پر لے جایا گیا کیمرہ لگا ہوا تھا لائٹس فٹ
تھیں کیمرے کے سامنے جگر صاحب کو ایک صوفہ پر بٹھا دیا گیا پھر واڈیا صاحب نے

مرحوم سے ایک غزل سنانے کی درخواست کی جگر صاحب نے ایک غزل سنا دی جو
فلم ہو گئی بعد میں واڈیا صاحب نے ایک اور غزل سنانے کے لئے کہا جگر صاحب
رضامند ہو گئے۔ واڈیا صاحب نے کیمرے کا رخ بدلنے اور لائیٹس کو از سر نو فٹ
کرنے کا حکم دیا۔ اس کے لئے کم و بیش ایک گھنٹہ درکار تھا۔ جگر صاحب تنہا
صوفہ پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگے واڈیا صاحب سامنے ہی مگر ذرا فاصلہ پر اپنے
مہمانوں سے بات چیت کرنے لگے میں نے اس موقع کو غنیمت جانا فوراً جگر صاحب
کے پاس پہنچا اور ان سے عرض کیا کہ واڈیا صاحب کی یہ خواہش ہے کہ آپ
جب دوسری غزل سنائیں تو ٹوپی کے بجائے سر پر پگڑی باندھ لیں تاکہ دونوں
فلموں میں لباس کی یکسانیت آنکھوں کو بری نہ معلوم ہو جگر صاحب یہ سنتے ہی
برہم ہو گئے غصہ سے کہنے لگے کہ خدا کی قسم میں پگڑی کبھی نہیں باندھوں گا میں
نے پھر پگڑی باندھنے کے لئے اصرار کیا اب تو جگر صاحب جامے سے باہر
ہو گئے صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ فرمانے لگے فلم جائے جہنم میں میں ایسی
لغویت کبھی نہیں کر سکتا پگڑی میں نے نہ کبھی باندھی ہے اور نہ باندھوں گا۔
میں نے جب دیکھا جگر صاحب کا پارا بہت بڑھ چکا ہے تو کہا کہ اچھا آپ
واڈیا صاحب سے خود فرما دیں کہ آپ پگڑی نہ باندھیں گے۔ جگر صاحب نے
غصہ سے فرمایا بلائیے واڈیا صاحب کو میں واڈیا صاحب کے پاس پہنچا اور کہا
کہ جگر صاحب آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔ واڈیا صاحب فوراً جگر صاحب کے
سامنے پہنچے جگر صاحب برس پڑے کہنے لگے صاحب! یہ کیا لغویت ہے میں
پگڑی وگڑی نہیں باندھوں گا۔ واڈیا صاحب سناٹے میں آ گئے حیرت سے

کہنے لگے۔ جگر صاحب آپ کیا فرما رہے ہیں۔ پگڑی کا کیا ذکر۔ جگر صاحب نے پھر صراحت فرمائی کہ آپ ہی نے تو یہ کہا ہے کہ میں اپنی دوسری غزل سناتے وقت ٹوپی کے بجائے پگڑی باندھوں۔ واڈیا صاحب نے پوچھا کہ آپ سے یہ کس نے کہا ہے۔ جگر صاحب بولے "خمار نے" میرا نام سنتے ہی واڈیا صاحب مسکرا پڑے اور کہنے لگے۔ جگر صاحب خمار کی حرکتوں سے شاید آپ واقف نہیں انھیں کی شرارت ہے۔ اب جگر صاحب پر سارا راز کھل گیا۔ میں دور ایک کونے میں کھڑا ہوا تھا۔ جگر صاحب نے بڑے غصہ سے مجھے دیکھا۔ مجھے ہنسی آگئی پھر دیکھا تو مرحوم کو بھی ہنستے ہوئے پایا۔

لکھنؤ ریڈیو کا مشاعرہ تھا۔ مشاعرہ کے اختتام پر جگر صاحب، میں اور دو چار حضرات بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے اتنے میں ڈیوٹی روم سے آدمی آیا اور کہا کہ آپ لوگ اپنے چیک جا کر لے آئیے۔ میں چیک لانے کے لئے اٹھا تو جگر صاحب نے فرمایا میرا چیک بھی آپ ہی لیتے آئیے چنانچہ جگر صاحب کا چیک میں لے آیا۔ رسید پر ان سے دستخط کرائے اور رسید واپس کرنے کے لئے ڈیوٹی روم میں پھر گیا جب واپس آیا تو دیکھا جگر صاحب چیک جیب میں رکھ چکے ہیں میں نے عرض کیا۔ جگر صاحب ریڈیو والوں نے کہا ہے کہ آپ یہ چیک پندرہ دن بعد کیش کرائیے گا چیک پر پندرہ دن بعد کی تاریخ پڑی ہے یہ سنتے ہی جگر صاحب آگ بگولہ ہو گئے کہنے لگے یہ کیا مجھے کل روپیہ کی ضرورت ہے کچھ خرید و فروخت کرنا ہے۔ یہ گورنمنٹ کا محکمہ ہے یا بنئیے کی دکان۔ میں نے عرض کیا کہ آپ اسٹیشن ڈائرکٹر کے پاس خود تشریف لے جائیے اور ان سے

کہئے تو ممکن ہے کہ وہ چیک کی تاریخ بدل دیں جگر صاحب فوراً تیزی سے گرفتہ میں اسٹیشن ڈائرکٹر کے کمرہ میں گھس گئے اور برسنے لگے "حضرت مجھے روپے کی ضرورت کل ہے اور آپ نے چیک پندرہ دن بعد کا دیا ہے تاریخ بدل دیجئے"۔ اسٹیشن ڈائرکٹر کو حیرت ہوئی انھوں نے کہا کہ چیک مجھے دکھائیے چیک پر اسی روز کی تاریخ پڑی تھی۔ ڈائرکٹر صاحب بولے جگر صاحب چیک بالکل ٹھیک ہے۔ آپ صبح کیش کرا لیجئے زیادہ ضرورت ہو تو میں روپیہ اپنے گھر سے منگوا دوں اور چیک بعد میں کیش کرالوں گا۔ جگر صاحب بولے نہیں اس کی ضرورت نہیں شکریہ۔ جگر صاحب کچھ شرمندہ اور کچھ برہم باہر آئے۔ مجھ سے کہنے لگے آپ کی یہ حرکتیں اچھی نہیں آپ آدمی کو ذلیل کرادیں اسٹیشن ڈائرکٹر نے میرے متعلق کیا رائے قائم کی ہوگی میں نے ہنس کر جواب دیا کہ آپ کی شاعرانہ عظمتوں کے ساتھ ساتھ ان پر آپ کی معصومیت اور سادہ لوحی کا سکہ بھی بیٹھ گیا ہوگا۔

ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) میں مشاعرہ تھا میں اور جگر صاحب کلکتہ کے لئے لکھنؤ سے روانہ ہوئے۔ جب ٹرین پٹنہ پہنچی تو پلیٹ فارم پر جمع کچھ طالب علموں نے ہم دونوں کو پہچانا وہ سب ہمارے کمپارٹمنٹ میں آئے اور آٹوگراف لئے ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں نے ہم دونوں سے ہمارے فوٹو مانگے میرے پاس اپنا کوئی فوٹو نہ تھا۔ البتہ جگر صاحب نے ان لوگوں کو اپنی ایک تصویر مرحمت فرمادی وہ لوگ چلے گئے۔ اب میں نے جگر صاحب سے عرض کیا کہ مجھے بھی آپ کی ایک ایسی تصویر درکار ہے جس کا سائز اتنا ہو کہ آپ کے

خدوخال واضح طور پر نمایاں ہوں۔ جگر صاحب نے فرمایا کہ آپ کو اتنی بڑی تصویر
کیوں چاہیئے میں نے عرض کیا کہ یہ جان کر آپ کیا کیجئے گا۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ
ضرورت بے حد شدید ہے جگر صاحب نے پھر بہ اصرار دریافت کیا کہ کیا ضرورت
ہے؟ میں نے پھر ضرورت بتانے سے گریز کیا۔ اب جگر صاحب جھنجھلا گئے
فرمانے لگے کہ جب تک آپ ضرورت نہیں بتلائیں گے میں تصویر نہیں دوں گا
میں نے سر جھکا کر نہایت ادب سے عرض کیا کہ جگر صاحب میرے بچے رات کو
بہت روتے ہیں کسی چیز سے نہیں ڈرتے اس لئے تصویر کی ضرورت ہے۔ جگر
صاحب یہ سن کر غصے کے مارے بالکل چپ ہو گئے اور کلکتہ تک مجھ سے بات نہیں کی

جگر صاحب کو رمی کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ مارچ سنہ ۵۸ء میں جگر صاحب
پر کئی بار دل کے دورے پڑے۔ ان کی طبیعت خطرناک حد تک بگڑ گئی مرحوم
لکھنؤ میں زیر علاج تھے میں اور شکیل بدایونی مزاج پرسی کے لئے بمبئی سے لکھنؤ
آئے اسلم صاحب کی کوٹھی پر جگر صاحب کا قیام تھا ہم دونوں وہاں پہنچے تو دیکھا کہ
جگر صاحب مسہری پر تشریف فرما ہیں اور دس بارہ آدمی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے
ہیں۔ اب جگر صاحب کی طبیعت سنبھل چکی تھی ہم دونوں کو دیکھتے ہی خوشی سے
بیتاب ہو گئے اور دونوں کو اپنے پاس ہی مسہری پر بٹھا لیا۔ پھر دورۂ دل کا حال
تفصیل سے بیان کرنے لگے فرمایا آخری دورہ بڑا جان لیوا تھا میں سات
گھنٹے بیہوش رہا ڈاکٹروں نے معلوم نہیں کتنے انجکشن لگائے۔ جب کہیں جا کر
مجھے ہوش آیا یہ سن کر میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹروں سے مرض کی تشخیص میں غلطی
ہوئی اگر میں موجود ہوتا تو فوراً ہی آپ کو ہوش میں لے آتا۔ یہ سن کر جگر صاحب

اور دوسرے تمام حضرات کو حیرت ہوئی۔ جگر صاحب نے فرمایا کہ آپ ہوش میں کیسے لے آتے ہیں میں نے عرض کیا کہ میں نہ کوئی انجکشن لگاتا ۔ نہ کوئی دوا پلاتا صرف تاش کی گڈیوں سے سارے جوکر نکال کر آپ کے سینے پر رکھ دیتا آپ فوراً ہوش میں آجاتے۔ جگر صاحب نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ فرمانے لگے خدا آپ کو خوش رکھے۔ کئی مہینوں کے بعد آج آپ کی وجہ سے دل سے ہنسا ہوں۔
دوسرے حضرات بھی جگر صاحب کے قہقہوں کا ساتھ دینے لگے۔
فطرت کی کیا ستم ظریفی ہے کہ آج جب اپنی یہ پرلطف حرکتیں یاد آتی ہیں تو ہنسی کے بجائے آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہر شئے میں کسی شئے کی کمی پاتا ہوں میں

جگر مراد آبادی

از سوامی ناتھم
مترجم
سعادت علی صدیقی

کئی سال پہلے کی بات ہے تب میں آٹھویں درجہ میں پڑھتا تھا ہمارا اسکول جاکھو (شملہ) کی سمت میں پہاڑ کے ڈھلان پر ایک طرف کو واقع تھا۔ میں اسکول کے اسکاؤٹ گروپ کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ اور اس دن شام کو معہود دی اسکول میں حاضر ہونے کو کہا گیا تھا ہمارے اسکول کے ہال میں مشاعرے کا انتظام تھا اور ہم لوگوں کو ٹکٹ چیک کرنے اور انتظام رکھنے کا کام سونپا گیا تھا جاکھو کی سڑک سے اسکول جانے والی پگڈنڈی جہاں بچھڑتی ہے وہیں سے اسکول تک کا قریب قریب ڈیڑھ فرلانگ کا دلچسپ سفر آج بھی میرے دل و دماغ پر نہ جانے کیوں نقش ہے۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف اونچے اونچے چیڑ کے پیڑ کھڑے ہیں۔ جن کے وسط میں سے کبھی کبھی اسکول کی سنیکڑوں شیشوں والی عمارت چمک جاتی ہے۔ کسی زمانے میں یہ انگریزوں کا کلب تھا۔ چڑھائی پر چڑھنے کی وجہ سے میرا دم پھول گیا ہے پھر بھی میں ہانپتا ہوا بھاگتا چلا جا رہا ہوں۔ بلند اونچی پہاڑیوں کے پیچھے ڈوبتے سورج کی سرخ کرنوں کو یا تو آسمان میں بکھرے گلابی بادل پکڑ رہے ہیں یا ہمارے اسکول کے جھروکوں میں لگے ہوئے شیشے۔ ہانپتا ہانپتا

جب میں اس کھلی جگہ پر پہونچا جہاں چیڑ کے درختوں کی قطاریں بائیں طرف نیچے ڈھلان میں اتر جاتی ہیں اور داہنی طرف اوپر کو چڑھتی چلی گئی ہیں۔ تو اسکول کی عمارت کو دیکھ کر میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ ساری بلڈنگ سورج کی آخری کرنوں میں اس طرح جگمگا رہی تھی۔ جیسے کوئی دمکتا ہوا ہیرا ہو یہ تصور میرے دل و دماغ پر نہ مٹنے والی تحریروں کی طرح نقش ہے کہ اسی شام مجھے ایک اور تجربہ ہوا جس کی یاد سے میں آج بھی لطف اندوز ہوتا ہوں۔

مشاعرہ شروع ہونے پر میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اسٹیج کے بالکل قریب آ بیٹھا۔ شاعر اپنی نظمیں اور غزلیں پڑھ رہے تھے۔ لیکن ان کے انداز پر ہنسی آ رہی تھی۔ میں ہندی پڑھتا تھا اور ان کا جھک جھک کر آداب عرض کرنا اور لوگوں کا چلا چلا کر ارشاد اور مکرر کہنا بہت مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ ابھی ایک شاعر صاحب اپنا ہاتھ اونچا اٹھا کر اور ایک پیر کچھ آگے کو بڑھا کر اپنی پتلی آواز میں کچھ گا ہی رہے تھے کہ اسنے میں شور اٹھا: "آ گئے" "جگر صاحب آ گئے"

ہال میں کھلبلی سی مچ گئی اور شاعر صاحب لاؤڈ اسپیکر پر کہتے ہی رہ گئے بیٹھ جائیے بیٹھ جائیے آپ لوگ بیٹھ جائیے۔ لیکن شور تب تھما جب جگر خود ڈائس پر آ گئے۔

اس دن میں نے جگر کو پہلی بار دیکھا تھا۔ چھریرے بدن پر چوڑی دار پاجامہ اور چست شیروانی جس کے بٹن گلے تک بند۔ ہاتھ دونوں کمر کے پیچھے۔ گردن سیدھی، چھوٹی نکیلی داڑھی گردن تک چھوتی لٹیں اور آنکھیں، جگر کی

آنکھوں کے جادوئی اثر کو میں آج تک نہیں بھولا شوخی و مستی سے ایک ساتھ چمکتی بھری محفل کو اپنی گرفت میں لیتی۔ اور اپنے جادوئی اثر سے شور کرنے والوں کو خاموش کر دینے والی آنکھیں مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ہال میں بجلی کوند گئی ہو

میں اردو نہیں جانتا تھا اور جگر نے اس دن جو غزلیں پڑھیں میں ان کے مطلب کو بالکل نہیں سمجھ پایا۔ لیکن جو انداز دوسرے شاعروں میں مضحکہ خیز لگ رہے تھے وہ نہ جانے کیسے جگر کی جادوئی شخصیت میں ڈوب کر میرے لئے سحر ثابت ہوئے نشے میں چور جگر جھوم جھوم کر پڑھ رہے تھے اور آواز کے آتار چڑھاؤ پر سارے سامعین کے ساتھ میں بھی جھوم رہا تھا۔ جگر نشے میں چور تھے اور مستی سے پھیلے ہوئے ان کے ہونٹوں سے پان کی لال پیک ان کی داڑھی کو رنگین بنا رہی تھی۔

بعد میں ہمارے ایک استاد نے کہا، بری بات ہے اس طرح شراب پی کر ان صاحب کو یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ لڑکوں پر کیا اثر پڑے گا؟ پتہ نہیں اوروں پر کیا اثر پڑا ہوگا لیکن مجھے اس دن ایسا محسوس ہوا جیسے جگر نے تمام بندھنوں کو توڑ کر کیف و مستی کا ایک ایسا دریا بہا دیا ہے جس کی ناچتی تھرکتی لہروں میں ہم سبھی لوگ اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیاں چھوڑ کر کچھ وقت کے لئے سرشار ہو سکتے ہیں۔ شاید آپ کو یقین نہ ہو لیکن جگر نے اس دن جو غزل پڑھی تھی اس کے کچھ شعر مجھے آج بھی یاد ہیں۔ حالانکہ میں اردو نہ تب جانتا تھا اور نہ اب جانتا ہوں ؎

ساقی کی ہر نگاہ سے بل کھائے پی گیا | لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا
زاہد یہ میری شوخیٔ رندانہ دیکھنا | رحمت کو باتوں باتوں بہلا کے پی گیا
اے رحمت تمام مری ہر خطا معاف | میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا
اس جان میکدہ کی قسم بارہا جگر | کل عالم بسیط پہ میں چھا کے پی گیا

جگر سے میری ملاقات ۱۹۵۷ء میں ہوئی۔ اسکول کے دنوں کی اس پہلی ملاقات کے تقریباً ۱۸ سال بعد۔ یوں میں اس دوران میں جگر کو کئی مشاعروں میں دیکھ اور سن چکا تھا۔ بہت سے دوستوں کو ان کی بیسیوں غزلیں یاد تھیں اور اردو رسم الخط سے انجان اور زبان سے واقفیت نہ رکھتے ہوئے بھی جگر کی تخلیقات اور اردو شاعری میں ان کے مقام کو میں نے کچھ کچھ سمجھ لیا تھا۔ حالانکہ اردو شاعری اور اس میں جگر کے مقام کے بارے میں مجھے کوئی بھی بات کہنے کی مجال نہیں ہے۔ پھر بھی لہروں کے کنارے کنارے چلنے کے دوران مجھ پر جو اثرات ہوئے انھیں میں چند الفاظ میں ضرور بیان کرنا چاہتا ہوں۔

مجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ ہندی میں بچپن کی شاعری کے برابر یا یوں کہئے کہ گیت کے برابر اردو شاعری کا، خاص کر غزل کا زندگی کی ترنگوں سے رشتہ ٹوٹ چکا ہے اور غزل کے ڈھانچے کے اندر صرف وہی لوگ اپنا رونا روتے ہیں جو ساری عمر گذر جانے کے بعد بھی زندگی میں کبھی بالغ نہیں ہوتے۔ ایسا ہی نہیں کہ صرف گیت کار اور غزل گو ان نابالغوں کی فہرست میں آتے ہیں۔ ایسے بہت سے ہیں۔ جن کی شخصیت ان ڈھانچوں

میں ڈھل نہیں پائی ہے۔

جگر غزل کے بادشاہ تھے اور ان کی شاعری بھی ساقی مینا اور غم فرقت کے دائرے میں تھی۔ ان کی شاعری میں ترنم کی اگر بہتات نہیں تو اتنا ہی مقام ہے جتنا کہ ان کے خیالات کا۔ جگر کی کوئی بھی غزل لیجئے۔ خواہ آپ پڑھ رہے ہوں یا کسی سے سن رہے ہوں نا ممکن ہے کہ آپ اس وقت اپنے آپ کو نہ بھول جائیں دیکھئے کس شوخی اور بے باکی کے ساتھ اپنے محبوب سے مخاطب ہیں۔

میرا جو حال ہو سو ہو برق نظر گرائے جا
میں یونہی نامراد ہوں تو یوں ہی مسکرائے جا

لحظہ بہ لحظہ دم بہ دم جلوہ بہ جلوہ آئے جا
تشنہ حسن ذات ہوں تشنہ لبی بڑھائے جا

جتنی بھی آج پی سکوں عذر نہ کر پلائے جا
مست نظر کا واسطہ مست نظر بنائے جا

لطف سے ہو کہ قہر سے ہوگا کبھی تو روبرو
اس کا جہاں پتہ چلے شور وہیں مچائے جا

جگر کی یہ زندگی کچھ کچھ بھیانک بھی لگتی ہے لیکن یہ عظیم شاعر یہ بھی کہتا ہے ؎

چاہتا ہے عشق راز حسن عریاں کیجئے
یعنی خود کھو جایئے ان کو نمایاں کیجئے

جگر ایک خوددار انسان تھے لیکن خود غرض نہیں وہ یہ صرور کہتے ہیں اور بار بار طرح طرح سے کہتے ہیں ؎

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں

اور ؎

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر

یا ؎

یوں تو مہر و ماہ میرے ہم سفر ہیں برسوں
پھر اس کے بعد میری گرد کو بھی پا نہ سکے

یا ؎

ایسی بھی اک نگاہ کئے جا رہا ہوں میں
ذروں کو مہر و ماہ کئے جا رہا ہوں میں

آگے قدم بڑھائیں جنھیں سوجھتا نہیں
روشن چراغ راہ کئے جا رہا ہوں میں

جگر اپنی شخصیت سے بخوبی واقف ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ ؎

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن
لیکن اپنا اپنا دامن

ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ؎

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضان محبت عام سہی عرفان محبت عام نہیں

لیکن جگر ایسے خود پرست نہیں تھے جنھیں اپنے سوا اور کچھ سوجھتا ہی نہیں ؎

آنا ہو جو بزم جاناں میں پندار خودی کو توڑ کے آ
اے ہوش و خرد کے دیوانے یاں ہوش و خرد کا کام نہیں

ہاں تو جگر صاحب سے میری پہلی اور سب مجھے افسوس ہے کہ آخری ملاقات میرے ایک دوست کے گھر پر ہوئی تھی جن کے والد جگر کے بڑے مرید تھے اور دلی آنے پر جگر انھیں کے یہاں ٹھہرتے تھے۔

رات کے دس بجے ہوں گے ہم لوگ انتظار میں بیٹھے تھے تھوڑی دیر میں جگر صاحب تشریف لائے ساتھ میں ان کے بھوپال کے کمیونسٹ لیڈر شاکر علی تھے۔ کسی محفل سے لوٹ رہے تھے آتے ہی انھوں نے تپاک سے ہاتھ ملایا اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ میرے دوست نے میرا تعارف کرایا۔ شاید یہ جان کر کہ میں ایک صحافی ہوں اور ان سے انٹرویو چاہتا ہوں۔ میرے لئے اس تعارف سے بڑھ کر بڑی بات کوئی نہیں ہوسکتی تھی۔ میں اسکولی زندگی کی اس انوکھی شخصیت کو قریب سے دیکھنے آیا تھا۔ ان کی لٹوں ان کی داڑھی اور ان کی مستی میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھنے آیا تھا۔ میں ان سے سوال کرنا نہیں ان کی بات سننا چاہتا تھا۔ سمجھ میں نہ آیا کیا کہوں گفتگو کا سلسلہ کیسے جاری ہو وہ شاید میری پریشانی کو بھانپ گئے بولے

"تو آپ کو شعر و شاعری سے دلچسپی ہے؟"۔

کیا جواب دیتا؟ دماغ میں فوراً ہی ایک جرأت بھرا خیال آیا "جی .... اردو تو میں جانتا نہیں کبھی کبھار مشاعروں میں سن لیتا ہوں۔ بہت پرانی تمنا ہے کہ آپ کے بارے میں کچھ لکھ سکوں ہندی میں...."

ایک کتاب کسی نے لکھی تو ہے آپ پبلشر ہیں کیا؟ ایسا لگا جیسے جگر صاحب نے میرے منھ پہ تھپڑ مار دیا ہو۔ ان کی تیوریوں کی شکن سے صاف ظاہر تھا کہ میری بات کا ان پہ اچھا اثر نہیں ہوا ہے۔ میں بالکل ڈھیر ہو گیا سر جھکائے، پاؤں کی انگلیوں سے فرش کو کریدتا رہا۔ انھیں رحم آگیا بولے "معاف کیجئے گا میں پبلشروں سے گھبراتا ہوں۔

آپ کو اردو شاعری سے دلچسپی کیسے ہوگئی ؟ میں نے سر اٹھایا ان کے چہرے پر انوکھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی میں نے چین کی سانس لی۔ بولا آپ کو سنا تھا بہت سال پہلے۔ "آنا ہے جو بزم جاناں میں ....."

واہ صاحب! خوب یاد رکھا آپ نے : پھر کچھ سنجیدہ ہو کر ایک طرف کو منھ موڑ کر بولے : میں عوام میں سینہ پیٹ پیٹ کر رونا بحد ناپسند کرتا ہوں ارے صاحب خلوص پیدا کیجئے اپنی مصیبتوں کو دوسروں پر لاد کر کیا کیجئے گا ؟ انسان کو خود دار ہونا چاہیئے خود غرض نہیں "

پھر ادھر ادھر نظر دوڑا کر کرسی سے اٹھتے ہوئے فرمایا "معاف کیجئے گا ..... ابھی آتا ہوں " مہمانی فرائض کے پابند ہمارے دوست ان کی طرف لپکے جگر نے ان کے کان میں کچھ کہا۔ لیکن وہ سمجھے کہ زور سے بول اٹھے آپ تشریف رکھئے یہیں تیار ہوئی جاتی ہے " جگر کچھ پریشان سے دکھائی دیئے۔ ابھی پانچ منٹ میں بن کی دوکان سے پی کر لوٹ آؤں گا کیوں پریشانی اٹھاتے ہو " لیکن ہمارے دوست سے یہ خطا کیسے ہو سکتی تھی ؟ مانے نہیں جگر پھر نا امید سے ہو کر کرسی پر آبیٹھے اور بولے تو ہماری طرف سے ہی سب کے لئے چائے منگوا لیجئے "

" منگوانے کی کیا ضرورت ہے جگر صاحب یہیں پانچ منٹ میں تیار ہوئی جاتی ہے " اور انھوں نے آنگن میں کھڑے ہو کر چھت پر سوتے ہوئے نوکر کو آواز دینا شروع کی۔ جگر صاحب کا حال دیکھنے کے لائق تھا۔ کبھی اپنی داڑھی کھجلاتے، کبھی پیروں سے فرش پر تھپکیاں دیتے کبھی کرسی

میں اس طرح کسمائے جیسے اس کے ساتھ زنجیروں سے بندھے ہوں۔ نوکر کو آنگن میں انگیٹھی جلاتے دیکھا تو رہا نہ گیا۔ اٹھ کر غسل خانے کی طرف گئے لوٹتے ہوئے نوکر سے کچھ کہا اور جیب سے مٹھی بھر کاغذوں کا پلندہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں اندھیرے کونے میں بیٹھا غور سے دیکھ رہا تھا۔ حالانکہ جگر اپنی حرکتوں کو چھپانے کی پوری کوشش کر رہے تھے جب وہ لوٹ کر ہمارے پاس آئے۔ تو کچھ شرمندہ سے تھے۔ نوکر کو اسکی زحمت کے عوض مٹھی بھر نوٹ دے ڈالے تھے اور اپنی اس دریا دلی پہ جھینپ رہے تھے۔

چائے آئی باتوں کا سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ سیاست کا ذکر چھیڑا۔ انھوں نے ٹیگور اور گاندھی جی کے سلسلے میں بہت سی عمدہ باتیں کہیں پھر یہ شعر دہرا دیا ؎

ان کا جو فرض ہے اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

انقلاب اور جوش ملیح آبادی کی بات پر صرف طنز بھری مسکراہٹ سے مسکرا دیئے۔ مذہب کے بارے میں کہا کہ خلوص ہی مذہب کا نچوڑ ہے۔ انھوں نے کائنات اور انسان کی باتیں کیں۔ نرالا کا ذکر میں نے کیا تو بولے: "انسان کی قدر کہاں ہوتی ہے؟"

چلتے وقت میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے جیسے کسی اپنے سے کہہ رہے ہوں: "گو ندہ آئیے باتیں ہوں گی۔ میاں فاکر علی کی مدد لیجئے

کچھ خطوط پڑے ہیں انھیں دیکھئے اسی طرح مصالحہ اکٹھا ہو جائے گا
گونڈہ ضرور آیئے گا۔ اپنا گھر ہے باتیں ہوں گی"

میں گونڈہ تک کبھی نہ جا سکا اور جگر اتنے لمبے سفر پر چل دیئے کہ جہاں سے کوئی لوٹتا نہیں۔ اردو شاعری کے اس بادشاہ کی کمی برسوں تک کھلتی رہے گی۔

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

انھیں دیکھا یا پڑتا تھا۔ میں مگر دور رُہیں ان کے بارے میں نہ سن سکا۔

جگر کی پرکشش و پر اخلاق شخصیت میں جو سوز تھا وہ ہر کس و ناکس کو اپنی جانب کھینچ لیتا تھا۔ مجسم اخلاق جگر زندگی بھر دوسروں کے ساتھ سلوک و نیکیاں کرتے رہے۔ انھوں نے ان کے ساتھ بھی سلوک جاری رکھے جو اس کے مستحق نہ تھے۔ اور اس حسن سلوک نے یہاں تک طول کھینچا کہ وہ بھی اس فیض کے سایے میں برقرار رہے جو ان کے حق میں بد، مضر اور خراب تھے۔

پیغمبری کا دوسرا نام شاعری ہے۔ شاعر بھی پیغامبر ہوتا ہے وہ بھی اپنی قوم ملک یا عالم انسانیت کو پیغام دیتا ہے۔ اس کی یہی پیمبری، دلبری و ساحری اس کی شخصیت کو عوام و خواص سے ممتاز و مقبول کرتی ہے۔ غفلتوں کے جنگل میں جہاں پھولوں کے دامن بھی کانٹوں سے تار تار ہیں۔ جگر کی شخصیت سب سے الگ تھلگ بے داغ، روشنی کے سب سے بلند منارے کی طرح صاف نظر آتی ہے۔ ان کی شخصیت کے جلوؤں میں کوہ طور کے شعلے ہیں۔ مقدس پھولوں کی آگ ہے۔

آج کے جملہ ضعیف و قوی راوی اس بات پر متفق ہیں کہ "اخلاق محسنی و ناصری" کی مکمل تصویر تھے۔ ان کی زندگی گلستاں، بوستاں کا چلتا پھرتا مرقع تھی۔ ان کی زندگی وقف تھی دوسروں کا اخلاق و علم سنوارنے کے لئے۔ وہ دوسروں کے لئے پیدا ہوئے اور دوسروں پر جان دی۔ جگر اگر شاعر نہ ہوتے تو انسانیت کس منزل پر ہوتے؟ لیکن انسانیت کی اس سے بڑی منزل کہاں؟ اس کی منتہا تو جگر ہوا ہے!

ان کی طبیعت کی سرمستی و سرشاری، کلام کا کیف و سرور، بے کا خمار، شخصیت کی شادابی نے ان کے خلوص کو قبول عام بنا دیا تھا۔ وہ دل سے کہتے اور سنتے

تھے۔ اسی وجہ سے ان کے کردار کی مجموعیت میں بڑی ہمہ گیری و وسعت تھی
ایک عالم تھا جو ان کا شیدائی تھا۔

ان کی زندگی مشرقی تہذیب و تمدن کا صحیح آئینہ دار تھی۔ جو لوگ اُن سے
متعلق تھے وہ اس بات کے معترف ہیں کہ وہ معمولی سے معمولی بات میں بھی اس کا
بے حد خیال رکھتے تھے کہ متکلم یا حاضر کو کسی طرح کی کوئی تکلیف نہ ہونے پائے
اس کے مسائل حیات جہاں تک امکان میں ہوں حل کر دیئے جائیں وہ کسی کو
تکلیف میں دیکھ سکتے تھے اور نہ کسی کی پریشانیوں کو خاموش تماشائی کی طرح
برداشت کر سکتے تھے۔ انھوں نے زندگی بھر اپنے گرد جو لوگ تھے ان کی ہر ممکن
امداد ہر جائز اور ممکن طریقہ سے کی۔ ان کے عیبوں سے چشم پوشی خامیوں کی پردہ پوشی
اور خوبیوں کو اجاگر کیا انھیں بہتر سے بہتر انسان بننے اور بنانے کی جد و جہد کرتے رہے۔
جگر کو جاننے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر کوئی زبان تک یہ بھی لانے کی کوشش
کرتا کہ فلاں یا فلاں نے ان کے ساتھ کیا کھوٹ کی ہے تو وہ اس کا بہت زیادہ برا
مانتے تھے۔ اس قسم کی ہزاروں داستانیں، واقعات و لطائف موجود ہیں جن میں
جگر صاحب کو معلوم ہو گیا کہ فلاں شخص ان کے ساتھ کھوٹ کر رہا ہے مگر اس کے
باوجود وہ بڑی بے جگری سے اس شخص پر اپنی ساری عنایتوں، مہربانیوں و سلوک
کے سلسلے اسی طرح جاری و ساری کئے رہتے۔ محض اس لئے کہ موصوف اپنی
جگہ شرمندہ نہ ہوں ان کے سامنے سرشار نہ ہو۔ یہ پردہ پوشی بڑی وضعداری سے
ہیں ان کے یہاں شروع سے آخر تک ملتی ہے۔

جگر صاحب ہمیشہ ہر شخص میں حفظ مراتب کا جس قدر خیال رکھتے تھے شاید وہ آج

کسی دوسرے کے لئے عملاً بھی ممکن نہ تھا۔ بڑوں کا احترام اور چھوٹوں کا خیال جیسا جگر نے رکھا شاید پھر کوئی اسے نہ برت سکے۔

یہی تہذیب، اخلاق و خلوص ان کی تہہ دار شاعری میں ہمیں بڑا رچا اور بسا ہوا نظر آتا ہے یاں کی شاعری اس کی مکمل طور پر آئینہ دار ہو۔ ان اشعار میں مقدس انسانیت کے شعلوں کی لپک بھی ہے اور خوشگوار چاندنی کی ٹھنڈک بھی۔ یہ ہمارے شعری ادب میں حسین اضافہ بھی ہیں اور روشن مستقبل کی ضمانت بھی۔ زندگی کا بہت گہرا اور واضح عکس شعر و ادب پر پڑتا ہے۔ اس کو جتنا زیادہ خلوص کی آنچ پر پکایا جائے گا جتنی خون جگر کی آمیزش کی جائے گی۔ اتنا ہی زیادہ اس میں لطافت نزاکت و ... پیدا ہوگا۔ اسی وجہ سے اس دور کی سینکڑوں ہزاروں آوازوں میں جگر کی آواز کی گونج سب سے زیادہ انوکھی، گہری اور شوخ ہے۔ جگر صاحب اب ہماری محفل میں نہیں مگر ان کا پیغام کلام حیات و اقعات جوں کے توں موجود ہیں جو ہماری سب سے بڑی ملکی، قومی و عام انسانی جاگیر ہے جس کے سایے تلے ہمیں انسانیت کے کاروان کی تلاش میں آگے بڑھنا ہے۔ اپنی منزل تک پہونچنے کے لئے انہی شعلوں پر چل کر گلزار ابراہیمی میں داخل ہونا ہوگا۔ جس کا مجھے انتظار بھی ہو۔ یقین بھی اور ایمان بھی، کیونکہ اسی میں ہماری نجات بھی ہے اور نشہ بھی۔

جگر صاحب پر مشرقی تہذیب و تمدن کا آخری دور ختم ہوگیا۔ ایسے مجسم و مکمل نمونے اب روز روز ہمارے سامنے نہ آئیں گے۔ اب اس تہذیب، تمدن، اخلاق و خلوص کا درس حیات ہمیں جگر کے یہاں ملے گا۔ جس کی مدد سے ہم اپنی آئندہ زندگی کے نقشوں میں خوشگوار رنگوں کے حسین امتزاج سے اس زندگی کو اور گوارا اور بہتر بنا سکیں گے۔

پروفیسر اکبر حیدری

جگرؔ مراد آبادی

امر سنگھ کالج سری نگر میں

جگرؔ مراد آبادی جشن کشمیر کے سلسلہ میں کشمیر سرکار کی دعوت پر ستمبر ۱۹۵۶ء وارد کشمیر ہوئے تھے۔ انھوں نے دوران جشن کئی اہم جگہوں پر سامعین کو اپنے انداز کلام سے بے حد متاثر کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ سری نگر کے ٹورسٹ سنٹر میں جو تاریخی مشاعرہ ۲۳ ستمبر کی رات کو ہوا تھا وہ اپنا جواب نہیں رکھتا ہے۔ اس محفل مشاعرہ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جگرؔ (جو پہلی بار کشمیر آئے تھے) کا کلام سننے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں دور دراز جگہوں سے آئے تھے۔ مشاعرہ کا ہال کھچا کھچ تھا۔ اس میں ریاست کے وزیر اعظم اور ان کی کابینہ کے رفقاء معزز شہری اور فوجی حکام بھی موجود تھے۔ ہندوستان سے جو لوگ سیر و تفریح کے لئے اس زمانہ میں آئے تھے ان میں سے بھی اکثر مشاعرہ میں موجود تھے۔ جب جگرؔ نے اپنا کلام ترنم (جو ان کی شاعری کی جان ہے) کے ساتھ پڑھنا شروع کیا تو محفل مشاعرہ داد و تحسین سے گونج اٹھی۔

۲۴ ستمبر دن کے ۲ بجے کشمیر سرکار نے وزیر داخلہ پنڈت پنت کے اعزاز میں احاطہ آرٹ ریپوریم میں چائے نوشی کا اہتمام کیا۔ اس تقریب میں صدر ریاست شری کرن سنگھ۔ بخشی غلام محمد وزیر اعظم۔ ان کی کابینہ کے وزراء اور اعلیٰ

سرکاری حکام اور فوجی افسروں کے علاوہ معزز شہری بھی موجود تھے۔ جلسے کی نوشی کے بعد بخشی صاحب نے جگرؔ سے درخواست کی کہ وہ اپنے دلکش انداز بیان سے اپنا کلام معزز مہمان کو سنا دیں۔ جگرؔ صاحب جب مائک کے سامنے تشریف لائے تو سامعین نے خوشی خوشی سے تالیاں بجائیں۔ مائک کے سامنے ہی پنڈت پنت صدر ریاست اور وزیر اعظم کشمیر تشریف فرما تھے۔ جگرؔ نے اس تقریب میں یہ غزل سنائی تھی ؎

تیرا تصور شب ہمہ شب　　خلوتِ غم بھی بزم طرب
دعوئ شوق اور شکوہ بلب　　شرم! دل آداب طلب
باتیں ہیں دو مقصود ہے ایک　　تیری طلب یا اپنی طلب
آ ہی گیا اک مست شباب　　شیشہ بدست نغمہ بلب
ختم ہوا انعام فراق　　اپنی ہی گیا پیغام طلب
بیت گئی جو دل پہ نہ پوچھ　　ہجر کی شب اور آخر شب
حسن مکمل جذب و گریز　　عشق مسلسل ترک و طلب

ترک طلب اور اطمینان
دیکھئے تو میرا حسن طلب

اس کے بعد پنڈت پنت نے کشمیر میں اردو شعر و ادب کے روشن مستقبل پر اپنی مختصر سی اردو تقریر میں روشنی ڈالی اور انھوں نے پرزور الفاظ میں جگرؔ کے مرتبہ غزل گوئی کو سراہا۔ جلسہ کے اختتام پر بخشی صاحب نے اپنے محبوب شاعر اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

یہ جلسہ تقریباً ۹ بجے شام کو برخاست ہوا تھا۔ اس کے بعد جگر مراد آبادی مرحوم علی اکبر کاظمی ناظم تعلیمات اور راقم کے ساتھ امر سنگھ ڈگری کالج چلے گئے۔ جونہی جگر صاحب احاطۂ کالج میں داخل ہوئے تو کالج کے سینکڑوں طلبا نے ان کا پرتپاک استقبال کیا جشن کشمیر کے سلسلہ میں صاحبزادہ محمود احمد پرنسپل امر سنگھ کالج کے اعزاز میں ایک شاندار مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا۔ اس مشاعرہ میں جگر کے علاوہ ساغر نظامی، روش صدیقی، سکندر علی وجد، عرش ملسیانی، عکس، ناتھ آزاد، ہری چند اختر، ساحر ہوشیارپوری وغیرہ بھی تھے۔ مشاعرہ کی کارروائی مرحوم کاظمی صاحب کی صدارت میں ٹھیک ۹ بجے رات شروع ہوئی تھی یہ مشاعرہ نہایت ہی کامیاب رہا۔

اس مشاعرہ میں جگر نے ذیل کی غزل اپنے ذاتی اور محبوب ترنم سے سنائی۔

کوئی یہ کہہ دے گلشن گلشن　　لاکھ بلائیں ایک نشیمن

کامل رہبر، قاتل رہزن　　دل سا دوست۔ نہ دل سا دشمن

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن　　لیکن اپنا اپنا دامن

عمریں بیتیں صدیاں گذریں　　ہے وہی اب تک عقل کا بچپن

عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے　　عشق ہے کار شیشہ و آہن

برق و حوادث اللہ اللہ　　جھوم رہی ہے شاخ نشیمن

بیٹھے ہم ہر بزم میں لیکن　　جھاڑ کے اٹھے اپنا دامن

دل کہ مجسم آئینہ ساماں　　اور وہ ظالم آئینہ دشمن

خیر مزاج حسن کی یارب　　تیز بہت ہے دل کی دھڑکن

تجھ سا حسین اور خونِ محبت — وہم ہے شاید سرخیٔ دامن
آج نہ جانے راز یہ کیا ہے — ہجر کی رات اور اتنی روشن

ق

کام ادھورا اور آزادی — نام بڑے اور تھوڑے درشن
شمع ہے لیکن دھندلی دھندلی — سایہ ہے لیکن روشن روشن
علم ہی ٹھہرا علم کا باغی — عقل ہی نکلی عقل کی دشمن

ق

مستیٔ شاعر اللہ اللہ — حسن کی منزل عشق کا مسکن
رنگین فطرت، سادہ طبیعت — فرش نشیں اور عرش نشیمن
کانٹوں کا بھی حق ہے کچھ آخر
کون چھڑائے اپنا دامن

۳۰ ستمبر دن کے ۴ بجے پرنسپل صاحب نے جگر کو چائے پر مدعو کیا۔ ان کے ساتھ ساغر نظامی، روش صدیقی بھی تھے۔ پرنسپل کی کوٹھی پر کم و بیش دو گھنٹے قیام کر کے جگر شام کے ۶ بجے ٹورسٹ سنٹر تشریف لے گئے۔ جگر کا قیام کشمیر میں ایک ہفتہ سے زیادہ رہا۔ انھوں نے کشمیر میں اکثر لوگوں کو اپنے حسن اخلاق سے متاثر کیا۔ روز کافی لوگ ان سے ملنے آتے تھے۔ جن میں سرکاری حکام بھی ہوتے تھے۔ جگر نے دوبارہ کشمیر آنے کے لئے وعدہ کیا تھا — افسوس یہ وعدہ ان کا پورا نہ ہو سکا۔

علی جواد زیدی

جگر — ایک تاثر

علی سکندر اور جگر مرادآبادی ایک ہی فرد کے دو نام ہیں۔ ایک نام کبھی بھول جاتا ہوں، کبھی علی سکندر اور سکندر علی میں خلط ملط کر دیتا ہوں۔ لیکن دوسرے نام کے بارے میں نہ کبھی شک ہوا نہ شبہ۔ یہ تخلص بھی بہتوں نے اپنایا لیکن کوئی جگر ہوا تو مرادآبادی نہ بن سکا اور مرادآبادی ہوا تو جگر نہ بنا۔ بہتوں نے جگر کے سے بال بڑھائے۔ فرنچ کٹ داڑھی رکھی۔ بالوں والی اونچی سیاہ ٹوپی پہنی۔ قدرت نے بعض کو رنگ بھی دیدیا۔ لیکن یہ کم سواد زیادہ سے زیادہ علی سکندر تو بن گئے۔ جگر مرادآبادی نہ بن پائے۔

بات یوں ہے کہ جس نام کا تعلق ظاہر سے ہے وہ علی سکندر سے ہے۔ اس کی داستان خاندانی شجرے سے شروع ہوتی ہے اور عقیقہ کی گلیوں سے گزرتی ہوئی، مکتبوں کی سیر کرتی ہوئی ایام جوانی کے اس کاروبار تک آکے رک جاتی ہے جس کا تعلق آنکھوں سے تھا۔ یعنی اس میں عینک کے کاروبار اور عشق کے پہلے جھگڑے

؎ یہ مضمون میں نے جگر صاحب کی حیات ہی میں لکھا تھا۔ اب اس میں کافی ترمیم کرنی تھی لیکن حال کے صیغوں کو ماضی سے بدلنا دل نے گوارا نہ کیا۔

دونوں کو شامل سمجھتا ہوں۔ انسان علی سکندر بن سکتا ہے، لیکن، جگر مرآبادی کیسے بنے؟ جگر کا تعلق تو شعر و نغمہ سے، احساس و نظر سے، علم و فن سے ہے۔ اسی میں وہ واردات قلبیہ بھی شامل ہیں۔ جنھوں نے شعر و نغمہ کا روپ دھارن کیا اور وہ لغزش مستانہ جو خمریات جگر کے لباس میں جلوہ گر ہوئی۔ نقالوں نے اس ردیف و قافیہ میں بھی طبع آزمائی شروع کی۔ جگر کا طرز شعر خوانی بہتوں نے اُڑایا۔ کچھ لوگوں نے تو ہلکی سی موسیقی کی بھی آمیزش کر لی۔ بعض بد مستی کو ہی شعریت کا مترادف سمجھ بیٹھے۔

گر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

آج تک جگر جگر ہے دگر، دگر ہے۔"

جگر کی زندگی کی داستان جد و جہد کی داستان ہے۔ خاندان شرفا کا تھا اور مستقبل کا حال تو مستقبل کا مورخ لکھے گا۔ لیکن اب تک علی العموم شرافت اور دولت میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ مستثنیات بھی ہیں۔ لیکن جگر مستثنیات میں نہیں تھے۔ جوانی کا حصہ عینک کے کاروبار میں گزرا۔ یہ کاروبار بھی سفری قسم کا تھا۔ اتر پردیش (جسے اس وقت یو پی یا ممالک متحدہ آگرہ اودھ کہتے تھے) کے مشرقی اضلاع میں شرفا کی بستیاں پھیلی ہوئی اور ان میں اکثر علم دوست تھے۔ جگر ان بستیوں کا چکر لگاتے اور عینکیں بہ قیمت اور شعر و سخن بے معاوضہ ان شرفا تک پہنچاتے رہتے تھے۔ خود کنواں کھودنا اور پیاس بجھانا یہ مردانہ کا تھا۔ اور جگر مرادآبادی نے اسے پورے خلوص سے انجام دیا۔

لیکن یہ تجارتی کاروبار جگر کے بس کا روگ نہیں تھا۔ نوجوان جگر کے دل

جس کے وہ ہر طرح مستحق تھے!

جگر کا نام لیتے ہی کئی ادیبوں کے نام ذہن میں بہ یک وقت آتے ہیں سلیمان ندوی، سہیل، احسان اور رشید احمد صدیقی۔ ان کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انھوں نے گدڑیوں میں دبے ہوئے لعل کو پہلی ہی نظر میں پرکھ لیا اور پھر اس قیمتی پتھر کے لئے وہی کیا جو جوہر شناس جوہری کو کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن جس ہستی کا نام جگر کے نام کے ساتھ لازم و ملزوم ہو گیا ہے وہ اصغر گونڈوی تھے وہ ہم پیشہ و ہم فن ہی نہیں تھے۔ پیر طریقت بھی تھے۔ انھوں نے جگر کو اپنے گوشۂ دل میں جگہ دی۔ وہ روکتے، ٹوکتے، سمجھاتے، سنبھالتے، خطروں میں سپر ہوتے اور مشکلوں میں شریک تالیب کی طرح کام آتے رہے۔ لیکن بزم شعر میں برابر کے رفیق بن جاتے تھے۔ جگر نے بھی انتہائے عقیدت میں اُن کے لئے سب سے بڑی ——— محبت کی ——— قربانی دیدی

ہر شخص کی زندگیوں میں راز ہوتے ہیں۔ جگر کی زندگی میں بھی تھے۔ ان رازوں کا جاننے والا اب رشید احمد صدیقی اور احسان احمد بیگ احسان کے علاوہ شاید ہی کوئی اور رہ گیا ہو۔ یہ راز بھی جگر کی زندگی کی طرح دلفریب ہیں اور شرافت کی ثقافتی لطافتوں کی طرح لطیف! لیکن یہ رازداں بھی شرفا کی رازداریوں کے آداب سے واقف ہیں اس لئے اسی کا امکان ہے کہ یہ راز راز ہائے سینہ ہی رہ جائیں گے۔ البتہ اس کا ڈر ضرور ہے کہ جن لوگوں نے میری طرح اڑتی پڑتی سن لی ہے۔ کہیں وہ افراد سے تحت شعور کے تجزیہ کا کام نہ لینے لگیں ——— لیکن میں بھی زبا کون سا قاضی ہوں کہ خواہ مخواہ شہر کے اندیشے سے

دُبلا ہو جاؤں!

ہاں، تو بات جگر کی ابتدائی شاعری کی ہو رہی تھی۔ بیسویں صدی کے پچھلے بیس برسوں میں کتنی ہی ادبی تحریکیں چلیں، قدیم و جدید کی بحثیں چھڑیں، ترقی پسندی و رجعت پرستی کی حدیں قائم کی گئیں، شاعری کا رخ بدل گیا، تنقید کے معیار تبدیل ہو گئے۔ لیکن جگر نے اپنی قوت بازو سے اپنے جو ہر ذاتی سے محفل ادب میں جو مستقل جگہ بنالی تھی وہاں سے انہیں اٹھانے کی کوئی ہمت بھی نہ کر سکا۔ الفاظ کی شکل میں مخالفتوں کے طوفان بہت اٹھے لیکن تاریخ ادب کے صفحات پر جگر کا نقش گہرا ہی ہوتا گیا۔ پوپلے منہ سے نکلی ہوئی پھونکوں سے زندہ ادب کے چراغ گل نہیں ہوا کرتے۔ متحدہ ہندوستان میں کراچی سے کلکتہ تک اور کشمیر سے راس کماری تک جگر کی پکار ہوئی ہے اور دھوم مچی ہے۔ تقسیم ملک کے بعد بھی یہ اقلیم محبت تقسیم نہیں ہو پائی۔ جس مشاعرہ میں بھی جگر پہنچ جاتے مشاعرہ لوٹ لے جاتے ع

میں چمن میں چاہے جہاں رہوں، مرا حق ہے فصل بہار پر

اکثر اہم عصر جگر کی اس کامیابی پر چیں بہ جبیں ہو کر یہ کہا کرتے تھے کہ لوگ جگر کے طرز خواندگی سے متاثر ہو کر "واہ واہ" اور سبحان اللہ کے شور بلند کرتے ہیں۔ مطالب پر نظر نہیں کرتے۔ لیکن یہ حضرات بھی چپکے چپکے جگر کے شعر گنگناتے اور کبھی کبھی ان کی نقالی کرتے پائے گئے ہیں۔ جگر کی شاعری میں جادو ہی وہ تھا جو سر پہ چڑھ کے بولتا تھا۔

جگر شروع ہی سے نوجوانوں کے محبوب شاعر رہے ہیں۔ اس کا سبب

ان کی آواز نہیں بلکہ ان کی غزل کا صحت مند لہجہ تھا۔ والہانہ محبت، سرمستی، عمل
ان کی غزلوں میں سبھی کچھ مل جاتا تھا۔ نوجوان دیوانہ وار جگر کے مشاعروں میں اُمنڈ
آتے۔ ان کے بجائے قیام پر مودب بیٹھتے، ان کی خدمت کے مواقع تلاش کرتے
آٹوگراف کاپیوں پر دستخط کراتے۔ ان کے لہجے کی نقل کرتے اور گلی کوچوں
میں کھیل کے میدانوں میں، سفر کے ہنگاموں میں، ان کے اشعار موقع و محل کے
اعتبار سے گاتے یا گنگناتے۔ جگر محبت، مستی اور جوانی کے سب سے بڑے
نمائندے تھے اور نوجوان ان کی چشم و ابرو کے اشاروں پر چلنے کو فخر سمجھتے
تھے۔ اس مریدی کے لئے یہ بیعت ضروری تھی نہ طریقت کی پیروی۔ بہت سے
صوفی صافی ہو گئے۔ اور اکثر پیر مغاں کی بیعت کر بیٹھے جگر وہی تھے لیکن
جس کا جیسا ظرف تھا اس نے ویسا ہی جگر سے حاصل کیا!

جگر کی اس عام مقبولیت میں ظاہری رکھ رکھاؤ یا ظاہری حلیہ کو دخل نہیں
بلکہ جو جگر کے کلام سے ان کے ظاہر کا اندازہ لگا کر جگر کو پہلی بار دیکھتا تو اسے
پہلی نظر میں شاید مایوسی ہی ہوتی۔ بیسویں صدی کے مشہور اردو شعرا میں خالص
ہندوستانی رنگ۔ گرم استوائی سورج کی تیز آنچ میں پختہ کیا ہوا رنگ۔ غالباً
صرف دو شاعروں کو ملا تھا ——— آرزو لکھنوی اور جگر مرادآبادی۔ جگر کے چہرے
پر چیچک کی گلکاریوں نے اس رنگ کے ساتھ وہی کیا جو سہاگہ سونے کے
ساتھ کرتا ہے اور نتیجہ وہی ہوا جو کڑوے کریلے کے نیم چڑھنے کا ہوتا ہے
گھنی فرنچ داڑھی نے بھی کوئی خاص فرق پیدا نہیں کیا۔ لمبا قد۔ چوڑی دار
پاجامہ، "بالدار" ٹوپی، قدرے ڈھیلی شیروانی۔ اوپر کے جیب میں چشمے کا خانہ

نیچے کے جیبوں میں پوری کائنات ـــــ سگرٹ۔ دیا سلائی۔ پانوں کی ڈبیہ چھالیئے کا بٹوہ وغیرہ! اس ظاہری حلیہ کی نوعیت ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے لیکن جگر کے ظاہری حلیہ کا سب سے تنگ نظر نقاد بھی یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر یہ ریگستان ہی ہے تو اس ریگستان میں بھی دو بہت ہی خوشنما نخلستان ہیں۔ جہاں پہنچ کر انسان سارے ریگستانوں کو۔ تلووں میں چبھتے ہوئے کانٹوں تک کو بھول جاتا ہے۔ یہ نخلستان ہیں۔ جگر کے لمبے بال اور ان کے ہونٹوں کی معصوم ہنسی! بالوں کا ایک حصہ تو بچے کی طرح اصغر گونڈوی سے انتہائی ارادت کی ترجمانی کرتا رہتا ہے۔ لیکن دوسرا حصہ وہ ہے جو ٹوپی کے کناروں سے راستہ نکال کر پیشانی کے ایک گوشے اور چہرے کی رونق بڑھاتا اور شعر پڑھتے وقت بار بار بکھرتا رہتا ہے۔ خود جگر کو اپنے بالوں سے کافی شغف ہے۔ اکثر میں نے انہیں دیر دیر تک مصروف آئینہ و شانہ دیکھا ہے۔ اس معاملۂ خاص میں وہ ٹیگور کے متبع ہیں۔ اس عظیم ایشیائی شاعر کو بھی اپنے بالوں سے عشق تھا! ـــــ اور وہ معصوم مسکراہٹ جو ان کے بڑھتے ہوئے سن کو جھٹلاتی اور ان کے ظاہری حلیہ کے گرد نور کا ہالہ بناتی رہتی ہے جو بہت ترقی کرتی ہے تو ہنسی بنتی ہے لیکن قہقہہ نہیں بن پاتی۔ ایک چھتنار درخت کی گھنیری چھاؤں ہے۔ جہاں بچے کھیل سکتے ہیں اور تھکے ہوئے مسافر چین کی نیند سو سکتے ہیں۔ جیسے پہاڑ کے نیچے پڑے ہوں اور ہمالیائی چشمے قلقاریاں مار رہے ہوں۔ تب ہے کچھ ایسی ہی بات" جگر کا نام آتے ہی طرفِ چمن، خرام یاد کرنا

اور جوشِ بہار وغیرہ کا خیال آنے لگتا ہے۔ اس وقت ان کا ظاہری حلیہ پس منظر میں چلا جاتا ہے اور جوانی، حسن اور مستی کی چلتی پھرتی تصویریں نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہیں۔ کہیں واعظوں کی پگڑیاں اچھلتی ہیں۔ کہیں دیوانۂ جستجو دشت و جبل میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ کہیں شیشوں میں برق چمکتی ہے۔ کہیں گریبانوں کے قریب دھواں اٹھتا ہے اور کہیں حسن کا شعلۂ جوالہ نیا طور بنا لیتا ہے۔ ان مناظر کے روبرو جگر خاموش تماشائی نہیں رہتے بلکہ وہ یہ آگ خود لگاتے ہیں، غریب واعظ کو اس کی تضحیک کے لئے خود محفلِ رنداں میں گھسیٹ لاتے ہیں اور پھر شیشوں کو کنپٹی سے ٹکرا دیتے ہیں

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ
میں اپنا شیشہ اٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا

ویسے تو جگر کی شہرت ان کی شاعری ہی کی بدولت ہے لیکن اس میں ان کی رندانہ سرمستی کو بھی کافی دخل ہے۔ اگرچہ اب یہ قصہ پارینہ ہے لیکن سننے اور سنانے کی چیز ہے۔ جگر فطرتاً بےحد جذباتی ہیں۔ محبت ہو یا شاعری و رندی۔ ہر معاملے میں انھوں نے یہی سیکھا ہے کہ اپنے سارے وجود کو ایک ناقابلِ تسخیر جذبے کے سپرد کر دینا اور پھر بالکل بےنیاز ہو کر تمام حسابِ کم و بیش کو بھول جانا تھا چنانچہ رندی کے معاملہ میں بھی وہ پابندِ پیمانہ نہ رہ سکے بلکہ اکثر و بیشتر افراط کی سرحدوں کو چھو آئے۔ جب انھوں نے آستانۂ رندی پر بستر کھول دیا تو نہ قاضیِ شہر کا اندیشہ رہا نہ محتسب کا!

محتسبوں کی کمی نہیں تھی۔ عام مذہبی اور معاشرتی احتساب کے علاوہ

مخصوص دوستوں اور خاندان والوں کا خصوصی احتساب بھی تھا اور ان کے پیر طریقت اصغر گونڈوی کا خاموش احتساب تو انہیں زندگی بھر اندر گھلاتا رہتا تھا۔ کیونکہ وہ محتسب ہی نہیں گوشۂ اماں اور جائے پناہ بھی تھے۔ نگاہوں کے بہک جانے اور دل پر چوٹ کھانے کے بعد، زندگی کی بدمستی کے طوفان اٹھانے کے بعد، جب جگر سنبھلتے تو بزم اصغر کے ایک گوشے میں نہایت سعادت مندانہ اور معصومیت مندانہ انداز میں ملول و سنجیدہ، سرنگوں، شرمندہ، بیٹھ جاتے اور اصغر کی درد مند نگاہیں اٹھ کر جگر کے زخموں پر پھاہا رکھتیں۔ سرمست آزادہ رو، بے باک جگر خاموش، مودب اور رتبہ شناس پجاری کی طرح اپنے کو اصغر کی محبت بھری آنکھوں کے حوالے کر دیتے۔ غالباً ایسے ہی کسی لمحے کی عکاسی اس شعر میں کی ہے ؎

اے محتسب تمام مری ہر خطا معاف میں تمنائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

جگر کی زندگی کے افسانے عام ہیں۔ سرور سے خمار تک کی تمام کیفیتوں کے دیکھنے والے ابھی زندہ ہوں گے۔ جب وہ پیتے تھے تو باصرار و باتکرار پیتے تھے اور جب چھوڑی تو ہمیشہ کے لئے چھوڑی۔ یا وہ بے اختیاری و مجبوری اور یا یہ قوت ارادی! انسان کی زندگی بھی کتنے تضادوں سے بنتی ہے! لیکن یہی تضاد جگر کے مے خواری کو غالب کی شراب نوشی سے ممتاز کرتا ہے شراب حرام ضرور ہے۔ لیکن شراب اور شراب میں فرق ہوتا ہے۔ فقیہ کے خوف سے یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ حرام اور حرام میں بھی فرق ہوتا ہے۔ غالب نے بھی پی۔ قرض کی، رؤسا کے روپیوں کی پی، گاڑھی کمائی کی پی۔ لیکن ہمیشہ دوسروں

یہی بتایا کیے کہ انھیں دن رات ایک بے خودی چاہیئے۔ ان کی میخواری منظم اور باترتیب تھی۔ جگر جب پیتے تھے تو کوئی "شاہد خیال" ان کے سامنے آجاتا تھا۔ وہ قرض کی پی رہے ہوں، کسی دوست سے کر پی رہے ہوں یا ان کے دوست انھیں زبردستی پلا رہے ہوں: "شاہد خیال" کی موجودگی ان کی شراب سے اگر جرأت گناہ نہیں، تو لذت گناہ تو ضرور چھین لیتی تھی۔ انھوں نے شراب کو ہمیشہ اپنے کیے کی سزا اور عمل کی پاداش سمجھا۔ ان کو شراب پی کے اچھلتے، کودتے، شور و غل مچاتے کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ وہ تو کچھ اور کھو جاتے تھے۔ بجھ جاتے تھے۔ نہ ان کے لبوں تک کوئی ناشائستہ جملہ آیا اور نہ کبھی کوئی نازیبا حرکت ظہور میں آئی۔ ان کی اس کیفیت سے ان کے نام نہاد دوست پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔ خوب پلاتے اور پلا پلا کے شعر سنتے اور جب غزلیں سنانے کی کیا بولنے تک کی سکت باقی نہ رہ جاتی تو اس نیم مردہ شرابی کو یکہ پر لاد کر اصغر کے یہاں پہنچا جاتے۔ اسے غالب کی رندی سے کیا نسبت، یہ تو رندی کا نوحہ اور زندگی کا ماتم تھا اور نوحہ و ماتم میں تنظیم و ترتیب کہاں!

جگر ہمیشہ سے بڑے مذہبی تھے لیکن ویسے نہیں جیسے ملائے مسجد ہوتا ہے جگر کی مذہبیت اعلیٰ ثقافتی اور اخلاقی اقدار کی مذہبیت ہے۔ جس پر تصوف کا چوکھا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ پتہ نہیں کہ وہ رندی کے ایام شباب میں بھی توبہ کا قصد کرتے تھے یا نہیں۔ لیکن مدت تمام سے معافی مانگنے کا ثبوت تحریری موجود ہے۔ آخر ایک قوی ارادے کے ساتھ انھوں نے توبہ کرلی۔ یہ وہ کسی کو کیوں بتاتے کہ انھوں نے توبہ کیوں کی۔ لیکن کی اس طرح کہ نہ صرف خراباتی بلکہ زاہدان

مثالی بھی ہو چیرت رہ گئے۔ جیسے اردو کی رہتی دنیا تک ان کی لغزش مستانہ کا افسانہ رہ جائے گا ویسے ہی ان کی توبہ، ان کی قوت ارادی اور استقلال مزاج کی کہانی بھی یاد رہے گی۔ آج کل جگر جہاں جاتے ہیں وہاں غیر سرکاری طور پر نشہ بندی کا پرچار خود بخود ہونے لگتا ہے۔ گویا وہ امتناع مے نوشی کا چلتا پھرتا اشتہار بن گئے ہوں!

جگر کی مے نوشی کے بڑے چرچے رہا کئے ہیں اور اسی وجہ سے بعض اوقات لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ درحقیقت رندی کے نہیں محبت کے نغمہ گو ہیں۔ رندی کے ذکر کے باب میں تو آپ کو یہ گمان بھی گزر سکتا ہے کہ مشاہدہ حق کی گفتگو ہو رہی ہے لیکن محبت کا ذکر وہ کچھ اس والہانہ طور پر کرتے ہیں کہ تصوف کے اشارے بھی مادی فضاؤں میں گھل جاتے ہیں۔ اگرچہ جگر کی محبت اسی دنیا کی۔ عالم آب و گل کی محبت ہے لیکن وہ محبت کو لباس جسم میں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ ان کی عورت عفت و حیا ہی کا مجسمہ نہیں ہے بلکہ وہ عشق کی دنیا کی غیر مجسم حقیقت ہے اسی لئے ان کے اشعار کا تیکھا پن اسی وقت زیادہ بے پناہ ہو جاتا ہے جب وہ فراق و مہجوری کے گیت گاتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ فراق جسمانی ان کے جذب شوق میں اور شدت پیدا کرتا ہے اور کوہکنی اور دشت نوردی کی صلاحیتیں بڑھا دیتا ہے۔ ایک مجروح بے قرار دل، انھیں ملا ہے تو منزل بھی انھیں بے تک نہیں پائی۔ دوری میں وہ قرب چاہتے ہیں۔ محبوب کے بغیر دنیا کی ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتے ہیں۔ لیکن ان کے عشق میں جسمانی آسودگی نہیں ہے،

ان کا محبوب آنکھیں ملاتا ہے، اس کی پلکوں پر محبت کے موتی لرزتے ہیں۔ دونوں
طرف ایک آگ لگی ہوئی ہے لیکن دونوں عائد کردہ "قیود و رسوم" سے مجبور ہیں
جگر نے یقیناً محبت کی ہے اور محبت برتی ہے۔ چوٹ کھائی ہے اور تڑپے
ہیں جب حالات نے انھیں حسن کے قریب دکھا جب بھی اور جب اس سے
قتی طور پر جدا کر دیا تب بھی۔ اُن کے دل میں محبت کی چنگاریاں اڑتی رہیں،
یہ چنگاریاں خاکستر کی چنگاریاں نہیں تھیں جو اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہیں بلکہ
یک آواز کے ساتھ چٹخ کر فضا میں بکھر جانے والی چنگاریاں تھیں جن کی چمک
ور گرمی نہ صرف جگر نے بلکہ ان کے ہر ایک ہم عصر نے محسوس کی ہے اور اسی
لے جگر کو جگر بنا دیا۔ حالات بھی بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ انھوں نے عمر کی
ھلتی بہاروں میں فراق کو وصال اور مہجوری کو دلداری سے بدلتے دیکھا
ی۔ عالم میں محبت کا سنجیدہ ذوق سر تا پا عرفانِ طریقت ہو گیا۔

عام زندگیوں کی طرح جگر کی زندگی بھی کئی ادوار میں تقسیم ہے۔ لیکن جگر کی
تا د طبع کی یکسانی سنے۔ ان کے بابایاں بلکہ غلط انداز خلوص نے انھیں
تعات و حالات کے ہاتھوں میں کھلونا بنا دیا۔ بڑھ بڑھ کے بات کرنے
بات اور ہے۔ ورنہ ہم میں سے اکثر کم سے کم تفاوت کا راستہ اختیار
تے ہیں۔ اگرچہ وہ اس صورت حال سے مطمئن بھی نہیں ہوتے، جگر کھلونا
کر بچوں کی طرح خوش ہوتے ہیں۔ لکھنؤ کے کشمیری بھانڈ جس تعلقہ دار کے
ل تقاریب وغیرہ میں جاتے تھے تو خود اس تعلقہ دار پر چوٹیں کرنے
ے باز نہ آتے تھے اور اپنی اس احسان شناسی پر مزید انعامات پاتے تھے،

لکھنؤ کے شہد سے آج بھی ایسے شیریں لب ہوتے ہیں کہ لوگ اُن کی گالیاں
کھا کے بے مزہ نہیں ہوتے بلکہ وہ پھولوں سے منہ بند کرتے ہیں۔ اگر آپ کو ان
صاحبانِ فن سے خلوص نہ ہو تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ انھیں کچھ دیتے
ہیں وہ "بہ لقمہ دوختہ بہ" کی پالیسی پر عمل کرتے ہیں۔ لیکن یہ فن کاروں، رندوں اور دل والوں
ہی سے ناانصافی ہوگی۔ جاگیرداروں اور نوابوں کی یہ پرانی ادا ہے۔ کہ "گاہے
بہ دشنامے خلعت دہند" کہتے ہیں کہ داد و دہش کے لئے بہانہ چاہیے
اور اچھی باتوں کے لئے بھی بہت سے بہانے مل جایا کرتے ہیں۔ جگر بھی
کچھ ایسا جاگیردارانہ مذاق رکھتے ہیں۔ لوگ خلوص و احترام کے نام پر انھیں ہر
طرح کا فریب دے سکتے ہیں۔ اور منہ مانگا انعام پا سکتے ہیں۔ خلوص کے
ہاتھوں میں وہ بہت خوش نما کھلونا ہیں۔ چاہے یہ خلوص نمائشی ہی کیوں نہ ہو۔

دوستی کے معاملہ میں جگر دیر پسند ہیں۔ رسمی ملاقاتوں کو وہ دوستی
نہیں سمجھتے۔ دوستی کا اعتبار دینے میں وہ جلدی نہیں کرتے لیکن جو لوگ
ان کے مزاج کو پہچان گئے ہیں وہ تھوڑا انتظار بھی کر لیتے ہیں۔ جب وہ
دل سے مل گئے تو انھیں تن من دھن سب کچھ نثار کر دینے میں عار نہیں
کبھی کبھی تو طلب کا اشارہ بھی ضروری نہیں ہوتا۔ وہ زبانِ حال کا تقاضا
سمجھ کر ہی "بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا" کا ورد شروع کر دیتے ہیں۔ اس مرحلہ جگر
کا اعتماد حاصل کرنے کا ہے۔ اگر کسی نے ایک بار یہ منزل طے کر لی تو پھر
جگر کو فریب دے لینا کتنا آسان ہے! فریبیوں کو جگر کا دل موہ لینے کے
لئے شروع ہی میں کافی ریاض کرنا پڑتا ہے۔ جہاں جگر پرخلوص راہ میں

نمائشی خلوص بھی شامل ہے) کے مسمریزم کا اثر ہوا پھر ان کو "نقصان مایہ"
اور "شماتت ہمسایہ" میں کسی ایک کا یا دونوں ہی کا نشانہ بنا لینا آسان ہی
نہیں بہت آسان ہو جاتا ہے۔ ایسے عمل سفلی برتنے والے کو آپ کچھ ہی
کیوں نہ کہیں لیکن جگر کو ایسے پُرخلوص فریبوں میں بڑا مزا ملتا ہے۔

کوئی فریب ہمیشہ نہیں چلتا۔ ایک نہ ایک دن بھانڈا پھوٹتا ہے۔ جگر بھی
فریب سے واقف ہو جاتے ہیں، لیکن اسے دوسروں سے چھپاتے ہیں
اور اگر دوسرے ان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ فریبی کی سرزنش کیوں نہیں
کرتے، تو بڑی سادگی بڑے بھولے پن سے کہتے ہیں کہ "کہو لوگ کیوں کر" یا اس
کی طرف سے یہ معذرت بھی پیش کر دیتے ہیں کہ "صاحب غرض، مجھ سے حیا
کے مارے صاف بات نہ کر سکا ہو گا" الا کلا یا تو دکھتی رگ پر ہی نہیں سکتا
جان بوجھ کر فریب کھانے کو انھوں نے فنون لطیفہ کی سرحد تک پہنچا دیا۔ اگر
کوئی مخلص دوست انھیں زیادہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے تو خود اس کا
خلوص مشکوک ہو جاتا ہے۔ اگر ایسی شرافت نفس کوئی کمزوری ہے تو جگر میں
یہ کمزوری ضرور ہی ہے۔ یہ کمزوری اُن کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے
ہیں۔ جس ماحول میں انھوں نے آنکھ کھولی، جن آغوشوں میں پرورش پائی
جن مکتبوں میں زانوئے تلمذ تہ کیا وہاں شرافت، مروت، خلوص و عیب پوشی
کو "جاگیردارانہ" اقدار کی بڑی عزت تھی۔ شرفا ان اقدار کو اپنی سب سے
بڑی جاگیر سمجھتے تھے۔ آج زمانہ بدل چکا ہے، بدل رہا ہے لیکن اگر زمانہ اپنی
خوئے تغیر نہیں بدلتا تو جگر اپنی وضع شریفانہ کیوں بدلیں؟ وہ تو ایسے

وضعدار ہیں کہ نوجوان ان کی طرف انگلیاں اٹھاتے ہیں اور بزرگ کہتے ہیں
کہ اس طرح کے بندے اب خدائی میں چند ہی رہ گئے ہیں!

جگر کبھی درباروں سے وابستہ نہیں ہوئے۔ اس کا ایک سبب غالباً یہ بھی
ہے کہ ان کے مزاج میں اکثر امیرانہ خصائص نے گھر کر لیا ہے۔ نازک مزاجی
بھی انہیں خصائص میں سے ایک ہے۔ ویسے وہ بڑے حلیم، بڑے بردبار،
بہت نرم، بہت خاموش ہیں۔ لیکن وہ ایسی کوئی بات گوارا نہیں کرتے ہیں
جسے اپنے مرتبہ سے گری ہوئی سمجھتے ہوں۔ وہ بات بات پر نہیں اینٹھتے وہ
اپنے فن کی عظمت کا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کوئی امیر وقت اگر [illegible] شہر
جگر تک پہنچنے کے لئے اس کو فن دوست اور علم پرست ہونا ہوگا۔ ورنہ جگر کی
اس سے نبھ نہیں سکتی۔ جن [illegible] سے آزادی لینے کی کوشش
کی وہ پچھتا [illegible] اور جب [illegible] وہ سختی پر ٹھہرے!

ابتدائی زمانہ مالی دشواریوں میں گزرا اب قدرے فراغت ہے لیکن
ایک مشاعرہ ہی خاطر خواہ آمدنی ہے پھر کتابوں کی رائلٹی سے مل جاتا ہے
یہ رقم ان کے مختصر سے خانگی اخراجات کو کفایت تو کر سکتی ہے لیکن مہمان نوازی
سے شغف، دوستوں اور حاجت مندوں پر نوازش اور قرابت داروں پر
عنایات کا سلسلہ بھی بدستور جاری ہے۔ متاع دنیا سے ان کے پاس صرف
ان کا بنوایا ہوا ایک گھر ہے۔ یہ گھر انھوں نے گونڈے میں بنوایا ہے۔ بڑے
شہروں کا خرچ نہیں ہے اور بہت ہی مختصر سا خاندان ہے۔ لیکن سنا ہے کہ
حساب کتاب برابر ہی رہتا ہے۔ اس لئے جب تک ہاتھ پیر چلتے ہیں اور

مشاعروں میں شرکت کرنے بھر صحت درست ہے تو یہ گاڑی چل رہی ہے۔ اگرچہ صرف اس گاڑی کو چلاتے رہنے کے لئے انہیں اپنی صحت سے کھیلنا پڑتا ہے اور قلبی تکالیف کے باوجود مشاعروں میں دور دور تک جانا پڑتا ہے لیکن جگر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا نہیں سکتے۔ ان کے لئے روپیہ اسی وقت تک چمکتا ہے جب تک وہ گاڑھی کمائی کا روپیہ ہو۔ وہ روپیہ حاصل کرنے کے لئے آن بان کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

جی تو نہیں چاہتا تھا کہ متفرقات کا بھی تذکرہ کروں، لیکن باتیں ذہن میں امنڈتی چلی آ رہی ہیں۔ انھیں میں ان کا لباس ظاہری بھی ہے۔ جی ہاں وہی ڈھیلی شیروانی چوڑی دار پاجامہ وغیرہ! میں یہ کہنا بھول گیا تھا کہ وہ اکثر شاعروں کے مقابلے میں جگر کپڑے اچھے پہنتے ہیں۔ "اکثر" اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ساغر نظامی کی نوک پلک کو نہیں پہنچ پائے ہیں۔ کپڑوں کے علاوہ اچھے کھانے سگرٹ، پان اور تاش کا بھی شوق ہے۔ تاش کا شوق تو عشق کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ تاش کے کھیلوں میں "رمی" سے ربطِ خاص ہے۔ کھیلنے بیٹھتے ہیں تو گھنٹوں کھیلتے رہتے ہیں۔ اگر مجمع مزاج کے موافق ہو تب ہی کھیلتے ہیں اور اکثر کافی رات گئے تک گرد و پیش سے بے خبر ہو کر کھیلتے رہتے ہیں۔ بیچ بیچ میں جملے بھی چست کرتے جاتے ہیں اور ہنستے ہنسانے رہتے ہیں وہ خاموش کھلاڑیوں میں نہیں ہیں۔ پورے جوش و خروش سے کھیل میں حصہ لیتے ہیں اور اس فضا میں جذب سے ہو جاتے ہیں۔

لاابالی پن بھی اُن کی خاص ادا ہے۔ مشاعروں وغیرہ کے سلسلے میں انہیں

اکثر سفر کرنا پڑتا ہے لیکن اپنی بے پروائی کی بدولت ہر سفر میں کچھ نہ کچھ کھو آتے ہیں۔ اب تک نہ جانے کیا کیا کھو چکے ہوں گے اور کیا کیا مخلصین ریاکار کو بخش چکے ہوں گے۔ لیکن "حساب دوستان در دل" ہے اور نگارندہ سطور را با فضولی چہ کار!

جگر اب رند نہیں، عاشق مہجور نہیں مگر اب بھی شاعر، تاش نواز، ظرافت دوست اور دوست پرست ہیں۔ مذہب شناس پہلے بھی تھے اب عبادت گزار بھی ہیں۔ کل تک صرف رونق بزم تھے اب رونق محراب بھی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یا تو جگر کو کوئی ایسی کھوئی ہوئی چیز واپس مل گئی ہے جس کی انھیں مدتوں سے تلاش تھی اور یا انھوں نے کوئی ایسی پائی ہوئی چیز کھو ڈالی ہے جس کا تعلق ظاہر سے کم اور باطن سے زیادہ ہے۔ بہر حال ایک فرق ضرور نمایاں ہے۔ جو اُن کی زندگی اور کلام دونوں کو حاوی ہے اور جو ان کی زندگی کے اہم پہلو کا ترجمان ہے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اُن کی رندانہ، عاشقانہ یا عارفانہ اداؤں میں سے کسی ادا نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ وہی بے پروائیاں، وہی جنونِ شوق، وہی وفا کوشی، وہی گداز روح آج بھی ان کی سب سے ممتاز خصوصیتیں ہیں۔ آج بھی نہ رہ بجوں آنوں پائیوں میں الجھتے ہیں اور نہ تسبیح و جبہ و دستار کو نفسِ عبادت سمجھتے ہیں۔ روح و دل کی دنیا میں اب ایسے "پراگندہ طبع لوگ" کتنے رہ گئے ہیں!

فکر و فن

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

جگر کا غزل پر احسان

حالی اردو شعر و شاعری کے مجدد ہیں. لیکن تغزل کی تجدید جن کی فنکاری کی مرہون احسان ہے وہ حسرت. اصغر. فانی اور جگر ہیں. ان میں ہر ایک اپنے رنگ میں منفرد اور اسلوب و آہنگ کے اعتبار سے ایک مستقل شخصیت کا مالک ہے لیکن جو مقبولیت اور ہر دلعزیزی اور پھر ساتھ ہی عظمت اور گیرائی جگر کو حاصل ہوئی وہ انھیں کے ساتھ مخصوص تھی۔ ایک شخص جب عام خاص میں اپنوں میں اور پرایوں میں محبوب و مقبول ہو اس کے متعلق کسی خاص صفت اور کمال کی نشاندہی کر کے یہ بتانا مشکل ہوتا ہے کہ اس کی محبوبیت اور ہمہ گیر شہرت کا دارومدار اس پر ہے۔ لوگوں کا ذوق اور پسند کا معیار مختلف ہوتا ہو اس لئے اگر ایک شخص سب میں مقبول ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں ایسی جامعیت اور ہمہ گیری پائی جاتی ہے کہ ہر شخص اور ہر گروہ نے اس کو اپنے اپنے معیار پسندیدگی پر جانچا اور وہ اس پر پورا اترا، اس میں دخل جہاں اس کے فنی کمال کو ہوتا ہے۔ اظہار فن کے پیرایہ کو اس کے ذاتی اخلاق و عادات کو اور اس کے بعض اور شخصی کمالات کو بھی ہوتا ہے۔ ایک نقاد کی نگاہ میں اگرچہ ان میں سے ہر چیز ایک دوسرے سے الگ اور جدا ہوتی ہے لیکن

جہاں تک مقبولیت اور شہرت کا تعلق ہے یہ سب چیزیں الگ الگ نہیں ہوتیں بلکہ ایک کو دوسرے سے مدد پہونچتی ہے۔ جگر کا حال بھی یہی ہے۔ ان کا تغزل اس کے ساتھ ایک نہایت دلآویز ترنم ان کی رندانہ ادابیت اور استغنا خلوص ہمدردی اور عمخواری یہ وہ اوصاف ہیں جن کے عناصر سے جگر کی محبوب شخصیت کا پیکر تھا۔

حسرت کے تغزل کا رنگ بہت پاکیزہ نکھرا ہوا۔ اور حسن وعشق کی دقیق نفسیات کا آئینہ دار ہے۔ اور اس لئے شہنشاہ تغزل کا خلعت فاخرہ ان کی شاعری کے قد و قامت پر راست آتا ہے۔ اصغر اور فانی کا تغزل بھی بہت بلند اور اعلیٰ قسم کا ہے۔ لیکن ان دونوں کے کلام میں دقت خیال دقت اسلوب اس طرح ہم رشتہ ہیں کہ ایک عیانہ شعر سکر جو کیف اور وجد طاری ہو جاتا ہے وہ نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اصغر اور فانی دراصل خواص کے شاعر ہیں عوام کے نہیں وہ حسن وعشق کے مضامین بھی بیان کرتے ہیں تو ان میں فلسفیانہ عمق خیال پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر اصغر تو کبھی عوام کے شاعر ہوتے ہی نہیں فانی کو عوام میں جو کچھ مقبولیت ہوئی وہ "دیکھتے جاؤ" والی جیسی چند غزلوں کی بدولت ہوئی جن کو ارباب نشاط میں بڑی مقبولیت تھی۔ جگر کا معاملہ اس کے برعکس ہے ان کے ہاں بھی دقت نظر اور عمیق مشاہدہ کی کمی نہیں ہے۔ لیکن ان کا آہنگ اور اسلوب ایسا ہے کہ ایک عمیق حقیقت بھی عریاں ہو کر سامنے آجاتی ہے اور سامعین پر سکر کی سی کیفیت طاری کر دیتی ہے جگر کے دام خیال میں فلسفیانہ حقایق جن کا ادراک شعور تحقیق و مطالعہ کا منت کش احسان نہیں ہوتا۔

بلکہ ان کا انعکاس فکر روشن اور دل بیدار پر خود بخود ہوتا ہے۔ بے تکلف ایسے ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ شعر و نغمہ کی زبان ہے۔ اسی سہولت کے ساتھ وہ دوسروں تک پہونچاتے رہتے ہیں مثلاً غم کا جیتے جی دم کے ساتھ لگا رہنا ایک ایسی حقیقت ہے جس کو اکثر شاعروں نے بیان کیا ہے۔ غالب نے کہا۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اسی کے لگ بھگ امیر کا شعر ہے۔

جب کہا میں نے شب غم کوئی غمخوار نہ تھا
درد نے اٹھ کے کہا کیا یہ گنہگار نہ تھا؟

لیکن جگر اسی مضمون کو بیان کرتے ہیں تو اس کے تیور ہی کچھ اور ہیں جس میں سادگی بھی ہے۔ سوز و گداز بھی ہے اور اثر آفرینی بھی ہے کہتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر دوست کوئی دوسرا ہوتا نہیں
سب جدا ہو جائیں لیکن غم جدا ہوتا نہیں

دوسرا مصرعہ تو اس درجہ بیساختہ اور رواں ہے کہ سنتے ہی فوراً یاد ہو جاتا ہے اور آدمی خود بخود اسے گنگنانے لگتا ہے۔ اس کے برخلاف غالب کے ہاں شعریت پر تفلسف غالب ہے اور مومن کے ہاں پر تکلف شوخی ہے جو سوز و گداز کے موقعے کے لئے مناسب نہیں۔ ہجر کے زہراب غم کو اکثر شاعروں نے بادۂ ناب وصل کے قرین ٹھہرایا ہے۔ ایک مشہور شعر ہے۔

کثرت شوق سے تھا ہجر بھی ہمرنگ وصال　　ہم نے لوٹے ہیں بہت تیری جدائی کے مزے

لیکن جگر کے یہاں حسن و عشق دونوں ایک دوسرے سے اتنے مرتبط ہیں کہ دونوں میں جدائی واقع ہی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کمال یکجہتی کی وجہ سے وہاں ہجر اور وصل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں۔

اللہ اللہ یہ کمال ارتباط حسن و عشق
فاصلے ہوں لاکھ دل سے دل جدا ہوتا نہیں

شاعروں نے عموماً شب فراق میں بیداری اور اختر شماری کا شکوہ کیا ہے لیکن جگر کے ہاں عالم ہی دوسرا ہے۔ نہیں فراق میں بھی نیند آنے لگتی ہے

شب فراق ہے اور نیند آئی جاتی ہے
کچھ اس میں ان کی توجہ بھی پائی جاتی ہے

عشق و محبت کی دنیا میں محبوب کے بغیر چین نہیں ملتا۔ لیکن جگر کو عشق کا ایک ایسا مقام بھی ملا ہے جہاں محبوب نہیں ہوتا لیکن دل میں بے چینی بھی نہیں ہوتی۔

یہ کیا مقام عشق ہے ظالم کہ ان دنوں
اکثر ترے بغیر بھی آرام آ گیا

ہماری شاعری میں رسم عاشقی کی تکمیل جنون کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی، دامن اور گریباں اگر تار تار نہ ہو۔ صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی نہ ہو تو وہ عشق پختہ نہیں ناقص و ناتمام ہے۔ لیکن جگر کے نزدیک جنون عشق کی واردات مسمی گر جیب و داماں کا چاک ہونا اس کی صرف ایک ادائے عامیانہ ہے جس سے خلوص کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔

مجھے چاک جیب و دامن سے نہیں مناسبت کچھ
یہ جنوں ہی کو مبارک رہ و رسم عامیانہ

جگر بنیادی طور پر حسن و عشق کے شاعر تھے لیکن انھوں نے روایتی طور پر ان کے گن نہیں گائے۔ بلکہ حسن کو بہت قریب سے دیکھا اور آزمایا ہے اس کی ایک ایک ادا کا گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ اس کو مختلف حالتوں میں جلوہ طراز پایا ہے۔ اور ہر جگہ انھیں ایک ماورائی نظر آیا ہے ــــ ایسا عالم جو اس عالم آب و گل سے ماورا ہے اور جہاں لطافت۔ نفاست اور دلربائی کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں ہے ــــ حسن کی طرح جگر کا عشق بھی افسانوی نہیں واقعی ہے۔ مجازی نہیں حقیقی ہے۔ دونوں مطلق ہیں مقید نہیں، لامحدود ہیں۔ زمین و آسمان کی وسعتیں ان کے دامن کا صرف ایک گوشہ ہیں چونکہ عالم کائنات کی ہر چیز انھیں دو سے فیضیاب وجود ہے اس لئے زندگی کی سب رعنائیاں۔ اس کے پیچ و خم نشیب و فراز۔ یہاں کی تاریکی اور روشنی۔ درد و غم۔ شادی و طرب یہ سب چیزیں اپنے اندر ایک حسن رکھتی ہیں۔ دلکشی اور رعنائی رکھتی ہیں۔ جگر ان میں سے ایک ایک چیز کا اس میں محو ہو کر تجربہ اور مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور اس میں حسن و عشق کی جلوہ سامانی ہی نظر آتی ہے۔

یہ فلک یہ ماہ و انجم۔ یہ زمیں یہ زمانہ
ترے حسن کی حکایت۔ مرے عشق کا فسانہ

محبت کم و بیش ہر شاعر ہی کرتا ہے اور حسن و عشق کے تجربہ و شعور سے

بیگانہ نہیں ہوتا لیکن ہر شخص کا اپنا اپنا ذوق اور نگاہ ہے۔ کوئی کسی نظر سے دیکھتا ہے اور کوئی کسی نظر سے اور ہر ایک اپنے ذوق و نظر اور حوصلہ و استعداد کے مطابق اس سے اثر قبول کرتا ہے۔ پھر تاثر کے مدارج و مراتب بھی مختلف ہیں۔ کسی کو زیادہ اور کسی کو کم پھر ان سب پر مستزاد یہ کہ اپنے تاثرات، محسوسات و مشاہدات کو بیان کرنے کی استعداد اور سلیقہ ہر ایک میں جدا جدا ہوتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے جگر کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو ان کا تغزل بڑا ابھرا ہوا، مکمل اور اس راہ کو ایک نیا سنگ میل نظر آتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جگر کا تصورِ حسن و عشق تدریجی مراحل ارتقا سے گذرنے کے بعد مکمل ہوا ہے۔ ان کا حسن رفتہ رفتہ ہلال سے بدر بنا ہے اور اس طرح ان کا عشق تجربہ و مشاہدہ کے خراد پر ایک عرصہ تک کسے جانے کے بعد مکمل ہوا ہے۔ وہ گویا اس راہ کے صوفی ہیں جو تمرین و ریاضت کے مختلف مرحلوں سے گذر کر صاحب معرفت بنتا اور حسن ازل سے ہم کنار و روشناس ہوتا ہے۔ غور سے پڑھا جائے تو جگر کے اشعار میں اس تدریجی ارتقا کی سب منزلیں الگ الگ صاف نظر آتی ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جگر کے ہاں تکرار یا بعض بعض اشعار میں سطحیت بہت زیادہ ہے۔ اس کی وجہ بھی دراصل یہی ہے۔ جب تک منزل مقصود سامنے نہیں آجاتی مسافر کے قدم میں استواری اور مضبوطی نہیں پیدا ہوتی۔ اسے بسا اوقات سراب پر آب کا اور صبح کاذب پر صبح صادق کا دھوکہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طرح کے دھوکوں سے جگر کے

اشعار بھی خالی نہیں ہیں۔ لیکن جگر کا یہ سفر نا تمام و نا کام نہیں رہا۔ انھیں در اصل اپنی منزل مل گئی۔ حسن نے بے نقاب ہو کر جگر کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور پکار اٹھا۔

"میں جگر کے واسطے ہوں اور جگر میرے لئے"

یہ مقام وہ ہے جہاں ہو کر منصور نے انا الحق کہہ دیا تھا۔ جگر بھی اس مقام پر پہونچے۔ لیکن شاید حق کی گفتگو کو بادہ و ساغر کے استعارہ میں کہنے کا بھلا ہو کہ انھیں وہ ابتلا پیش نہیں آیا جو منصور کو آیا تھا۔ منصور نے انا الحق کہا اور پکڑا گیا۔ اور جگر نے

جمال ان کا مزاج اپنا۔ غم ان کا زندگی اپنی
حیات حسن ہے گویا حیات عاشقی اپنی

کہا اور صاف بچ نکلے۔ حسن کے ساتھ غایت اتصال کا یہی فیضان تھا کہ وہ خود بھی حسین بن گئے تھے

تقسیم سے کئی برس پہلے کی بات ہے۔ ایک مرتبہ صبح کے وقت دفتر ہمایوں میں تشریف لائے اور "معلوم نہیں کیوں" والی غزل وہیں اپنے ہاتھ سے لکھ کر عنایت فرمائی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے خود ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چیز دیکھی تھی۔ اس قدر عمدہ اور پاکیزہ خط دیکھا تو میں نے کہا "اوہو! ماشاءاللہ آپ تو بہترین خطاط بھی ہیں"۔ فوراً بولے "میرے نزدیک وہ شخص کامل درجہ کا شاعر ہو ہی نہیں سکتا جس کا خط حسین نہ ہو"۔ میں اگرچہ ان کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ لیکن خود ان کی زبان سے اس کی تشریح سننے کی غرض سے میں نے

کہا ہیں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ ذرا وضاحت فرمائیے۔ اس پر انھوں نے
کسی قدر طویل تقریر کی جس کا حاصل یہ تھا: ہم قطرہ ہیں اور حسن دریا ہے
شاعر صحیح معنی میں وہی شخص ہو سکتا ہے جو اپنی ہستی کو قطرہ کی طرح فنا کر کے
دریا میں جذب ہو جائے۔ جب ایسا ہوگا تو اب اس کے ہر فعل میں۔ خیال میں
احساس میں بیان تک کہ اس کی ہر چیز میں حسن پیدا ہو جائے گا۔ اور اس
میں کوئی چیز ایسی نہ پائی جائے گی جو جمالیاتی ذوق پر بار گراں ہو۔ یہاں تک کہ
اس میں بد خطی بھی نہ ہونی چاہیئے۔ جگر کے فکر و فن اور قلب و ذہن پر حسن
کے اسی استیلائے عام و محیط کی کرشمہ سازی تھی جس نے جگر کی شخصیت میں
محبوبیت اور دلربائی پیدا کر دی تھی۔

اب حسن و عشق کے متعلق احساسات و تاثرات کے پیرایۂ اظہار کو دیکھیے
تو اس میں بھی جگر ایک بالکل منفرد نظر آتے ہیں۔ اشعار میں آورد بہت کم
اور بے ساختگی و آمد کا رنگ بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ وہ شعر کہہ نہیں رہے ہیں بلکہ شعر خود حسن و جمال صوری کے
سانچہ میں ڈھلے ڈھلائے ان کی طبیعت سے ابل رہے ہیں۔ ایک دریا ہے
کہ بیک اور خراماں بہتا جا رہا ہے۔ معنی اور تخیل جس قدر حسین ہیں الفاظ
اور فقرے بھی ایسے ہی حسین ہیں اور گویا عروس جمیل و لباس حریر کا
مصداق ہیں۔ فنی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اشعار میں صنعت ترجیع و سجع کی
منبت کاری جگہ جگہ پائی جاتی ہے۔ لیکن اس میں تشکایت یا تصنع کا دخل بالکل
نہیں ہے۔ جو کچھ ہے بے ساختگی کے ساتھ ہے اور اس میں بھی آمد کا رنگ ہے

الفاظ کی طلسم کاری جوش کے ہاں بھی کم نہیں ہے۔ لیکن دونوں کے لب و لہجہ میں وہی فرق ہے جو صبح کی نسیم جانفزا اور باد تند و تیز میں ہو۔ جگر کے ہاں معنی اور صورت میں ہم آہنگی ہے۔ الفاظ میں نرمی اور دلنشینی ہے اور جوش کے ہاں شوکت و صولت اور ہیبت و وقار ہے۔ جگر کے لہجہ میں خوددارانہ نیازمندی اور خودسپردگی ہے۔ اور جوش کے طرز تکلم میں بیباکی، لذت اندوزی اور کام طلبی ہے۔ اس لئے جہاں تک تغزل کا تعلق ہے جگر کے اشعار دل پر تیر و نشتر کا کام کرتے ہیں۔ اور اس کے برخلاف جوش کے شعروں سے سرور ضرور حاصل ہوتا ہے۔ لیکن قلب میں سوز کی وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ جگر کا شعر ہمہ نغمہ اور ہمہ موسیقی ہوتا ہے اس لئے ان کی زبان سے ادا ہوا اور سننے والے کے دل میں اتر گیا۔ ذرا ان اشعار کو دیکھئے۔ کون انھیں پڑھے گا یا سنے گا اور جھوم نہیں اٹھیگا

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کرلے، وہی فاتح زمانہ

یہ ترا جمال کامل، یہ شباب کا زمانہ
دل دشمناں سلامت دل دوستاں نشانہ

کبھی حسن کی طبیعت نہ بدل سکا زمانہ
وہی ناز، بے نیازی، وہی شان خسروانہ

تری دوری و حضوری کا ہے عجیب عالم
ابھی زندگی حقیقت ابھی زندگی فسانہ

جگر کی شاعری کی عمر خاصی طویل ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کا حاصل "شعلۂ طور" اور "آتش گل" صرف دو مجموعے ہیں جو کچھ ایسے ضخیم بھی نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے شعر محض برائے گفتن کبھی نہیں کہا۔ چنانچہ بعض اوقات پورا ایک برس گذر گیا ہے اور ایک دو غزلوں سے زیادہ نہیں ہوا ہے۔ اس بنا پر جو شعر نکلتا تھا "از دل خیزد بر دل ریزد" کا مصداق ہوتا تھا۔ انھیں خود بھی اس کا دعویٰ ہے۔ کہتے ہیں ؎

تکلف سے تصنع سے بری ہے شاعری اپنی
حقیقت شعر میں جو ہے وہی ہے زندگی اپنی
جگر رہ جائے آہ جو اک کاسۂ سائل
نہ ایسی شاعری اپنی نہ ایسی زندگی اپنی

اس مضمون کا مقصد کوئی تنقید کرنا نہیں ہے۔ بلکہ جگر کے تغزل کے بعض پہلوؤں پر کلام کرنا تھا۔ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ جگر نے اردو غزل کو بڑا نکھارا سنوارا اور وسیع کیا ہے۔ اردو شاعری کے موجودہ دور میں جب کہ غزل کا قافیہ تنگ ہو رہا تھا۔ جگر نے اپنی مسیحا نفسی سے اس کو اس درجہ ترو تازہ شگفتہ اور جوان بنا دیا ہے کہ اب اس کی بقا کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ اور بے شبہہ یہ کوئی معمولی اور کم لائق فخر کارنامہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

جگر اور جذبۂ عشق

جگر غزل کے شاعر ہیں۔ تغزل ان کی شاعری کی جان ہے۔ اس تغزل کی تشکیل مختلف عناصر سے ہوئی ہے۔ اس میں حسن اور احساس حسن ہے جمال اور ذوق جمال ہے۔ شوق اور کاروبار شوق ہے۔ جگر کی شاعری میں زندگی کے انھیں پہلوؤں کی تفصیل و جزئیات رمز و ایما کے پردے میں اپنے آپ کو رونما کرتی ہے۔ لیکن ان سب کی تان ان کے عشق اور تصور عشق پر جاکر ٹوٹتی ہے۔ اس عشق کو ان کے تغزل میں بنیادی حیثیت حاصل ہے وہ ان کی ساری شاعری پر چھایا ہوا ہے۔ ان کے یہاں حسن کا جو تصور ہے۔ محبوب کا جو خیال ہے، نشاط کا جو احساس ہے زندگی کو بسر کرنے کی جو خواہش ہے۔ اور اس کے نشیب و فراز کو سمجھنے کا جو شعور ہے۔ اس کا محور یہی عشق ہے۔ ان کے تمام خیالات۔ نظریات اور افکار و تصورات میں اس عشق کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی ہے۔ انھوں نے اس عشق کے بارے میں تو بے شمار باتیں کہی ہی ہیں۔ لیکن اس عشق کے پردے میں تو انھوں نے اس عشق کے علاوہ بھی نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ دیا ہے۔ اس صورت حال نے ان کے یہاں عشق کو زندگی اور زندگی کو عشق بنا دیا ہے۔

اردو غزل گو شاعروں میں جگر ہی ایسے شاعر ہیں جنھوں نے عشق کو
اتنی اہمیت دی ہے۔ محبوب ان کے نزدیک اتنا اہم نہیں۔ جتنا کہ یہ عشق ہے
اس کی وجہ یہ ہے کہ عشق کے بغیر محبوب کا کوئی تصور پیدا ہی نہیں ہوتا۔
محبوب کو محبوب بھی درحقیقت عشق ہی بناتا ہے۔ اسی لئے جگر محبوب سے
کہیں زیادہ اس عشق کو اہمیت دیتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ خود یہ عشق
ان کے یہاں محبوب کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ وہ اس سے محبت کرتے
ہیں۔ انھیں اس میں حسن ہی حسن نظر آتا ہے۔ ان کے خیال میں اس کے
بہت سے مدارج ہیں۔ اس کی راہ میں بہت سی منزلیں آتی ہیں جب
وہ اپنی صحیح منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ تو خود اس میں حسن کی خصوصیات پیدا
ہو جاتی ہیں۔ یہی اس کا اصلی مرکز ہے۔ اور جب وہ اس مرکز سے ہمکنار
ہوتا ہے تو خود حسین بن کر دونوں عالم پر چھا جاتا ہے ؎

جب عشق اپنے مرکز اصلی پہ آ گیا
خود بن گیا حسین دو عالم پہ چھا گیا

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جگر کا تغزل صرف حسن ہی سے عبارت
نہیں ہے۔ اس میں خیال حسن کا داخلی رد عمل نمایاں حیثیت رکھتا ہے
یہی رد عمل درحقیقت عشق ہے۔ اگر اس میں صحت مندی ہو۔ تو یہ بذات
خود بھی حسین ہوتا ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس کا محرک
محبوب کا حسن ہوتا ہے۔ اور اس نسبت سے بھی اس میں حسن کی قدر پیدا ہو
جاتی ہے۔ لیکن جگر کے خیال میں اس کے حسن سے ہمکنار ہونے کی وجہ

جذب و شوق کی وہ لغزش مستانہ ہے جس میں بذات خود غضب کا حسن ہوتا ہے۔ عشق کے حسین ہونے کا تصور کسی ایسے شاعر کے یہاں پیدا نہیں ہو سکتا جو انفعالیت پسند ہو۔ جگر انفعالیت پسند نہیں ہیں۔ وہ قنوطیت سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ وہ تو زندگی کو بسر کرنا جانتے ہیں۔ اور یہ عشق بھی ان کے نزدیک اس زندگی کو ایک مخصوص انداز میں بسر کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ وہ اسے ایک لائحہ عمل بھی سمجھتے ہیں ـــ ان کے خیال میں وہ ایک نظام بھی ہے۔ اسی لئے وہ انہیں حسین نظر آتا ہے۔ اس حسن میں ان کا حسن نظر بھی شامل ہے۔ اور یہ اسی حسن نظر کا کرشمہ ہے کہ وہ عشق کو حسین سمجھتے ہیں۔

یہ خیال بھی جگر کے یہاں عام ہے کہ حسن کو دوام حاصل نہیں۔ یوں تو بڑی دلکشی رکھتا ہے۔ اس میں بلا کی کشش ہوتی ہے۔ دل اس کی طرف کھنچتے ہیں۔ لیکن حسن کا یہ سحر باقی نہیں رہتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی دلکشی ماند پڑتی جاتی ہے۔ اور دیکھنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سارا حسن پر خزاں آرہی ہے اس کا شیرازہ منتشر ہوتا جا رہا ہے۔ اس میں تھکن کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ لیکن عشق اس صورت حال سے دوچار نہیں ہوتا زمانے کی گردش اس پر اثر نہیں کرتی وقت کا دھارا اس کی بنیادوں کو نہیں ہلاتا برخلاف اس کے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں زیادہ پختگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ وہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جاتا ہے زمانہ اس شراب کو دو آتشہ بنا دیتا ہے۔ اس میں جذب و مستی کی کیفیت

بڑھ جاتی ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں عشق میں ایک انداز محبوبی اور طرز
دلربائی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے انداز اب حسن سے بھی لطیف تر ہونے
ہیں۔ دونوں کو ابھارنے لگتا ہے۔ محبوبی اس کی فطرت بن جاتی ہے۔ اس کو
جگر نے کار معشوقانہ سے تعبیر کیا ہے ؎

حسن تو تھک بھی گیا لیکن یہ عشق
کار معشوقانہ کرتا ہی رہا

اور اس کار معشوقانہ کی ترکیب میں جگر نے نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ دیا ہے
اس میں حسن کی سادگی، رنگینی اور پرکاری کے ساتھ ایک والہانہ پن کا
خیال موجود ہے جو حسن کو معشوق بناکر کار معشوقانہ کرنے پر اکساتا ہے۔
عشق میں یہ خصوصیات حسن سے بھی کچھ زیادہ نہیں۔ حسن میں یہ خصوصیات
ہمیشہ ہمیشہ باقی نہیں رہتی۔ لیکن عشق ان کو باقی رکھتا ہے۔ بلکہ وقت
کے ساتھ ساتھ یہ خصوصیات اس میں زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوتی جاتی
ہیں۔ یہاں تک کہ وہ خود ایک معشوق بن کر کار معشوقانہ کرنے پر اتر آتا ہے
اور یہی عشق کا کمال ہے۔ کہ وہ حسن کو تھکا دے لیکن اپنے جذب و
شوق میں کمی نہ آنے دے۔ جگر ایسے ہی عشق کے قائل ہیں۔ اور عشق کے
اس تصور کو بنیادی اور معیاری خیال کرتے ہیں۔

جگر کے ہاں عشق کا تصور بہت ہی حسین اور دلآویز ہے۔ اس تصور
کو انھوں نے کہیں بھی بھیانک بنا کر پیش نہیں کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر واضح
کیا گیا ہے وہ اسے حسن سے کچھ کم حسین نہیں سمجھتے۔ اسی لئے وہ عشق کے

انداز کو ادا سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور ادائے یار کے ساتھ اسے نسبت دیتے ہیں جس طرح ادائے یار کی سادگی اور پرکاری دلوں کو بھاتی ہے اس طرح عشق کا یہ انداز بھی دلوں میں جگہ بناتا ہے۔ جگر نے کیسے دلکش پیرائے میں اس حقیقت کی وضاحت کی ہے۔

ادائے عشق ادائے یار ہی سے ہے
بہت سادہ بہت پرکاری بھی ہے

لیکن یہاں صرف ادائے یار کو ادائے عشق سے بہت ہی نہیں دی گئی ہے اس حقیقت کو بھی واضح کیا گیا ہے کہ ادائے عشق ادائے یار کا اور ادائے یار میں ادائے عشق کا لہو ہوتا ہے۔ جو دونوں کو اپنی اپنی جگہ حسن اور صحت مندی سے ہم کنار کرتا ہے۔ ادائے عشق میں سادگی اور پرکاری ادائے یار ہی سے آتی ہے اور ادائے یار میں اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے ادائے عشق پیدا کر لیتی ہے۔ جگر نے یہاں ان دونوں کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے اور ایک ہی دوسرے کے ساتھ ناگزیر وابستگی واضح کی ہے لیکن اس خیال کی کرن اس میں سے ضرور پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہے کہ عشق زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس کی ایک ایک ادا میں دلکشی اور دلاویزی پائی جاتی ہے۔

اس خیال سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حسن و عشق ایک دوسرے کے پابند ہیں۔ ان دونوں میں ایک ناگزیر ربط ہے۔ حسن و عشق کا اور عشق حسن کا مزاج داں ہوتا ہے۔ ایک کے اسرار و رموز دوسرے کو معلوم ہوتے

ہیں۔ جگر کے ہاں حسن ایک خارجی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ایک داخلی کیفیت بھی ہے۔ جب تک اس کو دیکھنے والا نہ ہو۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو پوری طرح رونما نہیں کرتا اور دیکھنے والا اس کو ان گنت زاویوں سے دیکھتا ہے۔ اس کی داخلی کیفیت بھی اس میں شامل ہوئی ہے حسن نظر کو بھی اس میں دخل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ حسن کی اصل حقیقت کو عشق کی نظر ہی دیکھ سکتی ہے۔ یہ نظر اتنی تیز اور دور رس ہوتی ہے کہ حسن کی داخلی تہوں تک پہنچنا بھی اس کے لئے مشکل نہیں ہوتا۔ اس کو مزاج دانی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ مزاج دانی حسن کے بہت سے ایسے گوشوں کو بے نقاب کرتی ہے جو نظر کی قید سے آزاد ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب عشق عشق معتبر کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ جگر نے اپنے مخصوص انداز میں اس اہم نکتے کی اس طرح وضاحت کی ہے:

جز عشق معتبر یہ کسی کو خبر نہیں
ایسا بھی حسن ہے جو بقید نظر نہیں

یہ حسن جو بقید نظر نہیں ہوتا کچھ زیادہ ہی اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ اس میں عشق معتبر کی مزاج دانی بھی شامل ہوتی ہے۔ اس کے حسن نظر کو دخل بھی ہوتا ہے۔ غرض اس طرح عشق۔ حسن کے بہت سے ایسے گوشوں کو بے نقاب کرتا ہے جن کی کسی کو خبر نہیں ہوتی وہ اس کے ایسے پہلوؤں کا سراغ لگاتا ہے۔ جس تک رسائی حاصل کرنا کسی اور کے بس کی بات نہیں عشق کی یہی کیفیت اس کے مرتبے کو بلند کرتی ہے۔ جب وہ اس

دلاتے ہیں ؎

عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے
عشق ہے کارِ شیشہ و آہن

کیوں کہ اس کارگہِ شیشہ گری کو اگر ذرا بھی ٹھیس لگ جائے تو چکنا چور ہو جاتا ہے۔ اس لئے عشق میں احتیاط لازمی ہے۔ لیکن اس احتیاط کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ عشق کرنے والا اس کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے میں کامیاب ہو جائے اس کا سبب یہ ہے کہ عشق کے معاملات اتنے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ ان کا سمجھنا اور ان سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہوتا۔

اس صورت حال ہی کا نتیجہ ہے کہ عاشق کو مقامات عشق بہت حسین نظر آتے ہیں۔ وہ ان سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کی روح ان معاملات سے روشناس ہوکر بالیدہ ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ ان مقامات سے کشاں کشاں گزرتا ہے ؎

ہر اک مقام محبت بہت ہی دلکش تھا
مگر ہم اہلِ محبت کشاں کشاں گزرے

اس سے زیادہ انسان کی بے بسی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ محبت اور عشق کے ہر اک مقام کی دلکشی کا احساس رکھتے ہوئے بھی اس سے پوری طرح لطف اندوز نہ ہو سکے۔ اور ان مقامات سے کشاں کشاں گزرنا اس کا مقدر ہو جائے یہی وجہ ہے کہ عشق و محبت کے جو حادثات اس پر ناگہاں گزرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ نہیں یاد رکھتا ہے اور ان کی یاد اس کے لئے بہت عزیز ہو جاتی ہے ؎

بہت عزیز ہے مجھ کو اُنھیں کی یاد جگر
وہ حادثات محبت جو ناگہاں گزرے

غرض عشق میں انسان کو عجیب و غریب حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس عشق کی فطرت بھی عجیب ہے وہ کبھی جدوجہد و پیکار کی صورت میں نظر آتا ہے اور کبھی اس میں شاخ گل اور تلوار کی سی کیفیت دکھائی دیتی ہے وہ ہوش میں نہیں رہتا۔ اس کے مزاج میں ایک دیوانگی برقرار ہے وہ ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے۔ لیکن وہ کسی منزل پر ٹھہرتا نہیں۔ کیونکہ وہ خود ایک منزل ہے اس لئے وہ منزل کے خیال سے بیگانہ نظر آتا ہے جگر نے ان خیالات کو کسی خوبصورتی کے ساتھ واضح کیا ہے ؎

محبت جہد بھی پیکار بھی ہے یہ شاخ گل بھی ہے تلوار بھی ہے

ہوش میں رہتا تو کیا جانے کہاں رکھتا قدم
یہ غنیمت ہے مزاج عشق دیوانہ بھی ہے
حاصل ہر جستجو آخر یہی نکلا جگر
عشق خود منزل بھی ہے منزل سے بیگانہ بھی ہے

اس میں ایک حریفانہ شان بھی ہے۔ وہ ضد پر آجائے تو پانی چھڑکتا ہے اور آگ لگاتا ہے اس کی تشنگی کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں۔ وہ زہر کے گھونٹ کو بھی اپنے لئے آب حیات بنا لیتا ہے۔

ہوشیار اے مست صہبائے تغافل ہوشیار
عشق کی فطرت میں اک شان حریفانہ بھی ہے

ضد پہ عشق اگر آ جائے	پانی چھڑک کے آگ لگائے

عشق وہ تشنہ کام ہے کہ جسے	زہر کا گھونٹ بھی ہو آبِ حیات

اس طرح جگر نے عشق کے مختلف پہلوؤں پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا تصورِ عشق اپنے دامن میں وسعت اور ہمہ گیری رکھتا ہے۔ اس میں تنوع اور رنگا رنگی بھی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے عشق کے تصور کو شاعرانہ بنا کر پیش کیا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں اس عشق کے شاعر ہیں اور یہی ان کی تغزل کی جان ہے۔ حسن اس عشق کا تابع ضرور ہے لیکن وہ اس حسن سے زیادہ اس حسن نظر کی طرف متوجہ نظر آتے ہیں۔ جس کی بدولت اس عشق کی ایک مخصوص انفرادیت نہیں ہے۔ ان کے نزدیک یہ عشق حسن کے مقابلہ میں زیادہ اہم ضرور ہے۔ لیکن حسن کے بغیر اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ بعضوں کے نزدیک یہ حسن ایک خواب اور یہ عشق ایک افسانہ ہو سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں مل کر ہی زندگی کو ہر حال میں دلکش بناتے ہیں ؎

زندگی آج بھی دلکش ہے انھیں کے دم سے
حسن ایک خواب سہی عشق اک افسانہ سہی

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی

۱۸۵۷ء اور اس کے گرد و پیش کے زمانہ کو "قیامت سے کم نہیں" کہا جاتا ہے اور صحیح یہ ہے کہ تھا بھی قیامت کا اس وقت تو صرف ایک دلّی کا سہاگ لٹا تھا، لیکن [illegible] برسوں میں دیکھتے ہی دیکھتے جتنی سہاگنیں بیوہ ہو گئیں اس کی نظیر تاریخ کے کسی اور دور میں دیکھنے میں نہیں آتی۔

حسن نظامی، مولانا آزاد، حسرت موہانی، ظفر علی خاں، سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، مرزا یگانہ، پنڈت کیفی، تاجور (نجیب آبادی)، پطرس، آرزو (لکھنوی)، سیماب، وحشت، قاضی عبدالغفار، فانی، اختر شیرانی، اصغر (گونڈوی)، منٹو، مجاز اور جگر ایک ایک کر کے چل بسے۔ یہ دن انھیں بھی دیکھنا پڑا اور بڑی بے بسی اور بے کسی کے ساتھ دیکھنا پڑا جو اس کا مذاق اڑاتے تھے اور انھوں نے بھی دیکھا۔ جو اسے سب سے بڑی حقیقت سمجھتے تھے۔

اس فہرست میں علماء اور فضلاء بھی ہیں اور شعراء و ادباء بھی۔ بوڑھے بھی ہیں، جوان بھی۔ کلیاں بھی ہیں اور پھول بھی۔ اس میں ایسے بدقسمت بھی ہیں جنھیں

شراب نے کبھی منھ نہ لگایا۔ اور ایسے خوش نصیب بھی جن کے منھ سے یہ کافر ہمیشہ لگی رہی۔ ان خوش قسمت بدنصیبوں یا بدقسمت خوش نصیبوں میں ایک جگر بھی تھے۔ لیکن ان کی محرومی دیکھئے کہ بھری بہار میں توبہ کر بیٹھے اور یہ بھی نہ سوچا کہ ہم مشرب کیا کہیں گے اور کیا کہہ کر یاد کریں گے۔

جگر کی یہ جراءت رندانہ، ہم مشربوں سے ان کی یہ بغاوت، شراب سے یہ سرکشی اور توبہ نوازی ہی وہ امتیاز ہے جو نہ صرف دوسروں سے انھیں ممتاز کرتا ہے بلکہ ارادہ کی مضبوطی حوصلہ کی بلندی یا یوں کیوں نہ کہہ لیجئے کہ انسانی قوت ارادی کی عظمتوں کا احساس دلانے کے لئے بھی کافی ہے۔

چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی

کو چھوڑ دینا اور اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منھ موڑ لینا، بچوں کا کھیل نہیں مردوں کا کام ہے۔ بڑے دل گردے اور بڑی بے جگری کا کام۔ اس بات کو جسے دنیا انہونی کہتی آئی ہو، ہونی کر دکھانا۔ کوئی معمولی بات نہیں، بڑا اور بہت بڑا کارنامہ ہے جسے ایک بڑا آدمی ہی انجام دے سکتا ہے۔

جگر یقیناً بڑا آدمی تھا

اردو شاعری کے دامن میں شراب و ساقی اور رندی و سرمستی کے گلہائے رنگا رنگ کی کمی میں ان پھولوں کی خوش رنگی اور خوشبو کوئی شعراء کے دل سے پوچھے۔ جو ان کے اسیر ہی نہیں، اپنی اس اسیری پر ناز بھی کرتے ہیں۔ ان شعراء میں ایسے بھی ہیں جنھوں نے پی "جھوم جھوم کر" اور پی پی کر جھومے اور ایسے بھی جو پیے بغیر مست و سرشار نظر آتے ہیں۔ اس محفل میں وہ طرح طرح

بھی ہیں جنھوں نے ساغر و صہبا، مے و مینا اور ساقی مطرب سے اپنا کام نکالا ہے
اور ایسے بھی نظر آتے ہیں جو زندگی بھر انھیں کے گرفتار اور آلہ کار رہے ہے،
اور اس طرح خود اپنے وجود کا کوئی قابل ذکر ثبوت پیش نہ کر سکے محو پرواز
دونوں ہی نظر آتے ہیں۔ مگر ان کی پرواز یکساں نہیں۔ پرواز پرواز میں فرق
ہے اور شاید بہت بڑا فرق۔ کیونکہ ایک جہاں "فضا" میں اپنے پروں کی
قوت کو آزما رہا ہے دوسرا "خلد" (Space) میں۔ بلند پرواز کون ہے؟
اس کا فیصلہ خود کیجئے۔ مگر سوچ سمجھ کر اور بڑی احتیاط سے کیونکہ یہ اور اسی قسم
کے مواقع جہاں ذوق اور وجدان کی آزمائش کرتے ہیں، وہاں اُنکی نمائش بھی
جگر بھی زمانہ کی گردش کا شکار ہوئے۔

غضب میں تنگدستی میں مرا ساتھ دیکھ پریشانیوں کو پریشانیاں ہیں

اور پھر اس بُری طرح کہ اگر یہ کہا جائے کہ معاشی اعتبار سے انہیں عرش
سے فرش پر اترنا پڑا تو بھی غالباً کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ لیکن دماغ، عرش معلیٰ
پر ہی رہا۔ "دماغ" سے میری مراد "بد دماغی" نہیں "بلند ظرفی" ہے۔ انھوں
نے خودداری کو کبھی اور کسی قیمت پر بھی ہاتھ سے نہ دیا۔ ہوش تو ہوش بیہوشی
(نشہ) کے عالم میں بھی یہ یا اس قسم کی رکاکتیں کبھی ان سے سرزد نہیں ہوئیں۔
جگر نے مفلسی کی حالت میں فیاضیوں کے جو نمونے پیش کر دئے۔ فارغ
البال کیا پیش کر سکیں گے۔ انکا حساس دل، عام لوگوں کی طرح صرف اپنی ذات
کے لئے حساس نہ تھا۔ دوسروں کے لئے بھی تڑپ اٹھتا تھا۔ بلکہ یہ کہنا سچائی
سے زیادہ قریب ہوگا: اپنے سے زیادہ دوسروں کے لئے حساس تھا۔ وہ

خود بھوکے رہ سکتے تھے۔ لیکن دوسروں کی بھوک ان سے نہ دیکھی جاتی تھی۔ وہ کڑاکے کی ٹھنڈک سے ٹکرا سکتے تھے لیکن دوسروں کو سردی سے کانپتا دیکھ کر ہمیشہ ان کے جسم میں لرزہ دوڑ جاتا۔ ہمدردی ایثار اور بے نفسی کے ایسے نمونے مشکل ہی سے دیکھنے میں آتے ہیں۔

جگر کی دوسری بڑی صفت جو زمانہ کے انقلاب سے قطعاً غیر متاثر نظر آتی ہے ان کی "وضعداری" تھی۔ اس میراث کو جیتے جی انھوں نے جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ اور ہر حال میں اس کی حفاظت کی۔ دنیا رنگ پہ رنگ اور اکثر ساتھی کینچلی پہ کینچلی بدل بدل کر اپنی دانست میں ترقی پسندی کا ثبوت دیتے رہے لیکن اس قلب نے ذرا جنبش نہ کی۔ وضع پر قائم رہنے اور اس طرح قائم رہنے کو قدامت پرستی، ترقی دشمنی حماقت جہالت کچھ کہہ لیجئے۔ لیکن ہے بڑی جگر داری کی بات۔ بڑے وہ نہیں، جو زمانہ کے ساتھ، اچھے برے میں تمیز کئے بغیر بدل جانے کو اپنی زندگی کی معراج سمجھتے ہیں۔ بڑے وہ ہوتے ہیں جو زمانہ کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ جگر زمانہ کو نہ بدل سکے۔ کیونکہ اس کے لئے غیر معمولی توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو ان کے مقدر میں نہ تھی۔ لیکن یہی فخر ان کے لئے کیا کم ہے کہ وہ خود نہیں بدلے اور زمانہ ان کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔

جگر نے بھی اور بہت سے کم ہمت لوگوں کی طرح غم عشق اور غم روزگار کی تمازت سے گھبرا کر کمزوری دکھائی اور وقتی سکون کی خاطر "شراب" کے سایہ میں پناہ لی۔ پناہ تو مل گئی لیکن سکون نہ ملا۔ اور مل بھی نہ سکتا تھا۔ کیونکہ ضمیر زندہ تھا، مردانہ تھا۔ وہ انھیں جھنجھوڑتا رہا۔ اس کی آواز کانٹے کی طرح دل میں

چبھتی اور کھٹکتی رہی۔ یہ کھٹک اور چبھن وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی اور تیز تر ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ برداشت سے باہر ہو گئی۔ اور وہ ، وہ کچھ کر بیٹھے جس نے دوست دشمن اپنے پرائے ، سبھوں کو چونکا دیا۔ جب دل سے نکلی ہوئی بات "تنک اثر" کا دعویٰ کر سکتی ہے تو قلب کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی کبھی کی جگر کی یہ دعا :-

اے رحمت تمام مری ہر خطا معاف		میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

کیسے اور کیوں بے اثر رہتی۔ رنگ نہ لاتی۔ مستجاب نہ ہوتی۔
"رحمت تمام" کی رحمتوں پہ یہ ناز ، یہ اعتماد ، یہ اعتبار ، کیا جگر کی پختہ ایمانی پہ دال نہیں۔

جگر نے شراب چھوڑ دی

چشم ساغر ، درپڑی ، مینا کے قہقہے ہچکیوں میں تبدیل ہو گئے۔ میخانہ پر سناٹا چھا گیا۔ یاران میکدہ ، لرز اٹھے ، تڑپ گئے۔ لیکن ہاتھ ملنے کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا

جگر بحیثیت انسان

جگر یوں تو شاعر کی حیثیت سے بھی ، اپنے ہم عصروں میں کسی سے پیچھے نہیں رہا لیکن انسان کی حیثیت سے وہ سب سے نہیں تو بہتوں سے یقیناً آگے اور بہت آگے نظر آتا ہے۔ اس کی شخصیت میں ایک دو نہیں بہت سی انسانی عظمتیں خوابیدہ یا بیدار آسودہ تھیں۔ نیکی اور سچائی محبت اور ہمدردی ایثار اور بے نفسی متانت اور سنجیدگی۔ غرض کون سی اس کی ادا ہے جو احترام طلب نہیں۔ لیکن جو چیز بے طلب اس کا احترام کرنے پر ہمیں مجبور کر دیتی ہے وہ اس کی "بے جگری" یا

قوت ارادی ہے۔ جگر نے دل پر پتھر رکھ کر جس شان سے اپنے وا حد غمخوار کے احسان سے سبکدوشی حاصل کی جگر ہی کا کام تھا۔ نہنگ و اژدھا و شیر نر مارنے والے تو بہت مل جائیں گے لیکن...

نرگس کے مقدر میں شاید رونا اور روتے رہنا ہی لکھا ہے

میں نے جگر کو قریب سے بھی دیکھا ہے اور دور سے بھی۔ قریب سے کمتر اور دور سے اکثر لیکن آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ زیادہ بڑے ہیں یا ان کی شاعری۔ جب شراب انکی زیست تھی تو شاعری بلند نظر آتی تھی جب زیست شراب ہو گئی تو شخصیت لیکن اب یکساں طور پر دونوں ہی بلند نظر آتی ہیں۔

جگر اپنے "شعر" اور "شراب" کی اثر انگیزی کی داستان کہہ گئے اور بڑے مزے میں کہہ گئے۔

سب کو مارا جگر کے شعروں نے اور جگر کو شراب نے مارا

لیکن جو چیز سب سے پہلے کہنے کی تھی اسے شاید اس خیال کے پیش نظر ٹال گئے کہ "خود اپنے منہ میاں مٹھو کون بنے"!

لوگوں نے عام طور سے ابتک جگر کی محض "رندی اور شاعری" کے شباب کا عالم دیکھا ہے لیکن رکھ رکھاؤ کا جو عالم ان کی زندگی شاعری اور رندی تینوں پر یکساں طور سے طاری ہے اور جو واقعی دیکھنے اور دیکھنے کے ساتھ ساتھ سر لینے کی بھی چیز ہے اسی پر توجہ نہ کی۔

"رکھ رکھاؤ"

یہی وہ چیز یا صفت ہے جو جگر اور ان کی شاعری کو عام سطح سے بلند ہی نہیں کر دیتی الگ بھی کر دیتی ہے۔ وہ جو سادگی میں بھی پرواز کا عالم دیکھنا چاہتے ہیں انھیں جگر کی زندگی اور شاعری کا مطالعہ غور سے کرنا چاہیئے۔

(ڈاکٹر محمد عقیل)

جگر اور جدید غزل

اگر شاعری بھی سیاست کی طرح ایک ناقابل اختتام ایڈونچر ہے، اگر انسان کا جمالیاتی احساس، باوجود سائنس کی روز افزوں ترقی کے اپنی آسودگی کا خواہاں ہے اور اگر ان تمام مادی ترقیوں کے بعد بھی انسان شاعری سے بے نیاز نہیں ہو سکتا تو ہمیں بھی غزل کی زندگی اور بقا سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے ہمارے دور انتشار کی پیداوار، نیم وحشی صنف سخن، بوڑھو اذہنوں کا ابال، شکست خوردہ ذہنیتوں کی دین کہتے رہیں گے مگر اس کے جادو سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکیں گے۔ کوئی نہ کوئی منچلا ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتا رہے گا کبھی میر و غالب کی محبت اور تفکر سے بھرپور شکل میں، کبھی آتش و ناسخ کی صورت میں آتش بیانی اور لفظی بازی گری دکھا کر، کبھی حسرت اور عزیز کی طرح محبت کی دلچسپ کہانیاں سنا کر، کبھی فانی کی طرح موت سے دل لگا کر، کبھی فراق کی طرح گرج کر اور کبھی روش اور جذبی کی آہستہ خرامی سے دل لبھا کر، اور اسی طرح یہ لا متناہی سلسلہ موج حوادث سے ہنستا کھیلتا چلا ہی جائے گا۔ اس سلسلے کی ایک اہم کڑی جگر مراد آبادی بھی ہیں جن کی جذبات میں ڈوبی ہوئی دلنشین آواز مشاعرہ میں تو سننے والوں کو اپنا گرویدہ کر ہی لیتی تھی مگر مشاعرہ سے

باہر ہو کر بھی اپنی عظمت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بٹھائے بغیر نہ رہ سکی۔

جگر صاحب کا عرصۂ حیات ۷۰ سال ہے اور اس عرصہ میں غزل مجموعی طور پر مائل بہ زوال رہی ہے۔ ان معنوں میں کہ اردو نظم ترقی کی بلندیوں کو چھونے میں کوشاں نظر آتی ہے اور غزل کو اپنے مقابلہ میں پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔ جگر نے جب ہوش سنبھالا تو ہندوستان میں ایک طرف حالی، اقبال اور چکبست کا طوطی بول رہا تھا تو دوسری طرف غزل کی دنیا میں امیر و داغ کی حکومت تھی حالی کے مقدمے نے دم توڑتے ہوئے لکھنؤ اسکول کی غزل گوئی کے انجر پنجر اور توڑ کر رکھ دیئے اور سوا اس کے کہ چند نام لیوا کہیں کہیں باقی رہ گئے تھے مجموعی حیثیت سے اس کی کوئی اہمیت نہ رہ گئی تھی۔ انتزاعِ سلطنت، نئی قوم کی آمد اور نیشنل تحریکات نے کلچر اور ذہن کا ڈھانچہ ایسا تبدیل کیا تھا کہ غزل کے پرانے میدان میں اب کوئی ہاتھ دکھانے کو باقی نہ رہ گیا تھا اور منیر امیر و داغ کے جانے کے بعد تو یہ میدان بالکل ہی خالی ہو گیا۔ نظم، نئی تحریکات سے متاثر ہو کر رومانی، نیم سیاسی نیم مصلحانہ انداز سے قدم اٹھا رہی تھی جس میں فرقہ بندی کا جذبہ زیادہ تھا۔ غزل کے لئے اب سوا اس کے اور کوئی راستہ نہ رہ گیا تھا کہ وہ مع اپنے تمام رسم و روایات کے ان چیزوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرے جو بدلتی ہوئی نئی زندگی کے ساتھ چل سکیں۔ کیونکہ اس کے بغیر اب مفر نہ تھا۔ ملک کے سیاسی حالات روز بروز لوگوں کا مذاق اور معیار زندگی بدلتے جاتے تھے۔ ایسے وقت میں قدیم خیالات اور رسموں کے ساتھ غزل کو لے کر چلنا ایک وقت کی شہنائی کا مصداق ہونا تھا حسرت کبھی قدیم۔

اقبالؔ، اور چکبستؔ نے وقت کی اس آواز کو بہت جلد پہچان لیا اور انھوں نے واقعات اور حالات کی نبض پر ہاتھ رکھ کر غزل کو ایک نئے میدان میں لانے کا فیصلہ کیا جس کی شروعات حالیؔ نے اپنے مقدمے کے ساتھ اپنے دیوان میں کر دی تھی۔ لکھنؤ پر جب نیا یہ تازیانہ پڑا تو شعرائے لکھنؤ نے بھی اپنا رخ بدلنا چاہا۔ مگر اس طرح کہ مرثیہ سے پیدا ہوئے اخلاقی مسائل، کچھ تصوف کا صوفیانہ پن، حکومت کے مٹنے سے اور مرثیت سے مترتب ہوا۔ غم و الم اور تھوڑی سی بہت وہ لکھنؤیت جو قابل اعتراض نہ ہو یہ سب کچھ شامل رہے۔ ان لوگوں میں صفیؔ، ثاقبؔ، فانیؔ، عزیزؔ اور اصغرؔ گونڈوی خاص ہیں۔ گو اصغرؔ اور فانیؔ کلیتہً لکھنوی نہ تھے مگر تغزل کے اس نئے عقیدہ کی بنا پر وہ غیر شعوری طور پر اپنے کو لکھنویت سے الگ نہ کر سکتے تھے۔ گویا غزل میں بھی یہ دو رخ بہت واضح نظر آتے تھے۔ جگرؔ کے تخیل اور تغزل کی نشو و نما اسی گل زمیں سے ہوئی اور اسی ماحول نے انھیں جی بھر کر متاثر کیا۔ گو ان پر چند مخصوص وجوہات کی بنا پر اصغر کا رنگ زیادہ اثر انداز ہوا۔

اسی زمانے میں سیاست کی لہریں جس میں حب الوطنی کا جوش شامل تھا، ہندوستان میں بڑی اونچی اٹھ رہی تھیں۔ اصلاحی تحریکوں کے بعد اہل ہند انقلابی کوششوں میں سرگرم تھے۔ تحریک خلافت، نان کو اپریشن اور عدم تشدد کی تحریک نے عوام[1] و خواص میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا اور جب روس میں

---

[1] اس میں بہت سی تحریکیں انقلاب روس کے بعد کی ہیں۔ یہاں محض ہندوستانی عوام کی بیداری کا اظہار مقصود ہے۔

الف ب کی تکمیل ہو گئی تو یہاں کے لوگوں کو بھی بڑھاوا ملا۔ اقبال چکبست
ظفر علی اور جوش کے خیالات نے شعر و ادب کی محفل میں بھی اس چنگاری
کو منظم طریقے سے لاڈالا حسرت موہانی نے مشق سخن کے ساتھ چکی کی مشقت
بھی لازمی قرار دی مگر جس اسکول سے جگر نے آج تک اپنے کو وابستہ کر رکھا
تھا وہ ایک بے حسی کے عالم میں تھا جگر کی خود اپنی شخصیت ابھی تک زیر تکمیل
تھی اس لئے انھوں نے بھی سیاست سے کوئی دلچسپی اور واسطہ نہ لیا۔ ان کی
اس وقت کی تمام غزلیں نہ صرف سیاسی اشاروں سے بلکہ غزل کے اسوقت
کے ترقی پسند رخ سے بھی عاری ہیں۔ نظریہ حسن و عشق میں بھی اس وقت کے
روائتی انداز کی گہری چھاپ ہے۔ جگر کے بت، سیاست اور جمہوریت
کے اصولوں کے قائل نہ تھے اور نہ شعوری طور پر وہ ایسا سمجھتے کہ ملک کی
سیاسی تحریکات بھی بنی نوع انسان کے بھلے سودمند ہو سکتی ہیں۔ انگریزوں کے
حامیوں نے اس حلقہ کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ تمام تحریکات محض شخصی اقتدار پسندی
کا ردعمل ہیں کانگریس اور دوسری سیاسی پارٹیاں ہندوستانیوں کی دشمن
ہیں جو آئے دن اپنے ذاتی مفاد کے لئے ملک میں خلفشار پیدا کیا کرتی ہیں جو
ایک طرح کی بغاوت ہے اور بغاوت کی سزا شاہی قصور سے متاثر متوسط
طبقہ اچھی طرح جانتا تھا۔ ان تمام عقیدوں سے صرف یہی نہیں ہوا کہ غزل
کے اس اسکول نے سیاست سے مجموعی طور پر کنارہ کر لیا بلکہ اس سے مترتب
ہو کر جو نفس کشی، خودانکاری، اخوت، مساوات اور انسانی فلاح و بہبود
کا نظریہ پیدا ہو سکتا تھا وہ اس حلقۂ فکر کے غزل گویوں کے قریب نہ جاسکا۔

نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ یہ لوگ نفس کشی، زہد و اتقا، خود انکاری کے انھیں نظریات کو اسی طرح اپنائے رہے جس طرح تصوف نے انھیں ایک مخصوص ماحول اور دور میں مخصوص تاریخی اثرات کے زیر اثر ہو کر انسانی جماعت کو بتایا تھا یعنی حقیقت، مجاز، انسان کی حقیقت، اس کے اس دنیا میں آنے کا سبب، عرفان، اسرار نفس امارہ اور مختلف انفاس، عالم امکان کعبہ و ایمان، راست بازی اور پاکبازی کا محدود نظریہ، جو عمل کی حد سے دور، نقشبند صورت معنی اور جانے کیا رمز و کنایات اس گروہ کا فلسفہ اور نظریۂ زندگی بنے رہے۔ جو یہاں تک کبھی کبھی پہنچ جاتے کہ اکثر مقلدین یہ بھی نہ جان پاتے کہ وہ کیا نظم کر رہے ہیں جگر ایسے مقلدین میں سے نہ تھے مگر اس وقت تک وہ اس گروہ سے الگ نہ تھے جس نے ایسے خیالات اور نظریہ زندگی کو تغزل میں تفاسف اور تمرد سے تعبیر کیا تھا۔ جگر پر اقبال کی بلند آہنگی کا اثر نہ تھا اور نہ چکبست، حالی اور جوش کے خیالات سے وہ متاثر ہو سکے۔ ان کا معیار مصحفی، ثاقب، عزیز، داغ، فانی، ریاض اور جلال تھے۔ اصغر ان کے استاد اور مرشد تھے۔ جگر نے انھیں لوگوں کو ہمیشہ سامنے رکھا۔ مغربی ادب سے ناواقفیت ان کے ذہن کو وسیع نہ کر سکی اور جگر بھی اس وقت کے بہت سارے غزل گویوں کی طرح بڑھ اور پھیل کر اس تحریکی زندگی کا اندازہ نہ لگا سکے جو نت نئے سانچے میں ڈھل رہی تھی، جو روز بروز اپنی ضروریات، مہمات، مشکلات اور نظریات کا نیا تصور پیش کرنا چاہتی تھی اور جو صرف۔

واقف سرِ حقیقت اگر انساں ہو جائے   غم سے نزدیک ہو، راحت سے گریزاں ہو جائے
اس سے بڑھ کر کوئی دلسوز بھی دنیا میں نہیں   نفس چالاک اگر تابع فرماں ہو جائے

جیسے اشعار سے حل نہیں ہو سکتا تھا۔ اصغر کا رنگ جگر کا فطری رنگ نہ تھا ان کی زندگی اور ہزار شیوائی محض جلوہ اور پردہ کے بیان تک محدود رہنا نہیں چاہتی تھی اور جگر تقلید پر مصر تھے ــــ ایسی تقلید جو ان کی ذات میں حل نہ ہوئی تھی اور جس کا خود انھوں نے کبھی کوئی تجربہ نہیں کیا تھا۔ نتیجہ سوا روایت کی لکیریں پیٹنے کے اور ہو ہی کیا سکتا تھا۔ نوجوانی کی آگ میں جلنے والا شاعر اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار نہ لا سکتا۔ خود کا مطالعہ زیادہ وسیع نہ تھا۔ اسی لئے جگر کی شخصیت عجیب طرح سے کھنچنے اور بکھرنے لگی۔ فانی اور عزیز کے ساتھ اردو غزل پر افسردگی کا وہ عالم کہ غزل ماتم والم کا بدل معلوم ہوتی۔ اصغر کا تصوف، زندگی سے فرار سکھانے لگا اور دوسری طرف اپنے دل کا رجحان مادیت کی طرف، فن میں حسرت کی کبھی کبھی کی قافیہ پیمائی کی طرف نظر، اقبال کی بلند آہنگی کی جھنکار کہیں پس منظر سے کانوں میں گونجتی ہوئی۔ غزل کی روایتوں اور رعایتوں کا پاس ــــ یہ تھے آزادی ہند سے پہلے کے جگر

جگر کے یہاں ان تمام باتوں میں سے، جو باتیں بہت واضح تھیں ان میں سے چند یہ تھیں۔ ان کا والہانہ پن حسن و عشق کا پاک جذبہ، تفکر سے قطع نظر قافیوں اور زمینوں کی تلاش، الفاظ و محاورات کی دار و بست اور روایت پرستی۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ باتیں آخر تک کسی حد تک ان کے

ساتھ رہیں۔ اضافے ضرور ہوئے مگر کمی بہت کم ہوئی۔ خاص طور پر والہانہ پن اور اصغریت نے ان کا ساتھ بہت کم چھوڑا۔ والہانہ پن ان کے ہر دور میں بہت واضح ہے محبت کے نشے میں سرشار ہو کر جس رکھ رکھاؤ سے وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں وہ قابل تقلید چیز ہے۔ یہ منزل کسی حد تک بڑی کڑی منزل ہے شراب پی لینا آسان ہے مگر پی کر اعتدال سے نہ گزرنا صرف ہوشمندوں ہی کا کام ہے عشق بہتوں نے کیا ہے اور اظہار حق ان سے بھی زیادہ لوگوں نے کیا مگر جو اردو شاعری کی تاریخ پر نگاہ رکھتے ہیں وہ واقف ہیں کہ اس اظہار میں اکثر معشوق کی کیا کیا گت بنی ہے مگر یہ جگر کا ظرف تھا کہ باوجود سرخوشی، سینہ کاوی اور وارفتگی کے غزل کو اس بلندی سے لیکر گذر گئے کہ سننے والے جھوم جھوم کر بھی مست جذبات، بوالہوسی اور ننگے پن کے شکار نہیں ہوتے۔ وہ داغ کے ساتھ بھی چلتے ہیں اور حسرت کی طرف بھی دیکھے جاتے ہیں مگر داغ کے ساتھ گرنے کے بجائے اپنے کو بچا لیتے ہیں۔ حسرت کی حقیقت نگاری پر نظر رکھتے ہیں مگر جب خود حقیقت نگاری کی کوشش کرتے ہیں تو رومان کی رنگین چادر اوڑھ لیتے ہیں جس سے ستر نگی کرنیں پھوٹ کر ان کی غزلوں کو جذبات اور روشنی سے منور کر دیتی ہیں اور ہم اس نور و رنگ میں ایسا کھو جاتے ہیں کہ حقیقت نگاری کی طرف زیادہ دھیان نہیں دے پاتے۔ جگر شاید یہ سمجھتے تھے کہ عشق میں حقیقت نگاری کی زیادہ تلاش اسے ٹھس بنا دے گی اور تغزل اس کا بار نہ سنبھال سکے گا۔ اسی لئے وہ تفکر صرف تصوف کی حد تک پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کا تغزل، ان کے خیال سے، عادی رہا ہے۔ اصغر نے اس

خیال کو مضبوط کر دیا۔ حالانکہ یہ کھوکھلی اور سادہ روایت پرستی تھی۔ اور اسی روایت
پرستی نے جگر کو بڑا شاعر بننے دیا۔ ان پر روایت پرستی کا اچھا خاصہ اثر ہے۔
کم از کم شعلۂ طور، اور داغِ جگر، میں اسے ہر قدم پر دیکھا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے
محسوسات اور عقل کی گرہیں نہیں کھل پاتیں اور تخیل میں ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا
ہے۔ طور کا جلوہ ہے حور کا لپکا ہے، مجاز و حقیقت کی آویزش، آسمان
اور تقدیر کا رونا ہے، جہاں بے خودی ہے وہاں ہوشمندی کا آنا ضروری ہے
اور اسی طرح جانے کیا کیا ہے۔ جگر فن مشاعرہ بازی کے مشاق کھلاڑی تھے
مشاعرہ کے جس مخصوص نفس اور لطف کام و دہن کے لئے جن الفاظ اور ان کی
تکرار کی ضرورت ہوا کرتی ہے جو اس محفل کے بعد تقریباً بے کار ہو جاتے ہیں
ان میں جگر کبھی کبھی بہہ جایا کرتے اور مشاعرہ لوٹ لینے کی فکر میں فن کی بلندی
کا احساس نہ کر پاتے۔

دل کو لے لیجئے جو لینا ہے — پھر یہ سودا گراں نہ ہو جائے
آسماں کو نہ دیکھئے تن کر — پھر یہ بوڑھا جواں نہ ہو جائے
آہ اک تیر ہی سہی لیکن — آشنائے کماں نہ ہو جائے

بیٹھیں وہ شوق سے تنہا مگر یہ کیا ممکن — ہمیں سرور نہ آئے انھیں سرور آئے

ناخنِ عشق کتنے ٹوٹ گئے — گرہِ نیم باز کیا جانے

اللہ اللہ میں بھی کیا نازک دماغ عشق ہوں — نکہتِ گل بھی ہے وجہ دردِ سر میرے لئے

دلِ عاشق بھی کیا مجموعۂ اضداد ہوتا ہے — ادھر آباد ہوتا ہے ادھر برباد ہوتا ہے

جیسے اشعار میں سوا رعایت لفظی، روایت پرستی اور لفظی بازیگری

کے اور کیا رکھا ہے محفل مشاعرہ اس پر اچھل سکتا ہے مگر ادب کی دنیا میں یہ اشعار بلند نامی حاصل نہیں کرا سکتے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد زندگی کا وہ شعور جو مادیت سے زیادہ قریب ہے اور جس پر تصوف کی تقریباً پرچھائیں نہیں ہے، بہت تیزی سے ابھر آیا۔ اس کی وجہ سائنسی حقائق، سائنس کی افضلیت جس نے تقدیر پرستی اور توہمات کے پرکالے اڑا دیئے، ذہنی ناآسودگی، عالمی بساط پر انسانوں کی جسمانی بے بضاعتی اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی صلاحیتوں کی عظمت کا احساس بہت شدید ہوگیا۔ محوری طاقتوں کے عروج و زوال کے بعد اشتراکی اور اشتمالی ممالک میں زندگی کی بے بسی کے ساتھ اس کی عظمتیں اور صلاحیتیں بھی سامنے آئیں مگر یہ عظمتیں اور صلاحیتیں اپنا جواز اور اپنے مادی و اقتصادی رشتے بھی واضح کرتی گئیں۔ ان کی بنیاد نہ محض خیال پر تھی اور نہ مابعد الطبیعات پر۔ عملی زندگی میں ان کا مظاہرہ ہو چکا تھا یا روز بروز ہو رہا تھا۔ ادب اس نئی کروٹ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اردو میں دوسرے اصناف کے ساتھ ساتھ غزل پر بھی اس کا اثر پڑا۔ جنگ عظیم کے بعد طرز فکر، الفاظ، موضوع اور خیال سب میں ایک واضح فرق محسوس ہونے لگا جو پہلے نہ تھا۔ غزل کبھی کبھی اپنے خالص تغزل کے خول سے باہر نکل کر تلخ حقائق کی طرف بھی متوجہ ہونے لگی اور بہت سے غزل گو تو یہاں تک بڑھے کہ غزلیں نظمیں معلوم ہونے لگیں حسرت، فراق، یگانہ اور جگر سبھوں نے اس تبدیلی سے اثر لینا شروع کیا جگر پر اصغر کے تصوف کا جو اثر تھا وہ رفتہ رفتہ زائل ہونے لگا۔ زمانے

سے الگ ہونے کے معنی فنا ہو جانا تھا۔ جگر اس نکتے سے باخبر ہونے لگے مگر اس کا اعلان انھوں نے فوراً نہیں کیا اور اچھا ہی ہوا کیونکہ خارجی اثرات ان پر اپنا اثر جلد چھوڑنے لگے تھے اور جلد بازی ان کے تغزل اور والہانہ پن کا خون کر دیتی۔ ممکن ہے ان لوگوں کے لئے یہ بڑا اچھی ہوا جو والہانہ پن کو محض افیون سمجھتے ہوں مگر میں ابھی تک ادب کے اس تصور کا ادراک نہیں کر سکا ہوں۔ چنانچہ جگر نے اب اپنا انفرادی رنگ قائم کر لیا جس میں ایک طرف ان کا والہانہ پن اور سرمستی ہے تو دوسری طرف ہندوستان کی بدلتی ہوئی زندگی کی پرچھائیاں۔ ایک طرف تصوف کی جھلک ہے تو دوسری طرف زندگی سے رس نچوڑ لینے کی خواہش فانی کی غزل گوئی کا استحکام ہے تو عزیز کی شیوہ بیانی مگر بس یہیں تک وہ موت کی دلربائی اور ماتم پرستی تک نہیں پہونچے۔ ان کی شاعری میں رجائیت کا پرتو ہے دل پگھلا دینے والے الفاظ اور جذبات غزل میں سمو کر جگر مردہ پرستی کی صلاح نہیں دیتے بلکہ زندگی کی رنگا رنگ دلچسپیوں سے ہمیں وابستہ کر دیتے ہیں جسے کسی حد تک داغ کی دنیا پرستی تک لے جایا جا سکتا ہے مگر سستی لذت پرستی تک نہیں جگر کی لذت اور مزہ میں ایک وقار ہے، تجسس ملی ہوئی تڑپ ہے جسے صرف وصل کی شادکامیوں تک لے جا کر ختم کر دینے والا جگر کے احساسات اور فن کو نہ صرف نہیں سمجھ سکتا بلکہ ان کی توہین بھی کرتا ہے۔ جگر جذبات کے شاعر ضرور ہیں۔ مگر سستے جذبات کے نہیں۔ حسرت کی حقیقت کو تو وہ اپنانے کی

کوشش کرتے ہیں مگر ان کے کبھی کبھی کے لذت پرستی کے جذبات سے کنارہ کر جاتے ہیں اور اسی طرح فراق اور یگانہ کے تفکر کی سطح تک نہیں پہونچتے بلکہ ہلکے پھلکے مسئلے اور نکتے ہی ان کی غزلوں سے ہم آہنگ ہو پاتے ہیں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے آتش گل کے دیباچہ میں جو بعینہ ان کی کتاب 'جدید غزل' کی حرف بحرف نقل ہے، بڑے زور شور سے ان لوگوں کا مذاق اڑایا ہے جو جگر کی شاعری کو ان کے معاصرین سے مقابلہ کر کے سمجھنا یا سمجھانا چاہتے ہیں اور غزل کی خوبیوں اور خرابیوں کا جائزہ لے کر جگر کے رنگ تغزل کو پرکھنا چاہتے ہیں۔ جگر غزل گو تھے اور شاعر بھی۔ اگر ان کے کلام کا جائزہ معاصرین کے کلام کے تقابل سے نہ لیا جائے گا تو کیا ہاتھی گھوڑوں سے ان کا مقابلہ کیا جائے گا۔ تنقید میں ایسی پھلجھڑیاں چھوڑنے سے کام نہیں چلتا۔ غزل کی رفتار اور متغزلین کے کلام کا جائزہ لئے بغیر جگر کی دین کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔

ہندوستان کی نئی زندگی آزادی کے بعد اپنے ساتھ بہت سی چیزیں لائی۔ سیاسی بحران، معاشی خستہ حالی، فرقہ پرستی، وعدہ خلافی، بیکاری سبھی کچھ۔ غزل کا یہ میدان براہ راست نہ تھا جگر یوں بھی کوئی منظم سیاسی شعور نہ رکھتے تھے۔ نہ کبھی انھوں نے اسے جذب کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس نئی زندگی کی نت نئی مہموں نے انھیں اپنی طرف توجہ کرنا شروع کیا۔ بمبئی، چھپرا، بہار، دہرہ دون، بنگال اور دوسرے مقامات پر جو واقعات رونما ہو رہے تھے۔ ان سے زندگی سے کوئی

بھی لگاؤ رکھنے والا، اپنے کو غیر متعلق نہیں رکھ سکتا تھا۔ فیضؔ، فراقؔ، مجروحؔ، مجازؔ، روشؔ، جذبیؔ، واثقؔ سبھوں نے ان سے اثر لیا۔ کچھ تو بالکل سیاسی رَو میں غزل کو اس طرح بہالے گئے کہ غزل کا حُسن تقریباً مجروح ہونے لگا اور کچھ لوگوں نے اسے بڑے سلیقے سے اپنایا۔ غزل کے مخصوص انداز اور لہجے میں اپنے جذبات کی تعبیر کی۔ جگرؔ بھی انھیں لوگوں میں سے تھے۔ وہ سیاسی شاعر نہ تھے اور نہ اب وہ محض روایتی شاعر رہ گئے تھے۔ ان کی شخصیت مکمل ہو چکی تھی یا کم از کم اس میں پختگی ضرور آگئی تھی۔ تقلید کا دور ختم ہو چکا تھا وہ اب تقریباً اجتہاد کی سرحد میں تھے۔ غزل میں جس طرح ان واقعات کو جگہ ملنی چاہیئے تھی انھوں نے اسی طرح انھیں جگہ دی اور اب یہ بات الگ ہے کہ یہ شعور کی بیداری تھی یا محض تاثر یا یہ کہ غزل بس یہیں تک ان مضامین کی تاب لاسکتی ہے یا اسے کچھ اور آگے بھی جانا چاہیئے۔ میرا اپنا عقیدہ اس سے آگے جانے کا نہیں ہے مگر یہ عقیدہ انفرادی ہے تبلیغی نہیں۔ جگرؔ کے یہاں سیاسی مضامین خارجیت کا بہر تو اسی لیے کم قبول کرتے ہیں۔ وہ وقت کی آواز پر آواز دیتے ہیں مگر اس آواز کو محض وقتی اور ہنگامی نہیں بنانا چاہتے بلکہ اس میں جذبات خلوص کا رنگ بھر کر اسے ابدی بنا دینے کی کوشش کرتے ہیں حسرتؔ نے بھی اس کی کوشش کی تھی مگر وہ خارجیت کا زیادہ اثر لے کر بہت برانگیختہ ہو گئے اور نرمی و آہستگی کے ساتھ چرخہ کاتنے کے بجائے دنیا کو ہلانے کا نعرہ ... نرالے اور بھی حسین بنا دیا۔ جگرؔ غزلوں میں انقلاب کا پرچم

نہیں کھولتے بلکہ ہمدردی اور انسان دوستی کا سہارا لے کر ایک پراثر احساس اور عبرت کا اظہار کرتے ہیں اور ایسے لمحات میں رنج و الم کے اتھاہ سمندر میں اس طرح ڈوب جاتے ہیں کہ لالہ وگل، باغ و بہار، جام و مینا کسی چیز کا خیال اپنے پاس نہیں آنے دیتے۔

کہاں کے لالہ وگل، کیا بہار توبہ شکن — کھلے ہوئے ہیں دلوں کی جراحتوں کے چمن

کام ادھورا اور آزادی — نام بڑے اور تھوڑے درشن

مرحبا! جذبۂ بے باک جوانانِ وطن — تیغ جم خم ہے، مگر ہاتھ میں نادانوں کے

جہل خرد نے یہ دن دکھائے — گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

خلوص شوق، نہ جوش عمل، نہ درد وطن — یہ زندگی ہے خدایا، کہ زندگی کا کفن

بھری بہار میں تاراجیٔ چمن مت پوچھ — خدا کرے، نہ پھر آنکھوں سے وہ سماں گذرے

ناز جس خاک وطن پر تھا مجھے آہ جگر — اسی جنت پہ جہنم کا گماں ہوتا ہے

یہ مرحلہ بھی مری حیرتوں نے دیکھ لیا — بہار میرے لئے، اور میں تہی دامن

چمن تو برق حوادث سے ہو گیا محفوظ — مری بلا سے، اگر میرا آشیاں نہ رہا

اسی اک جرم پر اغیار میں برپا قیامت ہے — کہ ہم بیدار ہیں اور اپنا مستقبل سمجھتے ہیں

حکومت کے مظالم جب سے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں — جگر ہم بمبئی کو کوچۂ قاتل سمجھتے ہیں

آنکھیں ابھی کچھ اور بھی ہیں منتظر جگر — چھیڑا کی قتل گاہ کا منظر لیے ہوئے

دہلی و دہرہ دون و نینی تال و بہار — انساں ہے اور ماتم انساں ہے آجکل

ہے زخم کائنات جو ہندو ہے ان دنوں — ہے داغ زندگی جو مسلماں ہے آجکل

چلتی پھرتی چھاؤں ہے پیارے — کس کا صحرا، کیسا گلشن

جیسے اشعار میں حکومت کی نااہلی کا انکشاف بھی ہے اور دردِ وطن کی کسک بھی چاہے اسے آپ تاثر کہیں یا شعور مسلمانوں کی ہمدردی کہیں یا ملک کی نادانی کا ماتم۔ جگر صاحب ایک حقیقی شاعر تھے اور شاعر کا مذہب انسان دوستی ہی ہوتا ہے اسے مذہب و ملت سے برائے نام واسطہ ہوتا ہے اور اردو شاعری کی روایت میں تو یہ نام نہاد واسطہ بھی ٹوٹ جایا کرتا ہے۔ قوموں کی زندگی میں اتھل پتھل ہوتی ہی رہتی ہے خواہ اقدام نو سے ڈرنے کے باعث ہو یا طرزِ کہن پر اڑنے کے سبب سے ہو یا سیاست کی بساط پر کسی چوک کے ہو جانے کے نتیجے میں ظاہر ہوئی ہو۔ شاعر اور ادیب کو ان باتوں کا شعور تو ہونا چاہیئے۔ مگر کیا نقابت کا فرض بھی اسے ادا کرنا چاہیئے؟ اور خاص طور پر غزل میں؟ میں اب اس عقیدے میں مشکوک ہو گیا ہوں۔

ابھی مضمون میں ایک بڑی کمی رہی جاتی ہے۔ جگر صاحب کی غنائیت کا تذکرہ اس میں کہیں نہیں کیا گیا جو ان کی شاعری کا ایک بہت بڑا وصف ہے اور جس کے باعث بہت سے لوگ جگر صاحب کو اس مخصوص فن میں اردو کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔ واقعی جگر صاحب کی غزلوں میں غنائیت کی بڑی کارفرمائی ہے اور اردو غزل کے اس عظیم سرمایہ میں بہت کم لوگوں کے یہاں جگر کا جیسا ترنم ملتا ہے۔ جگر صاحب ترنم سے اپنی غزلیں مشاعروں میں پڑھتے بھی تھے مگر صرف ترنم سے پڑھنا ہی غزلوں کو مترنم نہیں بنا دیتا۔ اس موقع پر مجھے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا ایک جملہ یاد آگیا۔ اس نے اپنی کتاب "شاعری کا نغمہ" (Music of Poetry) میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ اوپر اپاؤ میں

نہیں بلکہ کنسرٹ روم ہے جہاں شاعری کے جراثیم کی نشو و نما تیز ہوتی ہے، ہمارے شاعروں کے لئے اگر مشاعرہ کو کنسرٹ روم سمجھ لیا جائے تو اس لئے نامناسب نہ ہوگا کہ اچھی شاعری کے جراثیم یقیناً اچھے مشاعروں کی فضا میں بڑھتے ہیں۔ اور اگر آپ اسے نہیں مانتے تو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مشاعروں سے بڑھاوا اور بہتر کہنے کا جذبہ تو ضرور پیدا ہوتا ہے۔ مگر جگر صاحب کی غزلوں کا ترنم تمام تر مشاعرہ اور گلے بازی کا مرہون منت نہیں ہے ان کی غزلوں کے ترنم کی اساس اس والہانہ پن پر ہے جس کی تعمیر عشق اور رومان کے ملے جلے جذبات سے ہوتی ہے جو اصلیت واقعیت اور ملکی روایت کے ساتھ ذاتی تجربات اور بلند نظری کا پرتو لیتے ہیں۔ بلند نظری اس لئے کہا گیا کہ اگر ان میں سستے پن اور محض لذتِ کام و دہن کی کوشش ہوتی تو غنائیت اور ترنم محض تمسخر رہ جاتے اور ہم انھیں بعض فلمی گانوں کے ترنم سے زیادہ اہمیت نہ دیتے۔ ان کے اشعار کی فضا میں نغمگی کی کیفیت اور بڑھ جاتی۔ اگر وہ اپنی زبان میں دیسی پن زیادہ پیدا کر لیتے۔ اور فراق صاحب کی طرح تھوڑی سی دیسی روایت بھی اپنا لیتے تاہم انھوں نے اپنی غزلوں میں، الفاظ، صوت، ردیف و قافیے کی جھنکار، شعری فضا اور خیال کی تابناکی کے ساتھ ساتھ نغمے کے راگ و رنگ اور چلن سے جو نغمگی اور ترنم پیدا کیا ہے وہ مجموعی طور پر صرف کانوں سے سننے کا نغمہ نہیں ہے بلکہ محسوسات کے ساتھ دل میں اتر جانے والا نغمہ ہے۔

حسین و سادہ ہے کس درجہ فطرت شاعر — ہنسے تو غنچہ و گل، رو پڑے تو شبنم ہے

ہائے وہ غم کی کرم فرمائیاں — بھیگی راتیں اور وہ تنہائیاں

پھول مسکراتے ہیں دل پہ چوٹ پڑتی ہے — ہائے وہ لبِ خنداں، اف رے وہ شباب ان کا

جو تیرے عارض و گیسو کے درمیاں گذرے — کبھی کبھی وہی لمحے بلائے جاں گذرے

بے کیف زندگی ہے جئے جا رہا ہوں میں — خالی ہے شیشہ اور پئے جا رہا ہوں میں

نظر سے حسن دو عالم گرا دیا تو نے — نہ جانے کون سا عالم دکھا دیا تو نے

نگاہوں کا مرکز بنا جا رہا ہوں — محبت کے ہاتھوں لٹا جا رہا ہوں

آ کہ بیتاب انتظار ہوں میں — دل کی اک آخری پکار ہوں میں

نقاب حسن دو عالم اٹھائی جاتی ہے — مجھ ہی کو میری تجلی دکھائی جاتی ہے

بیخودی منزل سے بھی کوسوں نکل آئی جگر — جستجو آوارہ اب تک جادۂ منزل میں ہے

لہو آتا نہیں کھنچ کر مژہ تک — نہ آئے گی بہار اب کی برس کیا

اگرچہ ذوق نظارہ میں بھی ہزار سرمستیاں بھری تھیں
مگر یہ بیباکیاں کہاں تھیں، ترے حجاب نظر سے پہلے

جیسے اشعار جگر کے ترنم اور غنائیت ہی کی مثال نہیں ہیں۔ بلکہ بہترین شاعری کی بھی۔

ڈاکٹر وزیر آغا

"جگر کا تصوّرِ عشق"

عشق — اردو شاعری کا اہم ترین موضوع ہے بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ مناسب ہو کہ ہر زبان کی شاعری کا معتد بہ حصہ عشق کی واردات ہی سے متعلق ہے عشق دراصل نام ہے ایک فطری تڑپ، سوز اور لگن کا اور فطرت نے تسلسل حیات کے لئے اس کے والہانہ پن اور تُند زور بہاؤ سے بدرجۂ اتم فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ یوں کہ زندگی کا تسلسل، ربط و وصل کے بغیر ممکن نہیں تھا اور عشق کا جذبہ ہی اس "وصل" کا سب سے بڑا معاون ثابت ہو سکتا تھا — حیوانی یا نیم حیوانی زندگی میں اس عشق نے ایک اندھی تڑپ یا ایک جبلی لگن کی صورت اختیار کی جو "جنسِ مخالف" کی خوشبو سے بھڑک اٹھتی تھی اور یوں ربط و وصل کے امکانات روشن ہو جاتے تھے لیکن انسان تک آتے آتے کئی دوسری باتوں نے اس تڑپ میں تبدیلی پیدا کی اور عشق کا ناتراشیدہ جذبہ عقل و شعور کے عمل سے متاثر ہوتا چلا گیا چنانچہ انسان کے ہاں جذبے اور فکر کی وہ آویزش شروع ہوئی جو حیوانی یا نیم حیوانی زندگی میں موجود نہیں تھی اور اس کے نتیجے کے طور پر خود عشق کے جذبے میں بھی ایک ایسا نیا رنگ پیدا ہوا جو اس سے قبل ممکن نہیں تھا تاہم قدیم

شاعری کا جائزہ لیں تو عشق کی ناتراشیدہ صورت کے مطابق عام دکھائی دیتے ہیں ــ یعنی اس شاعری میں عشق کا جذبہ درحقیقت "خواہش وصل" ہی کا دوسرا نام ہے ــ بعد کی شاعری میں تکمیلی عناصر کی آمیزش نے عشق کے مزاج کو ایک بڑی حد تک بدلا اور اس کی تندی اور وحشت پر بندھ باندھ کر اس میں رفعت اور لطافت بھی پیدا کی تاہم بنیادی طور پر عشق کی نوعیت اس لگن یا تڑپ سے مختلف نہ ہو سکی جس کی منزل وصل کے سوا اور کوئی نہیں تھی اس شاعری میں عاشق جس کی شمع کی طرف پروانہ وار لپکتا تھا اور اگر اپنے راستے میں کوئی رکاوٹ پاتا تھا تو اس کا جذبۂ عشق ایک طوفانی ندی کی صورت اختیار کر لیتا تھا چنانچہ اس عشقیہ شاعری کی اساس حسن اور عشق کے علاوہ اس "دیوار" پر بھی قائم تھی جو ان دونوں کے درمیان حائل ہو کر حسن میں نکھار اور عشق میں تندی پیدا کر دیتی تھی ــ بیسویں صدی سے قبل کی اردو شاعری میں بھی عشق کی زیادہ تر یہی صورت ابھری ہے ۔ چند مستثنیات سے قطع نظر، ولی سے لے کر داغ تک عاشق کے پیش نظر وصل کی ایک شدید آرزو کے سوا اور کچھ نہیں اور شعرائے عاشق کی اسی پروانہ وار تگ و دو کے بیان میں اپنے قلم کا سارا زور صرف کر دیا ہے ۔ بے شک ان شعرائے عشق کو "عشق حقیقی" کے معنوں میں بھی پیش کیا ہے لیکن دراصل عشق کا یہ پہلو زیادہ تر رسمی اور اکتسابی ہے اور اس میں وہ خلوص اور وارفتگی نہیں جو "عشق مجازی" سے خاص ہے ۔ عشق مجازی نے اپنی اسی حیوانی صورت سے تو یقیناً ایک بڑی حد تک انحراف کیا ہے اور اس پر سماجی مقتضیات اور عقلی گرفت نے نمایاں

اثرات بھی مرتسم کئے ہیں۔ تاہم اس نے بنیادی طور پر گوشت اور خون کے ساتھ اپنا تعلق برابر قائم رکھا ہے اور مادی وصل کا تصور ہی اس کی منزل ہے۔
اس کے برعکس بیسویں صدی کی اردو شاعری میں عشق کا تصور ایک انوکھی کشادگی اور رفعت سے آشنا ہوا ہے جس سے مادی وصل کا تصور پس منظر میں چلا گیا ہے۔ اقبال اور جگر اس نئے انداز فکر کے سب سے بڑے ترجمان ہیں۔ ان کے ہاں عشق کی کیفیت "وصل" کے تصور سے دامن چھڑا کر ایک مقصود بالذات قوت کے طور پر ابھری ہے اور اسی لئے کسی گوشت پوست کی ہستی سے اس کا تعلق ایک بڑی حد تک رسمی اور روایتی ہے لیکن اقبال اور جگر میں اس بنیادی یک رنگی کے بعد ایک کشادہ خلیج کا احساس ہوتا ہے کیونکہ دونوں نے عشق کے سلسلے میں اپنے اپنے مزاج کے مطابق "ردعمل" کا اظہار کیا ہے بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کا عشق "جسمت" سے مشابہہ ہے لیکن جگر کا عشق "عمرانی" کی مانند ہے دوسرے لفظوں میں اقبال نے عشق کو ایک مثبت قوت کے روپ میں دیکھا ہے جو تحرک اور تندی سے آشنا ہو کر چاروں اکناف میں بڑھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے تا آنکہ ساری کائنات اس کی زد میں آ جاتی ہے لیکن جگر کے ہاں عشق "انکشاف ذات" کا ایک عمل ہے یعنی عشق ایک ایسی قوت ہے جس کی مدد سے وہ اپنی ذات کے بحر بیکنار کی غواصی کرتا ہے قوت ایک ہے لیکن اس قوت کے بڑھنے اور پھیلنے کی اطراف DIRECTIONS مختلف ہیں ـــ اقبال نے عشق کو ایک تڑپتی اور تلملاتی ہوئی قوت کے

روپ میں دیکھا ہے جو شاعر کی ذات سے ابھر کر خارجی زندگی کی وسعتوں میں مصروف
تگ و تاز ہے۔ اقبال کے ہاں اس قوت کی سب سے بڑی علامت "شاہین"
ہے جو بندشوں، حد بندیوں، مصائب اور حوادث کی پرواہ کئے بغیر بلندیوں
کی طرف پرواز کرنے کی سکت رکھتا ہے۔ بے شک اقبال نے اس عشق کی کوئی
واضح "منزل" معین نہیں کی لیکن اس منزل کے سائے کلام اقبال میں صاف
لہراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف جگر کے ہاں عشق، ایک کسک، ایک
سوز ناتمام کی طرح ہے جو باہر کو لپکنے کی بجائے "اندر" کی دنیا میں سمٹتا اور
دھیما دھیمے گنگناتا چلا جاتا ہے۔ اس "عشق" کی کوئی منزل نہیں بلکہ
یوں کہنا چاہیئے کہ یہ اپنی منزل آپ ہے۔ چنانچہ نہ صرف اپنے عمل اور رخ میں
بلکہ نوعیت اور مزاج میں بھی جگر کا عشق اقبال کے عشق سے مختلف ہے اور جگر
کے تصور عشق کو سمجھنے کے لئے اس فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

بظاہر جگر کے کلام میں عشق و حسن کے سلسلے میں وہ تمام رجحانات ملتے ہیں
جو اردو شاعری میں مروج رہے ہیں یعنی شاعر محبوب سے وصل کی خواہش کا اظہار
کرتا ہے، اس کی بے نیازی اور بے وفائی سے نالاں ہے اور اسے ہدف طنز
بناتا ہے، پھر محبوب سے گفتگو کرتے ہوئے زبان کی صفائی، برجستگی اور نکتہ آفرینی
کے وہ تمام جوہر بھی دکھاتا ہے جو اردو شاعری میں ارتقا کی منازل طے کر چکے
ہیں اور اسی طرح اپنی ناکامی اور نامرادی کا بار بار ذکر بھی کرتا ہے لیکن راز و
نیاز، وصل و ہجر اور فتح و شکست کے ان تمام سطحی معاملات کے پس پشت عشق
کے بارے میں اس کا ایک اپنا خاص نظریہ آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر ابھرتا

چلا آیا ہے اور اپنے مخصوص مزاج، انداز اور کیفیت کے باعث بالکل الگ اور انوکھا نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو یہی بات قابل غور ہے کہ جگر کے ہاں محبوب کا سراپا واضح طور پر نہیں ابھرا یعنی جگر نے محبوب کے جسمانی حسن کے ذکر میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ حسن اُس کے نزدیک عشق کے لئے ضروری تو ہے اور شاعر نے اس کا نام بھی بار بار لیا ہے لیکن مجموعی تاثر یہی مرتب ہوتا ہے کہ یہ حسن ایک مثالی ہستی کا ہے کسی گوشت پوست کے انسان کا نہیں۔ کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جگر کے ہاں حسن محبوب محض ایک فریب نظر ہے بلکہ صرف یہ کہ اُس نے محبوب کے وجود کو جسمانی صفات کی بجائے مثالی صفات سے نمایاں کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اُس کے ہاں خود حسن کو وہ اہمیت حاصل نہیں جو عشق کو ہے۔ بیشک عشق کے جذبے کو تحریک دینے اور ابھارنے تک تو حسن کارآمد ہے لیکن اس کے بعد شاعر اپنے جذبے کی شدت اور ہمہ گیری میں اس درجہ محو ہو گیا ہے کہ اس کے لئے حسن کی حیثیت اضافی ہو کر رہ گئی ہے۔ عشق کے مقابلے میں حسن کو ثانوی حیثیت دینے کے اسی رجحان کے باعث جگر کے کلام میں محبوب کے خدوخال بھی نمایاں نہیں ہو سکے اور عشق کا جذبہ ہی ہر شے پر محیط ہو گیا ہے۔ اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ جگر کے ہاں خود محبوب بھی عشق کی ”گرمی“ سے متاثر ہے اور بعض اوقات حسن کی روایتی بے نیازی اور سنگ دلی کا مظاہرہ کرنے کی بجائے خود عشق کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ گویا شاعر نے عشق کو اس درجہ پھیلایا ہے کہ خود حسن اس کی زد میں آ گیا ہے۔ یہ چند اشعار مذکورالذکر نکتے کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

محبت کے جلوے نہیں حسن سے کم — انھیں بھی مرے ساتھ حیرانیاں ہیں

اللہ اللہ عشق کی رعنائیاں — حسن خود لینے لگا انگڑائیاں

تماشا دیدنی ہے دیکھ لیں اہلِ نظر آکر — مرے ہمراہ منزل کا بھی گرد کارواں ہونا

عشق کی بے نیازیاں بن کر — حسن کو بے قرار کرتا ہوں

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا — دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آ ہی گیا

ستم عشق میں آپ آساں نہ سمجھیں — تڑپ جائیے گا جو تڑپائیے گا

کہیں چپ رہی ہے زبانِ محبت — نہ فرمائیے گا تو فرمائیے گا

لیکن یہ تو شاعر کے عشق کا محض ایک پہلو ہے۔ ورنہ اصل چیز تو جگر کے کلام میں عشق کی شدت اور ہمہ گیری ہے۔

اب ان کا کیا بھروسہ وہ آئیں یا نہ آئیں — آ اے غمِ محبت تجھ کو گلے لگائیں

زیست ہے زیست جو رگ رگ میں رواں ہے مرے عشق

موت ہے موت اگر رقص نہیں جوشش نہیں

اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں — میری آغوش کو اب حسرتِ آغوش نہیں

عشق ہے ہر موئے تن سے نغمہ زن — بج رہی ہیں ہر طرف شہنائیاں

اس پر کرے خدا ہی رحم گردشِ روزگار میں

اپنی تلاش چھوڑ کر جو ہے تلاشِ یار میں

تجھے اے عشق سینے سے لگاؤں دیدہ و دل سے

ترے ہر درد میں پنہاں نشاطِ جاودانی ہے

عشق کا ہاتھ سے پیمان نہ جانے پائے — جان جائے مگر ایمان نہ جانے پائے

صحرائے جستجو سے نہ آگے بڑھے قدم　　گم اسکی وسعتوں میں ہر اک کارواں ہوا
کیا بلا عشق تماشہ ساز ہے　　اس کا ہر انجام اک آغاز ہے
کمال عشق بھی کیا کیا فریب کار ہوا　　کہ اپنے پر مجھے اکثر گمانِ یار ہوا

اِن اشعار کے مطالعہ سے دو تین باتیں واضح ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ جگر محبوب سے بھی بے نیاز رہ سکتا ہے بشرطیکہ اُسے غم محبت حاصل رہے۔ پھر یہ کہ ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب وہ محبوب کے حسن کی بجائے اپنے ہی حسن کا پرستار بن جاتا ہے اور اُسے محبوب کے نہونے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اسی طرح بعض اوقات محبت ایک ایسا روپ دھار لیتی ہے کہ اُسے خود پر گمان یار ہونے لگتا ہے۔ حد یہ کہ وہ یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ خدا ہی اُس پر رحم کرے جو اپنی بجائے یار کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یہ تمام باتیں اس بات پر دال ہیں کہ جگر کے ہاں حسن کی بجائے عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور جگر حسن کی کرشمہ سازیوں اور رعنائیوں کی بجائے اپنے سوز ناتمام، کسک اور جستجو کو ہی حاصل حیات سمجھتا ہے۔ مگر بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ آخر آخر میں تو یہ عشق ایک ایسا "جام جہاں نما" بن جاتا ہے جس میں ساری کائنات منعکس دکھائی دینے لگتی ہے اور عشق اور حسن میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا :-

عشق کیا ہے، پرتو حُسنِ تمام　　شوق کیا ہے حُسن کا عکسِ شباب
ذرہ ذرہ ہے تیا مست گاہِ عشق　　صاف سنتا ہوں صدائے دردِ دل
اللہ اللہ تیرے غم کی وسعتیں　　کوئی عالم درد سے خالی نہیں

محبت میں نہیں ہے سیر مناظر کی ہمیں پرواہ　　ہم اپنے ہر نفس کو اک نئی دنیا سمجھتے ہیں
حسن سے عشق جدا ہے نہ جدا عشق سے حسن　　کونسی شے ہے جو آغوش در آغوش نہیں
عشق ہی کاش مرے عشق کا حاصل ہو جائے　　یہی رہبر یہی جادہ یہی منزل ہو جائے
وہ جانتا ہے اس کو جو ہے آشنائے عشق　　ہر ذرہ ہے مقام پر اپنے خدائے عشق

جگر اس بات کا آرزومند ہے کہ عشق ہی اُس کے عشق کا حاصل ہو جائے

حق یہ ہے کہ جگر کے ہاں جو "عشق" ابھرا ہے، اس کے سامنے کوئی خارجی منزل موجود نہیں بلکہ یہ تو اپنی منزل آپ ہے۔ مگر اس منزل کی تلاش میں جگر نے اقبال کی طرح خارجی زندگی کی وسعتوں میں بادیہ پیمائی نہیں کی بلکہ اس کی تلاش اپنے دل کے صحرائے اعظم میں کی ہے۔ اسی میں جگر کی انفرادیت ہے اور محض یہی بات اُسے زندۂ جاوید کر دینے کے لئے کافی ہے۔

ناظر کاکوروی

جگر کی انفرادیت

رسکن نے لکھا ہے کہ صحت مند فن پیدا کرنے کے لیے انسان کو متقی اور مقدس بھی ہونا چاہیئے۔ اس نظریہ کے مطابق عصریہ شاعروں میں جگر نہ صرف طرز نو کے خالق ہیں بلکہ طرز احساس بھی اُن کا منفرد ہے۔ جگر کی غزل میں مخصوص لب ولہجہ لطیف کھنک بے پناہ خلش، شگفتہ چبھن اور جراحت آمیز کسک پائی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ احساس منفرد ہر جگہ نظر آتا ہے اُن کے کلام میں ظاہری وباطنی شخصیت کا فرق بھی محسوس ہوتا ہے اگر جگر کی شعری صلاحیتوں کا پتہ چلانا ہو تو ان کی اندرونی آویزش کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اُن کی کشمکش میر و غالب کی باطنی کشمکش سے بھی ماورا ہے۔ جگر کی شاعری خودی اور لطیف انانیت کی آمیزش کہی جا سکتی ہے۔ جگر کی خودی۔ میر کی خودی سے بھی علحدہ شئے ہے میر میں فنی نازک خیالی (خودی) پائی جاتی ہے اور جگر ثقافتی خودی کے قائل ہیں اُن کی خودی ان عناصر مروجہ پر (خودی کے خلاف) ضرب شدید کی حیثیت رکھتی ہے اور سماجی اقدار بھی آسانی سے ان کی خودی و انفرادیت کو ابھارتے رہتے ہیں جگر کی شخصیت کا ایک بڑا حصہ حالی کی طرح سماجی اقدار سے متعلق ہے جگر کی شاعری کا پس منظر بھی بے حد لطیف ہے جگر کا ذہن رسا۔ روایات پارینہ کے مروجہ نظام کے خلاف بغاوت پر تلا ہوا نظر آتا ہے اسی جذبہ نے حالی کی طرح

جگر میں بھی عظمت تو پیدا کر دی ہے۔ لیکن زیادہ استاج سکے، بقدر ذوق اور بقدر ظرف محض جگر کو رنگین شاعر ہی سمجھ سکے۔ حقیقت یہ ہے جگر کی شاعری یکسر صداقت ہے اور اصلیت و حقیقت کا پرتو۔ اور اس کی شعری تحریک کی خودی میں کہیں بھی ہم کو ہیجان اور تلاطم نظر نہیں آتا۔

جگر میں جا بجا شریفانہ جذبہ قدامت بھی کارفرما ہے حالی کی طرح جگر نے بھی عشق و محبت کا وہ اعلیٰ معیار پیش کیا ہے جہاں عشق کو سپردگی کا شبہہ ہونے لگتا ہے یہ صلاحیت غالب سے کہیں زیادہ حالی میں اور حالی سے وراثتاً جگر کو عطا ہوئی ہے۔ جگر اکثر ماحول کے زیادہ تر غزلوں میں چمک و کشش پیدا کرتے ہیں اور اپنے پندار کا لحاظ کیے بغیر حقیقی محبت کا اعتراف کرتے ہیں اور جگر پہلے شاعر ہیں جو محبت اور محبوب کی ہستی کو ایک لازمی انسانی تعلق محسوس کرتے ہیں اور یہی وہ راہ روشن ہے جہاں جگر شعری سحر کاریوں سے ہستی کی ماہیت اور زندگی کی شکل و صورت بدل دیا کرتے ہیں۔ جگر کو اپنی ہستی موہوم کا عرفان بھی انھیں انسانی رشتوں کے کمزور سہارے ہوتا رہتا ہے۔ محبوب۔ معصومیت اصرار خلوص۔ احترام محبوب پاکیزگی عصمت، احساس محبت صلاحیت محبت کی پرانی اقدار حیات ہم کو ورثہ میں ملی ہیں لیکن جب یہی پارینہ صلاحیتیں بہ انداز نو جگر کرتے ہیں تو ان کا مفہوم ہی یکسر بدل جاتا ہے اور ان پارینہ روایتی اقدار میں ایک زندہ اور نئی روح تیزی سے دوڑنے لگتی ہے۔ جگر کے شعر میں حالی کی طرح انسانی روح کا مایوسانہ کرب و بے چینی کی بے پناہ چیخیں گو نجتی نہیں نظر آتیں۔ حالی کی طرح جگر بھی عشق کی بے راہ روی سے ضرور خائف ہیں وہ عشق کو

ترغیب و تحریص سے تعبیر کرتے ہیں جس طرح حالی منافاہت کے خواہاں ہیں اُسی طرح عشق کی راہوں کو کج راہی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن جگر کی سنجیدہ شوخی لطیف سکراہٹ اور مخصوص مزاج بھی شعری سحر کاریوں کو بلند کرتا رہتا ہے جگر کی مسکراہٹ کو اندرونی کشمکش سے فرار کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے اس میں حقارت اور نکبت دونوں جذبات بہ یک وقت موجود ہیں جگر نے اپنی ہستی کے متضاد عناصر کو ایک دوسرے میں مدغم کرنے کی مطلق کوشش نہیں کی۔ میر نے جو غم دوراں کھو کے پایا تھا حالی نے کھویا نہیں لیکن جگر نے اُسی غم دوراں میں توازن سے کام لیا۔ جگر عملی ذاعلی، نوعیت کے قایل نہیں ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں جگر اپنے معاصرین میں امتیازی حیثیت سے نمایاں ہیں۔ جگر اپنے مخصوص رنگ میں مستقلاً منفرد ہیں اور اُن کا ایک مستقل اسلوب ہے۔ معنویت بھرپور اور اُسی کے ساتھ سلیقہ سے حسن بھی۔ جگر کا کلام زندگی سے عبارت ہے وہ قدیم اقدار حیات کے پروردہ ہوتے ہوئے بھی حسن و بصیرت کے نئے زاویوں کو پیش کرتے رہتے ہیں۔

جگر شاعر ہے اور ــــــــــ سراپا شاعر محفل شاعری کا وہ چھلکتا ہوا جام ہے جس سے سب سرمست ہو گئے انھوں نے ایسا نغمہ چھیڑا جس کی دُھن دلوں کو برما گئی ... جگر غزل میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں اس شاعر کی غزلیں قدیم تغزل اور موجودہ رنگین نگاری کا مخلوط نمونہ ہیں۔ موزوں الفاظ اور دلکش ترکیبوں سے وہ خیالات کا ایک ایسا راج محل تعمیر کرتا ہے جہاں نغمے ہی نغمے بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں چمنستان سخن میں اس بلبل نے وہ نغمہ سنجیاں کیں جو فضائے بسیط پر چھا گئیں۔ جگر ایک فطری شاعر ہیں، وہ جو کچھ کہتے ہیں سمجھ کر کہتے ہیں

ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ سادگی روانی اور دلکش تسلسل جگر کا حصہ خاص ہے۔ سادگی و بے تکلفی حسرت کی خصوصیت ہے لیکن سادگی میں کشش اور لطافت پیدا کرنا جگر کا حصۂ خاص ہے۔

اگر کوئی تمھیں سا بے وفا ہو
بتاؤ کیا تمھارے دل پہ گذرے

اب تو یہ بھی رہا نہیں احساس
درد ہوتا ہے یا نہیں ہوتا

دل کو کیا کیا سکوں ہوتا ہے
جب کوئی آسرا نہیں ہوتا

یا یہ شعر غضب ہے عکاسی کا حق ادا کردیا۔

شبنم آلودہ وہ حسیں آنکھیں
رُخ پہ اُڑتی ہوائیاں توبہ

جگر نے بے راہ روی کی زندگی میں بھی کبھی جو کچھ بہک کے بھی کہا ہے وہ واردات قلب سے اور آج اقدار حیات بدلنے کے بعد بھی اُس کے خیالات احساسات اور اس کی شعری صلاحیتوں میں مطلق تضاد نظر نہیں آتا ہے وہ تو اپنے کلام میں حقیقی تاثرات قلبی اور واردات کا جذبہ پیش کرکے عوامی قلوب کو مسحور کرتا ہے اور برابر تا رہتا ہے اور لطف یہ ہے کہ خود جگر بھی اس نشہ سے کبھی کبھی سرشار و بے خود نظر آنے لگتا ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ جگر حسن و عشق کا متوالا ہے۔ یہ غلط ہے۔ یہ اتہام ہے یہ بہتان ہے جگر سے زیادہ متقی اور پاکباز شاعر اس عصریہ ادب میں نظر نہیں آتا وہ محبت کی رنگین وادیوں سے ضرور گذرا ہے لیکن بچتا ہوا اور دامن کو بچاتا ہوا۔ اسی لئے جگر کی شاعری یکسر

غزل ہی تک محدود ہے۔ جگر کی شاعری کو سمجھنا جس طرح کل مشکل تھا اُسی طرح آج بھی جگر کو سمجھنے کے لئے اُن کے شعر سے زیادہ اُن کے ماحول کو سمجھنا چاہیئے اور اصغر کے تعلق قریبی کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے جس نے جگر میں خلوص صداقت اور ثقافت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔

ہائے وہ کافروں کی کافر جنوں انگیزیاں
تم کو پیار آئے نہ آئے مجھ کو پیار آ ہی گیا

پیار آنے کی لطافت بیان سے باہر ہے اُسی طرح یہ شعر کس قدر پُر کیف ہے۔

میرا جو حال ہو سو ہو برقِ نظر گرائے جا
میں یونہیں نالہ کش رہوں تو یونہیں مسکرائے جا

یہ شعر خوب ہے

بس اک سمت اُڑا جا رہا ہوں وحشت میں
خبر نہیں کہ خودی کیا ہے بے خودی کیا ہے

یا یہ شعر

پاسِ ادب سے چھپ نہ سکا رازِ حسن و عشق
جس جا تمہارا نام سنا سر جھکا دیا

سر جھکا دینا بھی خوب ہے تعریف سے مستغنی ہے۔

یوں دل کے تڑپنے کا کچھ تو ہے سبب آخر
یا درد نے کروٹ لی یا تم نے ادھر دیکھا

حضرت نوح کے ایک باکمال شاگرد نے ایک جگہ فرمایا کہ جگر استاد داغ

سے زیادہ متاثر ہیں۔ مجھکو اس رائے سے شدید اختلاف ہے اقبال نے تو داغ کو کچھ کلام دکھایا بھی تھا لیکن اقبال کے انفرادی رنگ نے اُن کو صاحب طرز شاعر کی حیثیت سے پیش کیا۔ اسی طرح جگر کی انفرادی مساعی نے جگر کو بلند کیا ہے داغ کی غلامی جب نوح کے کلام میں کوئی امتیازی و تخلیقی اثر نہ چھوڑ سکی تو بھلا جگر ایسے خلاق معنی کو اُس سے کیا فائدہ پہنچ سکتا۔

کہ سامب شوخی۔ الفاظ کی تکرار۔ محبوب کا سراپا یہ چیزیں امیر۔ منیر۔ مومن غالب و حسرت سے جگر کو ورثہ میں ملیں یہ ضرور ہے مضطر اور بوڑھے ریاض خیرآبادی کے کلام سے ضرور جگر نے جوانی میں کبھی استفادہ کیا ہے کہ جگر کی سنجیدہ شوخی کو داغ کی بے محل شوخی سے کوئی علاقہ نہیں ہے جگر کو اگر حصہ ملا ہے تو اصغر صاحب نظر کا جن کی ثقافت طبع نے جگر کو آج زمرہ ادب میں خضر راہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے جگر کی نگارشات علمیہ بے حد لطیف و موثر ہیں۔

کیفیس کی طرح اُس کی نگاہ میں حسن کی بڑی قیمت و وقعت ہے اُس کا دل لذت عشق سے سرشار ہے جو نغمات بھی اسکے منتا ہے وہ بے کیفی میں سر دھننے لگتا ہے ظالم نے کیا شعر کہا ہے قیامت ہے۔

شباب سرکش، جمال سرکش، خیال سرکش نگاہ سرکش
خبر وہ رکھیں گے کیا کسی کی انھیں خود اپنی خبر نہیں ہے

جگر نے بعض جگہ نغمگی سحر پیش کیا ہے۔

تاعمر آہ کنج قفس دیکھنا پڑا
اڑ کر چلے تھے چار قدم آشیاں سے ہم

رازداری کا یہ عالم ہے کہ

آئے زباں پہ رازِ محبت مجال ہے
تم سے مجھے عزیز تمہارا خیال ہے

ثقافت کا یہ اعلیٰ معیار جگر قائم کر سکتا ہے۔

کس طرف جاؤں کدھر جاؤں کسے آواز دوں
اے ہجوم نامرادی جی بہت گھبرائے ہے

اس شعر کی بھی تعریف نہیں ہو سکتی۔

تم مجھ سے چھوٹ کر رہے سب کی نگاہ میں
میں تم سے چھوٹ کر کسی قابل نہیں رہا

حسن و عشق کا یہ اعلیٰ معیار جگر کے سوا کوئی دوسرا شاعر ابتک ادب میں پیش نہ کر سکا ایک جگہ بڑے طنز سے کہا ہے۔

ترا جذبۂ شوق بے حقیقت ذرا پھر تو ارشاد فرمائیے گا
نہیں کھیل ناصح جنوں کی حقیقت سمجھ لیجئے گا تو سمجھائیے گا

ایک باکمال ناقد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ معنوی لحاظ سے جگر جہاں بیان اندازِ خاص منفرد ہے سرمستی و سرشاری اُس کا حصۂ خاص ہے۔ جگر کی زبان غزل کی زبان ہے حسن و عشق کی چاشنی معاملہ بندی کی کیفیات جو جگر کے یہاں ہیں کسی کے یہاں نہیں اور سب سے بڑا جوہر یہ ہے کہ جگر کی بے ساختگی اور موسیقیت نے معاصرین میں اُن کو ممتاز کر دیا ہے۔

دل تھا ترے خیال سے پہلے چمن چمن اب بھی روش روش ہو مگر پائمال ہے

دل میں کسی کے راہ کیے جا رہا ہوں میں
کتنا حسیں گناہ کیے جا رہا ہوں میں

جب تک ہمارے جسم میں جانِ حزیں رہے
نظریں مری جواں رہیں دل حسیں رہے

مشہور ناقد ریچرڈ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شعری موسیقیت شعری عظمت کی نشاندہی کرتی ہے۔ جس شاعر کے کلام میں جس حد تک تیز موسیقی ابھرتی نظر آئے گی اسی حد تک اُس کی شعری صلاحیتیں بھی ابھرتی رہیں گی۔ آج کالرج اور ٹینی سن کا کلام کیسر نغمگی کی وجہ سے زندہ ہے یہ مانا جا سکتا ہے کہ کالرج کے مقابلہ میں جگر کے یہاں شدت نہیں ہے اُس کی وجہ ثقافت ہے اسی لیے جگر کے نغمات میں آہستہ آہستہ خراماں بہنے والا سکوت ہے ایک لطیف ٹھہری روانی ہے جو ہمیں کالرج سے زیادہ کیٹس کی یاد دلاتی ہے۔

مجھے دیں نہ غیض میں دھمکیاں گریں لاکھ بار یہ بجلیاں
مری سلطنت یہی آشیاں مری ملکیت انہی چار پر

کیا خوب شعر ہے

درد و غم دل کی طبیعت بن گئے
اب یہاں آرام ہی آرام ہے

در دو ستمی گر مجھے اور چاہیے کیا جگر
غم یار سے مرا شیفتہ میں فریفتہ غم یار پر

جگر کا اصلی رنگ یہ بھی نہیں ہے اُن کی فطری موسیقی اُس وقت یہ انداز

خاص ابھرتی ہے جب درد سے اُن کا شعری احساس شکست کھاتا ہے۔

دل گیا رونقِ حیات گئی　　غم گیا ساری کائنات گئی
ان کے بہلانے سے بھی نہ بہلا دل　　رائیگاں سعی التفات گئی
مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن　　ایک مسیحا نفس کی بات گئی

شیلے نے لکھا ہے کہ ہمارے سب سے زیادہ شیریں نغمات وہی ہوتے ہیں جن سے ہمارا غم تازہ ہوتا ہے یا جن سے ہمارے غمگین خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ جب جگر شعر کہتے ہیں تنہائی میں بیٹھے بیٹھے سروں میں پڑھتے ہی وفورِ غم سے تلملا اُٹھتے ہیں اور اُس کے بعد آپ کو متاثر کرتے ہیں اُس وقت جگر اپنے شباب پر پہنچ جاتے ہیں ان کا نغمہ اور اس کا کیف رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے اور شاعر کے دل کے ساز کا ایک ایک تار جھن جھنا اُٹھتا ہے اور سامع کا قلب بے زار کسی خیال خاص میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ ہے کمالِ فن اُس وقت جگر اس کرب کو اپنے درد میں سمو لیتا ہے۔

دل کو نہ چھیڑ اے غمِ فرقت کہ اب یہ دل
تیرے بھی التفات کے قابل نہیں رہا

وہی ہیں شاہد و ساقی مگر دل بجھتا جاتا ہے
وہی ہے شمع لیکن روشنی کم ہوتی جاتی ہے

ہائے ظالم نے غضب کیا ہے

بہارِ رفتہ مرکر پھر نہ آئی اے جگر واپس
چمن میں ہر خزاں کے بعد لیکن اک بہار آئی

جگر کو سورداس کا میاب مصور کہا جا سکتا ہے۔ اس سے مجھکو اتفاق کلی ہے کیا تصویر کھینچی ہے۔ محاکات کا حق ادا کر دیا ہے۔

چپ سے وہ بیٹھے ہیں آنکھوں میں نمی سی ہے
نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

جان ڈرائیڈن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ محبوب کے رنگین خون نے اس کے رخساروں سے کیا تبسم کیا ہے اور ایک شب کو یہ لہو اس درجہ شوخ نظر آنے لگا کہ اس کا جسم کا روئیاں روئیاں گویا ہو گیا۔ اس تلذذ پسندی و رنگینی کے معاملہ میں جگر کا معیار حسن یہ ہے

آستینوں کا وہ چڑھا لینا   گوری گوری کلائیاں توبہ
شبنم آلودہ وہ حسیں آنکھیں   رخ پہ اڑتی ہوائیاں توبہ!

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ تقسیم ہند کے بعد سے جگر کی رنگینی نے فلسفیانہ رنگ اختیار کر لیا ہے مجھے اس رائے سے بڑی حد تک اتفاق ہے جگر اردو زبان کے اولین کامیاب فطری اور فلسفی شاعر ہیں اور انھوں نے فلسفہ کی شدت کو رنگ و بو میں سمو کر غزل میں قوس قزح کا رنگ قائم کر دیا ہے۔

ظلمت شب نے دن پہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

ہائے وہ کیونکر جی بہلائے   غم بھی جس کو راس نہ آئے
ضبط محبت شرط محبت   دل ہے کہ ظالم امڈا آئے

اصل یہ ہے کہ جگر جس جگہ اخلاقیات کا درس دیتے ہیں تو عوام یہ سمجھنے لگتے

ہیں کہ جگر کا زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے۔ یہ اثر ہے ماحول کا — اُن کے گھر کا — اُن کے مزاج کا۔

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں
کیا تو نے کہا یہ اے ناداں فیاضیٔ قدرت عام نہیں
تو فکرِ نظر آپیدا تو کر کیا چیز ہے جو انعام نہیں

ان اشعار کو دیکھ کر ایک طبقہ جگر کو فراموش کرنے لگتا ہے۔

یہ لالہ و گل یہ صحن و روش ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریب چمن کے پردے میں تعمیرِ گلستاں ہوتے ہیں
جو حق کی خاطر جیتے ہیں مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں
جب وقت شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں

جگر نے خود اعتراف کیا ہے۔

مری سمت سے اُسے اے صبا یہ پیام آخرِ غم سُنا
ابھی دیکھتا ہوں تو دیکھ جا کہ خزاں ہے اپنی بہار پر

اس شعر کے مقابلہ میں شاد عظیم آبادی کا ایک شعر بھی غور طلب ہے

مرغانِ چمن سے پھول سنے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آتا ہے اگر تو آجاؤ ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

جگر کے بنیادی طرزِ فکر کو معلوم کرنے کے لئے یہ بے حد ضروری ہے کہ پہلے یہ معلوم کر لیا جائے اُنکی اساس طرزِ فکر کیا ہے۔ اس امر کی تحقیقات کے لئے اُن کی زندگی

کے مختلف ادوار پر نظر ڈالنے کی بھی ضرورت ہے۔ ہم آسانی سے ان کی زندگی کو
سو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا وہ حصہ ہے جب محض علی سکندر کی حیثیت سے
وہ مراد آباد میں اپنا وقت عزیز صرف کرتے تھے۔ اس دور کی شاعری کے نمونے
ضرور بصیرت افروز ہیں لیکن جگر خود اس دور کو قابل اعتنا تصور نہیں کرتے
اسی دور میں انھوں نے زیادہ تر مراد آباد میں وقت گذارا اور روایتی مکتب
سے مروجہ تعلیم حاصل کی۔ یہ ایک باکمال معلم کے سپرد کئے گئے جو لسانی اور دینی
تعلیم میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور جنھوں نے اس ابتدائی دور میں جگر کو نہ صرف
رسمیہ فارسی اور عربی کے ساتھ دینی تعلیم دی بلکہ انھوں نے ان کے سامنے اسلامی
اخلاق کی تعلیم پیش کی۔ یہ پہلا بنیادی نقش تھا جو جگر کے قلب پر مرتسم ہوا۔ انھوں
نے اس دور میں اسلامی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا اور مسلمانوں کے عروج و زوال
کی داستان اور اس کے اسباب و علل ان پر منکشف ہوئے اسی دور میں انھوں نے
سیاسی حالات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی کی گہرائیں
سمجھتے ہوئے ضمیر سے سنیں لیکن کوئی عملی قدم نہ اٹھا سکے۔ بچپن ہی سے درد
سے واسطہ پڑا۔ گلا بھی اس درد ناک نغمات کے لئے بہت موزوں تھا۔ نعت
گوئی شروع کی کبھی کبھی نظمیں بھی لکھتے تھے لیکن اس دور کے ختم ہوتے ہی
بے راہ رو زمانہ نے جگر کو کسی دوسری نہج پر ڈال دیا۔ شعر و نغمہ کے چشمے ابل
پڑے۔ اس دور میں مین پوری، بھوپال، بدایوں، آگرہ علیگڈھ میں جگر کی بڑی
قدر ہوئی۔ دوسرا تابناک دور اب شروع ہوتا ہے جب مشہور متغزل شاعر اعظم
حضرت اصغر سے ان کا ربط و ضبط بڑھا۔ اصغر بے شبہ متغزل شاعر تھے اور شاعر

سے زیادہ انسان انھوں نے جگر کے مرض کو پہچانا اور ایک دن اپنے پیر طریقت حضرت شاہ عبدالغنی منگلوریؒ کی خدمت اقدس میں اس جوہر نایاب کو تحفتاً پیش کر دیا حضرت شاہ عبدالغنی کی نگاہِ اولین نے جگر میں انقلاب پیدا کر دیا اب جگر شکستہ تاریخی عمارات آثار قدیمہ اور کھنڈروں کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے تھے اور جب وہ اصغر کے سامنے حاضر ہوئے تو بے اختیاراً ان کے قدم بوس ہونے کا دل چاہتا اور ان کا ذہن رسا انسان کامل کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف ہوجاتا وہ اوقات ایسے تھے جب جگر نے اصغر کی تربیت میں بہت کچھ سیکھا اور پایا۔ لازماً جگر کی شاعری کا رنگ نکھرنا شروع ہوا اور ان کی شاعرانہ سحرکاریوں کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ ان کا کلام خود ان کی زندگی کا آئینہ ہے تقریباً ہر شاعر صاف یا مبہم طور پر اپنی حیات دوروزہ کے کچھ دھندلے نقوش ضرور موضوع تحریر بناتا ہے چنانچہ جگر نے ہر بے راہ روی کی بنیاد پر قصر نو کی تعمیر کی۔ یہ تابناک دور اصغر کی وفات تک قایم رہا۔ اصغر کے فیض نظر کے اثر سے اس دوسرے دور میں جگر نے اپنی تمام غزلوں کا فلسفیانہ اور شاعرانہ مواد خود اپنی زندگی کے پرکیف واقعات اور دلکش حالات سے فراہم کیا جن سے آج بھی ان کے وسیع نظریہ حیات اور صحیح ادبی شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ان کے ابتدائی کلام سے ایسے بیشتر شعر منتخب کئے جا سکتے ہیں جن میں کسی بڑی حد تک جگر کی داخلی زندگی کے نقوش نظر آتے ہیں اور ان سے بہت اہم حالات و کوائف کا انکشاف بھی ہوسکتا ہے۔

جگر کی زندگی کا تیسرا دور اصغر کی وفات سے شروع ہوتا ہے۔ اب یہ
دور وہ ہے جس میں جگر کی تمام تر صلاحیتوں کے ابھرنے کا وقت قدرت
نے عطا کیا۔ واضح رہے کہ جگر کی تحریک یہاں اُن کے معاصرین سے قدرے
مختلف ہیں۔ جگر نے عشق کا ایک مخصوص تصور پیش کیا ہے جا بجا روایتی
تصور بھی ملتا ہے جہاں پرستاری کی جگہ خواہش کارفرما نظر آتی ہے۔ یہ بھی
کمالِ حق کا آخری نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ جگر سے پہلے ادب میں عشق کا وہ گداز
نظر نہیں آتا جو جگر کے کلام سے ہم کو ملتا ہے۔ جگر کی عشقیہ زندگی بھی گویا
اس طرح دو رخی ہے۔ پہلا وہ رخ ہے جب جگر کی بے راہ روی عین زندگی
تھی۔ اس دور میں روایت پرستی اور تصنع پر زور دیا گیا لیکن دوسرا رخ
ان کی شاعری کا وہ ہے جہاں شاعر دربارِ احدیت میں سربسجود ہو کر والہانہ
عرض و معروض کرتا ہے اور یہی وہ صحت مند جذبہ ہے جو تصنع اور بناوٹ سے
قطعاً بے نیاز ہے۔ معاصرین کے مقابلہ میں جمالیاتی حس جگر کو قدرت نے
بے پناہ عطا کی ہے وہ حسن کی باریک سے باریک نزاکتوں کو نگاہ میں رکھتے
ہیں حسن کہیں بھی ہو اور کیسا ہی ہو اُن کو بے حد محبوب ہے۔ جگر میں آبشار
کے ترنم، چڑیوں کے چہچہانے سے بےکس مصیبت زدہ افراد کی کراہوں
سے یکساں تاثر پیدا ہوتا ہے۔ جگر اپنی خواہش کا اظہار نہیں کرتا ہے اس
موقع پر جگر کی جمالیاتی حس خیام سے ٹکر لیتی ہے۔ ان کی پرکیف و گداز طبیعت
لالہ و گل میں شعلہ و شبنم کا حسن دیکھتی اور یہی احساس جگر کی عظمت کا پتہ دیتا
ہے۔ ایک بڑے شاعر کی یہ بڑی خصوصیت ہے کہ اس کا کلام اس کے عہد کی

سماجی معاشرتی اور دیگر عمرانی اقدارِ مروجہ کی نمائندگی کرتا رہا ہے۔ جگر کی
عاشقانہ اقدار کا تقابل غالب سے ضرور کیا جا سکتا ہے۔ اس حسن کے ساتھ
جگر کی سب سے بڑی صفت ان کی خودداری ہے اور خودداری کے ساتھ ان کی
آشفتہ سری کا سنبھلا ہوا انداز تو بہت عجیب و غریب جوہر لطیف ہے جگر
کے عشق میں خود فراموشی کے ساتھ ساتھ ایک بے پناہ بیداری کے آثار
بھی نظر آتے ہیں اسی لطافتِ خیال کو "شوخ ہوشیاری" سے تعبیر کیا جا سکتا
ہے۔ نام سے اختلاف ممکن ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے یہ ایک ایسی
ہوشیاری ہے جس میں دیوانگی کا غرور بھی مستتر ہے جگر کو بروقت حسن کی
جنت نگاہی اور محبوب کی آواز کے فردوس گوش ہونے کے ساتھ عشق کی
عظمت صحیحہ کا بھی احساس رہتا ہے اسی لئے معاصرین کے مقابلہ میں جگر
کا عشق منفرد اور پروقار نظر آتا ہے۔ جگر اپنے استاد اصغر کی طرح حسن کو کمزور
اور مجبور دیکھنا پسند نہیں کرتے اور نہ عشق پر آنچ آنے دینا ان کو پسند ہے۔ جگر
کے کلام سے جہاں شدت احساس کا پتہ چلتا ہے وہیں اعتدال کا بھی رنگ
نکھرا ہوا ملتا ہے یہ ایک عجیب بات ہے کیونکہ بالعموم شدتِ احساس میں انسانی
دماغ توازن و اعتدال کھو دیتا ہے لیکن جگر کے یہاں یہی کمال روز روشن
کی طرح عیاں ہے۔ جگر اپنے عشق میں ماورائیت کی خلاؤں میں مطلق نہیں
بھٹکتے بلکہ انسانوں کی طرح ہر حسین شے کی آرزو کرتے ہیں۔ اُن کو جو
لطائف اس جد و جہد میں حاصل ہوتے ہیں اُن کو وہ شعر میں بڑے سلیقہ سے
پیش کرتے ہیں اور یہی وہ انفرادیت ہے جس نے جگر کی شہرت ماہ تابہ ماہی

پہنچادی۔ جگر کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کی ارتقائی شائستگی اور بے پناہ
نغمگی ہے جگر کے پہلے گذشتہ ادوار میں جو رنگ شعری ملتا ہے اُس کو بھی ہم
اُردو شاعری کا ایک قابل قدر سرمایہ تصور کر سکتے ہیں اسی لئے انگریزی
شاعری میں ورڈس ورتھ، بائرن، شیلے اور کیٹس کے کلام کے مقابلہ میں
بے تکلف جگر کا کلام پیش کیا جا سکتا ہے۔ جگر نے مشرقی اداب کو کبھی
نہیں چھوڑا۔ ایک تیسری خصوصیت جگر کی اُن کا غیر معمولی تفکر ہے اسی لئے
اُن کا کلام آج بھی فکر و تخیل کا حسین ترین امتزاج کہا جاتا ہے اور یہی وہ
حسن ہے جو بہت کم معاصر شعرا کو نصیب ہو سکا ہے۔ جگر کے کلام میں وحدتِ
خیال اور وحدت تاثر کے آثار بھی موجود ہیں مگر اُن کی بے ساختگی شیلی
و کیٹس کی طرح بے آہنگی نہیں ہے ہم اس نازک منزل میں بھی جگر کی جدت
اور نازک خیالی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کیٹس کے یہاں لامرکزیت کھٹکتی
ہے لیکن جگر کی مرکزیت بہت ارفع اور روشن ہے۔ کولرج نے اشیائے
مافوق الفطرت کا کمزور سہارا لیا ہے لیکن جگر نے محض عصریہ تقاضوں کے تحت
شعر کہا اُن کی نغمگی منظر کشی ہے اور ان کے کلام کے مطالعہ سے ہم کو مطلق بے کیفی
پیدا نہیں ہوتی اور یہیں سے جگر بحیثیت رومانی شاعر کے مشہور ہوتے ہیں
اور یہ وہ کمال فن ہے جو معاصرین کے مقابلہ میں اُن کی انفرادی جد و جہد کو
جلوہ گر کرتا ہے۔

جگر کی ژرف نگاہی

(خواجہ مقبول احمد)

(آتش گل کے آئینہ میں)

خنجر ادا اور تیغ ستم سے گھائل سبھی ہوتے ہیں لیکن نیم نگاہی سے نبض شناسی کی منزل تک پہنچ جانا معدودے چند کا حصہ ہے۔ قسام ازل نے جگر جیسے حوصلہ مند کے لئے ہی یہ مخصوص کیا تھا کہ وہ نگہ مختصر اور دزدیدہ نگاہی کے مراحل طے کرتے ہوئے ژرف نگاہی کے حامل ہو گئے۔ نہ میری یہ تمنا ہے کہ خواہ مخواہ فلسفہ اور شاعری کی بحث چھیڑی جائے اور نہ یہ آرزو کہ جگر کو اقبال و غالب کا ہم پلہ ثابت کیا جائے یا اس معیار پر کس کر ان کا بھرم کھولنے کی سعی لاحاصل۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ غالب و اقبال نے شاعری کو فکر و نظر کے جس منارہ پر لا بٹھایا ہے اس کے بعد محض سطحی جذباتیت اور آس پاس کی باتوں کو شاعری سمجھ کر سر آنکھوں پر جگہ نہیں دی جا سکتی۔ یہ حقیقت بھی تسلیم کہ غزل کو میر کا مزاج پسند ہے اور عوام یا عوامی تقاضوں کی عظمت بھی قبول مگر اب شاعر کے لئے نباض دوراں اور ناقد حیات ہونے کی شرطیں پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ میر بھی "عوام سے گفتگو" کرنے کے باوجود اپنے اشعار کو "خواص پسند" دکھا کر زمانہ سے عظمت تسلیم کرانا چاہتے تھے۔ سطحی جذبات کی

ترجمانی انھیں بھی ناپسند تھی۔ صاف گوئی کا تقاضہ یہ ہے کہ بے جھجھک کہہ دیا جائے کہ جگر اپنے سارے کمال فن اور مقبولیت عام کے باوجود "آتش گل" کی آنچ پیدا کرنے سے پہلے مشاعرے کے شاعر تھے اور ہلکی پھلکی جذباتیت کے ترجمان۔ ان کی رندی اور ان کے ترنم نے انھیں جتنا بھی مشہور کیا ہو لیکن انھیں بلندی کی منزل اس وقت حاصل ہوئی جب وہ بے پئے نشہ کے عالم میں نظر آئے وہ خود اپنے لفظوں میں "سنگ میخانہ" سے "پیر میخانہ" بن گئے۔ آخیر کے چند سالوں میں جگر نے شاعری میں توانائی اور معنویت کی منزلیں اس تیزی سے طے کی ہیں جنھیں دیکھ کر ششدر رہ جانا پڑتا ہے۔ بقول آل احمد سرور "جگر ہندوستان کے مسلمان شرفا اس متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو روز بروز بکھرتا جا رہا ہے جسے "ماضی سے محبت، تہذیب و شرافت کی پرستش، ایک مذہبی شعور، چند اخلاقی قدریں ایک مبہم سی انسان دوستی ورثے میں ملی تھیں۔ جگر انھیں قدروں پر پلے بڑھے۔ جوان ہوئے تو شباب کے تقاضے اور فطرت کے مطالبے انھیں بہالے گئے"، خیالات اور عمل کے تضاد نے ایک حسین پرکیف اور بامزہ شاعری کو ضرور جنم دیا تھا لیکن معیاری اور بلند پایہ شاعری کیلئے راہ اسی وقت ہموار ہوئی جب گفتار کا غازی کردار کا غازی بننے کی تیاری کرنے لگا۔

جگر بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں۔ رومان کتنے ہی پرفریب سہی حقیقت کے زیر سایہ ہی پروان چڑھتے ہیں۔ اگر شوق جستجو اور طبع سلیم موجود ہو تو وہ پردہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے اور پھر فن کا حقیقت کی تلخیوں کو فن کی تیرہ باری

یا افسوں و افسانہ پر ترجیح دینے لگتا ہے جگر ایک صحت مند ذہن متوازن طبیعت اور حساس دل رکھتے تھے اس لئے انھوں نے زمانہ کے تقاضوں کو حسن و عشق کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ محسوس کیا۔ شہر کانپور ہو یا چھپرا کے مظالم یا بمبئی کی بہیمیت انھوں نے ہمیشہ مظلوں اور مجبوروں کا ہمنوا بن کر صدائے احتجاج بلند کی۔ آزادی وطن اور تقسیم ہند سے پیدا ہونے والے مسائل پر اظہار خیال کیا اور تباہیوں پر خون کے آنسو روئے۔ لیکن شاعر کی آنکھ غمگساری کے آنسو بہانے کے ساتھ ساتھ انسانیت کی پائیداری کا یقین بھی دلاتی رہی۔

کہاں کے لالہ و گل کیا بہار توبہ شکن — کھلے ہوئے ہیں دلوں کی جراحتوں کے چمن
خلوص شوق نہ جوش عمل نہ درد وطن — یہ زندگی ہے خدایا کہ زندگی کا کفن
جمال اس کا چھپائے گی کیا بہار چمن — گلوں سے دب نہ سکی جس کی بوئے پیراہن
جنوں کے بے سروسامانیوں پہ رنج نہ کر — اگر جنوں ہے سلامت ہزار ہا دامن

جگر رومانی زندگی کے سارے پہلوؤں کے رمز شناس اور سارے فریبوں سے واقف ہو چکے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ زمانہ اور اہل زمانہ کے مظالم حسن و عشق کی سدا بہار روش کو جلا دینا چاہتے ہیں انھوں نے بڑی صاف گوئی سے اس بے بسی کا اظہار کیا ہے:

اللہ رے بے بسی کہ غم روزگار بھی — بیٹھا ہوں تیرے غم کے برابر لئے ہوئے

شعور کی منزلیں طے کرنے کیلئے کسی پیر یا تحریک کی دستگیری ضروری نہیں ہوتی حساس دل اور بیدار ذہن اپنی دنیا آپ پیدا کرتے ہیں اور خود بخود صحیح

راستہ پر آجاتے ہیں۔ جگر ربودگی و سپردگی کی ان منزلوں سے گذرے جہاں مختصر وصل کے بعد ہجر محض یادوں سے کھیلنا۔ اور یادوں یادوں کو ہی محبوب سمجھ کر گلے لگانا ہی رہ اس آسکا۔ مقامات عشق کے سارے حجاب ان کی نظروں کے آگے چکے تھے زیب کا ایک پردہ تھا کچھ دنوں ذہنی کش مکش کے شکار ضرور رہے۔

حجاب عشق کو اے دل بہت غنیمت جان رہے گا کیا جو یہ پردہ بھی درمیاں نہ رہا

لیکن ان کی سلیم الطبعی نے پردہ چاک کرنا اور تلخ حقیقتوں سے آنکھیں چار کرنا سکھایا۔ وہ فریبوں کی وادی اور ہجوم جلوہ کے تماشائی رہنے کے بعد "جمال جہت آشنا" سے گھبرا چکے تھے اور خدا سے مزید وسعت کے طالب تھے۔ درگاہ ایزدی سے انہیں داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں سے "جمال جہت آشنا" کی خامیاں سمجھنے اور اس پر اضافہ کرنے کی توفیق ملی مجاز سے حقیقت۔ لیکن وہ اصغر کی دستگیری سے نہیں خود اپنی جستجو سے یہاں پہنچے اس لئے ان کے یہاں اصغر کی سی بلندی نہ سہی اصداقت کی سحر کاری ہے جو اپنا وزن رکھتی ہے

اب لفظ و بیاں سب ختم ہوئے اب دیدہ و دل کا کام نہیں
اب عشق ہے خود پیغام اپنا اب عشق کا کچھ پیغام نہیں
اللہ کے علم و حکمت کے محدود اگر اکرام نہیں
ہر سانس کے آنے جانے میں کیا کوئی نیا پیغام نہیں
اک شاہد معنی و صورت کے ملنے کی تمنا سب کو ہے
ہم اس کے نہ ملنے پر ہیں فدا لیکن یہ مذاق عام نہیں

یہ حسن ہے کیا یہ عشق ہے کیا، کس کو خبر ہے اس کی لیکن
بے جام فروغ بادہ نہیں، بے بادہ فروغ جام نہیں

حسن مطلق کی طرف رجوع کرنے سے انھیں مقام عشق کی معراج حاصل ہو جاتی ہے۔ اب وہ محبت اور زندگی کے ایک محدود دائرہ سے باہر نکل کر ایک وسیع و بے کراں محبت، ایک لازوال سرشاری اور عظمت غم کے مغنی بن جاتے ہیں۔ عرفان محبت بغیر توفیق ایزدی حاصل نہیں ہوتا اور اس منزل پر پہونچنے کے بعد کائنات کے ذرے ذرے میں حکمت کے دفتر نظر آتے ہیں۔ آرزو اور حسرت کے محدود تصور سے آگے بڑھ کر انسان کو عظمت غم اور مسرت زندگی کے سرچشمے ہاتھ آ جاتے ہیں۔ اس منزل پر پہونچنے کے بعد جگر کے یہاں بڑی معنویت اور توانائی آ جاتی ہے۔

وہ غم ہجر کے نوحہ خواں نہیں زندگی کے نغمہ خواں بن جاتے ہیں۔

یہ بزم گہہ ہستی ہے جگر یاں عشق کی صحت لازم ہے
کیا اس کی حیات و مرگ کہ جو بیمار رہا بیمار اٹھا

مسرت زندگی کا دوسرا نام — مسرت کی تمنا مستقل غم
پھول ہنستا تھا مسکراتا تھا — وہ کلی ہی نہیں جو مرجھائی
غم ہے کیا زینۂ صفات و ذات — غم نہیں ہے تو آرزوئے حیات
تو محبت کو لازوال بنا — زندگی کو اگر نہیں ہے حیات
آرزو ہے نفس حیات و مرگ — عاشقی بے نیاز مرگ و ثبات
محبت سرفروشی جاں سپاری — محبت میں خیال پیش و پس کیا

اجل خود زندگی سے کانپتی ہے　　اجل کی زندگی پر دسترس کیا!
زمانے پر قیامت بن کے چھا جا　　بنا بیٹھا ہے طوفاں در نفس کیا

جگر ایک سچے وطن پرست ہیں جنھیں اپنے چمن سے بڑی محبت اور بڑا پیار ہے۔ وہ اسی کے مدفون ہونے کی بھی تمنا رکھتے تھے اور خدا نے ان کی آرزو پوری کردی۔ وہ ایسے چمن پرست ہیں کہ یہاں کے پھول ہی کیا کانٹوں سے بھی پیار کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ہر گوشہ اور ہر ذرہ سے انھیں لگاؤ تھا۔ قحط بنگال پر انھوں نے بڑے غم و غصہ کا اظہار کیا ہے جو ان کے شعور کی بیداری کی دلیل ہے۔ ایسے موقع پر فکر جمیل کا خواب پریشان ہو جاتا ہے اور غزلخواں صاف گوئی پر آمادہ نظر آتا ہے۔

بچوں کا تڑپنا وہ بلکنا وہ سسکنا　　ماں باپ کی مایوس نظر دیکھ رہا ہوں
بے مہری و بے دردی و افلاس غلامی　　بے شامت اعمال جدھر دیکھ رہا ہوں
تعمیر کے پردے میں یہ انداز سیاست　　تخریب بہ عنوان دگر دیکھ رہا ہوں
انجام ستم اب کوئی دیکھے کہ نہ دیکھے　　میں صاف ان آنکھوں سے مگر دیکھ رہا ہوں
صیاد نے لوٹا تھا عنادل کا نشیمن　　صیاد کا لٹتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں

آزادی وطن کا نغمہ خواں اور اس کے نشہ میں مست و سرشار جگر سے زیادہ کون ہوتا لیکن دہلی، دہرہ دون، نواکھالی، و بہار کے زخموں نے ان کے لئے آزادی وطن کو "ایک پیکر بے جان" بنا دیا۔ رشوت خوری، نفع اندوزی، دولت کی نامساویانہ تقسیم، غلامانہ خصلتیں، ذہن کی تیرگی ان مرضوں نے جگر کو بے چین کر دیا تھا۔ اور انھوں نے اپنوں پر سخت تنقید کرنا مناسب سمجھا۔

غلط یہ جمہوریت کے دعوے، دروغ یہ زندگی کے نقشے
دلیل اس کی یہی ہے کافی کہ ذہن ہے تنگ تار اب بھی
یہ جشن آزادیٔ وطن ہے مگر اس جشن پُر خوشی میں
بہت ہیں سینہ فگار اب بھی بہت ہیں بیروزگار اب بھی
یہ رشوتوں کی یہ سازشوں کی یہ نفع اندوزیوں کی لعنت
وہ خود ہی انصاف سے یہ کہہ دیں نہیں وہ کچھ ذمہ دار اب بھی

کدھر ہے تو اے جرأت باغیانہ — بدل دے مقدر ہٹ دست زمانہ
کھلا باب زنداں تو کیا اس سے حاصل — کہ خود زندگی بن گئی قید خانہ
شرافت کا معیار افراط دولت — صداقت کی معراج لفظی ترانہ
زبانوں پہ اصلاح قومی کے نعرے — مگر طبیعتیں بیشتر مفسدانہ
مجسم خود اک پیکر مادیت — مگر درس "روحانیت" عارفانہ

لیکن نہ تو وہ وطن پرستوں سے بغض رکھتے تھے اور نہ جمہوریت کے مخالف نئے دستور کے نفاذ پر انھوں نے مسرت کا اظہار کیا ہے اور دعائیں دی ہیں۔ وہ حسب عادت ہندوستان کی کلی کلی پر نکھار آنے کا خواب دیکھنے لگتے ہیں:۔

خدا کرے کہ یہ دستور سازگار آئے — جو بے قرار ہیں اب تک انھیں قرار آئے
بہار آئے اور اس شان کی بہار آئے — کہ پھول ہی نہیں کانٹوں پہ بھی نکھار آئے
کھلے جو پھول تو دے جسم نازکی خوشبو — کلی اگر کوئی چٹکے صدائے یار آئے

مذاق عشق بدل دے مزاج کون و فساد دلوں تک آئے جو غم بھی تو خوشگوار آئے
نظام خلق و مروت کبھی جو برہم ہو نگاہ دوست و محبت بڑھے سنوار آئے

آزادی کے پردے سے جو ایک نیا ہندوستان طلوع ہونے والا تھا اس سے بھی آس لگائے بیٹھے تھے لیکن اس میں مشرقیت کی کمی، تہذیب نفس، کے فقدان، اخلاقیات کی عدم موجودگی، خود غرضی کی بہتات نے گاندھی جی اور ابوالکلام جیسے جاں نثاروں کی آس توڑ دی۔ جگر کا مایوس ہونا کچھ بے جا نہ تھا۔ اقوام یورپ کی سستی نقالی میں ہندوستانیوں نے اپنی خوبیاں تیزی سے بھلانی شروع کر دیں۔ عقلیت کے پرستاروں نے خلوص محبت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ روحانیت دم توڑتی نظر آئی۔ مادی آسودہ حالی سب کے لئے نہ سہی ایک محدود پیمانہ پر لجاتی شرماتی ضرور آگے بڑھی لیکن اس کی جنبش ابرو نے اخلاقیات کا خرمن جلا کر خاکستر کر دیا۔ دل کی دنیا ویران ہوتی نظر آئی۔ ظاہری چمک دمک، زمانے کے نئے تقاضوں نے اہل یورپ کی طرح انسانیت کے نام پر ظلم و غارتگری کرنا سکھلا دیا۔ بین الاقوامی معاملات میں اہل ہند کی دلچسپی ضرور بڑھی لیکن اپنے ملک کے مسائل کی طرف سے توجہ ہٹنے لگی۔ مغرب کی طرح نئی نئی سائنسی ایجادات کے اہل ہند تیزی سے گرویدہ ہونے لگے لیکن انھیں کی طرح روحانی قدروں کو الوداع کہنے لگے۔ جگر کو روحانی سکون سے عاری ہو کر خالص مادی ترقی ذرا بھی پسند نہ تھی۔ انھوں نے اس کے خلاف صاف لفظوں میں صدائے احتجاج بلند کی ہے۔

جھوٹی ہے ہر ایک مسرت — روح اگر تسکین نہ پائے
جہل خرد نے یہ دن دکھائے — گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے
تسخیر مہر و ماہ مبارک تجھے مگر — دل میں نہیں اگر تو کہیں روشنی نہیں
کام ادھورے اور آزادی — نام بڑے اور تھوڑے درشن
شمع ہے لیکن دھندلی دھندلی — سایہ ہے لیکن روشن روشن
دل کہ مجسم آئینہ ساماں — اور وہ ظالم آئینہ دشمن

چند سال ہوئے جگر کے شعر 'جہل خرد نے وہ دن دکھائے' الخ سے بحث کرتے ہوئے ممتاز حسین نے ایک مقالہ میں ان پر غم و غصہ کا اظہار کیا تھا اور انہیں رجعت پرست قرار دیا تھا۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے۔ ماضی کی صحت مند قدروں کی یاد دلانا کوئی گناہ نہیں۔ اہل ہند جو کسی زمانہ میں دنیا کو روحانیت اور اخلاق کا سبق دیتے رہے ہیں محض مادی فارغ البالی کبھی بخوشی قبول نہیں کر سکتے۔ جگر نے عقل کی اس بے راہ روی اور سائنس کی خام کاریوں پر اگر تنقید کی تو اسے معیوب کیوں سمجھا جائے۔ برٹرنڈ رسل نے "سائنس اور سوسائٹی" سے بحث کرتے ہوئے خود سائنسی زمانہ، سائنسی محرکات اور سائنسی ایجادوں کے بعض پہلوؤں کا بڑا سخت تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ جگر سائنس یا عقل کے باغی نہیں اسے خلوص اور اخلاق سے عاری پا کر شکوہ کرتے ہیں اور یہ دلیل بصیرت ہے۔ انھوں نے اہل مشرق کے دل کی دھڑکن سمجھا ہے اور اسے اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ رادھا کرشن نے بھی اپنے کتابچہ "کلکی" میں اخلاقی قدروں کے فقدان، عقل کی انتہا پسندی اور روحانیت کے زوال کا اسی شدت کے ساتھ احساس دلایا ہے۔ پھر جگر کی بصیرت کو گمراہی کا الزام کیوں دیا جائے۔

عطا محمد شعلہ

جگر کی شاعری
میں
تصورِ محبوب

اگرچہ شاکی ہیں ہم بھی یہ جی یہ چاہے ہے
ہمارے یار دل کا ہم سے کوئی گلہ نہ کرے
(مصحفی)

عشق کی یہ خاموشی کے ساتھ دل اڑا لے جانے کی کیفیت انسانی سرشت کی نرمی و شرافت، لہجہ کی یہ مٹھاس، یہ مہذب سنجیدگی اور آواز کی یہ زیریں کیفیت جسے فراق اور مجنوں تحت نغمہ کا نام دیتے ہیں۔ مصحفی کے یہاں کچھ اس مانوس طریقے سے سامنے آئی ہے کہ وہ عظیم شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی ہندوستانی سماج کا ایک نہایت مانوس عاشق اور ہمارا اپنا شاعر نظر آتا ہے۔ میر کی دردناکی اور سوز نہیں بلکہ سوزش پیدا کرنے والے نشتر نما اشعار کے بعد یہ ایک ایسی خوشگوار تبدیلی کا پیغام ہے کہ جس کو ساری فضا خوش آمدید کہتی معلوم ہوتی ہے۔ مصحفی کے کافی عرصے بعد جگر کے یہاں بھی اس طرح کا ایک موڑ ہمیں دکھائی دیتا ہے اگرچہ دونوں کے زمانے۔ طرز و رنگ کلام اور انداز فکر میں بعد المشرقین ہے پھر بھی ادب کی تاریخ میں دونوں نے ایک ہی جیسا رول ادا کیا ہے۔ اور وہ

لحاظ سے میں ان دونوں میں کافی مطابقت پاتا ہوں۔

جگر کے یہاں بھی محبوب مصحفی کی طرح ان کی شخصیت کی تکمیل کرتا نظر آتا ہے۔ وہ ایک عام چلتا پھرتا انسان ہے۔ جس کی سرشت میں نیک نفسی اور کریمانہ صفات غالب ہیں۔ ابتدا میں وہ ایک خوش باش۔ بے فکرا اور الھڑ قسم کا انسان تھا جو آہستہ آہستہ سنجیدہ اور کریم النفس بنتا چلا گیا ہے۔ اور بالآخر عاشق و معشوق ایک دوسرے کی شخصیت کا تتمہ بن کر رہ گئے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے نظر آتے ہیں۔

اردو شاعروں کا مطالعہ اس زاویہ سے کرنا کہ ان کا محبوب ان کے اشعار میں کس روپ میں نظر آتا ہے ایک دلچسپ مشغلہ بھی ہے اور عبرتناک بھی۔ دلچسپ اس لئے کہ بہر حال ہر شاعر کا محبوب جسمانی طور پر اپنے دور کا سب سے حسین شخص ہے جس کا جواب قدرت نے پیدا نہیں کیا اس کا سراپا ہر شاعر نے حسب توفیق پیش کیا ہے۔ اور اس میں اپنے دل و دماغ کی جدت اور حسن کاری کی پوری جولانیاں دکھائی ہیں۔ اور چونکہ ہر انسان فطری طور پر حسن پرست ہے اس لئے اس کی دلچسپی کے لئے شاعری میں ایک ایسی رنگا رنگ دنیا سامنے آئی ہے کہ جسے دیکھ کر وہ مبہوت ہو جاتا ہے۔ عبرتناک اس لئے کہ جب محبوب کی سیرت اور کردار کا معاملہ نظر کے سامنے آتا ہے تو بعض دفعہ تو خوف کی وجہ سے جسم میں کپکپی سی محسوس ہونے لگتی ہے اس لئے کہ

قرینے سے عجب آراستہ قاتل کی محفل ہے
جہاں سر چاہیے سر ہو جہاں دل چاہیے دل ہے (داغ)

بھویں تنتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہو، تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں (داغ)

حد یہ ہے کہ اس معیار سے غالب کا محبوب بھی ایک غیر متوازن مزاج کا حامل نظر آتا ہے۔ اس کے تیور بھی ملاحظہ فرمائیے۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

میر کے یہاں محبوب میں یہ خوفناکی نہ سہی مگر جفا کوشی اس غضب کی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ دیکھیے خود کہتے ہیں۔

بڑے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

ایسی خوفناک روایت کے پس منظر میں جگر کا محبوب ہم کو پہلے پہل کرشن کنھیا اوتار کے روپ میں ملتا ہے۔

شباب رنگیں، جمال رنگیں، وہ سر سے پا تک تمام رنگیں
تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں، تمام رنگیں بنا رہے ہیں
شراب آنکھوں سے ڈھل رہی ہے نظر سے مستی ابل رہی ہے
چھلک رہی ہے، اچھل رہی ہے پئے ہوئے ہیں پلا رہے ہیں

اس لہجے اور محبوب کی اس تصویر کشی میں سنجیدگی اور توازن نہ سہی، مگر روایت سے ایک ایسا انحراف ضرور ہے جو عشق کے بنیادی تصورات میں ایک انقلاب انگیز تبدیلی کا نقیب ہے۔ یک طرفہ عشق کے برخلاف اس میں عشق

طرفین کی جھلک ملتی ہے۔ چاہنے والا اور چاہے جانے والا دونوں ایک دوسرے کی شخصیت کی تکمیل کرتے نظر آتے ہیں۔ اصل میں عشق کی اعلیٰ ترین منزل وہی ہے کہ جہاں

دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی۔

عشق کی اس کیفیت بلیغ کا اظہار اختر انصاری دہلوی نے بھی یوں کیا ہے کہ

اس سے پوچھے کوئی چاہت کے مزے
جس نے چاہا اور جو چاہا گیا!!

اگر ناگوار نہ ہو تو اس موضوع پر خاکسار کا بھی ایک شعر سنتے چلئے۔

نئی اُمنگ، نئے راستے، نئے خطرے
کمال یہ ہے مرے ساتھ تو نہ گھبرایا!

ہاں تو بات یہاں سے چلی تھی کہ اردو شاعری میں یک طرفہ عشق کی بہتات ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ زیادہ تر عشق کی یک طرفہ تصویریں ہی ہاتھ لگتی ہیں۔ اور صاف طور سے شعراء کے دواوین میں دو موضوعات ہی پر اشعار کی بھرمار ہے۔ یا تو محبوب کے حسن کی تعریف کا موضوع یا پھر عاشق کی کیفیات ونفسیات کی عکاسی۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں محبوب کی حیثیت سب کچھ ہوتے ہوئے بھی محبوب کی سیرت و کردار کی کوئی دلکش تصویر نہیں ابھر سکتی۔ اس میں محض اشارات ہی مل سکتے ہیں۔ اور وہ بھی کچھ اس قسم کے کہ وہ اس دنیائے آب و گل کا انسان محسوس نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری شاعری سے کچھ لوگوں کو یہ شکایت رہی ہے کہ اس میں ارضیت نہیں ہے اور یہ شکایت کچھ ایسی

بیجا بھی نظر نہیں آتی۔ اگرچہ اس دعویٰ کے سلسلے میں جو استدلال اختیار کیا جاتا ہے وہ قطعاً غیر منطقی ہے۔ اگر ہم غزل کے دور متاخرین کے شعراء مثلاً قلق، داغ، امیر، رند وغیرہ کا کلام بالاستعیاب مطالعہ کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس دور میں جسم نے شاعری پر ہلّہ بول دیا تھا۔ اور اس میں یکسر ارضیت گھس آئی تھی۔ اور یہ دعویٰ کہ ہمارے یہاں عشق کا ارضی انداز مفقود ہے قطعاً بے بنیاد سا معلوم ہونے لگتا ہے۔ لیکن یہ دعویٰ اپنی جگہ صحیح بھی ہے۔ اس لئے کہ ایک طرف جہاں ارضیت کا مطلب محض جنسی تلذذ نہیں ہو سکتا وہیں ارضیت سے مطلب جنسی تلذذ سے یکسر انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ متاخرین کے یہاں ارضیت اپنی بد ترین شکل میں نمودار ہوئی۔ جس میں محبت کا نام چوما چاٹی ہو کر رہ گیا۔ اور وہ کسی روحانی یا دماغی تکمیل کا واسطہ نہ بن سکی غزل کے دور جدید میں محبت طرفین کی شخصیت کی تکمیل کے لئے ایک واسطہ کی شکل میں سامنے آئی۔ اور اس طرح پھر ایک بار اردو غزل کا احیاء ہوا۔ کیونکہ غزل سے زیادہ مکمل سانچہ محبت کے اظہار کا اردو شاعری کو نصیب نہ تھا۔ جگر یقیناً غزل کے دور جدید کے ان شعراء میں ہیں جنھوں نے عشق طرفین کی لطیف اور پرکیف تصویریں پیش کیں۔ اور اس طرح غزل کے احیاء میں کافی حصہ لیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے لہجہ میں وہ وزن اور انداز میں وہ تہیں نہ پیدا ہو پائیں کہ جو میر و غالب کا حصہ تھیں۔ مگر یقیناً وہ کسی آنے والے میر یا غالب کے لئے فضاء کو سازگار بنانے میں کامیاب ضرور ہوئے ہیں۔ مگر بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ ہمیں تو جگر کا مطالعہ اس حیثیت سے کرنا ہے کہ اشعار میں انکے

محبوب کا کھوج لگا سکیں۔ ظاہر ہے کہ محبوب نام نہ محض صورت کا ہے اور نہ محض سیرت کا بلکہ ان دونوں کے ایک نہایت متوازن امتزاج کا ہے۔ آئیے ان کے اشعار میں غوطہ لگائیں اور ان کے محبوب کو ڈھونڈھ نکالیں

نہ لٹتے ہم۔ مگر ان مست انکھڑیوں نے جگر — نظر بچاتے ہوئے ڈبڈبا کے لوٹ لیا

ٹوٹ پڑتا ہے دفعتاً جو عشق — بیشتر دیرپا نہیں ہوتا

ان شاعرانِ دہر پہ ہو عشق ہی کی مار — اک پیکرِ جمیل کو قاتل بنا دیا

میں ان کا ہو گیا، انھیں مسرور کر دیا — وہ میرے ہو گئے، مجھے مغرور کر دیا

کہئے حالِ دل لیکن، دیکھئے کن آنکھوں سے — ہر سکوں کے پردے میں حشرِ اضطراب [illegible]

تجاہل، تغافل، تبسم، تکلم — یہاں تک تو پہنچے وہ مجبور ہو کر

ہم سے پوچھو جگر کی سرمستی — محرمِ آنجناب ہیں ہم لوگ

قدم ڈگمگائے۔ نظر بہکی بہکی — جوانی کا عالم، ہو سرشاریاں ہیں

نیاز و ناز کے جھگڑے مٹائے جاتے ہیں — ہم ان میں اور وہ ہم میں سمائے جاتے ہیں

یہ نازِ حسن تو دیکھو کہ دل کو تڑپا کر — نظر ملاتے نہیں مسکرائے جاتے ہیں

خبر اس کی نہیں ان خاکسارانِ محبت کو — اسی کو دکھ بھی دیتے ہیں جسے اپنا سمجھتے ہیں

آ کے تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

ہائے رے مجبوریاں ترکِ محبت کے لئے
مجھ کو سمجھاتے ہیں وہ اور ان کو سمجھاتا ہوں میں

مجھے دے رہے ہیں تسلیاں وہ ہر ایک تازہ پیام سے
کبھی آ کے منظرِ عام پر، کبھی ہٹ کے منظرِ عام سے

پھر بھی مجھ سے ہزار شکوے ہیں　　جانتا ہوں مرا خیال بھی ہے
کرتے جاتے ہیں معاف عذرِ کرم　　اور پھر پرسشِ ملال بھی ہے

مانوس اعتبارِ کرم کیوں کیا مجھے　　اب ہر خطائے شوق اسی کا جواب ہے

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں　　محبت کا زمانہ آ رہا ہے

یا وہ تھے خفا ہم سے یا ہم ہیں خفا ان سے　　کل ان کا زمانہ تھا، آج اپنا زمانہ ہے

تھم تھم کے دل سے چھیڑ ہو تیرِ نگاہِ یار　　کیا لطف جب ہمیں نہ رہے اختیار میں

جیف وہ لغزیدہ لغزیدہ قدم میری طرف　　ہائے وہ دزدیدہ دزدیدہ نظر میرے لئے
اُف وہ کہنا اس کا پھر باہوں میں باہیں ڈال کر
میں جگر کے واسطے ہوں اور جگر میرے لئے

وہ رہ رہ کر گلے مل مل کے رخصت ہوتے جاتے ہیں
مری آنکھوں میں یارب روشنی کم ہوتی جاتی ہے

وہ چیز کہتے ہیں فردوسِ گم شدہ جس کو　　کبھی کبھی تری آنکھوں میں پائی جاتی ہے

ان اشعار کے مطالعہ سے ایک بات نہایت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے اور وہ ہے محبوب کی طرف سے محبت کا پورا پورا جواب۔ اور رفاقت کا عملی اقدام۔ ان اشعار میں عشق و وفائے طرفین کا وہ جذبہ پورے طور سے جھلک رہا ہے جس کی تصویر کشی اردو میں محض اردو کے جدید نسل کے نظم گو شعرا کے یہاں ملتی ہے۔ جگر کے اس نوع کے اشعار ہم

کو ان کامیاب نظموں کی یاد دلاتے ہیں جو اردو میں ادھر پچیس تیس سال سے لکھی جا رہی ہیں۔ ان اشعار کا محبوب اپنے گداز قلب اور محبت کی تڑپ میں اپنے عاشق سے بھی بازی لے جاتا نظر آتا ہے۔ طرفین کی یہ بھرپور کامیاب اور صحت مند محبت اردو کے کسی دوسرے غزل گو کے یہاں نہیں ملتی۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے لب و لہجہ میں جگر خواہش کے اظہار پر وہ قادرانہ گرفت حاصل نہیں کر سکے کہ قاری کے ذہن کو اس سطح سے اوپر لے جا سکیں اور کسی عارفانہ بصیرت اور نشاط انگیزی کی طرف رجوع کر سکیں۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے بعض جگہ یہ کوشش کی ہے کہ عشق مجازی عشق روحانی نظر آنے لگے۔ یہ شاید اصغر کا اثر ہو لیکن اس میں وہ کامیاب قطعاً نہیں ہیں۔ مگر آج کل کی دنیا تو عشق روحانی کی بھی قائل نہیں رہی۔ آج کل تو مجاز ہی سب کچھ ہے پھر بھی ایک مہذب سوسائٹی کا تقاضہ ہے کہ مجاز کو بنیاد بنا کر بھی عشق کی آگ کو کچھ اس انداز سے روشن کیا جائے کہ وہ انسان کو زیادہ مطہر اور زیادہ پاکیزہ بنا سکے۔ اور ذاتی منافع اور اغراض کے خس و خاشاک کو جلا کر اس طرح ختم کر دے کہ انسان زیادہ مجلا ہو کر معاشرے کا ایک مفید جزو ہو جائے۔ اور اس کو زیادہ برتر اخلاقی اساس پر قائم کر سکے۔ جگر کے کلام میں یہ چیز ذرا کم ہی دکھائی پڑتی ہے۔ مگر پھر بھی جو کچھ جگر کے یہاں ملتا ہے وہ ہمارے لئے ایک قابل وقعت ترکہ ہے۔

جواب دینے کے لئے صرف جگر کی جانب انگلی اُٹھا دینا کافی تھا۔ ان کے کلام کا تنوع، تاثیر اور بے پناہ مقبولیت دیکھ کر کس کی ہمت تھی جو ایمانداری کے ساتھ غزل کی اہمیت، صداقت اور ہمہ گیری کا منکر ہو سکتا۔

حقیقت خود کو منوالیتی ہے مانی نہیں جاتی

ایک عظیم المرتبت شاعر ہونے کے باوجود جگر ایک بڑے انسان پہلے وہ ایک بڑے شاعر بعد میں تھے۔ ان کی شخصیت پر نہیں بلکہ ان کی شخصیت ان کی شاعری پر حاوی تھی۔ جب کوئی شخص جگر کو زیادہ قریب سے دیکھتا تو اس کے دل میں ان کی شاعری کے لئے جو احترام پیدا ہوتا وہ اس محبت کا ہرگز مقابلہ نہیں کر پاتا جو ان کی شخصیت کے لئے دلپذیر ہو جاتی ہے۔ وہ حد سے زیادہ منکسر المزاج، غیور، مہذب، بااخلاق، پرخلوص، دردمند، دوست نواز وسیع القلب اور ایثار پیشہ انسان تھے۔ میرا یقین ہے کہ ان کے ایک بڑے شاعر ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ بحیثیت انسان ان کا درجہ بہت ہی اعلیٰ اور ارفع تھا۔ وہ اپنے اس مصرع کی۔

؎ میں محبت ہی محبت ہوں محبت کی قسم

کی ایک زندہ تفسیر تھے۔ انھوں نے ایک جگہ خود اپنے کمال شاعری کی یوں تفسیر کی ہے ۔

میرا کمال شعر بس اتنا ہے اے جگر وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانے پہ چھا گیا

میں ذاتی طور پر اس شعر میں "وہ" کا اشارہ جگر کے محبوب کی طرف نہیں بلکہ خود جگر بحیثیت انسان اور ان کے حسن باطن کی طرف سمجھتا ہوں۔

میرا متن شعر کے واقعی مطلب سے یقیناً بہت دور ہے لیکن اصل حقیقت سے ہرگز دور نہیں۔

دور سے دیکھنے والوں کو جگر اپنی زندگی کے ہر شعبے میں بڑے انتہا پسند نظر آتے لیکن واقعہ اس کے برعکس تھا۔ اعتدال، سلامت روی اور شائستگی ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ جب وہ پیتے تھے تو عوام ان کو ایک ایسا رند بلا نوش سمجھتے جو کبھی سڑکوں پر لوٹتا ہے اور کبھی لہرا کے پی جاتا اور اپنی مستیوں کی علی الاعلان تشہیر کرتا پھرتا لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی جگر ہمیشہ چھپا کر، شرما کر اور موقع محل دیکھ کر پیتے اور اپنی اس کمزوری پر انہوں نے کبھی کسی فخر یا اعتراضات سے بے بیاری کا اظہار نہیں کیا۔ وہ جب پیتے تھے اور جب پیتے تھے تب بھی وہ اپنی اس حرکت کو ایک گناہ کبیرہ سمجھتے اور دوسروں کو اس سے احتراز کرنے کی تلقین کرتے رہتے اور یہی سبب تھا کہ بالآخر جگر اپنی اس دیرینہ عادت کو ترک کر دینے میں کامیاب ہو گئے اور ایسا کامیاب ہو گئے کہ دوسرے اس سے سبق لے سکتے ہیں۔ ان کے مزاج کی بنیادی صداقت اس ریاکاری کو زیادہ دنوں برداشت نہیں کر پائی کہ ایک طرف وہ شراب کو برا بھی کہتے جائیں اور دوسری طرف وہ اس کو بے تکلف پیتے بھی جائیں۔ شراب تو بڑی چیز جو لوگ سگرٹ یا تمباکو چھوڑنا چاہتے ہیں ان کو بھی بخوبی اندازہ ہو گا کہ کسی ایسی دیرینہ عادت کا جو جزو زندگی بن چکی ہو چھوڑنا کتنا صبر آزما بلکہ روح فرسا ہوتا ہے۔ ایک بہت عام خیال ہے کہ جگر اپنے بہترین اشعار صرف نشے کی حالت میں کہتے تھے حالانکہ یہ بالکل غلط تھا۔ نشے کی حالت میں جگر شعر ہی نہیں

کہتے تھے بلکہ عالم سرخوشی میں شعر کہنا وہ شعر کی توہین سمجھتے تھے۔ اسی طرح عام طور
سے لوگ سمجھتے کہ جگر ایک رند لاابالی کی حیثیت سے بڑے بوالہوس اور دل پھینک
قسم کے انسان ہوں گے لیکن امر واقعہ اس کے بالکل خلاف تھا۔ جگر
حسن پرست ضرور تھے لیکن صرف حسن کی عزت اور احترام کرنے کے لئے
حسن کی بارگاہ میں ان سے زیادہ مہذب اور مودب کوئی دوسرا انسان نظر
نہ آتا۔ جگر کے کلام کی غیر معمولی مقبولیت دیکھ کر اکثر خیال کیا جاتا کہ اب جگر
کسی دوسرے شاعر کو نظر میں نہ لاتے ہوں گے اور بعض دیگر ممتاز شعرا
کی طرح اپنے بیشتر ہم عصروں کو اپنے سے کم تر سمجھتے ہوں گے لیکن اصل حقیقت
یہی کہ جگر دوسرے شعراء کے معمولی اشعار کی بھی داد دینے اور اپنے ہم عصروں
کی قدردانی کرنے میں اپنا جواب نہ رکھتے۔ وہ ان کے لئے ہمیشہ دیدہ و دل
فرش راہ کئے رہتے۔

جگر بہت سیدھے سادے تھے لیکن وہ کبھی زاہد خشک نہ بنے۔ وہ بڑے پائے کے
سخن فہم تھے لیکن انھوں نے [illegible] پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنی پسند اور ناپسند
میں بڑے سخت تھے لیکن کبھی دوسرے کی پسند اور ناپسند
کا لحاظ رکھنے میں وہ بڑے فیاض واقع ہوئے تھے۔ وہ ساری زندگی معترضین
کے نرغے میں گھرے رہے لیکن وہ خود کبھی کسی کے معترض نہیں بنے۔ نہیں معلوم وہ خود
کتنی مرتبہ موضوع بحث بنے لیکن انھوں نے خود ہمیشہ بحث و تکرار سے اجتناب
کیا۔ انھوں نے دوسروں کے حفظ مراتب کا ہمیشہ پاس کیا لیکن خود اپنے مرتبے
کا کبھی خیال بھی نہیں کیا۔ جن دوستوں سے انھیں تکلیفیں پہونچیں ان ہی کو سر
آنکھوں پر بٹھانے کے لئے وہ ہر دم تیار رہتے۔ وہ ایک عجیب مرنجاں مرنج

اور شان استغنا کے انسان تھے۔ انھیں دنیا کی آرام اور آسائش کی یقیناً خواہش تھی لیکن انھوں نے ان کے حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی بلکہ اگر ان کے حصول کا کوئی امکان بھی پیدا ہوا تو انھوں نے اس کو ٹھکرا دیا۔ انھیں دعویٰ تھا کہ وہ بڑے معقولیت پسند ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ اعتراف بھی تھا کہ معقولیت کو پرکھنے کے لیے وہ دماغ کو نہیں بلکہ دل کو کسوٹی بناتے ہیں۔

ان میں اگر کچھ بے اعتدالیاں تھیں تو اُن کے نقصانات صرف ان کی ذات یا ان کے قریب ترین متعلقین تک محدود تھے۔ مثلاً وہ بڑے مخیر، شاہ خرچ اور روپے پیسے کے معاملے میں انتہائی لاابالی اور غیر ذمہ دار واقع ہوئے تھے۔ کافی آمدنی ہونے کے باوجود وہ زیادہ تر خالی ہاتھ رہتے۔ لیکن یہ خالی ہاتھ خود ان کی خالی جیب میں ہوتا کسی دوسرے کی بھری جیب میں نہیں۔ وہ کبھی کسی سے کوئی امداد نہ چاہتے اور کسی کا غیر ضروری احسان اٹھانا وہ اپنے لئے باعث ننگ سمجھتے۔ دوستوں کی ہر ممکن فرمائش پوری کرنا وہ اپنا فرض منصبی سمجھتے۔ ان کی خاطر راتوں کی نیند حرام کر دینا کھانے پینے سے بدپرہیزی کر ڈالنا، ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ان کے خیال میں دنیا کی سب سے سستی چیز خود ان کی صحت تھی۔ نتائج سے بے پرواہ ہو کر وہ کسی دوست کی دل جوئی کے لئے ہر ممکن قربانی پر تیار ہو جاتے۔ اپنی آخری بیماری میں ڈاکٹروں کی سخت سے سخت ہدایت کے باوجود نہ انھوں نے دوستوں سے ملنا چھوڑا اور نہ اپنی زبان روکی چنانچہ جب مکمل آرام اور سکون کی انھیں ضرورت تھی وہ انھوں نے اپنے آپ کو کبھی میسر نہیں

ہونے دیا۔ اپنے آخری ایام میں ایک دوست سے جو صرف چند منٹ بیٹھ کر اُٹھنے لگے فرمایا "آؤ کچھ باتیں تو کر لیں پھر آگئے تو تنہائی ہی تنہائی ہے" اپنے روپے اور صحت کے تحفظ کا احساس انھیں کبھی پیدا ہی نہیں ہوا اور اس معاملہ میں جگر واقعی بڑے بے جگر واقع ہوئے تھے۔

جگر صاحب یوں تو بڑے باغ و بہار قسم کے انسان تھے لیکن کبھی کبھی کسی کی بدتمیزی یا اوچھے پن پر ان کو غصہ بھی آ جاتا لیکن وہ بیشتر اس کو پی جاتے اور شاذ و نادر اگر اس کا اظہار بھی کرتے تو خفگی سے نہیں بلکہ جھنجھلاہٹ سے لیکن یہ کیفیت بھی چند منٹ کیا چند سکنڈ بھی قائم نہیں رہتی اور اس کے بعد پھر اسکے ردعمل میں جو ندامت ان پر طاری ہوتی اس کا اثر بڑی دیر تک قائم رہتا۔ اپنے سے بڑوں کا احترام اور چھوٹوں کا لحاظ کرنے میں وہ اپنی نظیر آپ تھے کسی بزرگ کے سامنے گھنٹوں سر جھکائے مودب بیٹھا رہنا انھیں ہرگز گراں نہ گذرتا۔ اپنے سے کسی بہت ہی چھوٹے کے لئے اُٹھ کر کھڑا ہو جانا اور آگے بڑھ کر اس کا استقبال کرنا ان کا خاص شیوہ تھا۔ بچوں سے گھل مل کر باتیں کرنا ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ وہ جذبہ و کیفیت کے انسان تھے اور معمولی سے معمولی واقعہ سے بھی بہت جلد متاثر ہو جاتے اور اس حالت میں ان کی آنکھوں میں نمی سی جھلکنے لگتی اور وہ اکثر سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیتے۔

شاید ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے جگر سندیلہ آئے ہوئے تھے اور جہاں مقیم تھے وہاں بیخود موہانی بھی موجود تھے۔ بیخود کو وہ اپنا بزرگ سمجھتے اور ان

کی بڑی تعظیم کرتے۔ کسی صاحب نے بیخود کے سامنے جگر کا کوئی شعر پڑھا۔ بیخود
کو غالباً علم نہ تھا کہ یہ جگر کا ہے۔ انھوں نے فوراً اس پر اعتراض کیا اور
کافی دیر تک اپنے اعتراض کی توجیہات پیش کرتے رہے۔ جگر دم بخود سر
جھکائے سنتے رہے۔ بیخود جب اٹھ کر چلے گئے تو ایک صاحب نے جگر سے
پوچھا "یہ تو آپ کا شعر تھا؟" جگر نے ہنس کر جواب دیا "تو کیا ہوا؟"
انھیں صاحب نے پھر استفسار کیا "بیخود صاحب کے اعتراض کے متعلق
آپ کا کیا خیال ہے؟" جگر نے کہا "ان کا اعتراض اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن
میرا شعر بھی غلط نہیں ہے۔" سوال کیا گیا "یہ کیسے ممکن ہے؟" جگر بے ساختہ
قہقہہ لگا کر بولے "شعر سمجھا جاتا ہے سمجھایا نہیں جاتا!" اور پھر بڑے
والہانہ انداز سے اپنا معرضِ بحث شعر دو تین بار جھوم جھوم کر پڑھا
اور کہا "مجھے تو اب اس میں کچھ خوبیاں بھی نظر آرہی ہیں!"

شاید ۱۹۳۳ء یا ۱۹۳۴ء تھا اور اس زمانے میں جگر لکھنؤ آتے
تو کیپٹل ہاؤس ہی میں مقیم ہوتے۔ ایک روز ہم چند طالب علم ان سے ملنے
اور ان کا کلام سننے کیپٹل ہاؤس پہنچے۔ جگر کچھ بیمار تھے اور ایک کونے
میں چادر اوڑھے خاموش لیٹے تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئے
اور باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں شہر کے ایک ممتاز رئیس اپنے چند ساتھیوں
کے ساتھ موٹر پر تشریف لائے اور جگر سے اپنے ساتھ چلنے کی درخواست کی
جگر نے ناسازیِ مزاج کا عذر کیا۔ رئیس کا اصرار زیادہ بڑھا تو جگر کے
چہرے پر کچھ ناگواری کے آثار پیدا ہوئے اور انھوں نے ہم لوگوں کی جانب

اشارہ کر کے فرمایا" میں بیمار سہی لیکن دیکھئے میرے کچھ مہمان مجھ سے ملنے آئے ہوئے ہیں۔ میں انھیں چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟" اپنی جھینپ مٹانے کے لئے رئیس نے کچھ کلام سنانے کی فرمائش کی۔ جگر نے بمشکل تمام تین چار اشعار سنا دیئے اور خاموش ہو گئے۔ رئیس کسی دوسرے روز کا وعدہ لے کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہم لوگوں نے بھی اٹھنا چاہا۔ جگر صاحب نے پوچھا" اتنی جلدی کیوں؟" عرض کیا" ہم لوگ بھی کلام ہی سننے آئے تھے لیکن چونکہ آپ کی طبیعت ناساز ہے لہذا کسی مزید فرمائش کی ہمت نہیں پڑتی۔ آپ کو تکلیف ہوگی" ہنستے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے اور بولے" میں بکتا نہیں پھسلتا ضرور ہوں!" اس کے بعد قریب ایک گھنٹے تک ہمیں اپنے کلام سے محظوظ کیا مسحور کرتے رہے ؎

حسین و سادہ ہے کس درجہ فطرت شاعر ہنسے تو غنچہ و گل، رو پڑے تو شبنم ہے

غالب ان کا محبوب ترین شاعر تھا۔ ایک نشست میں ایک صاحب غالب کے بعض اشعار کو مغلق اور مہمل قرار دے رہے تھے جگر بار بار کچھ بولنا چاہتے لیکن پہلو بدل بدل کر خاموش رہ جاتے۔ آخر میں نہ رہا گیا تو بولے "مجھے غالب کے کچھ مہمل اشعار بتائیے؟" ان صاحب نے کچھ اشعار پڑھے اور پھر بالآخر جب اس شعر پر آئے ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

و جگر ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے" خدا کے لئے مجھ پر رحم فرمائیے۔ آپ اس مضمون کو مہمل اور مضحکہ خیز قرار دیتے ہیں اور یہ نہیں غور فرماتے کہ کیسے فرسودہ

اور پامال مضمون کو محض اپنے طرز ادا سے ندرت دے کر ان سے کہاں پہونچا
دیا ہے کہ اب اس پر اردو شاعری فخر کر سکتی ہے!

افسوس کہ جگر سے ملاقات، تمنا کبھی نہ ہو سکا اور آج جب وہ ہمیشہ کیلئے
رخصت ہو گئے تو صرف محسوس ہوتا ہے کہ ان سے ملنے کے کیسے کیسے مواقع ہاتھ
سے کھو دیئے ہیں

لاکھ آفتاب پاس سے ہو کر گذر گئے بیٹھے ہم انتظار سحر دیکھتے رہے

جگر سے متعلق ایک بڑا عجیب واقعہ یاد آرہا ہے۔ غالباً ۱۹۴۵ء
کا زمانہ تھا۔ وہ لکھنؤ میں ایک جگہ سہ پہر کو چائے پر مدعو تھے۔ چند اور لوگوں
کے ساتھ میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ میزبان کے یہاں پہونچے تو چائے میں کچھ
دیر تھی۔ حاضرین کے اصرار پر جگر نے کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ انکی سحر آفریں
آواز سن کر سارا محلہ جمع ہو گیا۔ حتیٰ کہ بیٹھنے کی جگہ نہ رہی۔ چائے آئی تو وہ
سب حاضرین میں تقسیم ہونے لگی۔ جگر کے سامنے کشتی آئی تو وہ پہلے دوسروں
کو پلوانے پر اصرار کرنے لگے۔ میزبان انتظام میں لگے ہوئے تھے۔ چائے کئی
دفعہ آئی اور تقسیم ہوتی رہی اور بالآخر دو گھنٹہ میں یہ محفل برخاست ہوئی
جگر جانے لگے ہم گھر چلے تو تھوڑی دیر بعد ایک رستوران کے سامنے یہ کہہ کر
تانگہ رکوالیا "آیئے چائے پیتے چلیں" عرض کیا "ہم لوگ تو دو دو پیالیاں
پی چکے ہیں" بچوں کی طرح ہنستے ہوئے فرمانے لگے "بھائی میں نے تو پی ہی
نہیں"۔ بعد میں حقیقت معلوم ہوئی کہ جگر کیطرف جو پیالی بڑھائی جاتی وہ کسی
دوسرے کیطرف بڑھا دیتے اور اس طرح وہ خود چائے سے محروم ہی رہ گئے تھے

اپنے جاننے والوں کے لئے جگر کی عقیدت محبت اور شفقت بے پناہ تھی۔ وہ ایک مخلص دوست، دلچسپ رفیق اور ایک بڑے نیک اور سادہ لوح انسان تھے بحیثیت شاعر ان کا بلند پایہ کلام ان کی شہرت عام اور بقائے دوام کا ضامن ہے لیکن انھوں نے بحیثیت انسان اپنی دردمند شخصیت کے جو گہرے نقوش اپنے جاننے والوں کے دلوں پر ثبت کر دیئے ہیں وہ بھی غالباً ان کے کلام کے ساتھ ہی اُن کی زریں روایات بن کر زندہ جاوید رہیں گے جگر کی موت سے ایک بڑا شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بڑا انسان بھی ختم ہو گیا ؎

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے، وہی فاتح زمانہ

محمد رضا انصاری فرنگی محلی

ایک معلّم اخلاق

لغت کی کتابوں میں کوئی جامع لفظ یا علم الاخلاق میں کوئی ایسی اصطلاح موجود ہے جو اپنی کمزوریوں کے فوری اعتراف اور دوسروں کی کمزوریوں کی بہتر معذرت کرنے کی متضاد صفت رکھنے والے کی خصوصیت کو واضح کرتی ہو تو جگر صاحب میری دانست کے دائرے میں اس لقب کے سب سے بڑا مصداق ہوں گے۔

میں کئی برس کی قربت و مجالست کے بعد میں اسی نتیجے پر پہونچا ہوں کہ مرحوم جگر صاحب اپنی غلطی کو جسے وہ "غلطی" کہتے تھے حتی جلد تسلیم کر لیتے اس سے زیادہ صدود دوسروں کی غلطیوں پر جنھیں وہ بشری کمزوریاں کہا کرتے تھے عذر خواہ بن جاتے تھے۔

جگر صاحب کی طرف "غلطی" کی اضافت کرنا طبیعت پر شاق گزر رہا ہے اس لئے کہ ایسی ایک بات بھی یاد نہیں آتی جس میں جگر صاحب انسانیت اور شرافت کے اعلیٰ معیار سے ذرا بھی نیچے آئے ہوں ان کی صحبت میں اپنی یا کسی اور کی چھوٹی حرکتوں پر ایسی دلاویز تاویلیں سننے میں آئیں ہیں کہ اس اچھائی تک سے نفرت معلوم ہونے لگی جس کے تحت یہ چھوٹی حرکت سرزد ہوئی تھی

اتنی طویل سعادت ہم نشینی کے بعد جگر صاحب کے بارے میں اگر کوئی تاثر قوی تر ثابت ہوا تو وہ ان کا دوسروں کی کمزوریوں اور چھوٹی حرکتوں سے درگزر کرنا ہے۔

دوسرا دوست ہو یا دشمن کیسی ہی غیر اخلاقی حرکت کر گزرے، چوری کا یک کرنے پر، جگر صاحب کو برہم ہوتے نہیں دیکھا اور اگر کوئی توجہ دلائے تو دیر تک جگر صاحب، دنیا، انسان، بشری کمزوریاں، نجی حالات اور خدا جانے کیا کیا کچھ سنا کر ماحول کی بدمزگی کو رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ایک شاعر صاحب جو میرے تنہا ساتھی تھے جگر صاحب کے ساتھ بھوپال اور بمبئی وغیرہ جا رہے تھے ایک انجمن کے لئے چندہ جمع کرنے۔ مجھے ان کی دیانت کا کوئی اچھا تجربہ نہیں تھا اور اپنے تجربے سے جگر صاحب کو باخبر کردینا میں نے اپنا فریضہ سمجھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ جگر صاحب کو یہ غیبت پسند نہیں آئی اور انھوں نے کچھ اس قسم کی باتوں سے مجھے متنبہ کیا "مولانا! بشری کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں۔ اگر آپ عیب جوئی کرنے لگے تو کوئی بھی عیب سے خالی نہ ہوگا۔ مجھ میں کتنی کمزوریاں ہیں جن کا خود مجھے احساس ہے ان کمزوریوں کو چھوڑیئے جن کا مجھے علم نہیں مگر دوسروں کو مجھ میں نظر آتی ہیں۔

انھوں نے کہا "اخلاص کی قدر کرنا چاہیئے، میں تو اس ڈاکو کی بھی قدر کرتا ہوں جو اپنے پیشے میں مخلص ہو"

ہوئے ایک استثنائی کیفیت جب جگر صاحب کے فن یا ان کی پسندیدہ صنف شاعری ۔ غزل پر وار کیا جاتا ۔ وہ ہمیشہ تبسم خیر خواہ ، دلجو اور ہمدرد ان ، تعلق کے دکیل صفائی فرمایا کیے ۔

فن پر یا ان کی محبوب صنف غزل پر وار کرنے والوں کے مقابلے میں بھی جگر صاحب کے اندر جو "سیرت فولاد" پیدا ہو جایا کرتی تھی تو ایسے وہ دوسروں پر وار کرنے یا محض اپنا بچاؤ کرنے کے کام میں نہیں لاتے ۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ شاعری یا غزل کی عظمت کی حفاظت کیلئے وہ سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو گئے ہیں ۔

جگر صاحب مجلس کے آدمی تھے میدان کے نہیں ۔ اگرچہ انکی شاعری پر بعض اہم اشخاص نے رد و قدح کی لیکن انھوں نے کبھی اپنی وکالت نہ خود کی اور نہ دوسروں کو کرنے دی ۔ بعض بظاہر وزنی اعتراضات کے سلسلے میں جب جگر صاحب سے رجوع کیا جاتا تو ایک آدھ اشارے ہی میں بعض اوقات وہ تمام پردے نگاہوں کے سامنے سے اٹھا دیتے تھے جو مفہوم شعر تک رسائی میں حائل ہوتے ۔

سنہ ۳۹ء میں جب "ترقی پسند ادب" کا قضیہ عنفوان شباب میں تھا اور نوجوان علمبردار اپنی ترقی پسندی کی پرجوش یلغار میں دوسری صف کے ادیب و شاعر جگر صاحب ہی کے دامن میں پناہ ڈھونڈھا کرتے تھے ایک نشست میں خود جگر صاحب کے بعض اشعار معرض بحث میں آگئے ۔

یہ عجیب پہلو تھا جگر صاحب کا کہ اپنی شاعری پر اپنے دوستوں کیطرف

سے اعتراضات سن کر وہ جس حد تک بے چین ہو جاتے تھے اسی حد تک وہ
ان اعتراضات کو برداشت اور سکون سے سن لیتے تھے جو غیر احباب کی طرف
سے ہوں جو لوگ جگر صاحب کے مزاج سے واقف تھے وہ ان کے شعر کے
حسن و قبح پر بحث اس لئے اظہار خیال نہیں کرتے تھے کہ کہیں جگر صاحب
کے خاطر معصوم پر گراں نہ گزرے اور اگر کوئی دوست ان کے شعر کے
کسی خاص پہلو کے بارے میں کوئی مناسب بات کہہ گزرتا تو وہ فوراً
شعر پر نظر ثانی کرنے پر آمادہ بھی ہو جاتے تھے۔

بہر حال بحث جگر صاحب کے اس شعر پر تھی ؎

زمانہ گرم رفتار ترقی ہوتا جاتا ہے مگر اک چشم شاعر ہے کہ پُرنم ہوتی جاتی ہے

ایک صاحب نے غیر ترقی پسند ادب کے رجعت پسندانہ کردار کی
مثال میں جگر صاحب کے سامنے جگر صاحب کا یہی شعر پڑھ دیا۔
جگر صاحب نے جواب میں جو کچھ کہا اس کے الفاظ کچھ اس قسم کے تھے
"کیوں جناب! اس شعر سے رجعت پسندی کا اظہار کیسے آپ نے سمجھا؟
معترض: "زمانے کی ترقی اور اس سلسلے میں اس کی گرم رفتاری پر چشم
شاعر اگر آنسو بہائے تو شاعر کی رجعت پسندانہ ذہنیت کا اظہار
نہیں تو اور کیا ہے؟"
کمال ذہانت کے ساتھ جگر صاحب نے کہا "آپ اسے طنز کیوں نہیں
سمجھتے جو ارتقاء خوش ہونے کے بجائے آنسو بہانے والے شاعر پر کیا
گیا ہے؟ اس ایک اشارہ نے جگر صاحب کے مفہوم کو اتنا واضح کر دیا

کہ ان کا یہی شعر رجعت پسند ادب سے بیزاری کا ایک بین ثبوت بن گیا۔
اسی طرح بہت سے فنی نکتے ضمنی طور پر وہ بیان کر دیتے تھے لیکن وہ بحث و مباحثہ اور نقد و تبصرہ کے آدمی تھے ہی نہیں۔ بس ایک بھولے معصوم انسان تھے جنھیں ایک ہی بل سے بار بار ڈسا جا سکتا تھا اور ڈسا جاتا رہا مگر انھوں نے نہ زہریلے کو زہریلا کہا اور نہ ایسے لوگوں کا سدِباب کیا۔
کہا کرتے تھے کہ نقاد شاعر نہیں ہو سکتا۔ تفصیل پوچھئے یہ وجہ بتائی کہ نقد کا مزاج عیب جوئی ہوتا ہے اور جب مزاج اس کا عادی ہو جائے تو اس سے کوئی اچھا خیال ظاہر ہونا نہیں ہو سکتا۔
اسی سے ملتی جلتی بات وہ اصول کے طور پر مانتے تھے کہ جب تک کوئی خود اچھا نہ ہو کا اچھا شاعر نہیں ہو سکتا۔
یہ نہیں کہ آپ ان کے مسلّمات کو چٹکیوں میں اڑا دیں۔ اگر کوئی ان کے کسی دعوے کو نہ مانے تو اسے وہ ایسی نازک اور لطیف دلیلوں سے قبول کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ ان سے انکار کرنا نامعقولیت معلوم ہونے لگتا تھا۔
لیکن یہ گفتگو اور استدلال ان ہی لوگوں کے لئے جگر صاحب نے مخصوص کر رکھا تھا جو ان کی نظر میں "اچھے" تھے اور ان کی دلیلوں کو سمجھنے کے اہل تھے۔

منظر سلیم

جگر — ایک انجمن، ایک تحریک

جگر در اصل کسی ایک شاعر کا نہیں، پوری ایک انجمن کا نام ہے جس کی دلکشی اپنی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں اور وقت اور ماحول کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی ہوئی زیبایش و آرایش کی بنا پر جس طرح گزشتہ نصف صدی میں برابر بڑھتی رہی ہے اسی طرح آئندہ بھی بڑھتی رہے گی۔ اس انجمن کی دلکشی میں اضافہ اگر نہ بھی ہوا اور شاعری کے تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے مزاج اور انقلابات زمانہ سے تیزی کے ساتھ متاثر ہونے والے ماحول نے اس مخصوص رنگ سخن ہی کو فراموش کرنا شروع کر دیا جس کے جگر مالک تھے تب بھی اس انجمن کی دلکشی کم از کم اس شکل میں تو بہر حال برقرار رہے گی جس میں اسے اس کے خالق نے چھوڑا ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ جگر کے اس احسان کو کبھی بھی فراموش نہ کر سکے گی۔ جو انھوں نے غزل کو زندہ رکھنے اور اسے عہد حاضر کے تقاضوں پر پورا اترنے کے قابل بنانے کے سلسلے میں کیا ہے۔

جگر کا شمار ان عظیم ادیبوں اور شاعروں میں ہوتا ہے جو اپنی برسوں کی محنت، اپنے فن کی انفرادیت، اپنے افکار و خیالات کی ہمہ گیری و مقبولیت

اور اپنی شخصیت کی جادو کرنے والی کشش کے باعث اپنی زندگی ہی میں
ایک ادبی تحریک کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسی ادبی شخصیتیں زبان
و ادب کی زندگی و ترقی کی ضامن ہوا کرتی ہیں اور یہ اعزاز چند ہستیوں ہی
کو حاصل ہوتا ہے۔ جگر کو جو یہ اعزاز حاصل ہوا تو اس میں ان کی شاعرانہ
عظمتوں اور شخصیت کی دلآویزیوں کے علاوہ اس زبردست جد و جہد کا
بھی ہاتھ تھا جو انھیں قدیم و جدید دونوں نقطہ ہائے نظر کے حامیوں کے
مشترکہ حملوں سے اپنے فن اور شخصیت کو محفوظ رکھنے کے لئے برسوں تک
جاری رکھنی پڑی۔ اس جد و جہد نے انہیں اپنی شاعری کو اور زیادہ بہتر
بنانے اور اپنے فن کو خون دل و جگر سے سنوارنے پر آمادہ کیا۔

جہاں تک قدیم طرز فکر کے حامیوں کی مخالفت کا تعلق ہے وہ جگر کی شاعری
کے شباب کے زمانے میں بلکہ غالباً اس سے کچھ قبل ہی شروع ہو گئی تھی۔ مشاعرے
شاعر کو بازاری اور سوقی تصور کئے جاتے تھے۔ اور مشاعروں میں جگر صاحب
اپنے مخصوص ترنم اور عام مذاق کے سیدھے سادے عشقیہ اشعار کی وجہ سے
مقبول ہونے لگے تو شاعروں اور سنجیدہ ذوق رکھنے والے بعض طبقوں
میں ان کی مخالفت شروع ہو گئی۔ لوگ کھلم کھلا کہنے لگے کہ ان کی شاعری
میں ہوتا ہی کیا ہے یہ محض ان کی رندی، لاابالی پن، اور ترنم کا جادو ہے
کہ ہر جگہ چل جاتا ہے اور وہ بڑے بڑے مشاعرے لوٹ لے جاتے ہیں۔
اور ان سے کہیں اچھے شاعر اپنی طنزیہ خاموشی یا طنزیہ جملوں کے باوجود
ان کا کچھ بگاڑ نہیں پاتے۔ اس دور میں جگر کے اشعار یقیناً ہلکے ہوتے تھے

ظاہر ہے کہ "داغ جگر" کے شاعر کو "آتش گل" کی منزل پر پہونچنے کے لیے طویل سفر کی ضرورت تھی جس کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا لیکن اس مخالفت کا ایک دوسرا پہلو رشک و حسد کا بھی تھا جو کسی نہ کسی شکل میں ان کی زندگی کے آخری ایام تک باقی رہا۔ بلکہ بعض حضرات نے تو انتقال کے بعد بھی ان کے بے حد مقبول ہونے کے گناہ کو نہ معاف کیا۔

جگر اس زمانہ میں ان "اساتذہ وقت" کی مخالفت سے ادبی طور پر کہاں تک متاثر ہوئے اور اس نے ان کو اپنے کلام پر زیادہ توجہ مبذول کرنے پر کہاں تک اکسایا یہ ایک الگ بحث ہے لیکن نفسیاتی طور پر ان کا متاثر ہونا فطری بات تھی کوئی عام صلاحیتوں کا شاعر ہوتا تو وہ اس مخالفت سے احساس کمتری کا شکار ہو کر رہ جاتا اور بہت ممکن تھا کہ شاعری ترنم سے آگے نہ بڑھ پاتی اور جگر کا بھی وہ کام ہوتا جو محض ترنم کے لیے شہرت رکھنے والے شاعروں کا عموماً ہوتا ہے۔ لیکن جگر مسکرا مسکرا کر اس مخالفت کو جھیلتے رہے ان میں کسی قسم کا احساس کمتری نہ پیدا ہوا انھوں نے عوام کی داد و تحسین کو اپنی شاعری کی زندگی سے قریب تر کا آئینہ تصور کیا اور مستقل مزاجی سے آگے بڑھتے رہے۔

بڑے بوڑھوں اور تنگ نظر ہم عصروں کی مخالفت کی اس دلدل سے جگر سرخرو ہو کر نکلے تو اردو میں جدید اور ترقی پسند ادب کی تحریکیں طوفان بنکر اٹھیں اور ایسا محسوس ہوا کہ غزل جس کے جگر شاعر تھے اس طوفان میں خس و خاشاک کی طرح بہ جائے گی۔ یہ تحریکیں جگر یا کسی دوسرے غزل گو کی براہ راست مخالف نہ تھیں لیکن چونکہ ان کا مقصد نئے ڈھنگ سے نئے خیالات

کی ترجمانی کرنے کے ساتھ ہی ساتھ پیرایۂ بیان کی سخت مخالفت کرنا بھی تھا۔ اردو شاعری میں غزل کو خاص طور سے رجعت پسندی کی علامت قرار دیا جا رہا تھا اس لیے ان کی چوٹ بالواسطہ جگر پر بھی پڑی۔

۱۹۳۵ء کے بعد کا زمانہ سارے اردو ادب کے لیے عموماً اور اردو شاعری کے لیے خصوصاً ہنگامی زمانہ رہا ہے۔ نظم کا دور شروع ہوا۔ نظمِ آزاد، نظمِ معریٰ اور نیم پابند، نیم آزاد، نظموں کی اخبارات و رسائل میں بھرمار رہنے لگی۔ غزل اور غزل کے شاعر کو، گئے دنوں کی چیز قرار دینا فیشن میں داخل ہو گیا۔ شاعری کی دنیا میں نئے نئے نام سنائی دینے لگے۔ میراجی، راشد، یوسف ظفر، قیوم نظر اور بعض دوسرے شعرا کی نظمیں مشکل سے سمجھ میں آنے یا بالکل سمجھ میں نہ آنے اور اردو شاعری کی روایات کے یکسر خلاف ہونے کے باوجود مقبول ہونے لگیں۔ یہ نظمیں معیاری رسالوں میں نمایاں طور شائع ہوتی اور ادبی مجلسوں میں بحث کا موضوع بنتی تھیں۔ جدید ادب سے تعلق رکھنے والے شعرا کے علاوہ کمیونسٹ عورتوں کا ایک گروہ سامنے آیا۔ ان میں مخدوم محی الدین۔ علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی وغیرہ شامل تھے۔ ایک تیسرا گروہ بھی تھا جو جدید اور ترقی پسند تحریک کے سلسلے میں متوازن رویہ اختیار کیے ہوئے تھا ان میں فیض، مجاز، جذبی، احمد ندیم قاسمی، علی جواد زیدی۔ اختر انصاری، اور سلام مچھلی شہری وغیرہ شامل تھے ان تینوں گروہوں کے شعرا نئے موضوعات کو نئے ڈھنگ سے پیش کرنے کے حامی تھے اور غزل کو فرسودہ اور ناقابلِ التفات صنف تصور کرنے کا رجحان ان سب میں تقریباً یکساں تھا۔

جدید ادب کی تحریک تو زیادہ دن نہ چل سکی لیکن ترقی پسند ادب کی تحریک نے زور پکڑا۔ اس تحریک نے جو سیاسی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بھی تصور کی جاتی تھی سیاسی موضوعات کو دیگر تمام موضوعات پر ترجیح دی۔

سیاسی شاعری کے اس طوفان میں جو تقسیم ہند کے کچھ برس قبل سے چند برس بعد تک جاری رہا غزل (اور غزل گو شعرا پر کیا بیتی اور بحیثیت مجموعی اس سے اردو شاعری کو نقصان پہونچا یا فائدہ۔ اس بحث میں الجھے بغیر بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس نے شاعری کے عام ذوق اور مزاج کو (عارضی طور پر ہی کیوں نہ سہی) بڑی حد تک بدل دیا۔

اس پورے دور میں بڑے شاعروں میں صرف جگر ہی ایک ایسے تھے جنھوں نے غزل کی شمع روشن رکھی۔ ترقی پسند شعرا سے ان کا فاصلہ تھا۔ وہ ان کو غزل کی مخالفت میں باتیں بھی سنتے تھے اور ان کے نیم سیاسی مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے لیکن اس زمانہ میں ان کی ذات غزل کو زندہ رکھنے کی تحریک کی شکل اختیار کر گئی تھی اور یہ انھیں کا دم تھا کہ ایسے مشاعروں میں بھی جہاں سامعین سیاسی مزاج کے ہوتے تھے اور طویل طویل سیاسی نظمیں سنتے تھے وہ اپنی غزلوں کی بدولت کامیاب ہوئے۔

جگر کے لئے یہ دور یقیناً بڑا صبر آزما ثابت ہوا ہوگا۔ اور اگر وہ اپنے طرز بیان اور خیالات کے سلسلے میں کسی کش مکش کا شکار ہو گئے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ خاص طور سے اس لئے اور بھی کہ ان کے ایک ممتاز ہم عصر فراق گورکھپوری تک جن کا مرتبہ غزل میں جگر سے کم نہیں سیاسی

شاعری کے اس رجحان سے متاثر ہو گئے اور ایسی الٹی سیدھی سیاسی نظمیں لکھنے لگے کہ یہ یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ یہ نظمیں جدید غزل کے اتنے بڑے شاعر کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔

سیاسی شاعری کے اس عام رجحان سے جگر بھی اگر متاثر ہو جاتے تو یہ کوئی عجیب و غریب بات نہ ہوتی بلکہ شاید بعض ناقدین ان کے اس اقدام کو بے حد سراہتے اور ان کی شہرت میں عارضی طور پر کئی گنا اضافہ ہو جاتا جیسا کہ جوش کی شہرت اس زمانے میں سستی قسم کی سیاسی شاعری کی بدولت اچانک بہت بڑھ گئی تھی۔ لیکن جگر کے قدم ایک لمحہ کے لئے بھی نہ ڈگمگا سکے۔ انھوں نے غزل کو ٹھکرایا نہ اس کی صحت مند روایات کو۔ بلکہ وہ غزل کی صحت مند روایات کو سنوارنے اور نکھارنے میں مصروف رہے۔ یہ بھی نہیں کہ انھوں نے خود کو غزل کے مخصوص موضوعات کے محدود دائرے میں اسیر کر لیا ہو۔ قحط بنگال، فرقہ وارانہ فسادات، تقسیم ہند اور اس کے بعد کے بعض اہم واقعات رونما ہوئے۔ سچے اور حساس شاعر کی طرح وہ متاثر ہوئے ہیں اور انھوں نے اپنے تاثرات کو اشعار کا جامہ پہنایا ہے۔ لیکن بہرحال غزل کے روایتی حسن کو برقرار رکھا ہے اور ان سیاسی موضوعات کو اتنی خوبصورتی سے غزل کے سانچے میں ڈھالا ہے کہ ایک ایک شعر اس دور کی طویل سے طویل سیاسی نظموں پر بھاری ہے۔

سیاسی شاعری کا یہ ہنگامی دور ختم ہوا۔ طویل سیاسی نظموں کی ریل پیل رکی اور ایک بار پھر لوگ غزل کی طرف واپس لوٹے تو جگر کی شاعرانہ عظمت

صحیح طور پر نمایاں ہوئی اور عام طور پر تسلیم کیا جانے لگا کہ اس پورے ہنگامی دور میں غزل کے زندہ رہ جانے میں جگر کی کاوشوں کا بہت ہاتھ تھا۔ غزل کی شدید مخالفت کے اس زمانے جگر جیسا بڑا غزل گو اگر غزل کی آن برقرار رکھنے کا کوشاں نہ ہوتا تو شاید غزل اس طرح دوبارہ مقبولیت کا درجہ نہ حاصل کر پاتی۔

غزل کی طرف سیاسی شاعری کرنے والوں کی واپسی کے متعدد اسباب ہیں اور یہ رجحان مجموعی حیثیت سے صحت مند نہیں قرار دیا جا سکتا لیکن ان شعرا کے کارناموں کو بہرحال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جنھوں نے غزل کو اس قابل بنا دیا کہ اس میں سیاسی شاعری کرنے والے سیاسی موضوعات کو بھی نظم کر سکیں۔ ایسے شعرا میں جگر کا نام سر فہرست ہے۔

جگر خود اپنی مخالفت اور غزل کی مخالفت کے صبر آزما زمانے سے اپنی مستقل مزاجی شاعرانہ خلوص، انداز بیان کی جدت و ندرت اور افکار و خیالات کے نئے پن کی وجہ سے جس طرح کامیاب ہو کر نکلے اور جس طرح انھوں نے نوجوان شعرا کی پوری ایک نسل کو متاثر کیا اس سے ان کی مقبولیت میں بے حد اضافہ ہو گیا اور وہ عوام و خواص میں یکساں طور پر مقبول ہو گئے مخالفت کے زمانے میں بھی مشاعروں میں ان سے زیادہ کامیابی کسی کو بھی نہ حاصل ہوتی تھی۔ لیکن مخالفت کے بادل چھٹ گئے تو ان کی مقبولیت میں احترام اور عقیدت کے جذبات بھی شامل ہو گئے۔ دھیرے دھیرے وہ شعر و سخن کی دنیا پر کچھ اس طرح چھا گئے کہ ان کے انتقال کی خبر سے

چاروں طرف صف ماتم بچھ گئی ایسا محسوس ہوا جیسے صرف ایک شاعر کا انتقال نہیں ہوا بلکہ پوری ایک انجمن اجڑ گئی۔ پوری ایک ادبی تحریک ختم ہو گئی۔

فرد سے انجمن تک۔ غم ذات سے غم حیات تک، مے خانے سے حرم تک داغ جگر سے آتش گل تک۔ جگر کا سفر ایک حساس باشعور اور عظیم شاعر کے ذہنی ارتقا کی داستان ہے وہ ہر لمحہ بدلتے ہوئے وقت سے قدم ملاتے نظر آتے ہیں۔ نئے خیالات سے متاثر ہوتے ہیں۔ ماحول کے مطابق خود کو بدلتے ہیں۔ اور اپنے خوابوں کے مطابق ماحول کو بدلنے کی شدید آرزو رکھتے ہیں اور زندگی اور شاعری کے سلسلے میں ان کے اسی رویہ میں شاید ان کی انفرادیت اور عظمت کا راز پنہاں ہے۔

قیصر تمکین

روحِ عصر، جگر کے کلام میں

حضرت جگر کے بارے میں کچھ بھی کہنے یا لکھنے کے لئے ان پورے حالات
کا جائزہ لینا ناگزیر ہے جن میں ان کی شاعری کو فروغ ہوا اور شہنشاہِ تغزل
کا تاج اتفاق رائے سے ان کے سر پر رکھا گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ پچھلی تقریباً
نصف صدی کی اردو شاعری پر جگر کی شخصیت اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ
شعر و ادب کا کوئی بھی تذکرہ کیوں نہ ہو حضرت جگر کے نام نامی کے بغیر
نامکمل رہے گا۔

جگر نے جس وقت شاعری شروع کی وہ زمانہ مجموعی طور پر داغ کا زمانہ
تھا اور داغ کے رنگ سے الگ ہٹ کر کہنا یا لکھنا تقریباً ناممکن تھا اور یہ
اثر اس حد تک غالب تھا کہ خود اقبال تک کی ابتدائی شعری تخلیقات میں داغ کا
رنگ جھلکتا ہے ان کے علاوہ لکھنؤ اسکول کے نام سے شاعری کی جو روش عام
تھی وہ اپنی بےکیفی اور اثر انگیز جذبات و تخیلات سے عاری ہونے کی وجہ
سے اردو شاعری کو بدنام کرنے میں خاص معاون رہی تھی۔ جگر کے [illegible]
دو میلانات بہ یک وقت برابر برابر جاری ساری نظر آتے ہیں۔ [illegible]

تو دوسری شعر کو قید و بند سے آزاد کرنے کا رجحان جس کی قیادت شعرائے نو نفس کے ہاتھوں میں تھی اور دوسرا رجحان زبان و بیان پر ضرورت سے زیادہ زور دینے اور محض قافیہ آرائیوں تک محدود رہنے کا تھا۔ جگر میں ہر دو خصوصیات کا ایک سنگم سا ملتا ہے ان پر آ کر غزل کی ایک روایت ختم ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی نوائے شاعری خود ایک ایسی نئی روایت کو جنم دیتی ہے جو ہر آئینہ تازہ شفاف اور خوبصورت ہے۔

ایک ایسی روایت کو شکست کرنے میں جو پوری شاعری میں رچ بس گئی ہو جو مشکلیں پیدا ہوتی ہیں ان کا جگر کو سامنا نہیں کرنا پڑا اور غزل کو نئے اسلوب اور لب و لہجے سے آشنا کرنے میں بھی جو ممکن دشواریاں ہو سکتی تھیں وہ بھی جگر کی راہ میں نہ آئیں۔ اس کا سبب اس دور کے حالات بھی تھے اور خود جگر کی دلپذیر شخصیت بھی۔ عام طور پر لوگ پر تصنع شاعری سے اکتا چکے تھے اور حالی نے جو اعتراضات کئے تھے انھوں نے پڑھے لکھے دماغوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اس کے علاوہ قومی تحریک کی شدت کے ساتھ ہی ساتھ درباروں اور چھوٹے موٹے نوابوں جاگیرداروں کی مصاحبت کی روایت بھی ختم ہو رہی تھی شاعری کو اگر زندہ رہنا تھا تو اس انحطاط پذیر اور مخرب اخلاق ماحول سے بھی رستگاری ضروری تھی۔

تاریخ میں جب کبھی بھی معاشرے نے نیا رنگ و روپ اختیار کیا ہے اور سماج میں دور رس تبدیلیاں ہوئی ہیں اور ایک پرانے سانچے کو توڑ کر نئے معاشرے کی بنیاد ڈالنے کی شعوری کوششیں ہوئی ہیں ان کا اثر

سیاست و معیشت کے ساتھ ادب و شعر پر بھی پڑا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ پرانا ڈھانچہ یا معاشرہ اپنے مخصوص دور میں اپنے پیشرو سماج سے زیادہ ترقی پسند اور قابل قبول رہا ہو۔ مگر ہر نئے دور کے ساتھ نئے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں اور ایک پہلے سے بہتر اور زیادہ ترقی پذیر سماج گذشتہ سماج کی شکست و ریخت کے ساتھ ابھرتا ہے۔ ہر سماجی تبدیلی کی محرک معاشی ترتیب ہوتی ہیں اور ہر ادبی تحریک پران سماجی تبدیلیوں کا بھی اثر پڑتا ہے اس لئے ادیب بھی بنیادی طور پر معاشی حالات کا پابند ہوتا ہے ادبی تحریکیں اپنے مخصوص سماج اور اس کے زوال پذیر عناصر کے ساتھ ختم ہوتی ہیں اور نئی تحریکیں اور نئے فکری سیلانات نئے معاشی مسائل اور پیداواری قوتوں کے ساتھ ابھرتے ہیں اردو شاعری کے لب و لہجے میں جو تبدیلیاں نظر آتی ہے وہ بنیادی طور پر ملک کے سیاسی و معاشی تغیرات کا لازمی اثر تھی۔ غزل کے لب و لہجے کو وسعت دینے اور اس کے مزاج کو نئے امکانات اور نئے تصورات زماں و مکاں سے واقف کرانے میں جگر کی کوشش شعوری یا غیر شعوری۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ جگر ان معنوں میں دنیا اور اس کی ترقی پذیر قوتوں کے ساتھ تھے کہ انھوں نے وقت کے نئے آہنگ سے اپنے سوز و ساز کو ہم آہنگ بنا لیا۔ اور گذشتہ خوبیوں کے مرثیہ خواں ہو کر نہ رہے۔

جگر ایک خوبصورت ترنم کے بھی مالک تھے اور پیاری شخصیت کے بھی۔ جب کبھی وہ مشاعروں میں اپنی سحر انگیز آواز اور پرمعنی اشعار کے ساتھ

پہونچتے تو سامعین نے دیدۂ و دل فرشِ راہ کر دیتے ان کی غزل گی لے
سب سے مختلف ہونے کے باوجود بھی سب سے زیادہ مقبول تھی۔ اسی
لئے جب انھوں نے اپنے مخصوص ترنم اور سازِ آہنگ کے ساتھ دورِ حاضر
کا مرثیہ کہا تو ان کی آواز برآوازِ ملا نے کو ایک زمانہ ساتھ تھا۔
اس دور میں کیا ہو گیا ادبِ جنوں کہ　　جینے کی ادا یاد نہ مرنے کی ادا یاد
جگر کی ذاتی مقبولیت کا دار ان کے عالم ہوش سے زیادہ
ادائے خود فراموشی میں مضمر ہے ان سے نسبت کرنے والے ان کی پی کر
بہک جانے کی کیفیات سے بھی واقف ہیں اور بہک کر ہوش میں آجانے
کی منزل سے بھی۔ مگر حقیقت ہے کہ وہ مرل ہوش میں ہوں یا عالم مدہوشی
میں۔ شاعرِ اول ہیں اور شاعر آخر۔ خود کہتے ہیں۔

عقل و جنوں میں سب کی تھیں راہیں جدا جدا
ہر پھر کے لیکن ایک ہی منزل پہ آ گئے

ان کی مقبولیت عام کا شرف عطا کرنے میں ان کی حد سے زیادہ
خاکساری کو بھی بڑا دخل تھا ان کے یہاں انانیت مطلق نہیں ہے
وہ ہر جگہ اپنے کو کمتر ہیں اور خاکسار سمجھتے ہیں لیکن ان کی یہی انکساری
ان کی ادا ہے۔ وہ گو ہر کی خود اپنے الفاظ میں وہ منجملہ خاصاں میخانہ"۔
تھے مگر لوگ جانتے ہیں کہ وہ کس حد تک خاصان میخانہ تھے اور کس طرح
ان پیر میخانہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس سلسلے میں ان کا یہ شعر قابل غور ہے۔
مرا تو فرضِ چمن بندیٔ جہاں ہے فقط　　مری بلا سے بہار آئے یا خزاں گزرے

شعلۂ طور سے آتش گل تک جگر نے ایک بڑی منزل طے کی ہے ان میں سے ایک میں اگر سخن محض ہے تو دوسرے میں ماورائے سخن بھی بہت کچھ ہے اور یہی ماورائے سخن تجربات ہے وہ ان کو تمام غزل گو شعرا سے الگ ایک منفرد اور ممتاز شخصیت کا حامل بناتی ہے۔ انھوں نے حالات سے آنکھیں چرا کر گل و بلبل کے نغمے الاپنے کو پسند نہیں کیا بلکہ بڑی بے باکی سے عصری مسائل پر اظہار خیال کیا۔ ایسا کرنے میں انھوں نے شاعری کی بنیادی خوبیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ وہ ان چند بکھے ہوئے شعرا میں گنے جا سکتے ہیں جنھوں نے شاعری میں افادیت اور فکری عنصر کو جگہ دی مگر کسی وقت بھی محض جذباتی انقلابی یا پرچارک نہیں بنے ان کے دو ایک شعر لیجئے کس طرح ان محسوسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

زمانہ گرم رفتار ترقی ہوتا جاتا ہے   مگر اک چشم شاعر ہے کہ پرنم ہوتی جاتی ہے

دنگر جمیل خواب پریشاں ہے آجکل   شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آجکل

سلامت تو ترا میخانہ تیری انجمن ساقی   مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمت دار و رسن ساقی

شاعری کی وہ کلاسکی روایات جو عربی اور فارسی سے اردو میں داخل ہوئیں اور جنھوں نے غزل گو شعرا کی ایک نمایاں تاریخ مرتب کی جس کی مسلسل اور زریں جدول پر میر۔ مومن۔ غالب۔ فانی حسرت، اصغر، یگانہ ایسے شعرا کے نام نامی منقوش نظر آتے ہیں ان کو بڑی حد تک قائم رکھتے

سازِ حیات سازِ شکستہ ہے ان دنوں　　بزمِ خیال جنتِ ویراں ہے آج کل
دل کی جراحتوں کے کھلے ہیں چمن چمن　　اور اس کا نام فصلِ بہاراں ہے آج کل
صحنِ چمن میں بوئے وفا کا پتہ نہیں　　رنگِ رخِ بہار پریشاں ہے آج کل

اسی دوران میں ہمارے ملک کا سب سے بڑا حادثہ یعنی گاندھی جی کا قتل پیش آیا۔ اس پر جگر نے بڑی شاعرانہ باریک بینی سے لکھا۔

یہ نغمۂ حیات ہے کہ ہے اجل ترانہ سنج　　یہ دورِ کائنات ہے کہ تھم گیا ہے اہرمن
ہزار در ہزار حیف اگرچہ رہبرانِ ملک　　مگر وہ رہبروں کا رہبر، وہ ایک مردِ صف شکن
وہی مہاتما وہی شہیدِ امن و آشتی　　پریم جس کی زندگی خلوص جس کا پیرہن
وہی ستارے ہیں مگر کہاں وہ ماہتابِ ہند　　وہی ہے انجمن مگر کہاں وہ صدرِ انجمن

ظاہر ہے کہ جگر نے جو لکھا وہ کسی مخصوص ملک یا سیاسی نظریہ سے وابستگی و شدت کی وجہ سے نہیں بلکہ انھوں نے یہ اس لئے لکھا کہ انھوں نے ایسا محسوس کیا۔ "وہ شعرائے بے کتاب و بے نگارے کے قائل رہے اور بڑی حد تک رہے لیکن جب کبھی انھوں نے زندگی کو درماندہ و پریشان دیکھا تو "حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز" کے بھی ہمنوا بن گئے۔ ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ کسی نظریے یا مکتبِ خیال کے پابند نہیں تھے اور اسی لیے ان کے یہاں کوئی باقاعدہ نظامِ فکر بھی نہیں ملتا ہے۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جگر باشعور فنکار نہ تھے۔

ان کو اپنے گرد و پیش کے حالات و حدود و استقرار کا اسی طرح احساس تھا جس طرح کہ دوسرے باشعور دانشوروں کو۔ مگر جگر نے فن کو پروپیگنڈہ

کے لئے قربان نہیں کیا ان کو بات کہنے کا ڈھنگ آتا تھا وہ حالات پر غیر جانبدارانہ طور پر اظہار خیال کرتے تھے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اظہار حقیقت میں انھوں نے کبھی کوتاہی نہیں کی لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے منصب کا لحاظ کرتے ہوئے فیصلے یا سزا و جزا کا معاملہ اہل سیاست ہی پر چھوڑ دیتے تھے وہ ناظر تھے مبصر نہیں۔ اس لئے کہتے ہیں۔

انسان کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر ۔۔۔ دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

لیکن حقیقت شاعر کے اور اس خیال کے قائل ہونے کے باوجود جیسے دل شاعر پر عیاں ہوتے ہیں انھوں نے اپنی دوربین نگاہوں سے یہ دیکھا کہ ایک بہتر زمانہ بہتر شب و روز لے کر آنے والا ہے۔

رحمت کا چمکنے کو ہے پھر نیر تاباں ۔۔۔ ہونے کو ہے اس شب کی سحر دیکھ رہا ہوں

یہی بات انھوں نے بڑی خوبصورتی سے کہی۔

صیاد نے لوٹا تھا جو سادل کا نشیمن ۔۔۔ صیاد کا لٹتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں

ارباب وطن کو مری جانب سے ہو مژدہ ۔۔۔ اغیار کو مجبور سفر دیکھ رہا ہوں

یہاں پر ایک سوال غزل اور نظم کی مقبولیت کا اٹھتا ہے۔ نئی شاعری کی آواز بحیثیت مجموعی نظم کی آواز ہے اور غزل اپنے سخت گیر اصولوں اور پابندیوں کی وجہ سے نئے مسائل و افکار کی متحمل نہیں سمجھی گئی ہے اقبال نے غزلوں کے ذریعے جدید ترین تصورات اور بین الملل مسائل پر اپنی بالغ نظری کے ساتھ روشنی ڈالی اسکے زمان و مکاں کو لامحدود وسعتوں سے

آشنا کیا اور ایک بار پھر صنفِ غزل کو صحت مند صنفِ شاعری بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ مگر اقبال کی آواز اردو کی دنیا میں بہت دور سے آتی معلوم ہوئی ان کے تجربات کے خلوص پر شبہ کیا گیا اسی وجہ سے ضرورت تھی کہ لکھنؤ ہی کے دبستانِ شاعری کا کوئی ترجمان اور نمائندہ غزل کے بعید ترین امکانات کو معلوم کرنے کی سعی کرے یہ کام اگر حسرت کے بعد کوئی اور کر سکتے کا اہل تھا تو وہ صرف جگر تھے۔ گزشتہ بارہ چودہ سال کے عرصے میں جگر نے جو کچھ لکھا وہ اپنی فکری عظمت سے قطع نظر اس لحاظ سے بھی قابلِ احترام ہے کہ انھوں نے غزل کے محدود و پابند گھروندے میں نئے دریچے کھولے اور صاف و تازہ ہوا اور روشنی کے حصول کے لئے اس محبوس چہار دیواری کی بعض کھڑکیوں کو توڑ کر بھی کھولا۔ لکھنؤ کے روایت پرست اور بیمار و آزردہ سفری ماحول میں یہ کوشش مستحسن نہیں سمجھی گئی مگر پھر بھی قابلِ تعجب امر یہ ہے کہ زبان و بیان کے پہرے داروں نے کوئی خاص شور و غل بھی نہیں مچایا۔

جگر کے یہاں "روحِ عصر" تیز و تند طوفانوں کی طرح تاراجی و پائمالی کرتی ہوئی داخل نہیں ہوئی بلکہ اس کا انداز ان کے یہاں شعر و ادب میں نسیمِ سحری کی آہستہ خرامی کی طرح تھا ان کی گرفت میں انتہائی سنگین مسائل بھی آتے ہیں آنے والے سماجی و نفسیاتی انقلاب کی ہلکی پرچھائیاں بھی ملتی ہیں مگر وہ "بھیڑیا بھیڑیا" نہیں چلانے لگتے ہیں (کیونکہ اس طرز فکر کے نتائج و عواقب ہندستانی ادیبوں نے ۱۹۴۹ء میں بائیں بازو

مگر ذاتی مفادات اور ایک رجعت پسند طبقے کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر اپنے عوام سے غداری کرکے ترک وطن کر جاتا ہے۔ ایسی صورت میں عوام پر خلوص اور مفاد پرست فنکار اور ادیب میں جلد ہی تمیز نہیں کر پاتے ہیں۔ جگر مفاد پرست شاعر نہیں ہیں انھوں نے جو کچھ سوچا ہے وہ وہی ہے جو ہندوستان کے بیشتر عوام نے سوچا ہے اور اسی لئے ان کے یہاں گھٹن گریز اور چیخ پکار نہیں ہے بلکہ دور حاضر کے امراض کی تشخیص محض اور نہ یوں ہی عوام کسی کو قبولیت عام کا تاج نہیں پہنانے۔

ادیبوں اور خاص طور پر اردو ادیبوں میں کسی غلط یا صحیح مقصد کے لئے قربانی کرنے کا جذبہ اپنے فقدان کی وجہ سے بہت نمایاں ہے پاکستان میں تو ایسی مثالیں ملی ہیں کہ ادیبوں نے حکومت کے اشارے پر لکھنے یا فرقہ پرستی اور رجعت پسندی کو ہوا دینے کی پیش کش اور بہترین مواقع مسترد کر دیئے مگر ہندوستان میں ایسی مثالیں کم ہیں۔ جگر نے اس سلسلے میں بلند کرداری کی ایک ایسی مثال قائم کی ہے جس کی کوئی نظیر فی الحال سامنے نہیں ہے۔ پاکستان کے ارباب دول کی پیش کش کو خوبصورتی سے مسترد کرتے ہوئے جگر نے صرف یہ کہنے پر اکتفا کی۔

یہی زمیں ترا مسکن یہی ترا مدفن
اسی زمیں سے تو مہر و ماہ پیدا کر

جگر کے یہاں بیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے کی ابتدا کے تمام مسائل و احساسات ملتے ہیں ان مسائل و احساسات کا ذکر

ان کے یہاں بہت ہی سلجھے اور باشعور انداز میں آیا ہے انھوں نے انسانیت کے مستقبل اپنے وطن کے مستقبل یا خود اپنے ہم مشربوں کے مستقبل کے بارے میں کبھی یاس و ناامیدی کا اظہار نہیں کیا۔ انتہائی مصلحت پسندی کے اس دور میں آزادی اور تیوروں کے نغمہ سرائی کرنا آسان نہیں ہے۔ جگر اس سلسلے میں بہت عظیم کردار کے حامل تھے ان کا یہی کردار ان کو زندہ رکھنے کو کافی ہے۔

از مفتون کوٹوی

جگر مرحوم کی وطن پرستی

جگر مرحوم کے جذبات و تاثرات کی شدت سے جہاں انکار ممکن نہیں، وہاں ان کے خلوص و صداقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، ظاہر و باطن کی یکسانیت نے انھیں ایک ایسا عظیم المرتبت انسان بنا دیا تھا۔ جس کی مثال آج دنیا میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے وہ بڑے خود دار اور بے باک انسان تھے جیسا کچھ وہ محسوس کرتے تھے جو کچھ وہ سوچتے تھے، اسے بہ انداز بے کم و بیش ظاہر کر دیا کرتے تھے۔ اور اس میں انھیں کوئی چیز مانع نہ آتی تھی۔ نہ کسی کی امارت و ریاست نہ کسی کا وقار و اقتدار

—— وطن دوستی کا اظہار ہندوستان ہی میں نہیں، ہندوستان سے باہر پاکستان میں بھی کیا جاتا رہا۔ وہاں فرمائش کے باوجود اس نظم کو سنانے سے انھوں نے انکار کر دیا جس میں ارباب وطن کی خامیوں کا اظہار کیا گیا تھا۔ اور ملک کے انقلابی ہنگاموں کا تذکرہ تھا۔ صاف کہہ دیا گیا کہ یہ نظم ہندوستان والے ہندوستان کے اندر سن سکتے ہیں۔ وہاں اس نظم کے سننے سنانے کا مطلب، غیر ملکیوں کے سامنے اپنے وطن کی اہانت کے علاوہ اور کچھ نہ تھا اور یہ جگر کو کسی صورت میں بھی گوارا نہ تھا —— پاکستان کے مشاعرہ میں مقامی شاعر کی اس نظم کے خلاف جس میں جہاد کے لئے کشمیر چلنے

کی ترغیب و دعوت دی گئی تھی ان کا سر مشاعرہ احتجاج کرنا اور اس مشاعرہ سے اٹھ کر چلا جانا ان کی وطن پرستی کا ایک بیّن ثبوت تھا۔ خیالی طور پر یہ فعل کسا ہی سہل و خوشگوار سہی، عملی طور پر ایک ایسے شخص کی جانب سے اس کا مظاہرہ جو مشاعرہ میں نمایاں حیثیت، ممتاز شخصیت رکھتا تھا اور معزز مہمان کے طور مدعو تھا بڑے زبردست کردار کا مظہر ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جگر کے دل میں اپنے وطن کی محبت و عظمت کس شدت و خلوص کے ساتھ جاگزیں تھی۔ پاکستان میں ان کے کئی محبوب ترین دوست موجود تھے۔ عزیز تھے، اقربا تھے۔ وہاں کے ارباب حل و عقد ان کے لئے چشم براہ تھے۔ جگر مرحوم کے سامنے کئی مثالیں ایسی تھیں، کہ ترک وطن کرکے لوگ وہاں چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے نہ کسی کو شکوہ نہ کسی کو شکایت، تاہم انھوں نے خاک وطن کو ملک سلیمان سے خوشتر ہی سمجھا پاکستان میں "سواحل گنگا و گلگشت جمن" کہاں میسر آسکتی تھی، لہذا بقیہ زندگی انھوں نے یہیں بسر کی اور یہیں ہندوستان جنت نشان میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

خلوص و صداقت کی شرانداریاں رنگ لائے بغیر نہیں رہتیں۔ سارباب حکومت نے ان کی وطن پرستی پر نہ کبھی شک کیا نہ انھیں کوئی شک کا موقع مل سکا اگرچہ وہ اپنی بے باک طبیعت کے تحت حکومت کی خامیوں اور بدنظمیوں کی طرف اپنی نظموں میں اہل حکومت کو توجہ دلاتے رہتے تھے۔ ان کا آخری مجموعہ "آتش گل" چھپا پاکستان میں اور قدر افزائیوں کی بہاریں لایا ہندوستان میں۔

س مجموعہ میں وہ نظمیں بھی شامل ہیں جن کی جانب اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی نے سنہ ۱۹۵۸ء میں پانچ ہزار کا انعام ۵۷-۵۶-۵۵ء کی بہترین اُردو کتاب مانتے ہوئے انھیں دیا۔ حکومت نے انھیں علمی وظیفہ بھی دیا۔ اور اب وہ پنشن ان کی بیوہ کو منتقل کر دی گئی ہے۔ علاج کے لئے انھیں مالی امداد دی گئی۔ وطن دوستی کے جذبۂ پرخلوص کی قدر و عظمت ان مثالوں سے صاف واضح ہے۔

اگرچہ وہ شہنشاہِ غزل تھے۔ یعنی محض غزل گو شاعر تھے۔ وہ غزل حسن و عشق کے معاملات جس کی روح ہیں اور جس کی رونقیں انھیں تا ب ناکیوں سے ہے۔ لیکن وہ گرد و پیش کے حالات سے بے خبر اور اپنے ماحول سے بے پروا ہو کر گذرنے والے انسانوں میں سے نہیں تھے۔ اسی زمین پر رہتے تھے۔ اس زمین کے حادثات و واقعات سے متاثر کیوں نہ ہوتے؟ جب کہ وہ فطری شاعر تھے۔ حساس طبیعت اور دردِ انسانی سے لبریز دل رکھتے تھے، جذبۂ وطن پرستی کے تحت انھوں نے جہاں جہاں اس کی خلاف ورزیاں پائیں یا اس جذبہ میں جہاں انھیں عناد و نفاق اور فتنہ و شر کی بو آئی وہ برملا بڑک اٹھے ایسے انسان نما درندوں، اور دوست نما دشمنوں کی نقاب کشائی وہ اس طرح کرتے ہیں ؎

ہندوستاں میں خیر سے ان کی کمی نہیں
سب یہ ہیں جو خلوص کا دفتر لئے ہوئے
دیتے ہیں بات بات پہ انسانیت کا درس
دل میں ہزار دشنہ و نشتر لئے ہوئے
چہرے جنونِ حبِ وطن سے دھوئیں دھوئیں
سینے خباثتوں کا سمندر لئے ہوئے

ظاہر میں کُچھ مجسمہ امن و آشتی — باطن میں لاکھ فتنۂ محشر لئے ہوئے
کہتے ہیں بھائی بھائی ہیں اہلِ وطن تمام — پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لئے ہوئے

اسی طرح ایک دوسری نظم کے چند اشعار اور پیش کئے جاتے ہیں ؎

زبانوں پہ اصلاحِ قومی کے نعرے — مگر نیتیں بیشتر مفسدانہ
غریبوں پہ جو کچھ گذرتی ہے گذرے — سمٹ آئے جیبوں میں سیکن خزانہ
مجسّم خود اک پیکرِ مادّیت — مگر درسِ روحانیت عارفانہ

یہ اشعار ایسے آئینے ہیں جن میں اگر ہمارے اربابِ وطن صدق دلی اور دیانت داری سے اپنے چہرے دیکھیں تو ان میں سے اکثر ویسے نظر نہیں آئیں گے جو دنیا انھیں سمجھے ہوئے ہے یا جیسا وہ دنیا کو ظاہر کرانا چاہتے ہیں۔ حقیقت میں ایسے منافق اور گندم نما جو فروش انسان عالمِ انسانیت پر بار ہیں ایسی زندگی سے خودکشی ہی بہتر ہے ؎

یہی ہے زندگی تو زندگی سے خودکشی اچھی
کہ انساں، عالمِ انسانیت پر بار ہو جائے

وطن پرستی کے سلسلہ میں جناب جگر نے یہ شعر بھی خوب کہا ہے ؎

بہ شکلِ ناخدا جس میں ہیں اب تک جعفر و صادق
وہ کشتی غرق ہو جائے تو بیڑا پار ہو جائے

اربابِ وطن پر وہ جب غیر ملکی حکومت کے مظالم دیکھتے ہیں تو بے اختیار تڑپ اٹھتے ہیں۔ غزل کہہ رہے ہیں لیکن مقطع میں بے قرار ہو کر فرما ہی بیٹھے ؎

حکومت کے مظالم جب سے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں
جگرؔ ہم بمبئی کو، کوچۂ قاتل سمجھتے ہیں

ارباب وطن کو جب خاک و خون میں ستھرا ہوا دیکھتے ہیں تو ان کا جذبۂ وطن پرستی بھڑک اٹھتا ہے۔ وہ بے قرار ہو جاتے ہیں، دیکھئے ان اشعار کا کیا جواب ہو سکتا ہے ؎

چشم کشادہ جانب رزم گہ وطن نگر — مقتل کا بنو رہیں، لاشۂ بے کفن نگر
خون حیات سو بہ سو خاک سرشتہ مو بہ مو — حلق بریدہ کو بہ کو، بچہ و مرد و زن نگر
بر تن حسن نازنیں آہ ز فرق تا قدم — زخم شفق شفق بہ بیں داغ چمن چمن نگر
طفل و جوان و پیر را صف بہ صف بہم بہم — دست جدا ز ساعد و فرق جدا ز تن نگر
بچہ شیر خوار را پیش نگاہ مادرش — چاک ز سینہ تا کمر کشتہ و بے کفن نگر
باز بیا بہ آگرہ دجلۂ خوں نظارہ کن — باز برو بہ کاشمیر کشتن و سوختن نگر
ہائے ازیں گزندگاں وائے ازیں درندگاں — ہند و بہار ہند را بسمل و خستہ تن نگر

بہت طویل نظم ہے جو شاعرانہ انداز بیان کے ساتھ وطن پرستی کے تمام احساسات و جذبات سے بھرپور ہے، واقعات و حادثات کے جزوی جزوی بیانات اگرچہ شاعرانہ مشاہدات اور واردات قلبی کے تحت ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ لیکن انھیں سے شاعر کی وطن پرستی اور وطن دوستی کے بلند معیار اور خود اس کے اعلیٰ وقار کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ "قحط بنگال" میں بھی یہی جذبہ بڑی شدت خلوص کے ساتھ کارفرما نظر آتا ہے ؎

افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سر راہ — بے گور و کفن خاک بہ سر دیکھ رہا ہوں

بچوں کا تڑپنا، وہ بلکنا وہ سسکنا — اں باپ کی مایوس نظر دیکھ رہا ہوں
بے مہری و بے دردی و افلاس و غلامی — یہ شامت اعمال بہر دور دیکھ رہا ہوں
انسان کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر — دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

اور پھر اس نظم کا انجام جس تابناک امید پر ختم ہوا وہ بھی جذبۂ وطن پرستی کا ایک درخشاں عنوان ہے ؎

ارباب وطن کو مری جانب سے ہو مژدہ — اغیار کو مجبور سفر دیکھ رہا ہوں
رحمت کا چمکنے کو ہے پھر نیر تاباں — ہونے کو ہے اس شب کی سحر دیکھ رہا ہوں
بیدارئ و آزادی و اخلاص و محبت — اک خندۂ آغوش نظر دیکھ رہا ہوں

"آج کل" کے عنوان سے جو طویل نظم مجموعہ میں شامل ہے، اس میں بھی وقتی حالات، ملکی انتشار اور ماحول کی افراتفری کا نقشہ بہترین انداز میں کھینچا گیا ہے اس سوز قلبی کے ساتھ جو ایک مخلص وطن پرست شاعر سے ہی ممکن ہے ؎

ساز حیات، ساز شکستہ ہے ان دنوں — بزم خیال، جنت ویراں ہے آج کل
آنکھیں تمام مشہد عشق و جمال ہیں — سینہ تمام گنج شہیداں ہے آج کل
دل کی جراحتوں کے کھلے ہیں چمن چمن — اور اس کا نام فصل بہاراں ہے آج کل
کیسا خلوص، کس کی محبت، کہاں کا درد — خود زندگی متاع گریزاں ہے آج کل
سازش، دغا، فریب، بحق پروری، دروغ — ہر درد کا یہ نسخۂ آساں ہے آج کل
وہ قومیت کہ جس سے ہے انسانیت ذلیل — ہندوستاں میں کس قدر ارزاں ہے آج کل

دلی و دہرہ دون نواکھالی و بہار
انساں ہے اور ماتم انساں ہے آج کل

تعداد ایک فرقہ کی جتنی بھی گھٹ سکے
کار ثواب و کار نمایاں ہے آج کل

کاٹے کسی کے حق میں کسی کو گل و ثمر
کیا خوب اہتمام گلستاں ہے آج کل

اس نظم کے آخری شعر میں جو لعن و طعن کی تندی و تیزی، جذبات و تاثرات کی تلخی و ناگواری لب و لہجہ کی جھلاّہٹ اور بیقراری موجود ہے۔ اس سے شاعر کے ان واردات قلبی کا اندازہ لگائیے جو اس وقت وطن دوستی کے تحت اسے بے قرار و مضطرب کئے ہوئے تھے ؎

اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے اے جگر

آزادی کے بعد ملک کے حالات نے جو خونین رخ اختیار کیا وہ حساس طبیعتوں کے لئے آسانی سے گذر جانے والی چیز نہ تھی۔ ملک کا ہر شاعر کم و بیش اس سے متاثر ہوا ہے۔ ہر خیر خواہ وطن اور ہر پرستار ملک ان واقعات پر خون کے آنسو بہا رہا ہے۔ اس وحشت و بربریت پر لعن و طعن کر رہا ہے۔ آزادیٔ وطن کو ایک سال گذر چکا ہے لیکن فضا اب تک بھی ارباب وطن کے لئے سازگار نہیں ہو سکی ہے۔ ہمارے حساس شاعر نے ایک بڑی طویل نظم حوالۂ قلم کی ہے کچھ اشعار اس کے بھی ملاحظہ کیجئے ؎

اگرچہ آزادیٔ وطن کو گذر چکا ایک سال کامل
مگر خود اہل وطن کے ہاتھوں فضا ہے ناسازگار اب بھی
خود اپنی بد نیتی کے ہاتھوں بُرے نتائج بھگت رہے ہیں

صداقتوں سے حقیقتوں سے وہی ہے لیکن فرار اب بھی
اسی کا ہے نام اگر ترقی تو اس ترقی سے باز آئے
کہ خون مخلوق سے خدا کی زمیں ہے لالہ زار اب بھی
نہ وہ مروت نہ وہ صداقت نہ وہ محبت نہ وہ شرافت
وہیں خوف و خطر ہیں یعنی سکون و امن و قرار اب بھی
زبان و دل میں نہ ربط صادق نہ باہمی وہ خلوص کامل
جو تھے ندامت زندگی میں وہی ہیں لیل و نہار اب بھی

جشن نظام نو منایا جا رہا ہے لیکن ہمارے بے باک شاعر کے دل میں وطنی خلفشار کے تحت آگ بھڑک رہی ہے۔ یہی وطن پرستی کا جذبہ ہے جس کے تحت وہ پکار پکار کر بے باکانہ کہہ رہا ہے ؎

جو محو جشن نظام نو ہیں پکار کر ان سے کہہ رہا ہوں
یہ جان ہے سوگوار اب تک یہ دل ہے ماتم گسار اب بھی
سفارشیں ظالموں کے حق میں پیام رحمت بنی ہوئی ہیں
نہیں ہے شائستہ سماعت دکھے دلوں کی پکار اب بھی
لطافت جمہوریت کے پردے دروغ ہیں زندگی کے نقشے
دلیل اس کی یہی ہے کافی کہ ذہن ہے تنگ و تار اب بھی
یہ جشن آزادیٔ وطن ہے مگر اسی جشن و سرخوشی میں
بہت ہیں سینہ فگار اب بھی بہت ہیں بے روزگار اب بھی
مندرجہ ذیل شعروں کی حقیقت و صداقت کا مزا وہی دل اٹھا سکیں گے

جنھوں نے اس وقت کے حالات کا مشاہدہ بڑے قریب سے کیا ہے۔ ایک مسلمان ہونے کے ناطے مسلمانوں کی وکالت اور ان کے حقوق کی سفارش ایسے موقع پر کرنا، جگر ایسے شیر طبیعت انسان اور مخلص مزاج مسلمان کا ہی کام تھا ؎

انھیں کے حلقوں سے خود انھیں کی مخالفت عام ہو رہی ہے
ہماری جانب سے لیکن ان کی نظر ہے بیگانہ وار اب بھی

کہاں کی دلداری و محبت، تلافیوں کا تو ذکر ہی کیا ہے
حقوق پامال کر رہے ہیں حقوق کے پردہ دار اب بھی

زمانہ کیا کیا نہ کہہ چکا ہے، زمانہ کیا کیا نہ کہہ رہا ہے
مگر وہ ہیں وضع دار ایسے ذرا نہیں شرمسار اب بھی

جو شکایت اس وقت کی گئی تھی آج بھی اس کی تلافی کہاں ہو سکی ہے۔ حقیقت و صداقت سے اب تک گریز کیا جا رہا ہے۔ ذہن ابھی تک تنگ و تار ہیں۔ طبیعت کی یہ کراھن، شکووں کی یہ تلخی، شکایت کا یہ تیکھا پن، شاعر کو منصب شاعرانہ سے ہٹا نہیں سکا ہے۔ چونکہ شکایت اپنوں ہی سے ہے اس لئے محض شکایت و شکوہ پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا ہے۔ اس تلخ و ناگوار انداز بیان کے ساتھ دکھوں، شکووں اور شکایتوں کا مداوا بھی خود ہی پیش کیا جا رہا ہے ؎

وسیع مسلک، رفیع فطرت، خلوص ایماں، خلوص نیت
انھیں فضائل پہ ہے وطن کے وقار کا انحصار اب بھی

حرص و صداقت اگر ارباب وطن میں پیدا ہو جائے اور سے چمن کے
مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی ——— تو سے چمن میں آ سکتی ہے
ہٹ کر چمن سے رونقِ بہار اب بھی ———

اس امر کی وضاحت کے لئے کہ یہ شکایت محض دوستانہ ہے اور اسی
میں اپنوں ہی کو اصلاح پر لانے کی دلسوزانہ کوشش کے علاوہ اور کچھ نہیں
ہے اس نظم کے اخیر کا شعر قابل توجہ ہے جس میں شاعر کے شعار حیات پر بھی
روشنی پڑتی ہے ؎

جگر کی ہے زندگی محبت نہیں ہے اس کو کسی سے نفرت
جگر کے دل میں ہے سب کی عزت جگر ہے یاروں کا یار اب بھی

حقیقت فی الواقع یہی ہے کہ اپنوں سے شکایت، اپنی حکومت سے
حقوق طلبی، ارباب حل و اقتدار کی خامیوں کی نشان دہی، جہاں خود کی زندگی،
بیداری، حرارت اور خودداری کی آئینہ دار ہے۔ وہاں اس حب الوطنی اور
صدق نیتی کی بھی مظہر ہے جس کے تحت ایک وطن پرست اپنے باغ میں
ہر طرف بہار جاوداں دیکھنا چاہتا ہے اور ہر اس تند و تیز جھونکے پر چیں
بہ جبیں ہوتا ہے، جو گلشن کے نازک پھولوں کی افسردگی و پژمردگی کا
باعث ہو سکتا ہے،

جشن جمہوریت منایا جا رہا ہے ملک کے بڑے بڑے لیڈر تشریف فرما
ہیں۔ وہ بھی موجود ہیں جن کے ہاتھوں میں اب عنانِ حکومت آ گئی ہے۔

وہ بھی ہیں جو ابھی ابھی ملک کا دستور نو بنا چکے ہیں اور عوام کے جمہوری حقوق مان چکے ہیں۔ اعلان جمہوریت کا یہ جشن اس شان و شوکت کا حامل ہے کہ اپنی نظیر آپ ہے۔ ہمارا شاعر اس موقع پر جس انداز سے ترنم ریز ہے اس کے لب ولہجہ، طرز اور تیور کو ملاحظہ کیجئے ـــــ الفاظ سے باطنی کیفیات کا سراغ لگائیے۔ اور شاعر کے حقیقی منصب و مقام کو معلوم کر کے اس کے جذبات وطن دوستی کی داد دیجئے ؎

خدا کرے کہ یہ دستور سازگار آئے
جو بے قرار ہیں اب تک اُنھیں قرار آئے
وہ سرخوشی ہو کہ خود سرخوشی بھی رقص کرے
وہ زندگی ہو کہ خود زندگی کو پیار آئے

یہ دعائیہ کلمات ہیں اور "آمین" میں ہم سب آج بھی شامل ہیں لیکن ساتھ ہی یہ یاد دہانی اور نشان دہی، شکوہ کی جرأت و بے باکی۔ مسلمانوں کے ساتھ اب تک کے سلوک کی نقشہ کشی بھی قابل غور ہے ؎

چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشہ گوشہ میں
کہیں بہار نہ آئے کہیں بہار آئے
یہ میکدہ کی یہ ساقی گری کی ہے توہین
کوئی ہو جام بہ کف کوئی شرمسار آئے
خلوص و ہمت اہل چمن پہ ہے موقوف
کہ شاخ خشک میں بھی پھر سے برگ و بار آئے

یہ کیوں کر ممکن ہے اور اس کا طریق کار کیا ہے۔ ساتھ ہی اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے ؎

جنونِ عشق ہو صالح اگر تو ممکن ہے
کہ پھر سے اجڑے گلستاں میں بھی بہار آئے

نظامِ خلق و مروت کبھی جو برہم ہو
[illegible] و معف و محبت بڑھے سنوار آئے

دلوں پہ نقش نہ رہ جائے کوئی نفرت کا
یہ فتنہ بن کے نہ آشوبِ روزگار آئے

وہ حادثات زمانہ سے محو ہو جائیں
کہ جن کے ذکر سے انسانیت کو عار آئے

نمائشی ہی نہ ہو یہ نظام جمہوری
حقیقتاً وہ زمانہ کو سازگار آئے

خلوص و صدق و مساوات دل میں گھر کر لیں
نہ یہ کہ ذکر زباں پر ہی بار بار آئے

ضمیر صاف ہو اپنا تو غیر ممکن ہے
کسی کے آئینۂ قلب میں غبار آئے

زبان و دل میں بہم ارتباط ہو ایسا
کہ جو زبان کے دل کو اعتبار آئے

بنا دیا ہے محبت نے آگ کو گلزار
مگر جو آج کے انساں کو اعتبار آئے

دستور سازوں سے ایک حساس طبیعت وطن پرست، شاعرانہ انداز میں پند و نصیحت کر رہا ہے یہاں شاعر کے مقام و منصب کو بھی پہچانئے اور اس کی بلندی و عظمت کو بھی۔ کیا ٹھوک بجا کر بات کہی ہے ؎

خلوص و عدل و مساوات دل میں گھر کر لیں
نہ یہ کہ ذکر زباں پر ہی بار بار آئے

کاغذی دستور سازی سے کیا ہوتا ہے؟ زبان کی تسلی و تشفی سے کیا بنتا ہے؟
جب تک عمل و کردار اس کی ہم نوائی نہ کریں کتنا اچھا کہا ہے ؎

زبان و دل میں بہم ارتباط ہو ایسا
کہ جو زبان کہے دل کو اعتبار آئے

اخیر میں کہا ہے ؎

نہ ہو جو عام مسرت۔ محال ہے اے دوست
کہ زندگی کو کسی حال میں قرار آئے

یہی وہ شاعر ہے جو رئیس المتغزلین ہے۔ شہنشاہ غزل ہے۔ غزل ہی جس کی جولان گاہ ہے۔ جنون عشق و تاب جمال تک جس کی دنیا محدود ہے۔ لیکن وطن دوستی اور وطن پرستی کے جذبات کی شدت کا بھی اندازہ لگائیے کہ شاعر کو کہاں سے کہاں لا ڈالا ہے۔ ادھر تو شاعر کے کمال کی داد دیجئے کہ کہ اپنے پیمانوں میں ہی یعنی غزلوں میں ہی اپنے جذبات و تاثرات کی شراب ڈھال رہا ہے۔ ادھر غزل کے ظرف و وسعت پر نظر ڈالئے کہ جو شراب ان پیمانوں میں بھر دیجئے۔ انھیں سے رنگین و سرشار ہو جائے گی۔

یہ اندیشے بھی لگے ہوئے ہیں جو انسان نوازی اور انسانیت پرستی کی وسعت
میں ہی سمائے ہوئے ہیں ؎

مجھے ڈر ہے کہ اس ناپاک تر دورِ سیاسی میں
بگڑ جائے نہ خود میرا مذاقِ شعر و سخن ساقی
کہیں ملحد نہ بن جائیں مرے افکارِ سنجیدہ
کہیں مرتد نہ ہو جائے مرا ذوقِ سخن ساقی
کہیں خود حسن رہ جائے نہ قومی ملکیت بن کر
کہیں خود عشق ہو جائے نہ محدودِ وطن ساقی

حب الوطنی کے کیف سرشار جذبات اور پرکیف تاثرات کے ساتھ اس نظم کا
اختتام ہوا ہے ؎

بدہ جام مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
سوادِ ساحلِ گنگا و گلگشتِ چمن ساقی

شاہد در بغل، رندِ میکش شاعر جب یہ دیکھتا ہے کہ اپنے وطن میں ؎
غضب کی چھائی جا رہی ہیں ظلمتوں کی بدلیاں ستم کہ زد میں آندھیوں کی شمع سوزگار ہے
تو نوائے وقت بن کر پکار اٹھتا ہے ؎

اٹھو اٹھو کہ زندگی ہی زندگی پہ بار ہے بڑھو بڑھو! کہ چارسو پکار ہی پکار ہے
وہ وقت ہے کہ علم حق ہو علم شیطنت میں گم وہ وقت ہے کہ آدمی کا آدمی شکار ہے
کہاں کے مطرب غزل کہاں کے شاہد و چمن کہ زندگی کی تمام تر بساط کارزار ہے
زمیں کو روندتے ہوئے مہوں کو چیرتے ہوئے بڑھے چلو بڑھے چلو! یہ وقت کی پکار ہے

اس غوغائے بیداری کا مقصد کیا ہے ۔ اُٹھو اور ایک جنت جاوید ہیں پیدا کرو اور پھر اسی خاک سے فردوس بریں پیدا کرو۔ اور یہ کس طرح ممکن ہے ؎

خس و خاشاک تو ہم کو جلا کر رکھ دے یعنی آتش کدۂ سوز یقیں پیدا کر
دل کے ہر قطرہ میں طوفانِ تجلی بھر دے بطن ہر ذرّہ سے اک مہر مبیں پیدا کر

حقیقت میں وہ اسی دنیا کو جنت بنانے کے متمنی تھے ؎

آسماں مرکز تخیل و تصور کب تک؟ آسماں جس سے خجل ہو وہ زمیں پیدا کر

جناب جگر کا یہ وہ جذبۂ وطن دوستی ہے جس کے سبب آج بھی ان کی وطن پرستی ہمارے لئے موجب صد افتخار رہے۔ آج اگرچہ وہ ہمارے درمیاں نہیں لیکن یہ ان کی حب الوطنی کے ترانے ہمارے جذبات حب الوطنی کی آتش کو ہمیشہ تیز کرتے رہیں گے۔ گلشن پسندی کا یہ درس کہ پھولوں سے ہی محبت نہ ہو کانٹوں سے بھی نباہ ہوتا رہے۔ ہمارے لئے ہمیشہ درس عمل بنا رہے گا۔ ساتھ ہی سہ ہیں چمن میں چاہے جہاں رہو میرا حق ہے فصل بہار پر۔ بھی ہمارے پیش نظر رہے گا۔ اور اس حق کے اظہار میں ہم کسی موقع پر کسی سے پیچھے نہ رہیں گے۔

جناب جگر کو زندہ جاوید رکھنے والے جہاں ان کی زندگی کے اور پہلو ہیں، وطن دوستی کا یہ پہلو بھی انھیں ہمیشہ زندہ جاوید رکھے گا۔ اور میرے خیال سے انھیں یہ فرمانے کا بجا طور پر حق ہے ؎

"فنا گشتم و لیکن جاودانم"

جگر

وحشی محمود آبادی

ایک سخن فہم کی نگاہ میں

رئیس التغزل یعنی حضرت جگر مراد آبادی کی موت بلاشبہ وہ سانحہ ہے جس کے تاثر میں اخبارات کے کالم سیاہ ہو جائیں، ادبی جرائد کے نمبروں پر نمبر نکلیں مشاعروں کی گرما گرمی سرد پڑ جائے اور جہاں کہیں تغزل کے دیوانوں کا اجتماع ہو نگاہیں جگر کو ڈھونڈھتی رہ جائیں اور وہ نہ ملیں تو دلوں سے ایک چنگاری پھوٹ نکلے اور لبوں سے ایک آہ نکل جائے۔

خود حضرت جگر مرحوم کو بھی اپنے پرستاروں سے یہی امید تھی جبھی انھوں نے مرنے سے چند ہی روز قبل کہا تھا۔

جان کر منجملۂ خاصان میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

وہ درحقیقت نواسنجی کی روح اور غزل گوئی کی جان تھے اور ان کی ذات شعر و نغمہ کا وہ امتزاج تھی جس نے اپنے وجود سے دونوں کی ہم آہنگی کو ثابت کیا۔ اور جس سے قبل صف شعراء میں کوئی نظیر نہیں ملتی جس کا نام تغزل کی ضمانت بن گیا ہو۔

اردو غزل میں یوں تو بہت سے نام سرفہرست نظر آتے ہیں لیکن سطحی نگاہ سے دیکھئے میں غزل کی صرف دو شاہراہیں ملتی ہیں ایک میر کی دوسری غالب کی جگر کو غالب سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ ان کو اگر لایا جا سکتا ہے تو میر کے ذیل میں۔ حالانکہ ان کا

رنگ میر کے رنگ سے بالکل الگ تھلگ تھا ـــــ اور میرے خیال میں یہ اور زیادہ قابل قدر بات ہے کہ انھوں نے اپنا ایک بالکل جدا راستہ بنایا تھا۔

یہ ادر بات ہے کہ مقبولیت عامہ میں ان کا نام میر کے بعد لیا جا سکتا ہے اور اس طرح ان کو خدائے سخن کے ساتھ ایک مطابقت ہے۔

مشہور ہے کہ میر کے دور میں جب کوئی شخص کسی مقام سے دلی کا عزم کرتا تھا لوگ اس سے میر کی نئی غزلوں کی فرمائش کیا کرتے تھے ـــــ جگر بھی اس لحاظ سے کم خوش نصیب نہ تھے۔ ان کی حیات میں کسی مقام پر جب کبھی بڑے پیمانے پر محفل مشاعرہ منعقد کرنے کا انتظام کیا جاتا تو لوگ منتظمین مشاعرہ کو جگر کے نام کی طرف توجہ ضرور دلاتے اور غزل گو شعرا میں جس شاعر کو سب سے پہلے بلوایا جاتا۔ وہ جگر مرادآبادی ہی ہوتے

جگر صاحب کی اس مقبولیت کا راز کیا تھا؟ فنی زاویہ نگاہ سے اس کا جائزہ لینا اہل فن کا کام ہے۔ ہم تو صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ جگر کے شعر کانوں میں پڑتے ہی دل میں اتر جاتے تھے اور ان سے پیدا ہونے والے کیف کی ایک لہر رگوں میں دوڑنے لگتی تھی ـــــ اس کی تہ میں اگرچہ بہت کچھ خوش الحانی کی کارفرمائی تھی، لیکن اشعار کی موسیقیت بھی ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

غزل اردو شاعری کی لطیف ترین صنف ہے۔ اس میں دوسری پابندیوں کے ساتھ ساتھ ربط اور مناسب الفاظ کا استعمال ضروری ہوتا ہے اور انھیں الفاظ کی برمحل نشست سے شعر میں ایک ترنم پیدا ہو جاتا ہے جو ندرت خیال کے ساتھ

شعر کو بلند سے بلند تر کر دیتا ہے ــــ جگر صاحب کو اس میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ وہ جس خیال کو لے کر اٹھتے تھے۔ اس کو اس خوش اسلوبی سے نظم کر دیتے تھے کہ سننے والے کو ان کا مافی الضمیر سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہ ہوتی تھی ــــ اور شعر کی موسیقیت گلو کے ترنم سے مل کر اتنی سامعہ نواز بن جاتی تھی کہ سامعین سحر زدہ ہو کر رہ جاتے تھے اور جگر صاحب مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔

فطرت کی یہی دین تھی جس کے بل پر انھوں نے ایک ایک خیال کو کرر سہ کرر نظم کیا اور نقش اول اور نقش ثانی دونوں کو لاجواب بنا دیا ــــ ہجر و فراق کی زندگی گذارنے کا خیال کسی بھی زبان کے لئے نیا نہیں ہے اور اردو غزل کا دامن تو اس سے بھرا پڑا ہے۔ جگر صاحب نے بھی اس کو نظم کیا ہے۔

آہ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست، گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

کیا کہنا اس انداز بیان کا ایک پٹا ہوا خیال نیا قالب مل جانے سے نیا معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جگر کی قدرت کلام کی معراج نہیں ہے ان کی منزل اس سے بھی آگے ہے۔ وہ ایک دوسری زمین میں اس کو نظم کرتے ہیں تو سلاست زبان کے نہایت ارتقائی درجہ پر نظر آتے ہیں۔

یوں زندگی گذار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں

ان کا مجموعہ کلام اگرچہ زیادہ نہیں ہے پھر بھی وہ جواہر پاروں سے پُر ہے اور کوئی غزل ایسی نہیں ہے جس میں دو چار شعر زبان زد ہو جانے

کے قابل نہ ہوں ــــ اور بعض غزلیں تو شروع سے آخر تک مرصع ہیں حالانکہ
ان غزلوں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ صرف وہی افراد کر سکتے ہیں جنھوں
نے ان کو جگر کی زبان سے سنا ہے۔

کس قدر بارونق تھے وہ مشاعرے جن میں جگر صاحب نے شرکت کی۔
کتنی شاندار تھیں وہ محفلیں جن میں جگر کی آواز کسی سرمدی نغمے کی طرح گونجی
بدنصیب اردو نے پچھلی پانچ سالہ مدت حیات میں ان گنت شعراء
کی صف ماتم بچھائی ہے۔ کیسے کیسے شاعران خوش بیان نے اس کی آغوش میں
دم توڑا ہے۔ لیکن جگر نے اس کے پُرتاروں کو جو نغمے سنائے ہیں۔ ان کی
گونج کو بھلایا نہ جا سکے گا۔

مجھے ذاتی طور پر جگر صاحب کو سننے کا اتفاق اگرچہ زیادہ نہیں ہوا لیکن
جن مشاعروں میں ان کا کلام ان کی زبان سے سنا ہے وہ آج تک نظروں
میں پھر رہے ہیں اور شاید کبھی فراموش نہ ہو سکیں گے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جگر، شاعر نہیں ساحر تھے۔ میں اس خیال سے
متفق نہ ہونے کے باوجود اس کی تردید کرنے کو تیار نہیں کیونکہ جگر کی مقبولیت
کے بارے میں میرا مشاہدہ کچھ اسی قسم کا ہے۔ اور ان کا کلام سننے کے لئے ارباب
ذوق کی بے چینی اسی طرح کی کوئی رائے قائم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

جگر صاحب کا وہ آخری مشاعرہ جس کے بعد میں انھیں صرف ریڈیو پر
سن سکا۔ میرے لئے یادگار رہے گا ــــ وہ صدر مشاعرہ کے قریب ایک
نمایاں مقام پر فروکش تھے اور ہزاروں نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ مائک پہ

ایک استادِ فن تحت اللفظ میں کلام کی پختگی کا لوہا منوا رہے تھے۔ میرا حال دوسروں جیسا نہ تھا پھر بھی یقین تھا کہ مشاعرہ ختم ہونے کے قریب ہے اور جگر صاحب کا نمبر آنے والا ہے اس لئے میں بھی لمحات کے درمیان وقفہ سے ان کی جانب دیکھ لیتا تھا کہ استادِ فن نے اپنی غزل ختم کی اور کسی بے صبرے نے باوازِ بلند کہہ ہی دیا۔

جگر صاحب کا نمبر کب آئے گا آخر —— ؟

مشاعرہ پر ایک جمود سا طاری تھا۔ اس آواز نے ایک بیداری پیدا کر دی —— اور اتفاق سے اسی وقت ان کو پکار بھی لیا گیا۔

"اب رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی اپنے کلام سے محظوظ فرمائیں گے۔"

جگر صاحب شاید اس کے لئے تیار تھے۔ وہ کچھ اس انداز سے حاضرین کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے جیسے کہہ رہے ہوں۔

لیجئے نام پکارا گیا سودائی کا

کھل گیا حشر میں دفتر مری رسوائی کا (ناصری)

مشاعرے میں ایک کھلبلی سی پڑ گئی اور لوگ سنبھل سنبھل کر بیٹھ گئے کہ جگر صاحب نے نغمہ بار آواز میں مطلع کا پہلا مصرعہ پڑھا۔

وہ جو روٹھیں یوں منانا چاہیئے

قریب بیٹھے شعرا نے اس کو دہرایا اور جگر صاحب نے ایک بار پھر مصرعہ کا اعادہ کرنے کے تسلسل میں دوسرا مصرعہ پڑھ دیا۔

زندگی سے روٹھ جانا چاہیئے

شاعرے میں شور تحسین بلند ہو گیا اور چار جانب سے مکرر، پھر ارشاد ہو کی آوازیں آنے لگیں۔ جگر صاحب نے ایک مرتبہ پھر رندانہ انداز میں مطلع سنایا اور مطلع ثانی پڑھنے کا ارادہ کرنے لگے ___ لیکن وہ اس ارادے پر عمل نہ کر سکے اور لوگوں کے اصرار نے ان کو مجبور کر دیا۔

"حضور! ایک بار پھر عنایت ہو ___ سیری نہیں ہوئی ابھی"!

جگر صاحب اب اس کی ضرورت نہ سمجھتے تھے مگر سامعین کی فرمائش کو رد نہ کر سکے اور تیسری بار پھر مطلع کو سنانے لگے۔

ان کا خیال تھا کہ اس کے بعد "فرمائش" کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی لیکن انھیں سخت مایوسی ہوئی جب چوتھی بار پڑھنے کی استدعا کانوں میں پڑے بغیر نہ رہی ___ ایک شاعر اس سے زیادہ اور کیا چاہتا ہے؟ جگر صاحب بھی قبولیت عام پر فخر کا احساس کرتے تھے مگر انھوں نے اصرار بیجا کو رد نہ کیا اور پہلے مطلع کی طرح دوسرا مطلع پڑھنے لگے

ہمت قاتل بڑھانا چاہیئے
زیر خنجر مسکرانا چاہیئے

احسنت و آفریں کی آوازیں حسب سابق ایک شور میں بدل گئیں اور جگر صاحب کا یہ مطلع بھی دوبارہ پڑھنا پڑا ___ مکرر، مکرر کا سلسلہ ہو گیا رہا تھا کہ انھوں نے پہلا شعر سنا دیا۔

زندگی ہے نام جہد و جنگ کا
موت کیا ہے، بھول جانا چاہیئے

مشاعرہ اپنی انتہائی بیداری پر پہنچ چکا تھا۔ دو کامیاب ترین مطلعوں کے بعد توقع نہ کی جاسکتی کہ پہلا شعر اتنا مقبول ہوگا لیکن جگر صاحب دوسرے مصرعہ کو پوری طرح ادا بھی نہ کر سکے تھے کہ چیخیں اڑنے لگیں۔ شعر، ان کے مخصوص رنگ تغزل سے بالکل جدا تھا مگر اتنی صفائی کے ساتھ نظم ہوگیا تھا کہ سامعین پھڑک اٹھے ــــ اور جگر صاحب کو چار مرتبہ پڑھنا پڑا ــــ یہاں تک کہ مزید دو شعر پڑھ کر وہ مقطع پر پہنچے تو تھک چکے تھے۔

ان سے ملنے کو تو کیا کہیے جگر
خود سے ملنے کو زمانہ چاہیے

جگر کی اس مختصر غزل نے اتنا وقت لیا۔ جتنے وقت میں کوئی دو شاعر پڑھ سکتے۔ اور جگر صاحب کو چند ہی شعروں میں اتنی طاقت صرف کرنا پڑی کہ وہ مزید کوئی شعر پڑھنے کے قابل نہ رہے لیکن سامعین کا یہ عالم تھا گویا ان کی تشنگی کو بھڑکا دیا گیا ہو جس کا اظہار فوری طور پر ہونے لگا اور چہار جانب سے آوازیں آنے لگیں۔

"حضور، ایک غزل اور ــــ؟"

ایک صاحب جو اگلی صفوں میں قدرے نزدیک تھے، بادب عرض پیرا ہوگئے

"جسارت ہے مگر "ساقی نامہ" کے لئے عرض کروں گا ــــ"

جگر صاحب شاعر ہوں یا ساحر ــــ لیکن ان تمام باتوں سے قبل وہ ایک انسان تھے۔ نہایت منکسر مزاج اور اخلاق مجسم۔ انھوں نے

تھکن کے باوجود کوئی معذرت نہ کی، اور بیاض کے ورق الٹنے لگے ـــــ
لمحات کے وقفہ سے پنڈال میں سناٹا چھایا ہوا تھا اور ہندوستان کا طوطی بیان
شاعر جھوم جھوم کر الاپ رہا تھا۔

یہ سنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاکِ وطن ساقی
خدا حافظ، چلا میں باندھ کر سر سے کفن ساقی

سلامت تو، ترا میخانہ، تیری انجمن ساقی
مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمتِ دار و رسن ساقی

غزل کے چند اشعار نے جتنی داد حاصل کی تھی۔ ساقی نامہ کے مطلعوں کی
تعریف اس سے ہزار گنی بڑھ گئی اور جگر صاحب کو آخری دو مطلعے اتنی دفعہ
پڑھنا پڑے کہ ان کی آواز نے جواب دیدیا اور آخر وہ خاموش کھڑے ہو گئے
ہزاروں کا مجمع اپنے محبوب شاعر کی تھکن کا احساس کر رہا تھا مگر وہ اس
موقع کو کھونے والا تھا اور نہ خود جگر صاحب اپنے پرستاروں کو محروم رکھنے
پر تیار تھے لہذا انھوں نے ایک لحظ دم لے کر پڑھنا شروع کر دیا۔

رگ و پے میں کبھی صہبا ہی صہبا رقص کرتی تھی
مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موج زن ساقی

ابھی ناقص ہے معیارِ جنوں، تنظیمِ میخانہ
ابھی نا معتبر ہے تیرے مستوں کا چلن ساقی

وہی انساں جسے سرتاجِ مخلوقات ہونا تھا
وہی اب سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی
جہانِ حریت کے اڑ رہے ہیں ہر طرف پرزے
بساطِ آدمیت ہے شکن اندر شکن ساقی

نمودِ صبحِ کاذب ہی دلیلِ صبحِ صادق ہے
افق سے زندگی کی دیکھ وہ ابھری کرن ساقی

"ساقی نامہ" کے سترہ شعر جگر صاحب گھنٹوں میں ختم کر سکے اور آخری شعر پڑھ کر وہ محسوس کر رہے تھے کہ انھوں نے پورا دیوان پڑھ کر سنا دیا حالانکہ برخلاف اس کے سننے والوں کا یہ عالم تھا جیسے انھوں نے ابھی کچھ سنا ہی نہ ہو — تاہم جگر صاحب کی حالت کا احساس کر کے کوئی کسی مزید فرمائش کی ہمت نہ کر سکا اور جگر صاحب اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئے

صفِ شعرا میں ابھی دو تین کاملینِ فن کے نام باقی تھے جنھوں نے رسم کو پورا کیا مگر مشاعرہ حقیقتاً ختم ہو چکا تھا —— اور صرف اسی مشاعرہ پر موقوف نہیں۔ جگر صاحب کے بعد کسی بھی مشاعرے میں رنگ جمانا آسان نہ تھا۔ جس کا تجربہ بارہا کیا جا چکا تھا۔ بعض لوگ اس مقبولیت کی توجیہ انکی خوش الحانی سے کرتے ہیں جس کو تسلیم کر لیا جائے تب بھی الفاظ کا ترنم ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ جگر کے یہاں بھی خمریہ، طلوع اور آتشِ گل جگر نگاہوں کو مسحور کرتا ہے گا اور جس کا کیف ان نظموں کی یاد دلاتے ہیں اور جن کا کیف کانوں میں گونجتے محسوس ہوتے ہیں۔

عرفان لکھنوی

رند بلانوش اور مرد مومن

یہ رند مست بادہ و ساغر، اور خمریات کا امام ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کی صبح کو جام و ساغر، ساقی و میخانہ اور بزم کیف و مستی سے منہ موڑ کر ابدی نیند سو رہا اور ارباب [illegible] کا ثبوت دے گیا کہ صرف احباب و اعزاء ہی یا دانشمند شعر و ادب ہی تو [illegible] سخن ہی اس کی موت پر گریہ کناں نہیں بلکہ خاصان میخانہ اور بادہ و ساغر سب اس کی جدائی پر آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے

جگر کے انتقال سے نہ صرف یہ کہ ہم نے ایک منفرد اور صاحب طرز غزل گو سے ہاتھ دھویا بلکہ ہم ایک ایسے انسان سے محروم ہو گئے جو انسانیت کی اعلیٰ قدروں، شرافت کے بلند پایہ مدارج اور اخلاق کا بہتر نمونہ تھا۔
جگر کا کہنا تھا کہ۔

عرش تک ہو نہیں سکتی جو رسائی نہ سہی — یہی انسان کی معراج ہو انسان ہو جائے
یہی ہو زندگی تو زندگی سے خودکشی اچھی — کہ انساں عالم انسانیت پر بار ہو جائے

یہی اسباب تھے جن کے باعث جگر اپنی زندگی ہی میں عوام و خواص میں ہر جگہ شہرت مقبولیت حاصل کر چکے تھے اور آج ہر دل اس غم کو دنیا غم سمجھ رہا ہے اور ہر آنکھ اس موت پر اشکبار ہے۔

اس دور میں جب غزل کو نفرت وحقارت کی نظروں سے دیکھا جا رہا تھا۔ اس کو پرانی و فرسودہ صنف سخن قرار دیا جا رہا تھا اس وقت حسرت اصغر۔ فانی اور جگر ہی نے اس کے قالب مردہ میں جان ڈالی اور اپنی تمام تر کاوشیں اس صنف سخن کو روشن اور جاندار بنانے میں صرف کیں اور اسے رنگینی و رعنائی عطا کی۔

حسن وعشق کا امتزاج اور رنگینی جوشِ تخیل تو حسرت اور اصغر کے یہاں بھی موجود ہے لیکن وہ کیفیت جو جگر کے یہاں ہے نہیں ملتی۔ فانی کی شاعری یاسیت ومحرومی اور درد وغم ہی تک محدود رہی لیکن جگر کے یہاں واردات حسن وعشق بھی ہیں اور کیفیات درد وغم بھی۔ دیکھئے جگر کے یہ اشعار جو فانی کے رنگ تخیل کے آئینہ دار ہیں۔

یوں بسر کی زندگی ہم نے اسیری میں جگر
بر طریقہ داخل آداب زنداں ہو گیا

بجھے گی سوز غم سے روح کی پیاس
اسی شعلہ کو بن جانا ہے شبنم

اف وہ کیفیت غم آنکھ جسے دیکھ سکے
ہائے وہ درد کی لذت جو زباں تک پہنچے

اور اصغر وحسرت کی رنگینی ورعنائی کی زندہ مثالیں جگر کے یہ اشعار ہیں۔

ترا ملنا تو ممکن تھا مگر اے جان محبوبی
میرے نزدیک توہین مذاق جستجو ہوتی

وہ چیز کہتے ہیں فردوس گمشدہ جسکو
کبھی کبھی تری آنکھوں میں پائی جاتی ہے

نہ ہو حشر میں ہر آنکھ اسے بے پردہ دیکھے گی
مجھے ڈر ہے نہ توہین جمال یار ہو جائے

آج کیا بات ہے کہ پھولوں کا
رنگ تیری ہنسی سے ملتا ہے

ان سب کے علاوہ جگر کی رندی و سرمستی اور کیفیت جام و سبو نے غزل کی رعنائی میں اور اضافہ کیا۔ جگر کی شاعری کا ایک طویل دور اسی عالم میں گذرا جب وہ غرق جام شراب رہے اور بادہ و ساغر ہی کو اپنی زندگی سمجھتے رہے اور کہتے رہے۔

شیشہ مست و بادہ مست و عشق مست و حسن مست

آج پینے کا مزہ پی کر بہک جانے میں ہے

اس رندی و سرمستی کے ساتھ ساتھ جگر کے یہاں ایمان کی وہ شمع بھی روشن رہی جس نے آگے چل کر ان کی مے نوشی و بادہ پرستی کو پارسائی اور زہد و تقوے میں تبدیل کر دیا اور مست و مدہوش رہنے والا جگر اپنے دل کی پکار پر جاگا اور بے اختیار ہو کر کہہ اٹھا۔

واعظ نے اور نہ زاہد شب زندہ دار نے مجھ کو جگا دیا میرے دل کی پکار نے

جگر رند بلا نوش ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مرد مومن بھی تھے۔ ان کی رندی ان کے نفس کی آگ بجھانے کے لئے نہ تھی بلکہ عشق و محبت کی پر پیچ راہوں سے گذرنے کے لئے اور چوٹ کھائے ہوئے دل کی بے چینیوں کو دور کرنے کے لئے تھی۔ وہ رندی و سرمستی کے عالم میں بھی ہوش سے بیگانہ نہ ہوئے اور معرفت و حق کی گفتگو کرتے رہے۔ وہ حسن و محبت کی دیرینہ روایتوں سے ہٹ کر عشق حقیقی اور خودی کے بلند پایہ مدارج کے طالب بھی رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ

مشاہد گر تو حق و شے انسان کے بس کا کام نہیں فیضان محبت عام سہی عرفان محبت عام نہیں

آتا ہی جو بزمِ جاناں میں یہ پار خودی کو توڑ کے آ   اے ہوش و خرد کے دیوانے یاں ہوش و خرد کا کام نہیں

دل کیا ہے نقش حسن حقیقت طراز کا   آئینہ کیا ہے عکس ہے آئینہ ساز کا

یہ مئے خوش زنگ کا شاعر جب بادۂ عرفان کا طالب ہوتا ہے تو ان رنگین ساغروں سے اس کی سیری نہیں ہوتی اور وہ ہمہ وقت تشنگی ہی تشنگی محسوس کرتا ہے اور اسی تشنگی کو اپنا مقصدِ حیات تصور کرتا ہے۔

یہ حاصل سرمایۂ عرفاں طلبی ہے   یعنی ہوس دید خود اک بے ادبی ہے

بجھتی ہی نہیں اب کسی ساغر سے میری پیاس   شاید مرا مقصد ہی مری تشنہ لبی ہے

اور پھر اس کی طلب بادہ اس سے کہلواتی ہے۔

مئے منصور پلا دے ساقی   نور ہی نور پلا دے ساقی

مئے گلرنگ کے جلوے کیتک   حاصل طور پلا دے ساقی

مئے ظاہر تو بہت کچھ پی لی   مئے مستور پلا دے ساقی

عالم سرمستی میں ایمان کی وہ شمع جو جگر کے دل میں روشن تھی اور ہمہ وقت انہیں ان کی لغزشوں اور گناہوں کی معافی مانگنے پہ مجبور کرتی تھی یہ کہلوائے بغیر نہ رہی۔

اے رحمتِ تمام میری ہر خطا معاف   میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

تیری رحمت خطا بخش و خطا پوش   میری جرأت خطا کار و خطا کوش

نویدِ بخشش عصیاں سے شرمسار نہ کر   گناہگار کو یارب گناہگار نہ کر

سرِ محشر ہم ایسے عاصیوں کا اور کیا ہوگا   درِ جنت نہ وا ہوگا درِ رحمت تو وا ہوگا

جگر اپنے گناہوں کی معافی اپنی لغزشوں پہ عجز و عاجزی اور اپنی رندی

پر توبہ و استغفار کرتے کرتے ترک جام و سبو پر آمادہ ہو گئے اور ان کو کہنا پڑا

رگ رگ میں کبھی کبھی صہبا ہی صہبا رقص کرتی تھی مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موج زن ساقی

کبھی میں بھی تھا شاہد و رند و توبہ شکن مے کش مگر بنا ہوں اب خنجر کیف ساغر شکن ساقی

چنانچہ جگر کی رندانہ شاعری میں جگہ جگہ ان کے مرد مومن ہونے کا ثبوت ملتا ہے انہوں نے شراب پینے میں فخر محسوس نہیں کیا بلکہ ان کو اس پر شرم آئی وہ نشۂ صہبا میں بے خبر و بے خود نہیں ہوئے بلکہ خبردار اور ہوشیار رہے ان کے ظاہر سے زیادہ ان کا باطن روشن و تابناک تھا۔

دیکھئے ان کی نعت کے وہ اشعار جو اسی سرمستی کے عالم کے آئینہ دار ہیں اور رحمت باری تعالیٰ سے معافی کے خواستگار ہیں۔

اک رند ہو اور مدحت سلطان مدینہ ہاں کوئی نظر رحمت سلطان مدینہ

اک ننگ غم عشق بھی ہو منتظر دید صدقے ترے اے صورت سلطان مدینہ

باہمہ رندی و سرمستی و عشرت طلبی ہوں درِ احمد مرسل کا غلام نسبی

مرحبا سید مکی مدنی و العربی دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

کیوں نہ پھر رحمت باری کا طلبگار ہوں میں

ہاں مجھے فخر ہے اس پر کہ گنہگار ہوں میں

رحمت باری کے اس طلب گار کی دعا قبول ہوئی۔ رحمت باری جوش میں آئی اور اس نے اس رند ازلی کو اپنے بادۂ عرفاں میں غرق کر کے ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لیا۔

احراز نقوی

جگر کی شاعری کا پس منظر

"حدیقۂ تنقید" کے عنوان سے ایک مقالے میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے "نظم" کی تنقید اور تشخیص کے سلسلے میں لکھا ہے۔ — نظم اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب اس کے ماخذ اور مواد کا سراغ لگایا جائے اور اس طریقہ کا پتہ لگایا جائے جس کے ذریعہ شاعر مواد کو استعمال کر پایا ہے۔ اس قول کی روشنی میں اگر ہم جگر کی پوری شاعری کو سمجھنے کے لئے اس کے ماخذ اور مواد کا سراغ لگائیں اور معائنہ کریں تو اعتقادی نقطہ نظر سے جگر کی شاعری کا نصب العین ہمارے سامنے واضح ہو جائے گا۔ تب ہی اور ہم کسی تنقید، تحلیل، تجزیے اور فیصلے کے منصب سے عہدہ بر آ ہو سکتے ہیں۔ جگر کی شاعری کا معیار اور مقام۔ اردو شاعری کی روایت اور تاریخ میں ان کا حصہ اور اس نہج کے نہ جانے کتنے مسئلے خود بخود حل ہو جائیں گے۔

اس پس منظر کو سمجھنے کے لئے جس منطقی تسلسل کی ضرورت ہے اس میں سیاسی، تہذیبی قدروں کا جائزہ، معاشی اور معاشرتی نظم و ضبط

کی تحقیق علمی و ادبی ضابطوں کے تجزیے کو سامنے رکھنا ہو گا۔ ظاہر ہے ان موضوعات پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی لکھا جا سکتا ہے۔ مضمون کو طوالت کے اندیشہ سے بچانے کے لئے اجمالی میں کچھ نکات ملاحظہ فرمائیے :۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہندوستان میں ایک نیا ماحول جنم لینے لگا۔ یہ نیا ماحول اساس اور قدروں کے ترک و اختیار سے پیدا ہوا تھا جس کو صدیوں کی تہذیب اور تمدن نے تخلیق کیا تھا۔۔۔ بات تو محض اتنی ہے کہ ۔۔۔ مغلیہ حکومت ختم ہونے کے بعد برطانیہ حکومت کا تسلط ہو گیا۔ جس طرح سے ہندوستان میں سیکڑوں بار تاج و تخت کے تجدید کی تقریب ہوتی رہی اور تھوڑے سے انتشار کے بعد پھر وہی ماحول تقریباً ہو گیا مگر تاریخی نقطہ نظر سے یہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا۔ تہذیب کے اعتبار سے ثقافت کے لحاظ سے۔ معاشیات اور معیشت کے حساب سے زندگی کا جب محور بدلنے لگا۔ تو اخلاقی قدریں۔ خلق و خلوص کے رابطے۔ ذوق و شعور کے مرحلے۔ اشرفیہ شعور اور طبقاتی نفسیات یہ سب کچھ مٹنے اور بدلنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ جاگیر دارانہ دور کے بعد صنعتی نظام نے "زندگی" کو اپنے تقاضوں پر بدلنے کی کوشش کی اس مقام پر سب سے زیادہ توجہ طلب نکتہ یہ ہے ۔۔۔ کہ یہ ساری انقلابی تبدیلیاں کسی منطقی محور اور تسلسل سے نہیں وجود میں آئیں تھیں۔ اور نہ کسی رجحان یا تحریک سے ظہور پذیر ہوئیں تھیں۔

بس یوں سمجھئے کہ ہندوستان کی نفسیاتی اور مزاجی اقدار کبھی ہموار راستے سے گذرتے گذرتے ایک دم کسی ناہموار ڈھال سے گذرنے لگیں۔ اس انقلاب نے زندگی کے تمام شعبوں پر اپنا پرتو ڈالا۔ یہاں تک تہذیبی مزاج جو اپنی نفسیات کی بنا پر کسی انقلاب سے اپنے خاکے سے ایک دم نہیں بدلا کرتا بلکہ اپنا رفتار کے عمل اور ردعمل سے فطری طور سے بدل جایا کرتا ہے۔ مگر غدر سے جو انقلاب پیدا ہوا اسی کی نوعیت سے جو رفتار میں تیزی پیدا ہوئی اور قدریں بنی ان کی چال میں ایک لنگ اور لڑکھڑاہٹ پیدا ہوگئی اگرچہ یہ بالکل حقیقت ہے کہ انگریزی حکومت کی غاصبانہ چالیں زراعتی اور صنعتی اعتبار سے ہندوستان کے دولت اور سرمائے کو تباہ کرنے پر تلی ہوئیں تھیں مگر اس کے پیچھے جو عمل اتفاقی طور سے منفعت بخش کار فرما تھا وہ نئے شعور اور نئی زندگی کا وجود تھا۔ یہ رجحان اسی افراط و تفریط کے ماحول سے پیدا ہوگیا۔ یہ رجحان جاگیردارانہ ماحول سے نجات پانے کے حوصلے اور زندگی کی نئی کروٹ سے پیدا ہوا تھا۔ نئے طبقات کی ترتیب اور جدید معاشی اقدار سے ایک نیا شعور بیدار ہو رہا تھا یہی شعور پہلے رجحان اور پھر تحریک کی صورت میں نمودار ہوگیا (یہ سب کچھ ابتدا میں بہت ہی ناہموار ڈھنگ سے ہوا) اور وہ انقلاب جو ۱۸۵۷ء میں جاگیردارانہ ماحول میں ہوا تھا وہی ۱۹۴۷ء میں اپنے صحیح شکل میں جمہوری فعالیت اور جذبہ وطنیت اور تحریک حریت کے سانچے میں ڈھل کر ہوگیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد جس انداز سے زندگی اور اس کے غور و فکر کے جائزے ذوق اور عشق کے سلسلے حسن و ادا کے تلازم بدلے میں اسی رنگ میں فن کا معیار، قیاشی اور مزاج بدلا ہے ہماری کلاسکی شاعری کا سرمایہ جاگیردارانہ ماحول میں ترتیب اور تخلیق پایا تھا۔ اور زندگی کی نفسیاتی فضا نے غزل ہی کو اپنا محبوب فن بنایا تھا اور اصناف جو تھیں ان پر بھی غزل کا کسی نہ کسی طرح جادو تھا اور اس دور کے فنکار دل سے اپنی زندگی کی تصویریں غزل ہی سے بنائی تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد فن میں بھی زندگی کے ساتھ تجدید و تجدد کا دور شروع ہوا۔ مغربی علوم کی واقفیت، سائنسی ترقی اور بیداری کی نئی لہروں نے فن سے بھی نئے تقاضوں کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اب فن برائے تعیش نہیں فن برائے مقصد کی آوازیں کانوں میں گونجنے لگیں۔ ان مقدس آوازوں کو زندگی کے نئے شعور سے۔ سیاسی تحریکوں (مثلاً آریہ سماج، برہمو سماج، وہابی تحریک اور سرسید تحریک) نے اور مغربی تعلقات کے ذہنی نتیجے نے پیدا کیں تھیں۔ ان سب کے اظہار و ابلاغ کے لئے ہندوستانی ادبیات میں اضافی اعتبار سے تجدید اور تجدد کی فضا پیدا ہو گئی اب تک ادب شاعری اور شاعری ہی ادب تھا۔ اظہار کی تنوع کیفیات کی شدت نے ہیئتی اضافے شروع کر دیئے جو بالکل فطری اور منطقی بنیاد پر تھے۔ جس کے اثر سے تذکروں سے تنقید۔ شعروں اور داستانوں سے ناول اور اسی طرح افسانہ سوانح نگاری صحافت اور شاعری میں نظم کی باقاعدہ ہیئت وجود میں آئی۔

نئے مطالبات اور تقاضوں نے نظم، ناول اور صحافت اصناف کی حوصلہ افزائی کی غزل پر یقیناً زوال آیا۔ غزل کے زوال کے اسباب پر بحث میرے موضوع سے خارج ہے مگر بات کے تسلسل کو قائم کرنے کیلئے اجمال میں اتنا کہے دیجئے کہ نظم ۔ غزل کے خلاف کسی تحریک کی صورت میں نہیں نمودار ہوئی (بعد میں ایک رجحان کی شکل میں غزل کی مخالفت کیگئی) اس کے مقابلہ میں نظم کا احیاء کیا گیا۔ تالیف اور پرداخت باقاعدہ تحریک کی صورت میں کی گئی۔ سرسید تحریک اور مغرب کے فنی ربط و اتصال نے اس کو پھیلنے، پھولنے اور پھلنے میں کافی سہارا دیا۔ "انجمن پنجاب" اور اس کے محرکین مولانا آزاد، کرنل ہالرائڈ (ڈائرکٹر تعلیمات) اور حالی کی شعوری اور عملی تحریک نے پنجاب میں باقاعدہ ایک نظم اسکول قائم کر دیا جس نے نہ جانے کتنے شعرا و نظم گو پیدا کر دیئے۔ لائق اور فاضل انگریزوں کی اس انجمن سے وابستگی اور ان کی تقاریر نے بھی نظم کے چمن کو بہاروں سے سدا بہار بنا دیا۔

ناول کی صنف بھی مقصدی نقطہ نظر سے ابھری تھی۔ معاشرتی اور سماجی ناولوں سے لے کر تاریخی ناولوں تک خواہ وہ کسی ردعمل کا نتیجہ ہو۔ مقصدی کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا حالانکہ یہ نقطہ نظر بہت دور تک نہ چل سکا۔ مگر حالات نے نثر کی طرف بہت توجہ کی۔ یہاں تک غزل کے شعرا بھی ناول لکھنے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ پنڈت بشن نرائن در کے ایک مضمون کی چند لائین میرے مافی الضمیر کی حمایت میں ملاحظہ فرمایئے۔

"تیز روی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر کس و ناکس نے ناول لکھنے شروع کیے
اسکول اور کالج کے طلبا اور معمولی لیاقت کے لوگ جنھیں سو پچاس
اشعار یاد ہو گئے قلم لے کر بیٹھ گئے اور سماں باندھنا شروع کر دیا
کئی کئی صفحے تک بے سر پیر کی بکواس کے بعد بازاری حسن و عشق کا
قصہ چھیڑ دیا" (اردو زبان اور ناول" ادیب اگست ۱۹۱۰ء)

اردو صحافت بھی اسی دور میں کافی ترقی کر گئی اردو رسائل، ہفتہ وار
عشرہ وار اور پندرہ روزہ اخباروں نے ناول اور نظم کو کافی تقویت
پہونچائی۔ بے تحاشا اخبار اور رسالے نکلنے لگے بقول سرسید جس کے پاس
کاٹھ کی مشین اور دو پتھر ہو گئے وہی ایڈیٹر بن بیٹھا۔

"چنانچہ ۱۸۸۲ء میں حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہاں کے اخبارات
کی تعداد ۳۰۳ تھی جن میں ہر زبان کے اخبار شامل تھے"

(ادیب ۱۹۱۳ء ص ۴۸ مضمون میر حسین)

اخبارات کے ساتھ چھاپے خانوں کی بھی کوئی انتہا نہ رہی۔

"تمام ہندوستان میں ۲۰۵۱ چھاپے خانے ہیں جن میں ہر قسم
کی کتابیں چھپتی ہیں گذشتہ دس کے اندر ۲۵ فی صدی کا اضافہ
ہوا ہے ۱۰۶۲ رسالے شائع ہوتے ہیں۔

(اقتباس" سرمہ روزگار بابت ۴ فروری ۱۹۱۰ء)

چھاپے خانوں کی ترقی اور رسائل کے فروغ نے نظم اور ناول کے
ارتقاء اور افزائش میں کافی اعانت کی اگر ہم اس دور کی صحافت کا

جائزہ لیں کہ منظوموں کا زور بھرپور طریقے سے ملتا ہے اور غزل بہت کم درباروں اور مشاعروں سے نکل کر صحیفوں تک آپاتی ہے۔ اور غزل کا روپ ابھی تک وہی کلاسکی ڈھنگ کا نظر آتا ہے۔ ہیئت اور مواد کے اعتبار سے غزل اسی رنگ میں مست تھی۔ قافیہ نوازی الفاظ پرستی اور معشوق کے چوچلوں اور شعبدوں میں لگی تھی۔

غزل ناسخی اسکول سے نکل کر ان کے شاگردوں کے ہاتھوں کافی رسوا ہو چکی تھی۔ غالب کی غزل نے کافی بھرم رکھا مگر غدر کے بعد جو نئے تقاضے ہنگامی طور سے ابھرے تھے ان کا جواب غالب کے پاس بھی نہ تھا۔ غزل اب چھوٹے درباروں میں پناہ گزین ہوئی یا مشاعروں تک محدود ہوگئی۔ اور وہ صنعتی دور میں بھی جاگیردارانہ مزاج اور ذوق و شعور کے ورثے کی پوری نگہداشت کرتی رہی۔ انحطاطی اور کلاسکی شاعری کے باقیاتِ صالحات میں منیر شکوہ آبادی تسلیم لکھنوی، امیر مینائی اور داغ و جلال تھے یہ سب غدر سے پہلے جوان ہو چکے تھے ان کے ذہنوں کی نشو و نما اور شاعرانہ تربیت انھیں کلاسکی تقاضوں کے پیش نظر ہوئی اور ادب اور تہذیب کا نیا شعور ان کے ذہنوں کو فنی طور سے نہیں آمادہ کر سکا۔ دوسری طرف انھیں کے سامنے نئی پود نئی زندگی کے ساتھ جدید فنی تقاضوں سے ابھر رہی تھی۔

امیر مینائی اور داغ کے بعد اردو غزل کا احیاء حسرت، اصغر، اقبال، فانی اور جگر کے ہاتھوں ہوا اقبال کو چھوڑ کر باقی یہ سب غزل ہی

کے شاعر تھے ان سب کے یہاں کلاسکی رنگ ملتا ہے فنی ترتیب ان سب کی پرانی شاعری سے ہوئی مگر نئی قدروں کا امتزاج بھی ان کے یہاں ملتا ہے۔ نئے موضوعات اور زندگی کا ردعمل بھی ان کے یہاں نظر آتا ہے ان کے مشاہدات ان کے تخیلات ان کے جذبات عصری رنگ و بو میں تخلیق ہوئے ہیں۔ جو سچ پوچھئے تو اس کا محرک اور نئی زندگی کا مسیحا حالی تھا جس نے تغزل کو زندگی سے قریب کر کے زماں اور مکاں کے حسن سے آراستہ اور دلفریب بنایا تھا۔ اور موضوعات کے اعتبار سے غزل میں کامیاب اور ناکامیاب قسم کے تجربات کر کے نئی پود کے فنکاروں کو خبردار کر دیا تھا۔ حالی کا زمانہ بیداری اور نصب العین کا دور تھا فن میں مقصدیت، افادیت اور حقیقت پر زور دیا جاتا اور موضوعات کے تنوعات میں انھیں پہلوؤں پر گہری نظر رکھی جاتی تھی اور اسلوب کی دلبری اور دلکشی زبان کے چٹخارے یا الفاظ کے شعبدوں یا صنعتوں کے حسن سلوک سے مرکب نہیں تھی بلکہ طبع کی سرشاری اور فنی اخلاص سے اسلوب میں رنگینی اور رعنائی پیدا ہو جاتی تھی۔ حالی ہمارے پہلے غزل گو ہیں جنھوں نے غزل کو شعوری کاوش سے حقیقی اظہار کی چیز بنا دی اور حسن و عشق کی سچی کیفیات سے غزل کی مشاطگی کی۔ اردو شاعری میں ہمیں پہلی بار حالی کا معشوق کلاسکی رنگ کے چوچلوں اور سوانگ سے مختلف نظر آیا ہے۔ حالی کی غزل کا خاصا حصہ سرسید اسکول کے مقصدی اور اصلاحی تحریک کے نذر ہو گیا اور حالی جیسا نقاد، استاد بھی غزل کے

مزاج اور اس کی نفسیات کو پوری طرح نہ سمجھ سکا اور پیروی مغربی کی دھن میں "اقتدائے مصحفی و میر" کے اغماض نے حالی کی غزل میں ایک خطرناک میلان پیدا کر دیا اور موضوعات کیے جانبدارانہ ربط نے حالی کی غزل کو کافی مجروح کیا۔ بہ سبیل تذکرہ کچھ اشعار اس قبیل کے ملاحظہ فرمایئے

چیونٹیوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق
آدمی کا آدمی دشمن خدا کی شان ہے

خود بڑا بن کے دکھاؤ آپ کو
باپ دادا کی بڑائی ہو چکی

حسرت، اصغر، اقبال اور جگر نے حالی کی فروگذاشت کا کفارہ ادا کر دیا اور غزل کو ایک نئی زندگی بخش دی تنقیدی نقطۂ نظر سے امیر اور داغ (ان کے شاگردوں کو بھی اسی قبیل کا سمجھئے) کا فن بہاری جمالیاتی، ثقافتی اور معاشی اقدار سے بالکل مختلف تھا ان پر یہ الزام غزل میں موضوعات کے تنوع اور زندگی کے مطالبوں کی حمایت (یعنی غزل کی تجدید) کے سلسلے سے ابھرا تھا۔ داغ اور امیر کی شاعری میں جو اسلوب پرستی کا جانبدارانہ رویہ تھا وہ جاگیردارانہ ربط و تلازم کا نتیجہ تھا ظاہر ہے کہ وہ کس طرح نئے حالات کے تقاضے پورے کر سکتا تھا حسرت، اصغر اور جگر نے وقت کی لے پر اپنے نغمات نو چھیڑا اور کلاسکی نظم و ضبط کو بھی قائم رکھا اور نئی زندگی کی علامتوں، استعاروں تشبیہوں کو تخلیق کر کے فن کو ارتقاء زندگی سے منسلک کر کے تغزل کی حدیث

دلبستگی اور روزنامچۂ حیات بنادیا۔ حسرت کی طبع نے غزل گوئی میں
ہر استاد سے فیض اٹھایا اور ایک اپنی الگ انفرادیت غزل میں قائم
کردی حسرت کی شخصیت میں جو جذبہ فعالیت کی بے باکی کا تھا اس نے
حسرت کی زندگی کو محض ایک کردار نہیں بخشا بلکہ غزل میں بھی اپنا ایک
کردار پیش کردیا اور اپنے فن کو بھی بے باک بنادیا یہ بے باکی کا بے محابہ
انداز انسانی فطرت اور طبع کو بیحد پسند اور مرغوب ہے (خواہ کوئی
فرد اپنی شخصیت میں اس رجحان سے عاری ہو) حسن کی بارگاہ ہو یا
سیاست کا اسٹیج یا عدالت کا کٹہرا یا جیل کی سلاخیں حسرت ہر جگہ
بے باک ہیں جو کہنا چاہتے ہیں کہہ لیتے ہیں حسرت کی اس بے تکلفی اور بیباکی
نے فن کو بیحد حقیقی اور دلفریب بنایا ہے۔ حسرت فطری شاعر تھے دل سے
شعر کہتے تھے اسی لئے وہ جذبے اور کیفیات کے بڑے مصور بن گئے
مگر حسرت کی شاعری محض فطری نہ تھی ان کے فن میں مختلف فنون کا امتزاج
ہے اسلئے ان کی شاعری اکتسابی شاعری ہے۔ یہ حسرت ہی کا حصہ ہے
جس نے غزل کا خون بہا نظم سے وصول کیا اور غزل کی ایک نئی نسل
کو پیدا کیا اور غزل کو درباروں اور شاعروں سے نکال کر صحیفوں
اور دانشوروں کے قریب کیا اور نظم کے مقابلے میں غزل کو پیش کیا۔
اصغر کی شاعری اتنی ضرور تھی ان میں انئی شبیہوں کا عکس تھا مگر
حسرت کی طرح وہ ہمہ گیر نہ بن سکی۔ اصغر نے غزل کے جدید تقاضوں
کو ضرور پورا کیا مگر فن کے ساتھ وہ بے تکلفی کی فضا نہ پیدا کر سکے جو

حسرت کا حصہ تھا۔ اصغر اپنی شخصیت کے اعتبار سے بھی یونہی تھے شخصیت پر تو اس کا اثر نہ پڑا اس اعتبار سے وہ ایک مستعلیق اور ثقہ بزرگ بن گئے مگر جب اسی شخصیت کا عکس غزل میں اُتر آیا اور اپنے ساتھ تصوف کا بھی رنگ اس میں شامل کر دیا تو غزل میں برگزیدگی اور بزرگی تو پیدا ہو گئی مگر وہ فنی بے تکلفی وہ والہانہ تڑپ اور وہ جذبے کی بے کلی نہ پیدا ہو سکی۔ اصغر کی نفسیات اور مزاج نے ان کو تخیلی بنا دیا ذہنی اعتبار سے وہ زندگی کے ساتھ رہے مگر نفسیات کے بھید بھاؤ نے آگے بڑھنے ہی نہ دیا۔

حسرت اور اصغر کے ہمعصروں میں کئی اور بھی غزل کے شعرا مقبولیت حاصل کر رہے تھے جن میں عزیز، شاد، جلیل، صفی، ثاقب کے نام بڑھائے جا سکتے ہیں ان لوگوں نے بھی غزل کو آگے بڑھایا مگر ان سب کے یہاں زندگی کا مقصد پوری طرح واضح نہیں ہے اور کسی نصب العین کی پاسداری نہیں ملتی ذہنی اور فنی طور سے یہ سب کلاسکی شعرا کا ضمیمہ تھے۔ حسرت کی شاعری ان سب سے الگ تھی۔ ہاں شاد کے یہاں غزل کی روایت کو سمجھنے اور بڑھانے کا سلیقہ اور صلاحیت کچھ زیادہ نظر آتی ہے۔

جگر کی فنی تربیت اور ذہنی ارتقا اسی ماحول میں ہوا ان کی شاعری اسی فضا میں پروان چڑھی وہ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے اور ابھی ستمبر ۱۹۶۰ء کو انتقال ہوا گویا ان کی شاعری ۲۰ ویں صدی کے قریب نصف حصے کا احاطہ کرتی ہے۔

جگر نے جب باقاعدہ شاعری شروع کی اس وقت ہندوستان سیاسی

دوسری کشمکش میں مبتلا تھا۔ سیاسی تحریکیں پوری طرح سے ابھر چکی تھیں۔ ان کا نصب العین واضح ہو چکا تھا۔ یہ جوش اور حوصلوں کا زمانہ تھا قومی حمیت کا جذبہ بیدار ہو چکا تھا۔ سودیشی تحریک، عدم تعاون خلافت اور ستیہ گرہ کی تحریکیں عملی بغاوت سے نکل آئیں، اور ان کی سرکوبی برطانوی سامراج نے گولیوں کی بارش سے کر رہا تھا ایک طرف خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں دوسری طرف جیل کی سلاخوں سے سیکڑوں آنکھیں آزادی کی دیوی کا انتظار کر رہی تھیں۔ شہیدوں کا خون مستقبل پر اطمینان اور یقین کی بشارت دے رہا تھا۔ اردو شاعری ان تلاطم خیز طوفانوں سے بیگانہ نہ تھی۔ اردو کے فنکار بھی خون دل میں ایسے قلم کو ڈبو چکے تھے اور آزادی کی جزخوانی کے لئے کاروان شوق کے ساتھ نکل چکے تھے نئی پود کے شاعروں میں حالی اور آزاد کی روایت کو آگے بڑھانے کے لئے اقبال چکبست۔ سرور جہان آبادی۔ حفیظ۔ جوش اور اختر شیرانی اپنے نغمات کو وقت کی آواز سے ہم آہنگ کر رہے تھے۔

جگر اسی دور کا شاعر تھا وہ روح عصر کو پہچان چکا تھا سنہ ۱۹۲۸ء کا "داغ جگر" اب شعلہ جوالہ میں نمایاں تھا۔ مگر جگر کے لہجے میں جوش کی وہ گھن گرج نہیں تھی۔ حفیظ کے باغیانہ نعرے تھے نہ اقبال اور چکبست کا نصب العین تھا۔ جگر کے نغمات میں صرف ایک تیکھاپن تھا جو مشاعرے کی فضا کو مسحور کر رہا تھا جگر مشاعرے کے شاعر تھے۔ یہ اردو شاعری کی بدنصیبی تھی۔ جگر کو حالات نے مشاعرہ پیشہ بنایا تھا۔ جگر جن حالات کے

ت شاعری اور مشاعرے تک پہونچے تھے وہ کوئی پختہ یا اعلیٰ شاعری
تصورات نہیں تھے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جگر شاعر تھے اور
شاعری ہی کے لئے پیدا ہوئے تھے اگر وہ شاعری نہ کرتے تو زندہ نہیں
سکتے تھے مگر جن حالات میں ان کا فنی شعور بیدار ہوا افسوس! وہ زمانہ
کے فکر معاش اور عشق بتاں کا تھا عشق بتاں تو کچھ برا نہ تھا مگر جامہ
ماڑنے سے پہلے انھیں کورٹ سلوانا پڑ گیا۔

ر کے یہاں ایک اچھا شاعر بننے کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں۔ اور
حالات کے تحت جو مقام انھیں ملا وہ صرف جگر کا حصہ تھا۔ پیچھے مڑ کر
ادیکھئے جس نے جگر کے راستوں کو اختیار کیا وہ کام سے گیا۔ مشاعروں
روں میں تو وہ صفِ اول میں شمار کیا جاتا ہے مگر ادب میں ان کی کوئی
تی شمار نہیں ہے۔

جگر کی پہلے عینکوں کی دوکان تھی۔ اور صرف دسواں پاس تھے اور
اعری کی طرف طبیعت شروع سے مائل تھی۔ مشاعروں کی اس زمانے میں
ری بھرمار تھی۔ اور ان مشاعروں میں وہ امیر اور داغ مارکہ شاعری چل
ہی تھی یہ لوگ تو چراغ سحری کی طرح ٹمٹما رہے تھے مگر ان کے شاگردوں
ماشاء اللہ ایک پوری پلٹن تیار تھی۔ جگر کا فنی شعور انھیں مشاعرے میں
ھرا چنانچہ جب شعر موزوں کئے تو داغ کو دیکھا یا پھر رسا کے سامنے
انوئے ادب تہہ کیا۔ سرسید اسکول۔ آزاد اور حالی کی تحریک جو نئی نسل
یدا کر رہی تھی اس سے جگر کا کوئی رشتہ نہ ہو سکا۔ اس حدیقہ سے اگر جگر

کا تعلق ہو جاتا تو فنی بیعت تو ہو سکتی تھی مگر پھر زندگی اور معاش سے مفاہمت کس طرح ہوتی۔ بس یہاں پر آکر بات ٹھہر جاتی ہے۔ اصغر کی شاگردی اور مشاعروں کی تربیت نے جگر کو بہت جلد مشہور کر دیا۔ پھر جگر کا ترنم جادو کا اثر رکھتا تھا۔ اشعار سے زیادہ ترنم غضب کا تھا۔ اور جس گلی میں ان کا مکان تھا اس کے دو دروازے بالا خانے پر تھے پھر بھلا وہ آواز کے جادو سے کیونکر نہ واقف ہوتے جب بھی وہ غزل پڑھتے تھے گلے کا فن بھی اس میں نمایاں رہتا خوبصورت تھے، عمر کا سوت استادی کی گرمیاں اور شائستہ ترکیبوں سے غزل کو آسمان پر پہونچا دیتے تھے۔ ترنم میں ایسے بھلے پھولتے کہ مشاعرہ لوٹ لیتے۔ مشاعرے میں حاصل مشاعرہ انھیں کی غزل ہوتی۔ چنانچہ اچھے مشاعرے کا معیار جگر تھے۔ جگر کے نام سے مشاعرہ شاندار ہو جاتا تھا۔ جگر کے بعد مشاعرہ اکھڑ جاتا گویا مشاعرے کے اکھاڑے کے راجا اندر جگر ہی تھے۔ جگر کی یہ مقبولیت سارے ہندوستان بھر میں تھی۔ خواص جگر سے اغماض برتتے رہے مگر عوام میں جگر بہت مقبول ہوئے غالباً اتنی شہرت کسی بھی شاعر کو نہیں ملی۔ جگر کی انا کی تسکین کے لئے اور خوش فہمی کے لئے یہ سب کچھ بہت تھا۔ نفسیاتی حوصلہ افزائی کا پہلو یہ بھی نکل آیا کہ کام[1] شاعر کا ذریعہ معاش ہو گیا۔

---

[1] اپنا دیوان بغل میں لے کر میکش یوں پکارے ہیں — کام شاعر کا،

میرے مضمون کے قاریوں کو ممکن ہے یہ اعتراض ہو کہ مشاعرہ ہمارا کلاسکی ادب ہے جگر کی شاعری اگر مشاعرے کی ہے تو کیا عیب۔ اس کا جواب اگرچہ بہت طویل ہو سکتا ہے مگر اختصار میں بھی کچھ بنیادی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ کلاسکی ادب ہمارا درباری مشاعروں سے مختص تھا وہاں کے سامعین فن کار اور دانشور ہوا کرتے تھے۔ مگر درباروں کے بعد صنعتی دور میں مشاعرے عوام کے ہو گئے اب مشاعرے اشرافیہ محفلوں سے نکل کر متوسط اور ناخواندہ محفلوں میں ہونے لگے ظاہر تھا کہ فنی میعار اس ردعمل سے کتنا بدل گیا۔ اب مشاعروں میں شاعری کا میعار معمولی تعلیم اور موزوں طبعی ہو گیا۔ غدر کے بعد تعلیم کا رواج یوں بھی بلاتخصیص ہر طبقے میں ہو گیا موزوں طبع ہونا کوئی بڑی بات نہ تھی اور غزل ــــ ہر موزوں طبع کہہ لیتا ہے۔ اسی لئے غدر کے بعد مشاعروں کا بڑا رواج ہو گیا۔ ان مشاعروں کی شاعری عوام کے لئے تھی۔ ظاہر ہے کہ ان کا مذاق کیا ہوتا ہے اور ان کے ذوق کا کیا پوچھنا۔ یہاں پر توجہ طلب غزل کا مسئلہ بھی ہے غدر کے بعد غزل نظم سے مات کھا کر انھیں مشاعروں میں آکر رہ گئی عوامی مشاعرے یا چھوٹے درباروں کے مشاعروں میں غزل ہی کا فروغ اور عروج تھا۔

جگر اسی ماحول کی پیداوار ہیں۔ اسی ماحول کو سامنے رکھ کر جگر کی شاعری کو سمجھنا ہوگا کیونکہ جگر نے بھی اسی ماحول کو سامنے رکھ کر شاعری کی تھی۔ جگر کے پیشے کا جب اچھی طرح تعین ہو گیا تو انھوں نے مشاعرے

کے رنگ پر غزلیں کہنا شروع کیں۔ اور شاعری اور فن کی اعلیٰ قدروں پر کہیں کہیں تصادم ہو جاتا ہے اس تصادم سے جگر کی شاعری کو کافی نقصان پہونچا ہے ان کے کلام میں اکثر سستے جذبات کی تصویریں ملتی ہیں۔ اسی سستے پن سے جگر کی شاعری ہلکی پھلکی شاعری ہے ان کے یہاں خیال کی گہرائی نہیں ملتی۔ ان کے یہاں فکری جذبوں کا فقدان ہے۔ اور خیالی کے تنوعات ان کے کلام میں محدود ہیں۔ غور و فکر کے جذبہ کا بری طرح فقدان ہے۔ اس کے برعکس اسلوب کی نیرنگیاں واضح ہیں۔ الفاظ کا صوتی ترنم ابھر رہا ہے۔ الفاظ کسی فکری تجسس یا تحیر خیزی کی طرف نہیں مائل کرتے بلکہ اکثر نوم توجہ (HYPHOTISM) کی سمت لے جاتے ہیں جو شاعری کو شعدہ سا دیتے ہیں۔ جگر کے یہاں ایک رجحان بڑا توجہ طلب ہے "داغ جگر" کے مجموعہ کو چھوڑ کر "شعلۂ طور" اور "آتش گل" میں جگر نے اپنے کو تھوڑا سا بدلا ہے۔ یہ تبدیلی وقت کے تقاضوں نے پیدا کی ہے ان کے کلام میں نئے متابدات کی بڑی واضح تبدیلی ملتی ہے۔ جذبہ کے ابلاغ میں نئی آب و تاب ملتی ہے مگر اس کا اثر کوئی دیرپا نہیں رہتا۔ جگر کا کارنامہ یہ کیا کم رہا کہ انھوں نے داغ اور امیر کی شاعری کی تجدید کی۔ جگر ان دو شاعروں کے حامی ہیں۔ انھوں نے مشاعروں کی زینت اور فضا کو بدلا۔

جگر اپنے مزاج اور شخصیت کے اعتبار سے بڑے بھولے بھالے میاں پوت قسم کے تھے۔ اور ان کی شاعری کچھ بھی ہو اسی طرح بھولی بھالی ہے رشید احمد صدیقی جو جگر کے بڑے نقاد ہیں ایک جگہ انھوں نے بھی

کہا ہے کہ "جگر عشقیہ زندگی میں عارضی لمحات کے شاعر ہیں" اور یہی عارضی لمحات جب شعری کا شبیہوں میں آتے ہیں تو فلم کی تھرتھراتی ہوئی تصویروں کی طرح غائب ہو جاتی ہیں وہ ہمارے دل کی متاع نہیں بن پاتے۔ اسلئے ادب میں ان کا مقام کسی اونچے درجے کا نہیں ہو پاتا۔ جگر کا فن "تاریجا" اور رنگ بوجھا" کا فن ہے۔ کچھ اشعار اس قبیل کے ملاحظہ فرمایئے۔

آنکھوں میں نمی سی ہے چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں
نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

مجھے دے رہے ہیں تسلیاں وہ ہر ایک تازہ پیام سے
کبھی آکے منظر عام پر، کبھی ہٹ کے منظر عام سے

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

آکر تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

کیا چیز تھی کیا چیز تھی ظالم کی نظر بھی
اُف کرکے وہیں بیٹھ گیا دردِ جگر بھی

لب تھرتھرا کے رہ گئے لیکن وہ اے جگر
جاتے ہوئے نگاہ ملا کر چلے گئے

رعنائی خیال کو رسوا نہ کیجئے
ممکن بھی ہو تو عرضِ تمنا نہ کیجئے

یہ عشق نہیں آساں، اتنا ہی سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

تم مجھ سے چھوٹ کر رہے سب کی نگاہ میں
میں تم سے چھوٹ کر کسی قابل نہیں رہا

اشعار کے انتخاب میں جگر کے سب ہی طرح کے اشعار میں نے لئے ہیں جگر کے کلام کا خاصا حصہ زور دار ہے جگر چاہے دی ہوئی مصرع طرح پر کہتے ہوں یا مشاعرے کے لئے کہتے ہوں ان کے یہاں خلوص ضرور ملتا ہے وہ دل سے شعر کہتے ہیں۔ ان کے اشعار میں انسانی دردمندی اور انسانوں کے جمال کی بڑی خوبصورت تصویریں ملتی ہیں۔ جگر کی شاعری سانس اور لہو کی شاعری ہے۔ حالات نے جگر کو بڑا شاعر نہیں بنے دیا لیکن بڑا انسان ضرور بنا دیا۔ جگر کی شاعرانہ صلاحیتیں تجربے کی منزلت کے عمیق نکتوں پر نہیں استوار ہو سکی ہیں۔ ان میں صلاحیتیں تو تھیں مگر ان کے پہنچنے کا موقع نہ مل سکا۔ ان کی شاعری میں حسن ہے۔ رنگ ہے زور ہے مگر اوچھلے پن کے ساتھ ہے ان کا حسن سراپی ہے۔ دیرپا نہیں۔ پھر بھی اردو شاعری میں جگر کا ایک مقام ضرور ہے۔

اردو شاعری کی روایت میں ان کا ایک حصہ ہے ان کے کلام کے سیکڑوں اشعار ایسے ہیں جن میں نئی زندگی اور وقت کے دھڑکنوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ آنے والی نسلیں اور تاریخ جگر کو فراموش نہیں کر سکتی۔

شمس تبریز خاں

جگر مرحوم

"مذہب کے آئینہ میں"

انسان عجوبہ پسند واقع ہوا ہے۔ ہر عجیب شے اسے اپنی طرف کھینچتی ہے، ہر عظیم شخصیت اسے متاثر کرتی ہے، ہر سانحہ اس کے لئے پیغام مسرت ہوتا ہے، یا زہر غم کا پیالہ ــــ اس لئے جب ایک عامی اپنے گرد و پیش پہ نظر ڈالتا ہے تو اسے حیرت ہوتی ہے کہ کائنات ہستی کا اتنا بڑا کارخانہ جس میں مسرت و خوشی کے پھول بھی ہیں اور رنج و غم، ناکامی و مایوسی کے کانٹے بھی تو ضرور کوئی اسکا سبب اور منتظم ہوگا، یقیناً کوئی اس کا حاکم اعلیٰ بادشاہ یا نگراں کار ہوگا۔ اس کی وجہ کیا ہے کہ بڑے سے بڑا انسان اپنی تمناؤں میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ اس کے ہمتوں کے پہاڑ آن کی آن میں گرد ہو جاتے ہیں۔ اس کے ارادوں کی خوشنما آب جو پلک جھپکتے ہی اک جلوۂ سراب نظر آنے لگتی ہے اس قسم کے غور و فکر کا منتہا خدا کی ذات ہوتی ہے۔ اس کے بعد اسے حیرت نہیں رہتی۔ اسے یک گونہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے یا دوسرے لفظوں میں اسے اپنے پاکیزہ جذبات کی تسکین ہاتھ آجاتی ہے؟

جب ایک عامی کے نہاں خانۂ خیال میں یہ فکری شمع روشن ہوتی ہے تو ایک شاعر ایک متفکر کے بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟ جو گہری نظر رکھتا ہو۔ حساس دل

رکھتا ہے۔ اس لئے میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہر شاعر فطرۃً موحد اور "خدا آشنا" ہوتا ہے!

جگر مرحوم ایک شاعر ہی نہیں، ایک پختہ مسلمان بھی تھے، خاندانی مسلمان، فطری مسلمان اور اپنی اس فطرت صحیحہ سے پوری زندگی میں کبھی نہیں ہٹے۔ اپنی "خود گفت" "سوانح حیات (مطبوعہ قومی آواز) میں کہتے ہیں:۔

"میرا خاندان مولویوں کا خاندان تھا ماحول علمی و ادبی تھا اصل خاندان دہلی کا تھا۔ عورتوں کی زبان ہمارے یہاں خالص تھی اور محفوظ وہ اکثر ایسے محاورات استعمال کرتی تھیں کہ طبیعت خوش ہو جاتی، میرے مورث اعلیٰ مولوی محمد سمیع صاحب شہنشاہ شاہجہاں کے اتالیق تھے دہلی کے اس خاندان کے دو حصے ہو گئے ایک حصہ اعظم پور باشتہ (بہار) اور دوسرا مرادآباد میں سکونت پذیر ہوا۔ میرے پردادا مرحوم حافظ نور محمد اور دادا حافظ مولوی امجد علی مرحوم دونوں شاعر تھے والد مرحوم سے سنا ہے کہ جد امجد شاعر تھے دادا مرحوم کا ایک شعر مجھے یاد ہے جو بیحد پسند ہے ؎

لطفِ جاناں رفتہ رفتہ آفتِ جاں ہو گیا
ابرِ رحمت اس طرح برسا کہ طوفاں ہو گیا

میرے والد ماجد مولوی علی نظر نظر بھی شاعر تھے ان کا بھی ایک شعر یاد ہے ؎

وہ یہاں آئے ہم وہاں پہونچے
ان کو شکوہ ہمیں گلہ نہ رہا!!

میرے چچا مولوی علی ظفر بھی شاعر تھے ان کا ایک مقطع یاد ہے ؎

ٹھہری جاتا ہے تخلص یہ ظفر کا دھوکہ
اے ظفر بندش اشعار کروں یا نہ کروں

میرے تایا مولوی علی اکبر صاحب بھی شاعر تھے اور اکبر تخلص کرتے تھے مولوی حکیم محمد احمد صاحب ان کے صاحبزادے مرادآباد میں اب بھی موجود ہیں۔ میرے

ایک پھوپھی زاد بھائی محمد حسین صاحب ابن اشفاق حسین صاحب بھی شاعر تھے مرثیہ بہت اچھا پڑھتے ایک امام باڑہ قائم ہوا شیخ تفضل حسین کے والد شیعہ تھے اور ان کے حقیقی بھائی مشتاق صاحب مولوی فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے والد صاحب تفضیلی تھے اور وہی عقائد میرے بھی تھے"

غرض جگر کی پرورش خالص دینی ماحول میں ہوئی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی رائے بڑی وقیع ہے:۔ —— یہاں کہنا یہ ہے کہ مرحوم بڑے پختہ مسلمان بھی تھے۔ عقیدۃً شروع ہی سے ایسے تھے البتہ بعض لتیں بری صحبتوں میں رہنے سے پڑ گئی تھیں اس کی بنیاد محض بشری کمزوری تھی اور نہ ان میں کوئی فرعونی پندار و استکبار نہ تھا یہ لتیں مدت ہوئی چھوٹ بھی گئیں تھیں اور جگر نے وہ مرتبہ حاصل کر لیا جو ایک تائب کے لئے مخصوص ہے۔ اب سالہا سال سے بڑے مخلص اور دیندار مسلمان تھے اور اس کا کھلا ثمرہ یہ دیکھنے میں آیا کہ نماز جنازہ نہ صرف جمعہ کے نمازیوں کے جم غفیر نے ادا کی بلکہ نماز جنازہ بار بار ہوئی وقت موعود کا احساس کچھ پہلے سے ہو گیا تھا۔ اس کا اظہار کر دیا تھا اور اس طرح کشف تکوینی بھی مومن کے لئے مبارک علامتوں میں سے ہے۔ اللہم اغفر لہ وارحمہ

(صدق جدید جلد ۱۰ نمبر ۲۳)

اس مذہبی زندگی کے دامن پر ساغر و مینا بھی چھلکا گئے۔ مگر طبیعت میں ہچکچاہٹ ہمیشہ رہی خود ہی فرماتے ہیں "اکثر پی کر دو دو تین تین گھنٹہ روتا بھی تھا شراب اپنے متعلقات کے ساتھ چلتی تھی پیچھے اس کی ندامت رہتی تھی"

(قومی آواز ۱۹ ستمبر ۶۰ء)

لوگ جگر کی شراب نوشی کو بہت اچھالتے اور اسے ان کے "آرٹ" کا ایک جزو سمجھتے ہیں اس کی سخت تردید جگر صاحب فرما گئے ہیں:— میں شراب پی کر شعر نہیں کہتا تھا یہ خیال کہ جب میں شراب پیتا تھا تو بہت اچھے شعر کہتا تھا غلط ہے .... ایک بات یہ بھی ہے کہ میں شعر اسی وقت کہتا تھا جب شراب چھوڑ دیتا تھا دو دو تین مہینے ایک بوند بھی نہیں پیتا تھا اور اسی زمانے میں غزلیں کہتا تھا شراب پی کر صرف دو تین غزلیں کہی ہیں۔

۱۔ میں ترے شوق میں گھبرا کے پی گیا۔ ۲۔ خیال خاطر اہل نیاز رہنے دے
۳۔ ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے۔"

ترک شراب

جگر مرحوم کی طبیعت بڑی ہی نازک اور منفعلانہ تھی رواداری اور مرنجاں مرنجی اور حسن اخلاق کے تو بادشاہ ہی تھے ترک شراب پر اصغر گونڈوی مرحوم نے زور ڈالا اور اپنی شریک حیات کو وصیت کی کہ "اگر جگر شراب ترک کردے تو اس سے شادی کرلینا" (یہ الفاظ جگر صاحب کے ہیں۔ اور حکیم عبدالباری ان کے دوست کے پاس اس مضمون کا خط بھی ہے) جگر صاحب نے اصغر کی وصیت کو سر آنکھوں پر رکھا اور ترک شراب کیا یہ واقعہ غالباً ۱۹۳۶ء کا ہے کیونکہ اصغر مرحوم کا انتقال ۱۹۳۶ء کے اواخر میں ہوا ہے دوسری وجہ خود جگر صاحب نے اپنی سوانح حیات میں لکھوائی ہے کہ "شمس العلما نواب علی حسن خاں صاحب (بھوپال) مجھ سے بہت محبت فرماتے تھے۔ ان کی دو باتیں مجھے کبھی نہیں بھولتی ہیں شعرائے لکھنؤ کے بارہ میں آزادانہ اظہار رائے کا اظہار کرتا تھا اس لیے کہ شعرا میں گروہ بندی سے مجھے نفرت ہے ایک دن بہت

شفقت سے مجھ سے فرمایا کہ جگر! تمہیں جو کچھ کہنا ہو۔ بھوپال ہاؤس میں کہا کرو باہر کچھ نہ کہا کرو یہاں قتل تک ہو جاتے ہیں۔ ایک اور بات کا میرے دل پر بہت گہرا اثر ہے میں بھوپال ہاؤس میں بہت بیمار تھا ایک دن میرے پاس تشریف لائے اور بہت گلوگیر لہجے میں فرمایا" جگر! میرے بڑھاپے پر رحم کرو اور شراب ترک کردو" مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ اس زمانے ہی میں میں نے ترک کردی تھی؛ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ "شغل مے و مینا"۔ ۱ سال تک جاری رہا۔

بزرگوں سے محبت دلی محبت اللہ والوں اور نیک نفسوں کے ساتھ ہمیشہ قائم رہی پہلے حضرت اصغر سے جو ایک صوفی باطن بھی تھے۔ عقیدت رہی ہے

حریم حسن معنی ہو جگر کا شانۂ اصغر   جو بیٹھو با ادب ہوکر تو اٹھو باخبر ہوکر

اس قسم کے بہت سے تعظیمی اشعار شعلہ طور آتش گل میں ملتے ہیں۔ خود بھی تحریر کر گئے ہیں: "اصغر صاحب کی صحبت نے مجھے بہت فائدہ پہونچایا میرے عقائد بھی بدل گئے میری زندگی کو ایک نیا رخ بھی مل گیا۔ اصغر صاحب نہیں رہے مگر مجھ پر اب تک ان کا اثر ہے اور ان کا فیض جاری ہے میرا رنگ ان کی وجہ سے بالکل بدل گیا اس میں بزرگوں کی نظر کا بھی فیض ہے اصغر صاحب نے حضرت پیر شاہ عبدالغنی صاحب مرحوم منگلوریؒ کے پاس بھیج دیا وہاں سے مجھے بہت کچھ ملا۔ حضرت شاہ عبدالغنی سے بیعت تھے۔ شعلۂ طور میں جابجا اردو فارسی میں منقبتیں لکھی ہیں جن سے بے پناہ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر شیخ طریقت، حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے نیاز مندی و عقیدت گرویدگی تک

پہنچ گئی ایک بار خدمت میں ایک فارسی غزل لکھ بھیجی مطلع تھا ؎

بہ سر تو ساقی است من بہ سرود بے طلبی خوشم　　اگرم شراب نمی دہی بخمار تشنہ لبی خوشم

حضرت مولانا عبد الماجد صاحب لکھتے ہیں: "مولانا اپنی اخیر علالت میں مبتلا مریض و مضمحل تھے پھر بھی کلام کو شوق سے پڑھا اور شعر کے جواب میں شعر لکھ بھیجا ؎

نہ بہ نثر نا تمہ بے بدل نہ بہ نظم شاعر خوش غزل　　بغلامی شہ عز و جل و بہ عاشقی نبی خوشم

مولانا مدنی سے بھی کمال اخلاص تھا ایک ملاقات میں کہنے لگے: "ان کی خدمت میں کئی بار حاضر ہوا ہوں" دار العلوم دیوبند میں اکثر جاتے رہتے وہاں کے رسالہ دار العلوم کو اپنی غزلوں سے سرفراز بھی کرتے۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی عبد السلام ندوی سے بھی بڑا گہرا تعلق رہا آتش گل کے انتساب میں ان دونوں حضرات کا بھی نام ہے۔ ایکبار میں نے دریافت کیا مولانا ندوی سے آپ کے تعلقات تو رہ چکے ہیں نا؟ کہنے لگے جی ہاں وہ اور مولوی عبد السلام ندوی بڑے صالح اور بڑے نیک دل انسان تھے۔ اور پھر العلال مولانا شبلی نعمانی مولانا ابو الکلام اور دار المصنفین کے بارہ میں بہت کچھ کہہ گئے۔ جب بھی جانا ہوا موضوع سخن توحید و نبوت اور مذہب و طریقت ہی رہے معلوم ہوتا کہ کسی "شیخ طریقت" کی محفل ہے کہ تصوف و معرفت کی تلقین کی جا رہی ہو ع

ایں سعادت بزور بازو نیست

یا جگر ہی کی زبان میں اس طرح کہیئے :۔

ہنر اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں　　فیضان محبت عام سہی عرفان محبت عام نہیں

کہا کرتے تھے کسی بزرگ صاحب دل کی صحبت ضروری ہے۔

شہید فرنگی محلی (قومی آواز ۹ ار ستمبر ۱۹۶۰ء) میں لکھتے ہیں۔ ان کا ضرب المثل استغناء اور خود داری دیکھنے والی ان ہی آنکھوں نے اس شہنشاہ تغزل کو سجادہ نشین مخدوم ردولوی حضرت شاہ حیات احمد مدظلہ کے حضور میں اس فروتنی اور خادمانہ انداز سے بیٹھے دیکھا ہے جو نہیں بھولتا وہ بڑے خوش عقیدہ اور عالی چشتی تھے اور سلسلہ عالیہ صابریہ سے مسلکاً وابستہ تھے: آگے چل کر ان کے سفر حجاز کے متعلق لکھتے ہیں۔ ایک مدت تک توبہ نصوحا پر قائم رہنے کے بعد حج کو گئے ہیں۔ اور اس حج میں جو ان کے کیفیات، شاہ خرجیاں اور صہبائے ساقی مدینہ سے جو سرخوشیاں تھیں ان کی تفصیل مجھے بھی کچھ معلوم ہے اور کچھ اس حج و زیارت کا ذکر ان کی زبان سے بھی سنا ہے لیکن یہ یقین کرتا ہوں کہ اب بھی ان روحانی برتریوں اور خادمانہ کیفیات کی طرف اشارہ ان کی روح کے لئے تکلیف دہ ہوگا۔

سفر حجاز ایک عاصی و خاطی جب رحمتوں کے گنجینے دیکھے گا تو اس کا دل کیوں نہ بلیوں اچھلنے لگے گا۔ ایک مہجور و مطرود جب دنیا کی سب سے "نرالی بارگاہ" میں اپنی رسائی کی صورت پائے گا تو بھلا کیوں نہ اس کی جانب والہانہ بڑھے گا؟ — جگر مرحوم نے بھی "لا ملجا من اللہ الا الیہ" رکھنے والے آقا کے آستانۂ پاک کا ارادہ کیا۔ اس ریگستانی سرزمین کا جو حوالیہ من کل فج عمیق کا دعوا رات دن کرتی ہے۔ ان کی جنون پسند طبیعت اسی دشت کی سیاحی کرنے پر آمادہ ہوئی جہاں "لیلائے رحمت" کی عاشق نوازیاں

بے پایاں بے حساب ہوتی ہیں۔ خود ہی ایک صحبت میں کہنے لگے سہارنپور کے ایک مولانا بھی ساتھ تھے ع

مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

حج ۱۹۵۳ء میں کیا ہے۔

نماز جگر اکثر نمازیں سخت علالت اور تقریباً بے خبری کی حالت میں چھوٹ جاتی تھیں۔ حکیم عبدالباری (ان کے رفیق قدیم) کہتے ہیں کہ میری موجودگی میں نماز میرے ساتھ ہی پڑھتے۔ ایک اور قریبی عزیز کہتے ہیں جب نمازیں پڑھتے دیکھا گیا بڑے خشوع و خضوع اور اطمینان کے ساتھ ادا کی، جتنی دیر میں لوگ دو دو سجدے کر لیتے جگر صاحب پہلے ہی میں سر نیاز خم کئے رہتے۔

مبشر علی صدیقی شراب کے ذکر کے بعد تنقیدی آئینے صد۲۰۳ پر لکھتے ہیں اس کے بعد میں نے جگر کو متعدد مرتبہ علی گڑھ میں دیکھا لیکن اس عالم میں ان کو کبھی نہ پایا۔ یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ ہر چیز کا ایک خاص زمانہ ہوتا ہے۔ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں علی گڑھ میں سرور صاحب اور رشید صاحب کے یہاں جب میں نے جگر کو وضو کرتے اور نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو بے ساختہ یہ واقعہ یاد آگیا لیکن اس کا اظہار میں نے کسی سے نہیں کیا۔"

ان واقعات سے ان کی مذہبی زندگی کا یہ پہلو بھی روشن ہو جاتا ہے۔

حج کے بارہ میں ایک جگہ خود ہی کہتے ہیں "کہ معظمہ میں ایک ماہ بیمار رہا جائے قیام میں لیٹا ہوا حرم اور مسجد نبوی کا دیدار کرتا رہتا تھا..... میں جب حج کے لئے گیا تو قدم قدم پر شکوک و شبہات تھے مگر مدینہ منورہ پہونچ کر تمام شکوک اس طرح رفع

ہو گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔

محبت رسولؐ شعلۂ طور میں ایک اردو نعت ملتی ہے اس کے علاوہ فارسی کی بڑی طویل نعت لکھی ہے اپنے مخصوص کمرے میں جہاں ع. بی طغرے ہیں وہیں یہ نعت بھی نہایت پاکیزہ خط میں اپنے ہاتھ سے لکھ کر آویزاں کر دی تھی۔ جس کا پہلا شعر ہے ؎

اے از لب صادقت شنیدہ نادیدہ خدا خدائے دیدہ

اسے ایک مخصوص علما کی مجلس میں والہانہ لہجے میں پڑھا تھا نعت گوئی کے بارہ میں لکھتے ہیں —— حج سے واپسی کے ایک یا ڈیڑھ سال تک نعت نہیں ہوئی میں ایک کرب میں مبتلا تھا کہ نعت کیوں نہیں کہہ سکتا ایک طویل عرصے تک کرب محرومی میں مبتلا تھا نعت میرے لئے عطیات میں سے ہے جی چاہتا ہے کہ موت آ جائے تو یہ سامنے ہو اس میں میرا کچھ بھی نہیں اس میں عنوانات ہیں احتراماً کہیں نام نہیں لیا ہے اور اپنے لئے کچھ مانگا بھی نہیں۔ خصوصیاتِ محمدیہ، عہد خلافت و عہد حاضر میں دو دو اشعار ہیں، مگر انہیں اقوام کی تاریخوں کے پس منظر میں دیکھنا چاہیئے۔ معراج و شمہ از حقیقتِ معراج۔ اس کے بارہ میں صاحب عقل شکوک پیش کر سکتا ہے عقیدت کے علاوہ بھی حقیقت بیان کرنی تھی ایک سامنے کی چیز تھا رکی تھی مگر یہی جان ایمان ہے ؎

اے کہ بر تو نثار عصیاں اے بر تو فدا دل تپیدہ

مطلع اور مقطع بھی غور طلب ہیں۔ یہ اندر کی بات ہے کسی نے اندر سے کہا ورنہ۔

اے از لب صادقت شنیدہ نادیدہ خدا خدائے دیدہ

میرے بس کی بات نہیں تھی۔ پہلے ہی مطلع ہوا کسی نے دل میں کہا تم نادانستہ
توہین کر رہے ہو۔ دعا سے محروم سمجھنا غلطی ہے کہ اتنی بڑی بارگاہ سے محروم
واپس آئے۔ اور پھر یہ؟ جب مجھ سا بدبخت نتیجہ ہے کہ رب محرومی کا شمار کرنے
کے لئے دل پیدا اور تیرے عصیاں کہاں سے لائے؟"

اپنے مخصوص کمرے میں ریشمی جزدان میں قرآن شریف رکھا کرتے اور ٹانی
جانماز بھی۔ البتہ کلام قرآنی سے استشہاد کرتے نہ سنا ہے۔

آخر میں ایک واقعہ مولانا عبدالماجد صاحب سے سن لیجئے :-
مشہور ہے کہ ایکبار جگر ایک مشہور نقیب الحاد شاعر کے ساتھ بیٹھے ہوئے
بادہ پی رہے تھے کچھ دیر بعد اپنے حسب معمول کہا یا اللہ! بلند آواز سے کہا الحاد نواز کو
دل لگی اللہ میاں سے بھی سوجھی بدکمال شوخ چشمی بولا. جگر صاحب آپ نے مجھ کو
پکارا ہے — جگر کیا چوکنے والے تھے تڑپ کر بولے ارے یہ شیطان کہاں سے
بول اٹھا میں نے تو اپنے رب کو پکارا تھا" (صدق جلد ۱۰ نمبر ۴۵)

نوٹ :- اس مضمون میں حضرت جگر کی جو باتیں بطور سوانح لکھی
گئی ہیں وہ اکثر نفیس الفاروقی کے مضمون "حیات جگر" کا ایک باب
مطبوعہ قومی آواز ۱۹ ستمبر ۱۹۶۰ء سے منقول ہیں"

احمر رفاعی ایم اے

جگر کا فلسفۂ حسن و عشق

اگر حسن و عشق کو اس کے عامیانہ تصور سے بلند ہو کر دیکھا جائے تو تصوف سے باہر علیحدہ کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ جگر نے حس نقطۂ نظر سے اس کا تجزیہ کیا ہے وہ خالص افلاطونی ہے حکمائے عہد قدیم اور متکمرین مابعد نے حسن و عشق کی قدریں متعین کرنے میں کسی قسم کا فکری اختلاف نہیں برتا ہے لیکن طریق استدلال خارجی موثرات کے زیر اثر ہر دور میں نئے نئے قالب اختیار کرتا رہا ہے، اس کا سبب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ متکمرین زمانے سے ٹکرا تو سکتے تھے لیکن وقت اور ماحول کے بنیادی تقاضوں سے روگردانی کی سکت نہیں پاتے تھے۔

ہندوستان کے قدیم اپنشدوں نے نفئ صفات (تسز یہہ) کی نیتی کا علم بلند کیا اور اس کی بنیادوں کو اٹھاتے اٹھاتے بام ثریا سے جا ملایا۔ وہ بھی دراصل حسن ہی کی ایک قدر تھی ایک ایسی اعلیٰ اور پاکیزہ قدر کہ جس کی تصدیق و توثیق خود اسلام کو کئی ہزار سال بعد کرنی پڑی ہے، اب یہ اور بات ہے کہ خود ہندوستان اس نیتی پر مستقلاً قائم نہیں رہ سکا، ایک پیکر محسوس کی متلاشی نظریں آخر کہاں تک بھٹکتی رہتیں، یہ تشنہ سامانیاں

رنگ لاکر رہیں اور ایک دن انسان کے اس احتیاط پسندانہ زہد و ورع کا
قصر پرشکوہ حدانہ زاداں کے ایک ہی تھپیڑے کی نذر ہو گیا، آسودگیٔ ذہن
فطری بعد کے فطری تقاضے ہر قسم کی امکانی حد بندیوں کو پھلانگ گئے۔
اور یہیں کے عہد پارینہ اعلیٰ و ادنیٰ تصور، رفتہ رفتہ تعینات و تعقیدات کی
سیکڑوں صورتوں میں تشدد مستقل ہوتا چلا گیا اسی عالم میں یکے بعد دیگرے
کئی صدیاں گذر گئیں بالآخر حسن کا ایک اچھوتا تصور یونان کی نکھرتی ہوئی فضاؤں
میں جلوہ گر ہوا، اس وقت جبکہ اس کے قوائے عمل میں بجلیاں سی کوند رہی تھیں۔
ایسے وقت میں حسن کا کوئی تصور اگر جنم لے سکتا تھا تو وہ عمل سے علیحدہ دوسری
اور کوئی شے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ لہذا اس دور کے حکماء کے ذہن میں حسن کی
بس یہی ایک قدر تھی یعنی عمل ا

آہستہ آہستہ تہذیب و تمدن نے کچھ اور ارتقائی منازل طے کئے یہاں
تک کہ فنونِ لطیفہ نے آنکھیں کھولنا شروع کیں، بت گری و سنگ تراشی
کے سادہ مگر دیدہ زیب شاہکاروں نے دامِ تہذیب پھیلا کر فکر و نظر کو
اسیر کر لیا تو حسن کا یہ روائتی تصور بھی بدلنا شروع ہوا، ایک گوشے سے خیرِ اعلیٰ
کی صدا بلند ہوئی حسن کا واحد معیار صرف حقیقت کو قرار دیا گیا۔ سقراط
فطرت کی بوقلمونیوں اور متنوع سامانیوں پر تفکر و تدبر کی جس دعوت کا
بار بار اعادہ کرتا ہے وہ دراصل ادراکِ حقیقت کے سلسلے میں ایک مسلمہ
اور پاکیزہ مہم کی حیثیت رکھتی ہے، وہ حقیقت جو فطرت کے پس پشت کارفرما
ہے یا پھر فطرت خود اس تک پہونچنے کا براہ راست ایک وسیلہ ہے۔

سقراط اسی پر اکتفا نہیں کرتا اس کے نزدیک حسن فطرت کے پس پشت اور ضمیر انسانی کی اتھاہ گہرائیوں میں برابر کا شریک ہے اور اس کی حیثیت ایک لحاظ سے افادی ہے۔

افلاطون نے کمال ترتیب و انضباط کے ساتھ اس مسئلہ کو اور زیادہ متعین پیرائے میں واضح کرنے کی سعی کی ہے، اس نے اس گتھی کو سلجھانے کی غرض سے کائنات کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا مادی اور غیر مادی۔ یہ ایک قسم کی ثنویت ہی تھی لیکن خیر و شر کی تقسیم سے علیحدہ، مجاز و حقیقت کے دو رہا ہی مباحث کا آغاز اسی وقت سے ہوتا ہے حقیقت حسن ہے اور مجاز عکس حقیقت

ابیقوریوں کا عقیدہ ہے ؎

آموزنہ اے غافلِ ناداں کہ ترا در خاک نہند و باز بیروں آرند
(خیام)

ابیقوریوں کے فلسفے کی مکمل تشریح اس شعر سے ہو سکے گی ؎

بقدر سکون راحت بود بنگر تفاوت را دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن

ابیقورس یونیوں کے امام ارسٹپس کی طرح لذت کو خیر برترین اور مقصود حیات سمجھتا ہے وہ ۳۴۱ ق م میں پیدا ہوا اور ۲۷۵ ق م تک اس فلسفے کی تبلیغ کرتا رہا ہے۔

ابیقورس کے نزدیک حسن نام ہے تناسب مادی کا[1]

---

[1] مولانا حفظ الرحمٰن اپنی کتاب "اخلاق و فلسفہ اخلاق" میں لکھتے ہیں ابیقورس کے نزدیک لذت کے وہ معنی ہرگز نہیں ہیں جو زمانہ موجودہ میں سمجھے جاتے ہیں ابیقورس ... [illegible]

رواقیت کی تحریک دراصل ابیقوریت کا ردعمل تھی، رواقیت نے
زیادہ تر اخلاقیات سے سروکار رکھا۔ رواقیت کے پیرو کار باوجود اپنی
تمام موشگافیوں کے جمالیات کا کوئی واضح تصور پیش نہیں کر سکے۔

اشراقیین نتائج عقلی سے دست بردار ہو کر صرف روحانیت سے
ناتہ جوڑتے ہیں اس تحریک کے علمبرداروں نے حقیقت کو حسن مطلق کی شکل
میں دیکھا اور موجودات محسوسات کو حقیقت کا آئینہ قرار دیا۔

زمانہ مابعد میں اور بھی متعدد مفکرین پیدا ہوئے جن میں سے کسی نے
جزوی تشریح اختیار کیا اور حسن و قبح کے معیاروں کا انھیں دو دو اسطوں سے
تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک مفکر نے قبح کو بھی حسن ہی کا جزو لازم
قرار دیا ہے۔ یہ موشگافیاں باستثنائے چند تمام کی تمام فلسفیانہ نوعیت
کی حامل ہیں لیکن اہل باطن یا حاملان شریعت حسن و عشق کے معیاروں کا تعین
کرنے کے لئے عقلی سانچے تیار نہیں کرتے، ان کے نزدیک حسن ایک
کیفیت ہے۔ تمام محسوسات کی دسترس سے ماوراء، وہ ایک حالت ہے

(بقیہ حاشیہ صـــ) بلکہ وہ کہتا ہے کہ ہم کو اول زندگی کے تمام مراحل پر نظر
ڈالنا چاہئیے اس کے بعد ہم حصول لذت کے طالب ہوں، اگر ہم یہ سمجھتے ہیں
کہ مثلاً عیش و لذت کے بعد اس سے کہیں زیادہ تکلیف و الم پیش آنے والا
ہے تو ہمارے لئے ضروری ہوگا کہ ہم اپنی خواہشوں کی باگوں کو روک لیں اور
موجودہ لذت کے لئے دائمی الم کو دعوت نہ دیں۔

تعینات و استداد کی جملہ نظری مفروضہ سامانیوں سے بے نیاز، وہ دراصل
ایک ایسا اندرونی تجربہ ہے جس کے جلو میں تعمیر و تحسین، ترتیب و تزئین اور
تخلیق و تفویض غرضکہ وہ سب کچھ ہے جو روح کی ازلی تشنہ سامانیوں
کو نہ معلوم کتنی اور کیسی کیسی لطیف سرمدی سعادتوں سے ہمکنار کر دیتا ہے۔
مشہور چینی حامی سریت لاؤتسے (LAUTZE) اپنے مخصوص عارفانہ
انداز میں کہتا ہے :-

"ہم تاؤ (حسن مطلق) کی طرف دیکھتے ہیں اور ہمیں کچھ نظر نہیں آتا
اس کا کوئی رنگ نہیں ہم تاؤ کو کان لگا کر سنتے ہیں اس کی کوئی آواز
نہیں، ہم تاؤ کو ٹٹولتے ہیں لیکن وہ ہمیں کہیں نظر نہیں آتا، اس کا
کوئی جسم نہیں، ہمیشہ ہاں ہمیشہ تاؤ بے نشان رہتا ہے اور بار بار
عدم کی جانب واپس آتا ہے"[1]

عشق بھی ایک تجربہ ہی ہے۔ ایک ایسا شدید اندرونی تجربہ جس کی بے پناہ
شدت کا جواب نہ شعلہ ہے اور نہ شراب۔ جگر نے کیا خوب کہا ہے ؎

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجئے ۔۔۔ اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

عشق کی یہ ناقابل گرفت رستخیز کیا ہے اور کس سبب سے ہے عقل
آج تک اس کا کوئی قابل قبول جواز بہم نہیں پہونچا سکی۔ البتہ صوفیہ نے
اپنے اندرونی محرکات کے زیر اثر کچھ مختلف النوع نظریات قائم کئے ہیں
جو بیک وقت حسن و عشق دونوں پر مشتمل ہیں۔

---

[1] انواع فلسفہ ترجمہ جناب ظفر حسین خاں۔

پہلا نظریہ :۔ عشق خالقِ حسن ہے۔

دوسرا نظریہ :۔ اصل حقیقت محض حسن ہے اور حسن کا تقاضا ہے ظہور و خود نمائی اور یہ تقاضائے عشق کا محرک اور خالق ہے۔ اور مذہب کی اصطلاح میں اسی کو توفیق کہتے ہیں

تیسرا نظریہ :۔ حسن و عشق دونوں اپنی جگہ مستقل ہستیاں ہیں مگر ہر شخص کا معیارِ حسن فطری طور پر مختلف ہوتا ہے اور فطرت اپنے معیارِ پسند کی جستجو میں رہتی ہے اور جب اتفاق سے وہی چیز سامنے آجاتی ہے تو دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھتی ہیں اور اسی تطابقِ حسن و عشق سے دونوں کا فطری رنگ نکھر آتا ہے۔

چوتھا نظریہ :۔ تمام کائنات عالم چونکہ محض حسنِ ازل کا پرتو ہے لہٰذا حسن و عشق کی حقیقت ایک ہے نہ کہ مختلف ہیں"

یہ چوتھا نظریہ وہی ' وحدت الوجود کا مسئلہ ہے جگر کچھ شروع ہی سے اس صہبائے الست کے متوالے دکھائی دیتے ہیں جس کا نشہ کسی نہ کسی شکل میں آج بھی ان پر چھایا ہوا ہے لیکن اس کی نوعیت ان کے یہاں کچھ دو دھاری پہلو لئے ہوئے ہے۔ یہ موضوع چونکہ طویل ہے اور کسی قدر خشک بھی لہٰذا سردست اس سے احتراز ہی لازم ہے۔ رہے بقیہ تین نظریات تو ان کے ضمن میں البتہ بطور اختصار کچھ عرض کیا جائے گا۔

جگر کے ابتدائی کلام میں مسئلہ وحدت الوجود کے سوائے بقیہ تین

---

۵ مقدمہ "نشاطِ روح" از مولانا سہیل اعظم گڑھی

نظریات میں سے کسی ایک پر بھی کوئی شعر نہیں ملتا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی جبکہ وہ حضرت اصغر کی خدمت میں پہونچ چکے تھے اور ان کے کلام کی معنوی خوبیوں سے محظوظ و مستفیض ہو رہے، ایک عرصے تک وہ اس موضوع سے ہٹ کر حسن و عشق سے متعلق کسی اور پہلو پر غور نہیں کر سکے اس کا سبب بہت ممکن ہے یہ ہو کہ مراسم ابتداءً خالص عقیدت مندانہ رہے ہوں یا یہ ایک قسم کا شدید جذباتی لگاؤ سا ہو جو فوراً ہی ذہنی اشتراک کا باعث نہ بن سکا۔ بایں ہمہ کچھ عرصے بعد اس کے اسباب بھی مہیا ہوتے چلے گئے۔

گمان غالب یہی ہے کہ اول الذکر تین نظریات کا سراغ جگر کو حضرت اصغر ہی کی وساطت سے ملا۔ اور جگر نے شعوری طور پر ہی اصغر کے خیالات کا اثر قبول کیا ہے۔ جیسا کہ ان کے اس شعر سے مترشح ہے ؎

یہ ان کے حضرتِ اصغر کے اے جگر اشعار وہ مست ہوں کہ کوئی پی کے بادہ خوار نہو

البتہ اس کے ساتھ ہی کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک عرصے تک اپنے مخصوص حدود سے تجاوز کرنا نہیں چاہتے تھے یہی سبب ہے کہ ان کے دوسرے دور کے ابتدائی کلام میں بڑی تلاش کے بعد صرف ایک شعر ایسا مل سکا ہے جس پر نظریۂ اولین کا اطلاق کیا جا سکتا ہے، شعر مذکورہ درج ذیل ہے۔

زندگی کیا ہے نمودِ عاشقی عشق کیا ہے حسن کا آغاز ہے

تیسرا دور ایک ہیجانی دور ہے لیکن فکری عنصر سے خالی نہیں بلکہ ہمہ گیری اس دور کی غزل کا ایک وصف امتیازی ہے۔ یہ ہمہ گیری صرف تصوفانہ مسائل اور واردات عشق و عاشقی تک ہی محدود نہیں بلکہ اس بار جگر نے ان موضوعات

سے ہٹ کر بھی بہت کچھ کہا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ مروجہ نظریات حسن و عشق پر بڑے ہی باقاعدہ انداز میں نیز قطعی شعوری طور پر ان کی توجہ مبذول ہوئی ہے شاید یہ اس بدلتے ہوئے رجحان کا تقاضا بھی تھا جس کے تحت نیاز عاشقی کی عظمت کے ساتھ ساتھ حسن کی حرمت و احترام کا لحاظ خصوصیت سے روا رکھا جانے لگا تھا۔ بایں وجہ اس دور میں نظریۂ اولیں کے بجائے جو صرف عظمت عشق و عاشقی کا نقیب ہے۔ جگر کی نظریں موخر الذکر دوسرے دو نظریات کی جانب مبذول ہوتی ہیں ؂

دوسرا نظریہ :-

حسن بیتاب تجلی خود ہے لیکن اے جگر — ایک ہلکا سا حجاب چشم حیراں چاہئے

ہر ادا سنجیدۂ بیگانہ پیرائی صورت ہے بنر — شعاع حسن اڑالے جا بیگی خود نال و م

حسن میں جب تک کہ شان خود آرائی ہے بھی — عشق میں مستی بھی لیکن خودئے رسوائی نہ تھا

تیسرا نظریہ :-

حسن بے قید سہی عشق بھی محدود نہیں — مجکو پائیں گے جہاں تک وہ نمایاں ہونگے

چوتھے دور کا آخری زمانہ سر سودا زدہ کی شوریدہ سامانیوں کے اختتام سے شروع ہو کر طبع مطمئنہ کی دراز نفسیوں پر ختم ہوتا نظر آتا ہے، انداز بیان میں شدت کی بجائے بالعموم شگفتگی اور کرب و کسک کی خصوصیات کے بالعموم ایک مزنہ لطافت و رعنائی کی جھلکیاں سی بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ حسن و عشق سے متعلق نظریۂ اولین پر صرف ایک اور نظریۂ ثانی پر چند منتشر اشعار ملے جاتے ہیں۔ ؂

نگاہِ یار خود تڑپ اٹھتی شرطِ اوّل خراب ہونا تھا

دوسرا نظریہ ۔

اب سے پہلے تو نہ تھا ذوقِ محبت کے سوا شاید ان مست نگاہوں نے کچھ ارشاد کیا

عشق کیا ہے پر توِ حسنِ تمام شوق کیا ہے حسن کا عکسِ شباب

مری طلب یہ اسی کے کرم کا صدقہ ہے قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

خلاف توقع تیسرے نظریے کی مطابقت سے کوئی شعر نہیں ملتا، اس کے بالعوض جگر ایک بالکل ہی جدید نظریئے کا پرچار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جو بلا شرکت غیرے صرف انھیں کی ذہنی اپج کا شاہکار ہے اور اس لحاظ سے اپنی طرفہ خصوصیات کی بنا پر ان کی اوّلیت کا نقیب بھی۔ اس نظریے کی رو کی حسن و عشق دو علیحدہ اور الگ الگ مستقل ہستیاں نہیں رہتیں بلکہ وہ ایک ہی محور و مرکز پر سمٹ آتے ہیں ؎

عشق کا سحر کامیاب ہوا میں ترا تو مرا جواب ہوا

نیاز و ناز کے جھگڑے مٹائے جاتے ہیں وہ ہم میں اور ہم ان میں سمائے جاتے ہیں

حسن سے عشق جدا ہے نہ جدا عشق سے حسن کون سی شے ہے جو آغوش در آغوش نہیں

تو ہی کمالِ عشق ہے تو ہی کمالِ حسن ہے اپنے سوا کسی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھ

یہ اشعار بظاہر وجدانی کیفیات کے حامل نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے ان کی تخلیق میں ایک ترقی پذیر فکر و شعور کی کارفرمائی کا پورا دخل ہے، جگر نے اس مسئلے پر پورے سکون ذہنی سے غور کیا اور بصمیمِ قلب اس کا اظہار بھی کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مبادا اس ڈر سے

کہ یہ طرزِ تصور کسی لحاظ سے ایک شاعر کی ذہنی قلابازی پر محمول کیا جائے
جگر نے اصل حقیقت کی پردہ کشائی کرتے ہوئے ایک بڑی ہی معرکتہ آرا
بات کہہ دی ہے ؎

وہی ہے عشق وہی حسن ہے وہی سب کچھ — مگر کسی سے کسی کا جواب ہو نہ سکا

اور آج بھی جبکہ بقول خود شاعر کی ذہنی کیفیات میں یہ انقلاب
رونما ہو چکا ہے ؎

یہاں تک تو جگر پہونچی ہے معراج خودی اپنی
کہ حسن اک مشغلہ اپنا ہے، عشق اک دل لگی اپنی

اگر مسئلہ وحدت الوجود کے علاوہ حسن و عشق سے متعلق کوئی اور نظریہ
بھی ہے جو اس کی ذہنی کائنات میں جاگزیں ہو سکتا ہے تو وہ صرف
ایک ہے اور یہی ایک ؎

پھر یہ جدائیاں ہیں کیا پھر یہ دہائیاں ہیں کیا
عشق سے تو الگ نہیں حسن سے میں جدا نہیں

جب عشق اپنے مرکز اصلی پر آ گیا — خود بن گیا حسین دو عالم پہ چھا گیا
تنہا نہیں ہے عشق ہی رسوائے جستجو — خود حسن کو بھی گرم سفر دیکھتا ہوں میں
ملتا چلتا ہے مزاج عشق ہی سے رنگ حسن — شمع گر بیباک ہو گستاخ پروانہ بھی ہے
یہ حسن ہے کیا یہ عشق ہے کیا کس کو ہے خبر اسکی لیکن
بے جام ظہورِ بادہ نہیں بے بادہ ظہورِ جام نہیں

ظہیر احمد صدیقی ایم اے (علیگ)
شعبۂ اردو۔ دہلی کالج۔ دہلی

جگر کا لب و لہجہ

اردو غزل کی روایت جگر کے بغیر نامکمل رہ جاتی ہے۔ شاعری کی آبرو غزل کو کہا گیا ہے اور اس آبرو کو جگر نے ہمیشہ اپنی آبرو سمجھا۔ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں یہ وہ زمانہ تھا جب مغربی فکر سے متاثر ہو کر تعلیم یافتہ جماعت نے غزل کے خلاف بڑی غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں۔ ایک زبردست طوفان تھا جو غزل اور اسکی روایتوں کے خلاف اٹھایا جا رہا تھا۔ اس کو نیم وحشیانہ اور جاگیردارانہ ماحول کی یادگار بتایا گیا۔ اس کے موضوعات اور عدم تسلسل کو روایت پرستی ٹھہرایا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حسرت۔ فانی۔ اصغر اور جگر سے پہلے غزل اپنی کشش کھو چکی تھی۔ دہلی اور لکھنؤ میں بڑی حد تک روایتی اور رسمی غزل کا دور تھا۔ آخر صفی عزیز اور ان کے رفقا نے اصلاح کا قدم اٹھایا ان لوگوں کی شاعری میں نئے تجربے جذبہ و فکر کا امتزاج اور پستی و ابتذال سے انحراف ہے۔ ان لوگوں نے غزل کے لب و لہجہ کو پستی سے نکالنے کی کوشش کی۔ مگر ان کی کوششیں ہندوستان گیر نہ ہو سکیں اور ان کے یہاں موت۔ جنازہ۔ گور و کفن کا بکثرت بیان مذاق سلیم پر گراں

گذرنے لگا۔ اس موقع پر حسرت۔ فانی اور اصغر نے غزل کو فکری رفعت اور ماورائی
صداقت کا آئینہ دار بنایا۔ جگر انہی کے ہم عصر ہیں۔

جگر کی شاعری میں رنگ و بو کا ایسا عجیب امتزاج ہے جو ان کے معاصر شعرا میں
حسرت کے علاوہ اور کسی کے یہاں نہیں ملتا۔ جگر کے یہاں فکر ہے نہ فانی کی طرح دقیق
کہ رسائی سے بلند ہو اور عشق ہے مگر نہ اصغر کی طرح ماورائی کہ جس میں نو افلاطونی فلسفہ
کے پیچ و خم ہوں۔ ان کے یہاں فکر اور جذبات کی رعنائیاں ہیں جنھوں نے ان کو امتیازی
درجہ عطا کیا۔ جگر فانی سے تو کبھی قریب نہیں رہے اس لئے جگر کے لہجہ اور فانی کے لہجہ میں
زمین و آسمان کا فرق ہے۔ فانی کے یہاں غالب کی آواز اپنی پوری شدت اور توازن
کے ساتھ سنائی دیتی ہے جگر کو میر اور اصغر سے ہوتا ہوا جو ورثہ ملا تھا اس میں سوز و
گداز۔ سرمستی اور وجدانی کیفیت ملی جلی ہیں۔ میر کا لہجہ یاسیت کے باعث اور اصغر
کا انداز تصوف کی وجہ سے گرانبار ہو گیا ہے۔ اس کمی کو ان کے خلوص اور رعنائی بیان
نے پورا کر دیا ہے۔ جگر کے یہاں بڑے متوازن جذبات ملتے ہیں۔ جگر کے خیالات
ترتیب طرز فکر، طرز ادا ان کی شاعری کا درجہ متعین کرتے ہیں۔ مثلاً

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ — جو دلوں کو فتح کر لے۔ وہی فاتح زمانہ
یہ ترا جمال کامل۔ یہ شباب کا زمانہ — دل دشمناں سلامت۔ دل دوستاں نشانہ
دنیا کے ستم یاد۔ نہ اپنی ہی وفا یاد — اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد
جب کوئی حسیں ہوتا ہے سرگرم نوازش — اس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد
لاکھوں آفتاب پاس سے ہو کر گذر گئے — بیٹھے ہم انتظار سحر دیکھتے رہے
سینہ میں اگر ہو دل بیدار محبت — ہر سانس ہے پیغمبر اسرار محبت

گر میر اور جگر میں نمایاں فرق یہ ہے کہ میر کے یہاں قنائیت اور سپردگی ہے۔ جگر کے یہاں محبت میں خودنگری اور خودداری ہے یہی وجہ ہے کہ جگر کے یہاں محبت کی تعلیاں پائی جاتی ہیں۔ اس میں وہ مومن سے قریب نظر آتے ہیں۔ جگر مومن کی طرح حسن کے پجاری بھی ہیں اور اس کے ادا شناس بھی۔ وہ محبت کو مقدس اور نورانی تصورات سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا عشق زندہ اور صحت مند ہے۔ وہ رومانی شاعر ہونے کے باوجود رومان کی وادیوں میں اپنے آپ کو کھو نہیں دیتے۔ بقول سرور صاحب جگر کے یہاں کبھی کبھی عاشق خود محبوب بن گیا ہے۔" یہ آپ اپنی ہی تمنا والا معاملہ جگر کو انفرادیت بخشتا ہے۔

محبت ہی گو اپنا مذہب لیکن طریق محبت جدا چاہتا ہوں

میں تو ہر حالت میں خوش ہوں لیکن اس کا کیا علاج
ڈبڈبا آتی ہیں وہ آنکھیں جگر میرے لئے

عشق خود اپنی جگہ میں حقیقت ہو جگر عشق ہی میں کیوں نہ شان دلبری پیدا کریں

عالم تو ہے دیوانہ جگر حسن کی خاطر تو اپنے لئے حسن کو دیوانہ بنا دے

عشق کو بے نقاب ہونا تھا آپ اپنا جواب ہونا تھا

جگر کے ابتدائی دور میں نشاطیہ عناصر زیادہ تھے۔ مگر اس نشاطیہ عنصر نے پیا قول سطحیت کبھی پیدا نہیں ہونے دی۔ جوں جوں رنگ شاعری نکھرتا گیا سوز و گداز کی کیفیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے ابتدائی زمانہ میں آورد ضرور تھی مگر گھلاوٹ اور والہانہ انداز و سرمستی اس دور میں بھی نمایاں ہے۔ جب ہم نشاطیہ شاعری کا ذکر کرتے ہیں۔ تو ہماری مراد اس عامیانہ اور بازاری جذبہ سے

نہیں جو مثلاً انشا، یا جرأت کی شاعری کا طغرائے امتیاز ہے۔ بلکہ ہمارا مقصود وہ رچا ہوا لطیف آسودگی کا احساس ہے جو کسی شاعر کے دل پر جلوۂ دوست سے طاری ہوتا ہے یا وہ سرمستی کا عالم جو انسان کو ماسوائے محبوب سے بے نیاز کر دیتا ہے یہی نشاطیہ عنصر جگر کی غزل کا امتیازی وصف ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے مسلسل ریاض نے اس کو اور زیادہ نکھار دیا۔ اسی نکھار کا فیض ہے کہ ان کے آخری دور کی شاعری میں غم (غم عشق) میں بھی ایک خاص لطیف اور پاکیزہ نشاطیت پیدا ہو گئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ انھوں نے غم کو اپنے لئے گوارا بنا لیا ہے۔ چند مثالوں سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہو سکے گی۔

بس رہیں درد ہی اگر مجھے اور چاہیے کیا جگر غم یار ہو مرا شیفتہ میں فریفتہ غم یار پر

تری صبح عیش ہے کیا بھلا۔ اے فلک جو ہو تو صلا
کبھی کرے آکے مقابلہ غم ہجر یار کی شام سے

تری امانت غم کا تو حق ادا کروں — خدا کرے شب فرقت ابھی دراز رہے
نہیں معلوم وہ کس وضع کے انسان ہونگے — جن پہ ترے ستم خاص کے احسان ہونگے
غیر جو تلخ کام ہے اس کے نصیب کی کمی — مجھ کو تو اک مزہ ملا ہر غم جانگداز میں
بے فائدہ الم نہیں بے کار غم نہیں — توفیق دے خدا تو یہ نعمت بھی کم نہیں
مستی حسن غم عشق پہ یوں چھائی ہے — دل سے جو موج غم اٹھے تری انگڑائی رہو
بہت حسین سہی صحبتیں گلوں کی مگر — وہ زندگی ہے جو کانٹوں کے درمیاں گذرے

کوئی یہ ناصح کو سمجھائے بطرز دل نشیں
عشق صادق ہو تو غم بھی بے مزا ہوتا نہیں

اصل یہ ہے کہ غم ہو یا خوشی ان میں سے ہر ایک کا تعلق انسانی جذبات سے ہے اور انسان کو متاثر کرنے میں ہر ایک کو برابر کا حصہ ملا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ غم کا اثر نسبتاً شدید ہوتا ہے۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا چاہیئے! کسی شاعر نے جذبات غم یا جذبات مسرت کو واقعی محسوس کیا ہے یا نہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس کا انداز روایتی ہے یا مجتہدانہ۔ اور نیز اس کے ادا کرنے کے لئے کون سا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ جہاں تک جگر کی شاعری کا تعلق ہے ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کا جذبہ نشاط واقعی ہے رسمی نہیں۔ ان کے خیالات اور اسالیب دونوں ذاتی ہیں۔ جن پر ان کی انفرادیت کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ اور جن کا مطالعہ کرنے پر ہر ذی فہم پکار اٹھے گا کہ یہ آواز جگر ہی کی ہو سکتی ہے style is the man کسی نے سچ کہا ہے۔ در اصل یہی اسٹائل ایک بڑے شاعر یا ادیب کی انفرادیت کا ضامن ہوتا اور اس کے کلام کو تیر و نشتر بخشتا ہے۔ محبوب کے تصور میں آنے کے بعد عاشق پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کا اندازہ اس شعر سے کیجئے!

یادش بخیر جب وہ تصور میں آ گیا — شعر و شباب و حسن کا دریا بہا گیا

محبت میں سود و زیاں کا احساس بھی کفر ہے۔

محبت سرفروشی جاں سپاری — محبت میں خیال پیش و پس کیا

ایک جگہ پر شاعر کی حساس طبیعت کی نزاکتوں کو دیکھئے۔

زمانہ گرم رفتار ترقی ہوتا جاتا ہے — مگر اک چشم شاعر ہے کہ پرنم ہوتی جاتی ہے

اس طرح ان کے چند تیر و نشتر ملاحظہ کیجئے۔

جنوں کی بے سروسامانیوں پہ رنج نہ کر   اگر جنوں ہے سلامت ہزار ہا دامن

نہیں وہ معاف ہاں کہہ دوں جو ہے فرق مجھ میں تجھ میں

ترا درد درد تنہا مرا غم غم زمانہ

ہر اعتبار دوست پہ صدقے ہزار جان   لیکن وہ کیف وعدہ نا معتبر کہاں

مانا کہ محتسب بھی بڑا باشعور ہے   لیکن اسے نزاکت غم کی خبر کہاں

ہر چند کائنات دوعالم ہیں اے جگر   انساں ہی ایک چیز ہے انساں مگر کہاں

ایک چیز ان کی شاعری اور زندگی میں نمایاں نظر آتی ہے۔
اور وہ یہ کہ جگر ہمیشہ جگر رہے۔ اور ان کی شاعری ہمیشہ شاعری رہی۔ یعنی ان کی شاعری اور زندگی میں برابر ہم آہنگی رہی۔ ان پر جو بیتی اس کو انھوں نے شدت سے محسوس کیا اور جو کچھ محسوس کیا وہی ان کے اشعار کے قالب میں ڈھل گیا۔ یہ بات ایک بڑے شاعر کے سوا دوسروں کے یہاں قطعا غیر ممکن ہے۔ خواہ وہ رندان بلا نوش کی محفلیں ہوں یا صوفیائے باصفا کے حلقے۔ ان کے یہاں شاعری کا احترام ہر زمانہ میں ملے گا۔ اور یہی چیز ان کی سیرت اور شاعری کی بلندی کی ذمہ دار ہے۔ انھوں نے نہ کبھی اپنے آپ کو بیچا اور نہ کبھی اپنے فن کو فروخت کیا غالبا اسی خودداری کا اثر ہے کہ اگرچہ جگر اپنی شاعری میں حسن کے وفادار ضرور ہیں مگر وہ کہیں عشق کو ذلیل و پست نہیں ہونے دیتے۔ وہ حسن کے دلدادہ ہیں خواہ یہ حسن حقیقت میں پوشیدہ ہو یا مجاز میں وہ مجاز کو بھی حقیقت کا پرتو خیال کرتے ہیں۔

تجھ کو دیکھ کے کونین کی وسعت دیکھی   حسن ہی حسن محبت ہی محبت دیکھی

روبروئے دوست ہنگامِ سلام آہی گیا
رخصت اے دیر و حرم۔ دل کا مقام آ گیا

شش جہت آئینۂ حسنِ حقیقت ہے جگرؔ
قیس دیوانہ تھا محوِ روئے لیلیٰ ہو گیا

دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

نمایاں ہیں چہرے سے آثارِ عشق
جگرؔ آج سے باخدا ہو گیا

جگرؔ کی شاعری کا نمایاں وصف یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں کسی قسم (conflict) نہیں پائی جاتی۔ بظاہر کہنے کو یہ آسان بات ہے مگر یہ امر واقع ہے کہ ہمارے ادب کے عظیم شاعروں کے یہاں شاعری یا زندگی کی الجھنیں موجود ہیں۔ یہی زندگی کی الجھنیں ان کی شاعری میں بھی تضاد پیدا کر دیتی ہیں۔ اس conflict سے میرؔ غالبؔ مومنؔ جیسی عظیم اور برتر شخصیتیں بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ اس سے ان بلند مرتبہ شخصیتوں کو گھٹانا ان کے مقابلہ میں جگرؔ کی فضیلت کو ثابت کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ بتانا صرف اس قدر ہے کہ جگرؔ نے اس ذہنی الجھن سے اپنے آپ کو ہمیشہ آزاد رکھا۔ جگرؔ کے یہاں ایک بہاؤ ہے جس میں رنگینی اور مستی کی گھلاوٹ ہے۔ جس کے درمیان میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے اگر اس کو مبالغہ نہ سمجھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جو بہاؤ (flow) جگرؔ کے یہاں ہے وہ اردو شاعری میں میرؔ اور حسرتؔ کے علاوہ کسی کے یہاں نہیں ہے۔

اکثر لوگوں کو جگرؔ کے متعلق کہتے سنا گیا ہے کہ ان کے یہاں داغؔ کی صدائے بازگشت ہے۔ داغؔ ہماری شاعری کے نہیں بلکہ ایک تہذیب کے آخری نمائندے تھے۔ ان کے بعد ایک نئی تہذیب نے جنم لیا اور اس نئی تہذیب اور مزاجِ عاشقی کا آشنا حسرتؔ تھا۔ مگر حسرتؔ کے یہاں داغؔ سے زیادہ

نکھار ہے اور حسرت کے بعد یہ نکھار صرف جگر کے یہاں ملتا ہے۔ مگر جگر کی شاعری کو ان کی محض صدائے بازگشت کہنا جگر کے ساتھ ناانصافی ہو گی۔ ان کا اپنا لب و لہجہ ہے۔ ان کی شاعری کے اپنے زیر و بم ہیں۔ ان کا اپنا آہنگ ہے جس کو داغ سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس رنگ کے خود جگر موجد ہیں۔ ممکن ہے کہ جگر کا تحت الشعور ایک حد تک داغ سے متاثر ہوا ہو۔ مگر پھر بھی دونوں میں نمایاں فرق ہے۔ داغ کی شاعری کے تیور اور بانکپن مسلّم۔ لیکن ان کا عشق پست اور ان کا معشوق بازاری ہے۔ ان کے برخلاف جگر جس وادی ایمن کی برق پاش تجلیوں سے آنکھ لڑاتے اور اپنے ساتھ قاری کو جس بلندی تک لے جاتے ہیں وہاں داغ کی رسائی نہیں۔ وہ جب ماورائی فضا سے نیچے کی جانب نزول کرتے ہیں تو بھی ان کی نظر کی رفعت اور ان کے مذاق کی پاکیزگی علیٰ حالہ قائم رہتی ہے۔ جس کسی نے مجاز کو قنطرۂ حقیقت کہا اس نے مبالغہ سے کام نہیں لیا۔ جگر بھی مجاز میں حسن حقیقت کی جھلک دیکھتے ہیں اور بے خود ہو جاتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ غزل کی آخری روایت جگر سے وابستہ تھی۔ جس کا افسانہ سنہ ۱۹۶۰ء میں آکر ختم ہو جاتا ہے یہ ان لوگوں کا خیال ہے جو اردو شاعری اور اس کے ہمہ گیر مزاج سے ناواقف ہیں۔ غزل کی روایت کبھی ختم نہیں ہوتی وہ اپنا رنگ و روپ بدلتی رہتی ہے مگر اس کی آفاقیت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ خود ہمارے اور آپ کے دور میں فراق موجود ہیں۔ اس روایت کا ایک دور جس کا آغاز حسرت سے ہوتا ہے فراق پر آکر مکمل ہوتا ہوا

فراق کے یہاں اردو غزل کا ایک نیا ذہن۔ ایک نئے فکر کا احساس ملتا ہے۔ اس وقت جبکہ غزل کو نئے تجربوں کا نشانہ بننا پڑ رہا ہے فراق کی ذات بسا غنیمت ہے۔ فراق کی غزلوں میں گہرائی اور گیرائی دونوں ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے یہاں وہ رچاؤ، نکھرا ہوا جذبہ اور ہم آہنگی نہیں ہے جو جگر کے یہاں ہے۔ جگر کے کچھ چونکا دینے والے اشعار سنئے اور بتائیے کہ ان میں جگر کی انفرادیت اور ان کا اپنا لب و لہجہ سنائی دے رہا ہے یا نہیں!

دل گیا رونق حیات گئی　　غم گیا ساری کائنات گئی

ترک الفت بہت بجا ناصح　　لیکن اس تک اگر یہ بات گئی

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی　　وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

ہر اعتبار دوست پہ صدقے ہزار جان　　لیکن وہ کیف وعدۂ نا معتبر کہاں

لالہ و گل سے تجھ کو کیا نسبت　　نامکمل سے استعارے ہیں

کانٹوں کا بھی حق ہے کچھ آخر　　کون چھڑائے اپنا دامن

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں　　فیضان محبت عام سہی۔ عرفان محبت عام نہیں

نہیں معلوم کس عالم میں حسن یار دیکھا تھا　　کوئی عالم ہو لیکن دل کی حیرانی نہیں جاتی

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے　　کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ دور حاضر کے غزل لکھنے والوں میں حسرت۔ فانی اصغر اور جگر شعر کے وہ عناصر اربعہ ہیں جن کے دم سے شاعری کی کائنات قائم و استوار ہے۔ مگر ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ اگر کوئی شخص ایک لفظ میں ہر ایک کے انداز فکر پر روشنی ڈالنا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ حسرت تغزل کے۔ فانی

فلسفے کے۔ اصغر تصوف کے اور جگر سرمستی کے علمبردار ہیں۔ جگر کے یہاں جو سرمستی اور جوش بیان ہمیں نظر آتا ہے وہ حافظ شیراز کا فیضان معلوم ہوتا ہے خود فرماتے ہیں

میں نہیں بسمل خیام جگر　　حافظ خوش کلام نے مارا

موازنہ مقصود نہیں۔ دونوں کے چند شعر پڑھ کر آپ خود فیصلہ کریں گے کہ ہند اور ایران کے ان دو بڑے شاعروں میں کس قدر مماثلت پائی جاتی ہے۔

حافظ:

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم　　فلک را سقف بشکافیم و طرح نو در اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد　　من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم
بہشت عدن اگر خواہی بیا با ما بہ میخانہ　　کہ از پائے خمت یکسر بہ حوض کوثر اندازیم
شراب ارغوانی را گلاب اندر قدح ریزیم　　نسیم عطر گرداں را شکر در مجمر اندازیم
بیا جاناں منور کن ز روئت مجلس ما را　　کہ در پیشت غزل خوانیم و در پایت سر اندازیم

جگر:

ہر قید سے ہر رسم سے بیگانہ بنا دے　　دیوانہ بنا دے مجھے دیوانہ بنا دے
ہر دل ہو تری بزم میں لبریز مئے عشق　　اک اور بھی پیمانے سے پیمانہ بنا دے
تو ساقی میخانہ بھی تو تشنۂ مے بھی　　میں تشنۂ مستی، مجھے میخانہ بنا دے
تو ساقی میخانہ ہو میں رند بلانوش　　میرے لئے میخانہ کو پیمانہ بنا دے

عالم تو ہے دیوانہ جگر حسن کی خاطر
تو اپنے لئے حسن کو دیوانہ بنا دے

قریشہ بانو قمر

جگر کا نظریۂ شاعری

جگر کی شاعری حسن و عشق کا بہترین تصور پیش کرتی ہے وہ شفق کے چشموں اور چاندنی کے آبشاروں میں نہائی۔ اس نے سیب و بادام کے شگوفوں سے اپنے حسن کو سجایا اور برفانی طوفان کی راتوں اور بہار کی حسین صبحوں میں مشق کیا۔ کہیں اس نے آنسو بہائے اور کہیں نظر کے تیز تیر چلائے اور کہیں زمین کے بگولوں اور آسمان کے ستاروں کو جنبش ہوئی گزر گئی۔ اس نے تاریخ کے چہرے سے ماہ و سال کی نقابیں اٹھا دیں، وقت کی زفتا کا مطالعہ کیا اور جمہوریت کے دلچسپ سیلاب میں اپنے نشتر چبھوئے اسی لئے ان کے یہاں جذبات کی آسودگی بھی ہے اور ہجر و جدائی کی کربناک اذیت بھی، زندگی کی دھڑکنیں بھی ہیں اور سسکیاں بھی، آہوں اور قہقہوں کا یہ حسین امتزاج جگر کی مقبولیت کا خاص سبب ہے۔

محبت کی واردات و کیفیات کے وہ نہایت حسین ترجمان ہیں بات پرانی ہی ہوتی ہے لیکن اسلوب بیان اسے نیا کر دیتا ہے۔ اسلوب موزوں نہ ہو تو گفتنی ناگفتنی بن جاتی ہے۔ عشق میں ذہن جن حقیقتوں کا آماجگاہ بنتا ہے جن تصورات کا مسکن ہوتا ہے اور جن لطیف و نازک احساسات کا مترجم

بنتا ہے وہ تمام خیالات جگر کی شاعری میں موجود ہیں۔ انہیں اس بات کا شعور و احساس ہے کہ محبت ایک لازوال و لافانی جذبہ ہے اور زندگی بغیر اس کے نامکمل۔

زندگی اس طرح بھی دلکش ہو انہیں کے دم سے — حسن ایک خواب سہی عشق ایک افسانہ سہی

اس احساس و شعور نے انہیں وہ تازگی و رنگینی بخشی کہ وہ محبت کو بے ثبات زندگی پر ترجیح دینے لگے۔

تو محبت کو لازوال بنا — زندگی کو اگر نہیں ہے ثبات

اگر شامل نہ در پردہ کسی کی آرزو ہوتی — تو پھر اے زندگی ظالم نہ میں ہوتا نہ تو ہوتی

محبت سے قبل زندگی انہیں ویران و اجاڑ نظر آتی تھی۔ جہاں قہقہوں و مسکراہٹوں کا فقدان تھا، خزاں کا تسلط تھا۔ مایوسیوں کی تجلی تھی لیکن یہ عشق ہی کا کرشمہ ہے کہ کسی کے غم معتبر کا سہارا لینے کے بعد زندگی انہیں گلزار نظر آنے لگی۔ شورش، مستی، رنگینیاں، کیف و لذت و لطافت روح اس جذبہ نے عنایت کیا۔ زندگی خوابیدہ تھی لیکن عشق کی لطافتوں نے اسے بیدار کر دیا۔

کہاں تھی یہ روح میں لطافت کہاں تھی کونین میں یہ وسعت
حیات ہی جیسے سو رہی تھی کسی کی پہلی نظر سے پہلے

اس لطیف ترنم میں محو ہو جانے کے بعد وہ وصل کے دلچسپ لمحات کے نغمے بھی گاتے ہیں جب ساری کائنات ان کے لئے ایک دھڑکتا ہوا دل بن کر رہ جاتی ہے کیونکہ ان کی نگاہوں کو بارہا باریابی کا موقع ملا ہے،

وصل کی چھیڑ چھاڑ، رنگینیوں و بے باکیوں سے وہ بہت اچھی طرح محظوظ ہوچکے ہیں ان کی محبت یک طرفہ نہیں۔ تپش عشق نے نہ صرف انھیں خاکستر کیا بلکہ ان کے محبوب کے دل و جگر پر بھی اثر انداز ہوئی۔ ان کے یہاں عاشق کا کردار غزل کے روایتی کردار سے مختلف ہے۔ وہ عجز و سپردگی نہیں جو اردو شاعری کا قدیمی حصّہ ہے۔ اسی لئے عاشقانہ بے تکلفی کی جو کامیابی ہمیں ان کے یہاں ملتی ہے وہ داغ کی آزاد جنسی محبت کی شاعری کی یاد دلاتی ہے۔

شرما گئے لجا گئے دامن چھڑا گئے
اے عشق مرحبا وہ یہاں تک تو آگئے

محبت نے رسے آغوش میں بھی پالیا آخر
تصور ہی میں رہتا تھا جو اک محشر خرام اکثر

چھپ کے بہروپ اسے لے دیکھنے والے بتا
مجھ میں کیا بات نہیں جو مری تصویر میں ہے

یہ جگر کی نمایاں خصوصیت ہے کہ انھوں نے مجبوریوں اور ناکامیوں کو زندگی کا ایک مستقل راگ نہیں بنایا۔ ان کی محبت زندگی کا حوصلہ نہیں کھینچتی وہ موت کے سکون سے مبرا ہے۔ وہ تاریک و سیاہ راتوں میں بھی روشنی کی کرن تلاش کرتے ہیں اور عشق کی لذتوں اور تلخ کامیوں سے مکمل لذت حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں۔ وہ وصل و ہجر دونوں کو اپنے لئے باعث برکت سمجھتے ہیں۔ عشق ان کے لئے شاخ گل اور تلوار دونوں ہی ہے لیکن نشتر کی تیزی برداشت کرتے ہوئے چہرے کو تبسم بنائے رکھنا جگر کا ہی کمال ہے ۔

زندگی ہے نام جہد و جنگ کا
موت کیا ہو؟ بھول جانا چاہیئے

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

تجھے حادثات پیہم سے بھی کیا ملے گا ناداں ترا دل اگر ہو زندہ تو نفس بھی تازیانہ
طول غم حیات سے گھبرا نہ اے جگر ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہیں

لیکن حالات کی کش مکش اور مصائب کی یورش کبھی ان کے پائے استقلال میں جنبش بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ اپنی رنگین مزاج طبیعت کے زیر اثر ان حالات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ کسک اور تڑپ انھیں اس بات پر یقین کرنے کے لئے مجبور کر دیتی ہے کہ ساز ہستی کا وہ تار جس کی ہر جنبش کے ساتھ ان کی سادہ معصوم زندگی کی مسرتیں رقص کرتی تھیں اب ٹوٹ چکا ہے۔ انتہائی کرب کی حالت میں دل کا یہ طوفان ان کے ہونٹوں سے سسکیاں بن کر نکلتا ہے آسمان کی قندیلوں کے سوا جنھوں نے بارہا انھیں انجم افشانی میں مصروف پایا اور خاک کے ان ذروں کے سوا جنہیں بارہا انھوں نے اشکوں کے موتی لٹائے کسی کو کیا معلوم کہ ان کی چھوٹی سی زندگی میں کیا کیا طوفان اٹھتے ہیں یہ اذیت و تکلیف انھیں اس قسم کے اشعار کہلانے پر مجبور کر دیتی ہے جنھیں پڑھ کر انسان تڑپ اٹھے ؎

اس سے بڑھ کر دوست کوئی دوسرا ہوتا نہیں سب جدا ہو جائیں لیکن غم جدا ہوتا نہیں
ختم شور طوفاں تھا دور تھی سیاہی بھی دم کے دم میں افسانہ تھی مری تباہی بھی
خلوص شوق نہ جوش عمل نہ درد وطن یہ زندگی ہے خدایا کہ زندگی کا کفن
محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

یہ ناسازگار حالات کبھی کبھی ان کے خواب و خیال کو جدائی کے افسانہ

انھوں سے ہٹا کر زندگی کے گہرے حقائق کی توسیع و تنظیم کا باعث بھی
بنا دیتے ہیں۔ یہ احساسات انھیں اس بات پر پشیماں بھی کرتے ہیں
کہ وہ عرصہ تک کیف و سرمستی میں محو رہے جو زندگی کی حقیقی دھڑکن
نہیں اس لئے اب وہ شاہد در بغل کے قائل نہیں بلکہ حسن کی فسوں کاریوں
سے الگ ہٹکر خنجر بکف اور ساغر شکن بننے کے آرزومند ہیں۔ یہی وجہ ہے
وہ اس قسم کے باغیانہ اشعار کہنے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ جن میں
انقلاب کی جد و جہد ہے آگے بڑھنے کا حسین جذبہ ہے اور دنیا کے
لئے ایک واضح اور روشن پیغام ہے ؎

کدھر ہے تو اے جرات باغیانہ بدل دے مقدر پلٹ دے زمانہ
کہاں کے مطرب و غزل، کہاں کے شاہد و چمن
کہ زندگی تمام تر بساط کار زار ہے
کبھی میں بھی تھا شاہد در بغل تو بہ شکن مے کش
مگر بنا ہے اب خنجر بکف، ساغر شکن ساقی

اس ناکامی و رنگینی کے امتزاج نے جگر کی شاعری کو قدیم و جدید کا
ایک بے مثل شاہکار بنا دیا ہے۔ زندگی کے جتنے واضح اور روشن ثبوت
ان کے یہاں ملتے ہیں وہ کسی نئی حقیقت کو سامنے نہیں لاتے لیکن اسلوب
کے بانکپن نے اس میں شوخی و ظرافت کی جو چاشنی بھر دی ہے اسے
فراموش کرنا ممکن ہے۔ انھیں اس بات کا شعور ہے کہ زندگی ایک
تلخ حقیقت ہے لیکن مشرب رندانہ کی چاشنی کے ذریعہ وہ اس تلخی میں

بھی شیرینی لانے کے خواہش مند ہیں۔ غموں سے مضمحل ہونا۔ ناکامیوں سے افسردہ ہونا۔ زندگی کو ایک مستقل درد بنانا اور اجل کا آرزومند ہونا زندگی سے فرار ہے۔ زیر خنجر مسکرانا ہجر کی تاریک راتوں میں وصل کی تصویری شمعیں روشن کرنا اور اشک آلود آنکھوں کو متبسم بنانا بڑے حوصلے کا کام ہے۔

جگر نے اردو شاعری میں یہ حوصلہ پیدا کرنے اور تغزل کی محبوبیت رعنائی قائم رکھنے کی کوشش کی یہ انہیں کا کام تھا، جس کو اردو شاعری کا محبوب دلاویز۔ پرکشش و باحوصلہ عکس سمجھنا چاہیئے۔

نسیم علوی کاکوروی

جگر ایک منفرد شاعر

جگر کی موت کے ساتھ اردو شاعری کا وہ دور ختم ہو گیا جس کی بنیاد حالی اور آزاد نے رکھی اور حسرت، اصغر، فانی، شاد اور جگر وغیرہ جیسے ستون بنے۔
شاعری کا یہ وہ دور ہے جبکہ اردو شاعری نے ایک نیا موڑ لیا تھا جو یہ خیالات اور نئے اسلوب سے روشناس ہوئی۔ اردو شاعری کے ساتھ غزل نے بھی اپنی ترنم ریز رعنائی کے لئے چولا بدلا۔ نئی تراش خراش اور جدید نظریات کے امتزاج نے غزل کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا۔ اسی دور میں غزل کو عارض و کاکل کے تصور سے زیادہ روشن اور حسین تصور بخشا گیا اور غزل صرف ضیائے رخ محبوب ہی سے نہیں بلکہ گرد و پیش و ماحول کے رنگین تصورات سے بھی جگمگا اٹھی
ایک عرصہ دراز تک یہ سوال زیر بحث رہ چکا ہے کہ غزل گوئی زمانہ جدید کے اہم تقاضوں کو کہاں تک پورا کرتی ہے یا وہ موجودہ زمانے سے کس قدر ہم آہنگ ہے۔ اکثر دلدادگان جدید شاعری غزل کے نہ صرف مخالف بلکہ منکر ہیں۔ مگر غزل گوئی اس مخالفت کے باوجود دنیائے شاعری میں اپنا ایک علاوہ و اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ غزل حسن تخیل اور شوخئ بیان کا ہے جس میں فطرت انسانی کی اصلی صفات منعکس ہوتی ہیں۔ اور فطرت انسانی گرد و پیش

سے ایک خاص ربط رکھتی ہے گویا غزل فطرت انسانی ہی کی نہیں بلکہ ایک پورے ماحول کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس معیار غزل گوئی پر گو حسرت اور جگر دونوں پورے اترے ہیں۔ مگر ان دونوں کے تصورات میں ایک بین فرق نظر آتا ہے۔ آل احمد سرور کے الفاظ میں وہ فرق یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ "حسرت کی شاعری میں زندگی ہے اور جگر کی زندگی میں شاعری" کتنی سچی اور سیدھی سی بات ہے حسرت کی شاعری میں زندگی کوٹ کوٹ کر بھری ہے ان کے یہاں زندگی اپنے اصلی روپ میں ہنستی بولتی نظر آتی ہے اس کے برعکس جگر کی کل زندگی شاعری میں رچی ہوئی ہے۔ ان کی شخصیت شاعری سے عبارت ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کے حسین تصورات اپنی پوری خوبیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ گو تصورات زندگی اور شاعری کو ہم آہنگ کرنے والے حسرت ہیں اور اول اول وہی اسے دنیا سے روشناس کراتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری کا مطالعہ زندگی کے نقشے کو گہرا کر دیتا ہے اور کائنات کچھ پہلے سے زیادہ حسین ہو جاتی ہے۔

جگر نے اردو غزل کی صالح روایات کو جدید نظریات سے مزین کر کے شاعری کو تمام تر ایک لطیف و دلکش حقیقت کا روپ دے دیا۔ انھوں نے میر، مومن، داغ، حسرت اور اصغر کی قائم کی ہوئی روایات کو زندہ ہی نہیں کیا بلکہ شاعری کے جسم مردہ میں ایک نئی روح پھونکی اور اسے ایک نئی طاقت، توانائی، شگفتہ اور پر معنی زندگی بخشی ۔۔۔ وہ سرمستی، نفاست اور شیرینی جو غزل کی روح ہے زندگی کے مختلف مسائل کے ساتھ مل کر جگر کی

غزلوں میں نمایاں ہو گئی اور غزل پہلے سے نفیس، لطیف اور رفیع تر ہو گئی
جگر کی غزلیں زندگی کی، ماحول کی، فطرت کی حقیقی ترجمان اور آئینہ دار
ہیں۔ جگر کے دل پر جو بھی کیفیات گذرتی ہیں وہ غزل کی شکل
اختیار کر لیتی ہیں چاہے وہ مسجد کانپور کا ہنگامہ ہو یا قحط بنگال، تقسیم
ہند ہو یا گاندھی جی کی موت .. غرض وہ کسی بھی جذبے سے متاثر ہوں
وہ جذبہ خود ہی غزل کا روپ دھارے گا۔ اور یہی جگر کی انفرادیت ہے
داغ کے بعد بہت سے لوگوں نے ان کے رنگ میں کہنے کی کوشش کی
مگر کامیاب نہ ہو سکے لیکن جگر اسی فرسودہ راہ پر گامزن ہو کر ایک ایسی
منزل تک جا پہونچے جو خیالات و صناعی کے لحاظ سے بالکل نئی اور دلکش
چیز ہے۔ جگر کی شاعری گو عاشقانہ ہے مگر روحانیت لئے ہوئے ــــ داغ
کی بوالہوسی اور مادی تلذذ سے پاک یہ چیز اردو شاعری میں بہت کم
لوگوں کو نصیب ہوئی ہے۔ گویا اس لحاظ سے بھی جگر اپنا ایک علٰحدہ مقام
رکھتے ہیں۔

دور اول میں جبکہ امنگیں جوان تھیں۔ جگر پیتے تھے اور خوب پیتے تھے
مگر اس لئے نہیں کہ نفس کی تشنہ لبی بجھانا چاہتے تھے۔ بلکہ اس لئے کہ ان کا دل
چوٹ کھایا ہوا تھا اور اسی بے چینی و عشق کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی غرض
سے انھوں نے اس بت کافر کو منہ لگایا تھا جو بڑی جد و جہد و کوشش کے بعد
منہ سے چھٹی ان کی اس بلا نوشی نے بعض لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا
کہ وہ بغیر پئے شعر نہیں کہہ سکتے۔ خوب ہی اچھا ہوا جو جگر خود ہی فرما گئے کہ

"میں شراب پی کر شعر نہیں کہتا تھا یہ خیال کہ جب میں شراب پیتا تھا تو بہت اچھے شعر کہتا تھا غلط ہے بہ یک وقت دو محبوب نہیں ہو سکتے۔ جو شخص شراب میں کبھی پانی ملانے کا روادار نہ ہو وہ بھلا اپنے اوپر شعر مسلط کر سکتا ایک بات یہ بھی کہ میں شعر اسی وقت کہتا تھا جب شراب چھوڑ دیتا تھا۔ دو دو تین تین مہینے سے ایک بوند نہیں پیتا تھا اور اسی زمانہ میں غزلیں کہتا تھا۔ شراب پی کر صرف دو تین غزلیں کہی ہیں" ـــــ شراب پینے کے باوجود جگر کا دل مومن تھا۔ ان کے یہاں ایک عرصہ دراز کے طوفانی و جذباتی زندگی کے بعد ٹھہراؤ آیا۔ جیسے جیسے عمر کا آفتاب بلند ہوتا گیا خمار اُترتا گیا۔ اور رنگینئ بیان اور حسن خیال کے ساتھ ساتھ بادہ عرفان ہلکورے لینے لگا راگ ورنگ گل وبلبل کے ساتھ ساتھ آفتاب معرفت طلوع ہونے لگا صبح پیری نے انگڑائی لی۔ جام ہاتھ سے چھوٹ گیا اور جگر تائب ہو گئے۔ جوانی میں رند تھے تو بڑھاپے میں صوفی ہو گئے یہ بات کہی گرچہ اکبر کے لئے تھی مگر پوری جگر پر اترتی ہے۔

اور اسی دور میں جبکہ جگر رند مشرب تھے کوشش یہ کی جاتی تھی کہ حسن کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہے جسے وہ (شاعر) اپنی غزل کا موضوع نہ بنا سکیں لیکن جگر جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں "عورت کے شعر کہنے کا میں قائل نہیں ہوں وہ تو خود فنون لطیفہ کی جان ہے۔ شعر کہنے سے اس کی شان محبوبیت پر حرف آتا ہے" گویا جگر اس طور سے بھی اپنا ایک علحدہ مقام رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے غزل کی زندگی عورت سے وابستہ تھی مگر جگر نے اردو شاعری کو ایک

حقیقت سے روشناس کرایا کہ غزل عورت کے بغیر بھی ایک مکمل مجسم اور دلکش رمز ہے۔ عورت غزل کے ترنم کا باعث تو ہوتی ہے لیکن وہ بھی غزل کی افادیت میں اضافہ سے قاصر ہے۔ جگر کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کے یہاں حسن و عشق کی دھیمی دھیمی آنچ پر انقلاب اور نئے نظریات کی بازگشت سنائی دیتی ہے جو اپنے عروج پر پہونچ کر ایک بالکل نئے نغمے میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

وہ اور شعرا کے خلاف حسن کے پہلو بہ پہلو عشق کو بھی مؤثر اور لطیف جذبہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک حسن و عشق دنیائے محبت کے لئے لازم و ملزوم ہیں ؎

تو حسن ہو میں عشق ہوں تو جاں میں جسم — کس کی یہ طاقت ہو کہ مجھے تجھ سے چھڑادے

وہ گرمی عشق سے واقف تھے۔ وہ عشق کی انانیت اور خودداری پر بار بار زور دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود حسن کا درجہ کم کرنے کو تیار نہیں چنانچہ ان کی غزلوں میں حسن کا احترام نظر آئے گا اپنے کہنے کے مطابق انھوں نے حسن و عشق کے مقام مقرر کر دیئے ہیں یعنی حسن و عشق لازم و ملزوم ہونے کے باوجود اپنے علحدہ مقام رکھتے ہیں۔

حسن و عشق فن کے دو محرکات ہیں اور پھر اس نشے کی بنیادی قدریں جو حسین نظر آتی ہیں تصور حسن اور سوز عشق ہی سے وابستہ ہیں وہ لطف و نشاط جو احساس حسن سے حاصل ہوتا ہے عشق ہی کی وجہ سے ہے۔ حسن کی ادائیں ہم کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہیں۔ ان میں کچھ بے اختیارانہ کشش

ہوتی ہے اور ہم اپنے مزاج عاشقانہ کی سبب سے اس کی طرف کھنچتے ہیں اور یہ جذب و کشش اسی محبت اور عشق کی وجہ سے ہے جو ہم کو تجلی حسن کی طرف والہانہ نظر ڈالنے پر مجبور کرتی ہے۔ بغیر عشق و محبت کے حسن کی تصویر میں رنگ نہیں بھر سکتا اور بغیر حسن کے عشق کی جلوہ گری کمال کو نہیں پہونچ سکتی۔ کچھ شعر ملاحظہ ہوں ؎

عشق ادا شناس حسن حسن ادا شناس عشق
کام ہے اپنے کام رکھ بیخودی و خودی نہ دیکھ

زندگی کیا ہے نمود عاشقی
عشق کیا ہے حسن کا آغاز ہے

عشق کیا چیز ہے؟ اک حشر در آغوش خیال
حسن کیا ہے خواب چشم تماشائی کا

عشق و حسن کے متعلق بھی جگر کے نظریات ملاحظہ ہوں۔

عشق رنگ حسن سے ہو بے نیاز
حسن کیف عشق سے خالی نہیں

عشق ہے اعتماد کے قابل
حسن کا اعتبار کوئی کرے

بندگی جنون ادا بیخودی ادب سرشت
حسن کی اصطلاح میں عشق اسی کا نام ہے

تاثیر سوز محبت سے بچنا محال ہے
ایسی لگے یہ آگ کہ دیکھا کرے کوئی

محبت کیا ہے تاثیر محبت کس کو کہتے ہیں
ترا مجبور کر دینا مرا مجبور ہو جانا

نمائے عشق کیا ہو گا، دل در کار داں ہونا
یہاں تک منتشر ہونا کہ بے نام و نشاں ہونا

ایک لفظ محبت کا ادنی یہ فسانہ ہے
سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

محبت اثر کرتی ہے چپکے چپکے
محبت کی خاموش چنگاریاں ہیں

محبت ہی اپنا مذہب ہو لیکن
طریق محبت جدا چاہتا ہوں

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی
سناتا جا رہا ہے جس کو جتنا یاد ہوتا ہے

شوقِ بے پایاں و جوشِ بے حساب　　عشق کیا ہے؟ اک مسلسل اضطراب

جگر بھی حسرت کی طرح خیالی حسن کے پجاری نہیں ان کے یہاں بدا اتی یا افسانوی محبوب کے بجائے ایک چلتے پھرتے محبوب کی حقیقی تصویر نظر آتی ہے انکا محبوب انسانیت و ہمدردی کا پیکر محبت و خلوص کا مجسمہ اور رحم و کرم کا دیوتا ہے جو دوسروں کے لئے بیتاب و بے چین رہتا ہے ـــــ عشق کی آنچ نے جگر کو بھی حسرت کی سی تڑپ بخشی تھی چنانچہ ان کے یہاں بھی ایک خاص تڑپ اور کھٹک کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کا بولتا ہوا رنگ و روپ ان کا لب و لہجہ اس تڑپ اور جلن کی غمازی کرتا ہے۔ اس پوری غزل میں شانِ محبوبیت جلوہ گر ہے ہر شعر طالبِ داد ہے اور رنگِ جگر کا مظہر۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا　　دل کچھ اس صورت سے تڑپا انکو پیار آ ہی گیا

ہائے یہ حسنِ تصور کا فریبِ رنگ و بو　　میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا

اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں　　درحقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آ ہی گیا

ہائے کافر دل کی یہ کافر جنوں انگیزیاں　　تم کو پیار آئے نہ آئے مجھ کو پیار آ ہی گیا

دل نے اک نالہ کیا آج اس طرح دیوانہ وار　　بال بکھرائے کوئی مستانہ وار آ ہی گیا

جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

حسن و عشق کا شاعر ہونے کے باوجود جگر کے یہاں خودی کی آواز کافی بلند ہے یہ خودی گو اقبال کی خودی سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی لیکن اپنی جگہ پر خوب ہے غزل گو شعرا میں صرف جگر ہی خودی کی صدا بلند کرتے ہیں۔

اللہ اللہ یہ وارفتگیٔ عشق مری | اس جگہ ہوں کہ جہاں حسن بھی دیوانہ ہو
مجھی میں حسن کا عالم مجھی میں عشق کی دنیا | نثار اپنے پہ ہو جاؤں اگر سو بار پیدا ہوں
جب نظر اپنی حقیقت آئی | مجھ پہ خود میری طبیعت آئی
میں چلوں عشق میں وہ راہ جو سب سے الگ | کچھ سجھائی نہ دے اور سطح بھی ہموار نہ ہو
کونین کی ان بھول بھلیوں سے گزر جا | اپنی ہی طرف دیکھ اُدھر جا نہ اِدھر جا

جگر نہایت ہی درد مند دل اور گداز طبیعت لے کر آئے تھے چنانچہ اُن کی غزلوں میں سادگی اور بے پایاں خلوص ہے۔ اثر پذیری بھی ہے اور تیر کی بھی چبھن بھی ہے اور سوز و گداز بھی۔ انھوں نے اردو غزل کو ترنم و موسیقیت عطا کی۔ شاعری کو روانی اور جذبات کی وہ حسین کیفیات بخشیں جو جانِ تغزل ہیں۔ جگر کی شاعری میں غم حیات اور حکایت ہستی کی داستانیں سنائی دیتی ہیں وہ صرف عارض و کاکل کا تصور ہی نہیں پیش کرتے حق آزادی کی صدا بھی بلند کرتے ہیں، ساغر و مینا ہی کو سب کچھ نہیں سمجھتے بلکہ وہ اجتماعی زندگی کے مطالبات سے بھی واقف ہیں وہ گل و بلبل ہی کی باتیں نہیں کرتے انقلاب کا نعرہ بھی لگاتے ہیں ان کے یہاں سوز بھی ہے اور ساز بھی تڑپ بھی ہے۔ اور چبھن بھی۔ ان کے شعر صرف خیال آرائیوں کے ہی نمونے نہیں بلکہ پُرتاثیر بھی ہیں۔ ان کی غزلوں میں بڑی سنجیدہ سرمستی والہانہ مسرت اور گہری محبت پائی جاتی ہے۔ ان کی مصوری سرمایۂ کائنات اور مرقع نگاری دلربائی و دل آویزی کا منقش آئینہ۔ انھوں نے غزل کے معنوی حسن میں ہی اضافہ نہیں کیا بلکہ زبان کو بھی تازگی و لطافت بخشی۔ جگر کی بعض غزلوں کی زبان

بڑی ہی شیریں اور پرکیف ہے۔ ان کے یہاں بڑے لطیف اور ترنم ریز جذبات
بھی ملتے ہیں جو دلربائی و دلاویزی کے مرقع ہیں۔ جگر کا اسلوب تغزل آہستہ
آہستہ جذبات انسانی کے مرقعات صفحۂ قرطاس پر بکھیرتا ہوا دل کے تاروں
سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔

ہائے وہ ضبط محبت کی جفائیں سر بزم — دل میں گھٹ گھٹ کے وہ آہوں کا فنا ہو جانا
یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر — جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں
بے کیف دل ہے اور جیے جا رہا ہوں میں — خالی ہے شیشہ اور پیے جا رہا ہوں میں
وہ دل کہاں ہے اب کہ جسے پیار کیجیے — مجبوریاں ہیں ساتھ دیے جا رہا ہوں میں
تاثیر محبت کی اثر رس ہے جو ہو گئی — ہر دوری میں اک قرب، ہر قرب میں اک دوری
وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی — وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی
کیا کہہ دیا کسی نے کہ سنتے ہی چشم شوق — دو دو قدم ترے دست محبت دراز تھا
سب ہو گئے، اٹھ اٹھ کے ایک بار نثار شمع — یہ دور نے کیا جانے کیا وقت سحر دیکھا
آئینہ جو ہم سے رہتے تھے وہ بار بار — دیکھا تو یک بیک مجھے شرما کے رہ گئے
الٰہی ترک الفت بھی کیا ترک محبت ہے — بھلاتے ہیں انہیں جتنا وہ یاد آتے ہی جاتے ہیں
زندگی آج بھی دلکش ہے انہیں کے دم سے — حسن اک خواب سہی عشق اک افسانہ سہی
آج کل میخانہ میں تقسیم ہوتے ہیں جگر — زہر کے ساغر شراب زندگی کے نام سے

ان اشعار میں جگر کی شاعری کا ایک دھندلا سا عکس نظر آتا ہے جسے دیکھتے
ہوئے ہم بخوبی کہہ سکتے ہیں کہ جگر حسن کے شاعر تو ضرور ہیں مگر وہ گلستان شاعری
میں بوئے الفت کی مہک سے سرشار ہو کر بیٹھ نہیں رہتے بلکہ کچھ نئے نظارات، کچھ

اچھوتی اور ایسی چیزیں پیش کرتے ہیں جو جذبات انسانی کو متاثر کر کے ان کے
دلوں پر اپنا سکہ بٹھا دیتی ہیں۔ وہ شاعری اور آرٹ کا بہترین نمونہ پیش کرتے
ہوئے اپنا ایک علحدہ و اعلیٰ ترین مقام رکھتے ہیں۔ حسن و عشق کا شاعر ہونے کے
باوجود وہ انسان کو انسانیت کی قدروں سے روشناس کراتے ہیں ؎

جہل خرد نے دن یہ دکھائے — گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے

وہ قرادیت کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ وہ بلند ہمتی، اولوالعزمی، محبت،
اخوت اور مساوات کے مبلغ ہیں۔ بے حسی، بیکاری اور کم ہمتی کے بجائے وہ
استقلال، عزم بالجزم اور محرکات حیات کو عزیز رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک
"زندگی ناکامیوں کا نام ہے" لیکن پھر بھی وہ طوفان کا منہ موڑنے اور زندگی
کی پُرپیچ راہوں کو فتح کرنے کا ایک عزم آہنی رکھتے ہیں جو اس دور تغزل
میں صرف جگر تک محدود ہے ؎

پھر دیکھنا بہار بیابان عشق کی — گلشن بنا چکوں جب اس خارزار کو
تشنہ لب کیوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں — کچھ نہیں تو شکست خم و خمخانہ سہی
ادھر آ ہر قدم پر حسن منزل تجھکو دکھلادوں — فلک کو پاس سے منزل بہ منزل دیکھنے والے

جگر کی انفرادیت دنیائے شاعری میں ایک اور حیثیت سے بھی مسلم ہے اس
سے پہلے عموماً عورت اور اس کے وصل یا قرب کو شاعری کا سب سے بڑا اور وسیع
موضوع سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جگر دنیائے شاعری میں گریز محبوب یا فراق کا نیا اور
اچھوتا نظریہ لئے داخل ہوتے ہیں۔ محبوب سے گریز کا نظریہ بُرا ہی پرتمو [illegible] ہے مگر
اور جگر وہ واحد شخص ہیں جو اس نظریہ کو پیش کرتے اور اپناتے ہیں۔ جگر بھ

نہ آپس میں ملت زیادہ ہ! کے بھی قائل ہیں چونکہ زیادہ راہ و رسم سے محبت
میں کمی آجاتی ہے محبت و حسن کے درمیان وصل کا ہونا انسانہ محبت کے
تسلسل کو الگ کر دیتا ہے یعنی تسلسل محبت کے لئے گریز وصل ضروری ہی نہیں
بلکہ لازمی ہے۔ اور میرے خیال میں وہی شاعر ایک کامیاب شاعر ہے جو نکہ
و نظریاتی و مانی طور پر محبوب سے قریب ہی نہیں بلکہ اس کے دل کی دھڑکن
ہو لیکن جسمانی و مادی اعتبار سے نہ صرف دور بلکہ اس قسم کی بے راہ روی
سے بالکل پاک اور مبرا ہو۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ جگر کی شاعری
روحانیت لئے ہوئے ہے۔ یعنی مادی تلذذ سے یکسر پاک ہے۔

جگر، چونکہ ہجر میں رہتے ہوئے بھی یادِ محبوب سے سرشار رہتے ہیں۔
اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنے محبوب سے حقیقی محبت ہے۔ وہ اس کی
روح ــــ اس کی جان سے محبت کرتے ہیں وہ اس کے جسم کے طلب گار
نہیں وہ جسمانی محبت کے خواہشمند نہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے عشق
حقیقی اور روحانیت کی منزلیں ایک ہو جاتی ہیں۔

جگر چونکہ ہجر و فراق، دوری اور مہجوری کے شاعر ہیں اسی لئے وہ محبت
کے شاعر ہیں اور محبت رنگ و آہنگ نکہت و نزہت اور سوز و ساز
مجموعہ کا نام ہے۔ اس لئے جگر ترنم و تناسب ندرت و نفاست، لطافت
و نزاکت برجستگی و بے ساختگی، رازداری۔ رمزیت۔ دلکشی و دل آویزی
گہرائی و گیرائی، سوز و گداز، بے نیازی و خودسری، اخلاص و صداقت، ہمدردی
و غم گساری۔ ایثار و قربانی اور لطیف احساسات کے شاعر ہیں ؎

یہ حسن ہے کیا؟ یہ عشق ہے کیا؟ کس کو ہے خبر اس کی لیکن
بے جام ظہورِ بادہ نہیں، بے بادہ فروغِ جام نہیں

زندگی تلخ حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں   اس میں کچھ چاشنیٔ مشربِ رندانہ بھی

شعر و الہام تو کیا عرش بھی نازل ہو جائے   دل جو اک شے ہے حقیقت میں اگر دل ہو جائے

شباب بے کشش، جمال بے کشش خیال بے کشش، نگاہ بے کشش

خبر وہ رکھیں گے کیا کسی کی، جنھیں خود اپنی خبر نہیں ہے

خود وہ بہارِ تازہ دنیا کے رنگ و بو   ایک بار جس نے دیکھا تماشا آرزو کی

یہ کمالِ شوق کی ساز نہیں، یہ جمالِ یار کی ناز نہیں
یہ عنایتیں یہ نوازشیں مری اک مشتِ غبار پر

مختصر ہے شرحِ ہستی اے جگر   زندگی ہے خوابِ اجل تعبیرِ خواب

وہاں تک ہو نہیں سکتی جو رسائی نہ سہی   یہی انسان کی معراج ہے کہ انسان ہو جائے

معنیٔ صورت، صورتِ معنی فکر و نظر کے دھوکے ہیں
فکر و نظر تک رہ جانا فکر و نظر کی پستی ہے

کیا حسن کا افسانہ محدود ہو لفظوں میں   آنکھیں ہی کہیں اس کو آنکھوں نے جو دیکھا ہے

بندگی جنونِ ادا تجھ دی ادب سرشت   حسن کی اصطلاح میں عشق اسی کا نام ہے

نہ کیا تھا صرف ترتیبِ عناصر کے سوا   خاص کچھ بے تابیوں کا نام انساں ہو گیا

غضب تھا آج گلشن میں یہ حیرت خیز نظارہ   ادھر بلبل کا دم ٹوٹا ادھر فصلِ بہار آئی

ابتدا عشق کی ہے فطرتِ انسانی کی نمود   انتہا عشق کی تکمیل ہے انسانوں کی

اثرِ جذبِ عشق کا اللہ رے کمال   آئینہ بن گئے تری اک اک ادا کے ہم

دل تھا ترے خیال میں پہلے چمن چمن
اب بھی ہے وہ روش روش مگر پائمال ہے

یہی تو فرق ہے بس کافر و مومن میں اے غافل
کہ اس کے لاکھ کعبے ہیں اور اس کا ایک کعبہ ہے

اک اک سانس ہے اس کے لئے پیغام حیات
آدمی اپنی حقیقت سے اگر دور نہ ہو

روح بن جاتی ہے خود نغمۂ بے ساز و صدا
ختم جب معرکۂ لفظ و بیاں ہوتا ہے

جگر نے غزل کو ایک نئی زندگی بخشی۔ ان کی غزلیں مدہوشی و رنگینی کے چھلکتے ہوئے ساغر ہیں جس میں طرح طرح کے رنگ موجود ہیں اور قسم قسم کے جذبات جلوہ گر ہوتے ہیں۔ جن کا مطالعہ زندگی کے رشتہ کو گہرا کر دیتا ہے کائنات کے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے اور حیات ایک نئے روپ میں جلوہ گر ہو کر دل کی دھڑکن میں جذب ہو جاتی ہے۔ خون کی روانی تیز ہو جاتی ہے اور خاوری دل کے تاروں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

سحر مرادآبادی

جگر اور ”حسن و عشق“

جب حسن و عشق دونوں رویا کریں گے مجھ کو
وہ بھی جگر زمانہ نزدیک آرہا ہے

دورِ حاضر کا عظیم المرتبت اور ہر دل عزیز شاعر جس کو دنیا رئیس المتغزلین و شاعرِ فطرت حضرت جگر مرادآبادی کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اگرچہ وہ سحر البیان جس کی درد بھری آواز برصغیر ہند و پاک میں اب تک گونج رہی ہے۔ ہم میں موجود نہیں لیکن ہمارے دیدہ و دل اس کی حسرتِ دید میں تڑپ رہے ہیں اور اربابِ ذوق اس کی دلکش پیاری آواز سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہیں افسوس! کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے اسے ہم سے چھین لیا ہے لیکن شاعر کی عظمت کا آفتاب اسی آب تاب کے ساتھ آج بھی روشن ہے اور ہمیشہ رہے گا اس کے جذبات و احساسات کی روح اس کے کلام میں نمایاں ہے اور یہ جذبات و احساسات کی جیتی جاگتی تصویریں اس کو کبھی نہ مرنے دیں گی ؎

موت کیا آئے گی ہم عشق کے دیوانوں کو
موت خود کانپتی ہے نام سے دیوانوں کے

اردو ادب جب تک زندہ ہے جگر بھی زندہ رہیں گے۔ جگر کے گلشنِ حیات

ہیں تین پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں: "داغ جگر" "شعلۂ طور" اور "آتش گل" افق ادب پر یہ جگمگاتے ہوئے ستارے رموز حسن و عشق وجدان حیات، انسانیت اور محبت کے پیامی ہیں اور آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت جگر کے کلام پر کسی قسم کا تبصرہ تو صرف اہل فن اور ناقدان ادب کا کام ہے میں اس ضمن میں کچھ کہنا بھی سوئے ادب تصور کرتا ہوں میرا مقصود تو صرف جگر کے کلام میں حسن و عشق کے ایک بلند و برتر تصور اور ان کی انفرادیت کی طرف اشارہ کرنا ہی اور بس ——— "حسن و عشق" جگر کی شاعری کے دو بنیادی پہلو اور اہم جزو ہیں گو دو شاعری خصوصاً اردو غزل کے لئے یہ موضوعات نئے تو ہرگز نہیں کہے جا سکتے لیکن جگر کی معجز بیانی نے ان موضوعات کو ایک خاص قسم کا "نیا پن" عطا کیا ہے اس "نئے پن" کا تعلق ان کی اپنی شخصیت اور ان کے اپنے انداز فکر اور افتاد طبع سے ہے۔ حسن و عشق کی دنیا کے لطیف واقعات ہوں یا سنگین حادثات ان کی طبیعت نے ان حقائق کو جس طرح قبول کیا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا حسن و عشق کا تصور لطیف و پاکیزہ ہی نہیں صحت مند و بلند بھی ہے ؎

جس سے کہ مطمئن ہو مری فطرت بلند
شاید وہ حسن و عشق کی دنیا ہی اور ہے

ان کا بیشتر کلام اسی حسن و عشق کی دنیا کا آئینہ دار ہے ؎

تیرے عشق کی کرامت یہ اگر نہیں تو کیا ہے
کبھی بے ادب نہ گذرا مرے پاس سے زمانہ

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجے اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

بے خودی کا نہ ہوا شک کسی بیگانے کو فطرتِ عشق سنبھالے رہی دیوانے کو

تیری ہر ایک شان کے نمایاں بنا دیا انساں کو وہ عشق نے انساں بنا دیا

عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے عشق ہے کار شیشہ و آہن

ذرہ ذرہ دیدۂ دل ہے گوشہ گوشہ بستی ہے

عشق ہے جبتک سلسلہ جنباں دل کی ہستی ہستی ہے

عشق ہر رنگ میں ہے اپنی حقیقت کی دلیل یہ وہ دعویٰ ہی نہیں ہے کہ جو باطل ہو جائے

یہ عشق وہ بلا ہے کہ حسن ازل کو بھی تخلیق کائنات پہ مجبور کر دیا

ہم پہ نازل ہوا صحیفۂ عشق صاحبانِ کتاب ہیں ہم لوگ

مجھ سے لگے ہیں عشق کی عظمت کو چار چاند

خود حسن کو گواہ کئے جا رہا ہوں میں

انھوں نے اردو غزل کو مخصوص اور منفرد "فلسفۂ حسن و عشق" سے روشناس کیا ہے۔ وہ خودداریٔ عشق کے ساتھ حسن کی عظمت اور احترام کے بھی قائل ہیں اور اس سلسلے میں حسن و عشق کو برابر کا درجہ دیتے ہیں۔ جس کا اظہار انھوں نے اکثر اشعار میں کیا ہے ؎

عشق سے حسن جدا ہے نہ جدا حسن سے عشق

کونسی شے ہے جو آغوش در آغوش نہیں

عالم تو ہے دیوانہ جگر حسن کی خاطر تو اپنے لئے حسن کو دیوانہ بنا دے

نہیں ہے عشق سے جبتک مگر یہ کون کہے وہ خود حسین ہے اس کو نہ کیوں غرور آئے

عشق بے جذب ہوئے رہ نہیں سکتا ہرگز   تری ہر شان میں اک شان جگر ہو کہ نہیں
میں اپنی آہ کے صدقے کہ مری آہ میں بھی   تری نگاہ کے انداز پائے جاتے ہیں

کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

ہر لحظہ نیا جلوہ نئی آن نئی شان   میری نگہ شوق بھی کیا شوخ حسیں ہے

دیکھئے کیا شور اٹھتا ہے حریم ناز سے
سامنے آئینہ رکھ کر خود کو اک سجدہ کریں

حسن وہی ہے حسن جو ظالم   ہاتھ لگائے ہاتھ نہ آئے
ہر جلوہ ہے بجائے خود اک دعوت نگاہ   کیا کیجئے جو تیری تمنا نہ کیجئے

کونین ہے عبارت اک عشق بے اماں سے
نکلا یہی فسانہ الٹا ورق جہاں سے

یہ حسن ہے کیا یہ عشق ہے کیا، کس کو ہے خبر اس کی لیکن
بے جام ظہور بادہ نہیں بے بادہ ظہور جام نہیں

وہ حسن و عشق کی نفسیات اور اس کے تمام تر اسرار و رموز پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اردو شاعری میں اس قسم کی مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب یقیناً ہیں ؂

ترے حسن مغرور سے نسبتیں ہیں   کہیں ہم نہ رہ جائیں مغرور ہو کر
عشق نظر آفریں اور نظر معصیت   عشق تمنا نواز اور تمنا گناہ
عاشق کی بے دلی کا تغافل نہیں جواب   اس کا بس ایک جوش محبت جواب ہے
ستانے نہیں وہ تو ان کی طرف سے   خود اپنے ستانے کو جی چاہتا ہے

تم اس دل وحشی کی وفاؤں پہ نہ جانا اپنا نہ رہا جو وہ کسی کا نہ رہے گا

تجھ سے اے دوست کوئی شکوۂ بیداد نہیں دل ستم ساز ہے خود تو ستم ایجاد نہیں

شوق بے پایاں و جوش بے حساب عشق کیا ہے اک مسلسل اضطراب

ان کے بہلائے بھی نہ بہلا دل رائیگاں سعی التفات گئی

میرے ہجوم شوق پہ منہ سے تو کچھ نہ کہہ سکے
چہرے پہ رنگ آ گیا ہاتھ میرا دبا دیا

وہ اپنے پیش رو اساتذہ کے برعکس "معاملات حسن وعشق" کو شعری جامہ پہنانے میں حد درجہ محتاط واقع ہوئے ہیں۔ ان کے کلام میں معاملات حسن وعشق کا اظہار حد درجہ فطری اور شائستہ ملتا ہے وہ عشق کی بیتابیوں کے ساتھ حسن کی مجبوریوں کا بھی شدید احساس رکھتے ہیں ؎

ادھر سے بھی ہے سوا کچھ ادھر کی مجبوری کہ ہم نے آہ تو کی ان سے آہ بھی نہ ہوئی

جو ان پہ گذرتی ہو کس نے اسے دیکھا ہے اپنی ہی مصیبت ہے اپنا ہی فسانہ ہے

ہائے یہ مجبوریاں محرومیاں ناکامیاں
عشق آخر عشق ہے تم کیا کرو ہم کیا کریں

وہ ان تمام مجبوریوں محرومیوں اور ناکامیوں کے باوجود محبت کی پرپیچ راہوں سے والہانہ انداز میں مسکراتے ہوئے گذرتے ہیں اور محرومیوں میں بھی ایک کیفیت اور دلکشی محسوس کرتے ہیں ؎

آج نہ جانے راز یہ کیا ہے
ہجر کی رات اور اتنی روشن

ان کا ذوق و شوق سطح عوام سے بلند تر ہے۔

میرا ذوق بھی جمیرا شوق بھی ہے بلند سطح عوام سے
تیرا وصل بھی تیرا ہجر بھی۔ میرے درد دل کی دوا نہیں

ایک جگہ کیا خوب کہا ہے ؎

مجھ کو وصال، ہجر سے کیا واسطہ جگر
عاشق ہوں اک تبسم دیوانہ ساز کا

اور یہی ان کا پیغام ہے ؎

نالہ یوں کیجئے بہ اعجاز شکیبائی ہو
جیسے بے ساختہ ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہو

اردو کی عشقیہ شاعری کو یہ مزاج جگر نے دیا — جگر جو ہر ایک دل پہ مہر ثبت کر گئے ہیں ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما (حافظ)

از حکیم عبدالقوی دریابادی بی اے

مجاز کی راہ سے حقیقت تک پہونچنے والا شاعر

حضرت جگر مرادآبادی ان خوش قسمت شعرا میں تھے جو مست و سرشار
رہنے کے باوجود بھی خاصانِ خدا کے حلقہ میں نیک نام رہے۔ اور کبھی بھی
نشہ کی ترنگ میں بھی مذہب سے بغاوت اور بزرگانِ دین کے ساتھ گستاخی
کے مرتکب نہیں ہوئے۔ گناہ کو گناہ سمجھتے رہے۔ اس کو حق بجانب ثابت
کرنے اور دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کبھی ادنیٰ کوشش نہیں کی
اس دور میں جبکہ ان کا شمار رندِ مشربوں میں ہوتا تھا، سلوک و معرفت کی باتیں
ان کے کلام میں پائی جاتی تھیں وہ اکثر شعر کہتے کہتے ان کا رخ مجاز سے
حقیقت کی جانب ہو جاتا تھا۔ حضرت اصغر گونڈوی، شاعر سے کہیں زیادہ
عارف باللہ تھے ان کی صحبت و رفاقت کے شرف نے جگر میں جس انقلاب
کا آغاز کیا تھا۔ اس کی تکمیل حضرت اصغر کی وفات کے کئی سال بعد ہوئی
اور بالآخر انھوں نے بادہ نوشی سے بالکل توبہ کر لی۔ حج بیت اللہ سے
مشرف ہو آئے اور ذکر و شغل میں دن گزارنے لگے۔ اس قلب ماہیت
اور توبۂ نصوح کے باوجود ان کے کلام میں کیف و اثر پہلے ہی کی طرح باقی
رہا بلکہ ان کی مقبولیت میں اور اضافہ ہی ہوتا گیا۔ وہ [illegible] کے صدر حلقوں میں

اور اپنے کو بڑھانے کے فن سے قطعاً نا واقف تھے۔ کسی سیاسی پارٹی سے
بھی وابستہ نہ تھے۔ اس کے باوجود ان کی مقبولیت بڑھتی ہی رہی اور وہ
ملک کے رئیس المتغزلین تا دم آخر سمجھے جاتے رہے۔ ان کی وفات پر
جو ملک گیر ماتم ہوا اور اس برصغیر کے دونوں حصوں ہند اور پاکستان میں
جس طرح ان کی یاد منائی جا رہی ہے وہ اس دعوے کی شاہد عادل ہے
علامہ سید سلیمان ندوی کی نگاہ حقیقت شناس نے اس وقت جبکہ
جگر کا شمار رندان قدح نوش میں تھا۔ ان کے کلام کے مجموعہ "شعلہ طور"
کے اولین اڈیشن پر مقدمہ لکھتے ہوئے۔ ان کے کلام پر تبصرہ کرتے
کرتے ان کے بارہ میں جو پیشین گوئی کی تھی وہ حرف بحرف صحیح ثابت
ہو کر رہی اور اسے علامہ مرحوم کی فراست ایمانی کی دلیل قرار دیا جا سکتا ہے

"جگر مست ازل ہے۔ اس کا دل سرشار الست ہے وہ محبت کا
متوالا ہے اور عشق حقیقی کا جویا۔ وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی
منزل تک اور بت خانہ کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ کو اور خم خانہ
کے بادۂ کیف سے بے خود و فراموش ہو کر بزم ساقی کوثر تک
پہونچنا چاہتا ہے۔ جگر بظاہر سرشار مگر در حقیقت بیدار ہے
اس کی آنکھیں پر خمار مگر اس کا دل ہشیار ہے۔ اور کیا عجب کہ
خود جگر کو بھی اپنے دل کی خبر نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے
کلام میں اثر نہ ہوتا"

مقدمہ نگار فاضل نے غالباً اس قسم کے اشعار "شعلہ طور" میں ملاحظہ فرما کر

یہ رائے ظاہر فرمائی ہوگی ؎

(۱) حرم و دیر نظر آتے ہیں سب بہ سجود
جلوہ گر کون مرے شوق جبیں ساز میں ہے

(۲) ہو کے فنائے ذات حق دل مرا سوز و ساز میں
مرکز اصل بن گیا دائرۂ مجاز میں

(۳) دل مرا توڑ کر کہا اس نے زبان راز میں
ساز میں نغمہ وہ کہاں ہو جو ہے شکست ساز میں

(۴) دونوں جہاں میں دو قدم اول و آخر ہوس
اُن کو اٹھا تو ہے ابھی خاص حریم ناز میں

(۵) اصل سے ہو کے بیخبر ڈھونڈھ رہا ہے دل حزیں
عیش دوام عافیت غم کدۂ مجاز میں

(۶) یہ تو حسن ازل کی اُف یہ نقش آرائیاں
بن گئے کتنے مرقعے ایک ہی تصویر میں

(۷) ترے جلووں میں گم ہو کر خودی سے بیخبر ہو کر
تمنا ہے کہ رہ جاؤں زسرتاپا نظر ہو کر

شعلہ طور کی ردیف الف کی پہلی ہی غزل میں ابتدا اس مطلع معرفت آگین سے ہوتی ہے ؎

جبھی سے ابتدا ہے تو ہی ایک دن انتہا ہوگا
صدائے ساز ہوگی اور نہ ساز بے صدا ہوگا

اپنی عصیاں شعاری کا ذکر اور رحمت حق کی تمنا کس البیلے انداز میں کرتے ہیں ؎

(۱) سر محشر ہم ایسے عاصیوں کا اور کیا ہو گا
در جنت نہ وا ہو گا در رحمت تو وا ہو گا

(۲) جہنم ہو کہ جنت جو بھی ہو گا فیصلہ ہو گا
یہ کیا کم ہے ہمارا اور ان کا سامنا ہو گا

ایک اور جگہ رحمت پروردگار کا ذکر دوسرے پیرایہ میں ؎

وہ مرا ساغر بکف ہونا پشیمانی کے ساتھ
ابر رحمت کا وہ اٹھنا جھوم کر میرے لئے

ایک اور جگہ یہی مضمون ؎

میں خطاوار، سیہ کار گنہگار، مگر
کس کو بخشے تری رحمت جو گنہگار نہ ہو

اسی عالم رندی میں بھی زمزمہ نعت سے بھی غافل نہیں ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

(۱) تو صبح ازل آئینہ حسن ازل بھی
اے صلّ علیٰ صورت سلطان مدینہ

(۲) اے خاک مدینہ تری گلیوں کے تصدق
تو خلد ہے تو جنت سلطان مدینہ

(۳) اس طرح کہ ہر سانس ہو مصروف عبادت
دیکھوں میں در دولت سلطان مدینہ

توبہ کے بعد جب حضرت جگر سفر حرمین کو گئے۔ تو یہ قال حال بن کر رہا۔ اور جن لوگوں نے حرم کعبہ اور بارگاہ نبوی میں جگر صاحب کو دیکھا ہے وہ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں ؎

(۱) اک رنگ غم عشق بھی ہو منتظر دید
صدقے ترے اے صورت سلطان مدینہ

(۲) کونین کا غم یاد خدا اور شفاعت
دولت ہے یہی دولت سلطان مدینہ

(۳) ظاہر میں غریب الغربا پھر بھی یہ عالم
شاہوں سے سوا سطوت سلطان مدینہ

(۴) اس امت عاصی سے نہ منہ پھیر خدایا
نازک ہے بہت غیرت سلطان مدینہ

رندی و مستی کے عالم میں جہاں یہ شعر اس راہ مجاز میں ٹھوکریں کھانے والے کی زبان سے نکل رہا تھا ؎

جتنی بھی آج پی سکوں عذر نہ کر پلائے جا
مست نظر کا واسطہ مست نظر بنائے جا

وہیں سالک راہ حقیقت کی طرح یہ شعر بھی ملتا ہے ؎

لحظہ بہ لحظہ دم بہ دم جلوہ بہ جلوہ آئے جا
تشنۂ حسن ذات ہوں تشنہ لبی بڑھائے جا

یا اس طرح کا یہ دوسرا شعر ایک اور غزل میں ؎

سلام اس پہ کہ جس نے اٹھا کے پردۂ دل
مجھی میں رہ کے مجھی میں سما کے لوٹ لیا

ایک اور عاشقانہ غزل کے اسی رنگ کے دو شعر ؎

(۱) نگاہ شوق ہی کچھ جانتی ہے راز مستوری
وہ خود جلوہ ہیں انکا جسے پردہ سمجھتے ہیں

(۲) مے و مینا کے پردے ان کو دھوکا دے نہیں سکتے
ازل کے دن سے جو راز مے و مینا سمجھتے ہیں

ایک اور طویل غزل کے چند شعر مجاز کے بجائے حقیقت ہی کی ترجمانی کر رہے ہیں ؎

(۱) کچھ اس طرح وہ پس پردۂ نیاز رہے
حجاب ساز میں جیسے نوائے ساز رہے

(۲) نہ کوئی راز رہا ہو نہ کوئی راز رہے
نفس نفس میں وہ خود ہی جو نے نواز رہے

(۳) محبت اصل حقیقت محبت اصل مجاز
وہ کم نظر تھے جو بیگانہ مجاز رہے

اور یہ مقطع تو حقیقت و مجاز دونوں پر یکساں طور سے محمول کیا جا سکتا ہے ؎

تو خوب جانتا ہے او جان و دل کے مالک
ہر حال میں جگر نے تیری ہی آرزو کی

ردیف ہی کی ایک غزل میں کئی اشعار خالص تصوف و معرفت کے ملتے ہیں ؎

(۱) سنتا ہوں کہ ہر حال میں وہ دل کے قریں ہے
جس حال میں ہوں اب مجھے افسوس نہیں ہے

(۲) جس رنگ میں دیکھو اسے وہ پردہ نشیں ہے
اور اس پہ یہ پردہ ہے کہ پردہ ہی نہیں ہے

(۳) ہر ایک مکاں میں کوئی اس طرح مکیں ہے
پوچھو تو کہیں بھی نہیں، دیکھو تو یہیں ہے

(۴) اس بزم حقیقت کی حقیقت میں کہوں کیا
نغموں کا تلاطم تو ہے آواز نہیں ہے

ایک اور غزل کے تین شعر اسی رنگ کے ملاحظہ ہوں ؎

(۱) ہزار جان گرامی فدا بہ ایں نسبت
کہ میری ذات سے اپنا پتہ دیا تو نے

(۲) یہ کیا کیا کہ عطا کرکے عشق لامحدود
مجھے حریف مقابل بنا دیا تو نے

(۳) ہر ایک دل کو عطا کرکے مدعائے حیات
جگر کو ایک [illegible] سب مدعا دیا تو نے

ایک منکر خدا اور [illegible] کے جواب میں جگر کا یہ مقطع بھی قابل ہے

مجازیؔ سے جگرؔ کہدو ارے او عقل کے دشمن
مُقرِ ہو یا کوئی منکر، خدا یوں بھی ہو اور یوں بھی

اس شعر پر جناب جگرؔ نے حسب ذیل نثری حاشیہ بھی دیا تھا۔
مجازی ایک لکھنوی منکر خدا کا تخلص ہے جو بدقسمتی یا خوش قسمتی سے میرے دوست بھی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی شان رحمت کا ذکر دو یا تین ان کی غزلوں کے آخری شعروں میں

(۱) شان رحمت کو نہیں درکار کوئی پیش کش
احتیاطاً اکتساب کفر و ایماں کیجئے

(۲) مجھ گنہ گار کو بھی شکوہ ہو تری رحمت کا
کیوں خطا بخش و خطا پوش ہوئی جاتی ہے

دَورِ سوم کے کلام میں بھی مجاز کی جلوہ آرائیوں کے ساتھ ساتھ حقیقت کی مضمون آرائیاں بھی برابر ملتی ہیں مثلاً ؎

(۱) تمام اُٹھ گئے پردے تو اس سے کیا حاصل
مزا تو جب تھا کہ میں بھی نہ درمیاں ہوتا

(۲) یہ سب نمود و نمایش ہے تیرے چھپنے سے
جو تو نہ پردے میں ہوتا تو میں کہاں ہوتا

(۳) محیط عشق میں جو کچھ بھی تھا اک عالم دل تھا
اسی ذرے میں دریا تھا اسی قطرے میں ساحل تھا

(۴) یہ سب جو حسن حقیقت پہ ہیں حجاب اٹھا
نظر کو ہے جو اٹھانا تو کامیاب اٹھا

(۵) کہاں مشاہدۂ روح ہیں ہے پابستہ
بہت لطیف سہی پھر بھی یہ حجاب اٹھا

(۶) نہ چونکے اہل دل تا حشر مست و بے خبر ہو کر
زمانہ کروٹیں بدلا کیا شام و سحر ہو کر

(۷) اب اس رحمت کے آگے حشر میں کیا ہاتھ پھیلاؤں
رہی وابستہ جو مجھ سے مرا دامان تر ہو کر

(۸) دور ہے منزل عرفان خودی اور یہاں
بے خودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں

(۹) کچھ نہیں کھلتا جگر راز طلسم کائنات
مجھ میں یہ آباد ہے یا اس میں میں آباد ہوں

(۱۰) علم کے جہل سے بہتر ہے کہیں جہل کا علم
میرے دل نے یہ دیا درس بصیرت مجھ کو

(حضرت اصغر گونڈوی سے جگر کو جو عقیدت و ارادت تھی اور جس طرح ان کے اصلاحی اثرات ان کی آئندہ زندگی پر پڑے اس کا اعتراف متعدد جگہ انھوں نے کیا ہے مثلاً اس غزل کے مقطع میں ہے۔

یوں تو ہونے کو جگر اور بھی ہیں اہل کمال
خاص ہے حضرت اصغر سے ارادت مجھ کو)

(۱۱) واقفِ سرِ حقیقت اگر انساں ہو جائے
غم سے نزدیک ہو، راحت سے گریزاں ہو جائے

(۱۲) ایک ذرے کا اگر حسن نمایاں ہو جائے
آدمی شدتِ انوار سے حیراں ہو جائے

(۱۳) کفر ہی کا اگر انسان کو عرفاں ہو جائے
جس جگہ ٹیک دے سر کعبہ ایماں ہو جائے

(۱۴) دل ہے گنجینۂ اسرار، نگاہیں محدود
کاش اس کل کا ہر ایک جزو پریشاں ہو جائے

(۱۵) عرش تک ہو نہیں سکتی جو رسائی نہ سہی
یہی انسان کی معراج ہے انساں ہو جائے

(۱۶) اس سے بڑھ کر کوئی دل سوز بھی دنیا میں نہیں
نفس چالاک اگر تابع فرماں ہو جائے

(۱۷) یوں بڑھے پائے طلب حسن قدم کی جانب
ایک ہی جست میں طے عالمِ امکاں ہو جائے

(۱۸) عام ہے بیعتِ ساقی درِ میخانہ ہے باز
آج ہونا ہے جسے آ کے مسلماں ہو جائے

ایک اور غزل میں بادۂ معرفت کے نشہ سے سرشار شاعر کے چند پُرکیف اشعار ملاحظہ ہوں ؎

(۱) میں ہوں رند لم یزلی اک ساقی بے نام کا
شش جہت میرے لئے ٹوٹا سا اک پیمانہ ہے
(۲) فیض ساقی نے مجھے لبریز مستی کر دیا
ہر نظر جام و سبو ہے ہر نفس میخانہ ہے
(۳) عشق وحدت آشنا و شوق صورت آفریں
اک نظر اپنی ہے کعبہ اک نظر بت خانہ ہے

ان کی ایک مشہور عاشقانہ رنگ کی غزل ہے جس کا مطلع ممکن ہے آپ نے بھی سنا ہو ؎

عشق نے توڑی سر پہ قیامت زور قیامت کیا کہئے
سننے والا کوئی نہیں روداد محبت کیا کہئے

اسی رنگ مجاز میں حقیقت کی جلوہ آرائی کرنے والے اور موت و فنا کے بارہ میں عارفانہ رنگ کے یہ شعر بھی کہے ہیں ؎

(۱) دل ہے کسی کا راز حقیقت، راز حقیقت کیا کہئے
حیرت جلوہ مہر بلب ہے۔ جلوۂ حیرت کیا کہئے -
(۲) جینے تک ہیں ہوش کے جلوے، آ گئے ہوش کی مستی ہے
موت سے ڈرنا کیا معنی، موت بھی جزو ہستی ہے
(۳) معنی صورت، صورت معنی۔ فکر و نظر کے دھوکے ہیں
فکر و نظر تک رہ جانا فکر و نظر کی پستی ہے

راز حقیقت کی پردہ کشائی ایک اور جگہ عارفانہ انداز میں یوں کرتے ہیں:

(۱) ستم کشوں نے نہ سمجھا کمال حیرت میں
چھپے ہوئے تھے وہ خود پردۂ محبت میں

(۲) اگر نہیں پس پردہ کوئی حقیقت میں
یہ کون بول رہا ہے طلسم صورت میں

(۳) جب آئے محفل وحدت سے بزم کثرت میں
نظر کا بن گئے پردہ نظر کی صورت میں

واردم کے کلام کی ردیف الف میں پہلی ہی غزل میں اس رنگ کے چند خاص اشعار ملاحظہ ہوں ؎

(۱) دل کیا ہے نقش حسن حقیقت طراز کا
آئینہ کیا ہے عکس ہے آئینہ ساز کا

(۲) عالم نہ پوچھ عشق کی شان نماز کا
کونین خود اک ذرہ ہے خاک نیاز کا

(۳) آخر کھلا یہ راز طلسم مجاز کا
ایک شعبدہ تھا غفلت بیگانہ ساز کا

(۴) دھوکا قدم قدم پہ تری بزم ناز کا
کیا سخت مرحلہ ہے طلسم مجاز کا

(۵) مجھ سے گناہ گار پہ یہ بارش کرم
منہ دیکھتا ہوں رحمت عاجز نواز کا

(۶) صوفی نے جس کو شاہد مطلق سمجھ لیا
اک پرتو لطیف تھا حسن مجاز کا

ایک غزل میں تین تین قافیے وادیٔ ایمن کے لائے ہیں اور ہر جگہ نئی مضمون آفرینی کی ہے ؎

(۱) آشنا قید مکاں سے کب رہی برق جمال
ذرے ذرے میں ہے وہ جو وادیٔ ایمن میں تھا

(۲) مجھ کو سب معلوم ہے افسانۂ برق و کلیم
میرے دل کا ذرہ ذرہ وادیٔ ایمن میں تھا

(۳) ورنہ ممکن ہی نہ تھا نظارۂ برق جمال
ذوق موسیٰ بھی حدود وادیٔ ایمن میں تھا

آیۂ قرآنی نحن اقرب الیہ من حبل الورید کی تلمیح ملاحظہ ہو ؎

(۱) ہر تڑپ کے ساتھ اک جلوہ نمایاں ہو گیا
آج ثابت یار کا قرب رگ جاں ہو گیا

ایک غزل میں کہتے ہیں ؎

(۲) روح قالب سے نکل کر اصل میں گم ہو گئی
نے سے ہوتے ہی جدا نغمہ پریشاں ہو گیا

(۳) دل کے پرتو بن گئے سب نقشہائے رنگ رنگ
ایک ذرہ موجد کل بزم امکاں ہو گیا

اپنی عصیاں شعاری اور اس کے مقابل رحمت پروردگار کا ذکر کس

ا چھوتے انداز میں کرتے ہیں ؎

عصیاں کی بھی نہ ہو سکی مجھ سے تکمیل آہ
کیا منہ دکھاؤں رحمت پروردگار کو
بھڑکا رہا ہوں آتش عصیاں ہر ایک سمت
پھیلا رہا ہوں رحمت پروردگار کو

ایک اور غزل انھیں عارفانہ اصطلاحوں اور سالکانہ استعاروں و تلمیحوں سے پُر ؎

(۱) نگراں کوئی بجز دیدۂ مستور نہ ہو
جلوہ اس طرح دکھا برق نہ ہو طور نہ ہو
(۲) خود ضیا بار جو اک جلوۂ مستور نہ ہو
آئینہ خانۂ عالم میں کہیں نور نہ ہو
(۳) کھول کر آنکھ ذرا دیکھ تو لے اے غافل
تیری ہستی ہی حجاب رُخِ پُر نور نہ ہو
(۴) خاک سے سوزِ غم عشق کی تاثیر کلیم
دل کا ہر ذرہ اگر برق سر طور نہ ہو
(۵) عین ایمان ہے انا الحق کا ترانہ لیکن
ہے یہی کفر اگر دیدۂ منصور نہ ہو

ردیف ہی کی ایک پُر کیف نعتیہ غزل، مناجات کے سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی ؎

(۱) قدرت کی آن والے رحمت کی شان والے
تجھ پر جہاں تصدق او پاک جان والے

(۲) دونوں جہاں کی نعمت ہے سٹھیوں میں تیری
بوسیدہ کپڑوں والے ٹوٹے مکان والے

مجاز کے پردہ کو چاک کرکے حقیقت کی دعوت شاعر نے زندگی کے اس دور میں بھی متعدد بار بڑھا دی ہے جبکہ وہ حقیقت مجاز کے رنگ میں ڈوبے نظر آتے تھے ؎

(۱) دنیا یہ اسی کی ہے عالم یہ اُسی کا ہے
جو آپ ہی مجنوں ہے جو آپ ہی لیلا ہے

(۲) بیکار ہے اے مجنوں یہ ہیکر آب و گل
اس چیز کا طالب بن جو اصل میں لیلا ہے

اور اس کے بعد والی غزل میں کہتے ہیں ؎

(۱) یوں محو ثنا ہو جا اے دل رہ الفت میں
ہر سانس سے پیدا ہو اک نغمۂ منصوری

(۲) کل ہستی عالم پر طاری ہیں صفات اس کے
سب کہنے کی باتیں ہیں، مختاری و مجبوری

(۳) تو نے ہی جگر اس کو مٹی میں ملایا ہے
ورنہ یہ دل تھا اک آئینۂ نوری

اسی دور کے متفرق اشعار میں یہ شعر بھی ملتا ہے ؎

میں بتاؤں تجھ کو یہ راز کیا، تو اسیر دامِ قیود ہے
میں جہاں ہوں نغمہ سرا وہاں نہ وجود ہے نہ شہود ہے

دورِ اول کا کلام نغمات جگر یا انتخاب داغ جگر کی پہلی غزل کا مطلع ملاحظہ ہو ؎

کثرت میں بھی وحدت کا تماشا نظر آیا
جس رنگ میں دیکھا تجھے یکتا نظر آیا

اور آخری شعر یہ ہے ؎

ہر جلوہ کو دیکھا ترے جلووں سے منور
ہر بزم میں تو انجمن آرا نظر آیا

ردیف ن میں نعتیہ رنگ کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

(۱) سرور کم نہ کبھی ہوگا اب قیامت تک
خمِ حجاز کی پی کر شراب آتے ہیں

(۲) کوئی جا کے در پاک پر خبر کر دے
خراب حال بہ حالِ خراب آتے ہیں

کفر و ایمان کا فرق رندی و سرمستی کے عالم میں بھی فراموش نہیں ہو سکتے ہیں اور صاف لفظوں میں کہتے ہیں ؎

یہی تو فرق ہے بس کافر و مومن میں اے غافل
کہ اس کے لاکھ کعبے ہیں اور اس کا ایک کعبہ ہے

نامۂ اعمال کی سیاہی کے ذکر میں ایک نیا شاعرانہ نکتہ پیدا کیا ہے ؎

اسی کو ایک دن بننا ہے خالِ عارضِ رحمت
ہمارے نامۂ اعمال کی جتنی سیاہی ہے

آخر میں نظمیں بھی درج ہیں۔ اسی میں ایک نظم مجذوب کی صدا بھی ہے
چند اشعار حقیقت آثار ملاحظہ ہوں ؎

(۱) اسی تلاش و تجسس میں کھو گیا ہوں میں
اگر نہیں ہوں تو کیونکر جو ہوں تو کیا ہوں میں

(۲) کمالِ بے بصری پر بھی کیا بلا ہوں میں
وہ مجھ کو دیکھ رہا ہے یہ دیکھتا ہوں میں

(۳) کدھر ہے ؟ منظرِ ہستی کے دیکھنے والے
یہ ساز وہ نہیں جس ساز کی صدا ہوں میں

(۴) تصورات کی آئینہ بندیاں بے سود
تعینات کی دنیا سے ماورا ہوں میں

اس کے مقابعد نغمۂ اسلام کے نام سے ایک پرکیف نظم ملتی ہے جس میں اپنے اقرار و اعتراف گناہ کے ساتھ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ و التسلیم کی غلامی پر فخر کیا ہے اور حضورؐ کے رحمتِ عالم ہونے کا ذکر خاص طور سے کیا ہے آگے چل کر صحابہ کرام کی مدح و توصیف بھی کی ہے ؎

(۱) با ایں ہمہ رندی و سرمستی و عشرت طلبی
ہوں خیر احمدؐ مرسل کا ، غلام نبی

(۲) مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

(۳) کیوں نہ پھر رحمت باری کا طلبگار ہوں میں
ہاں مجھے فخر ہے اس پہ کہ گنہگار ہوں میں

(۴) ہر زمانے میں پیمبر بھی نبی بھی آئے
مصلح ملی و ملکی بھی رشی بھی آئے

(۵) حق کے جو بندہ بھی اور حق کے ولی بھی آئے
واقف محرم سر ازلی بھی آئے

(۶) آئے دنیا میں بہت پاک مکرم بن کر
کوئی آیا نہ مگر رحمت عالم بن کر

(۷) کس نے مے جام توحید پلایا سب کو
کس نے پیغام مساوات سنایا سب کو

(۸) راستہ کس نے حقیقت کا دکھایا سب کو
کس نے اس حسن کا دیوانہ بنایا سب کو

. . . .

(۹) تم میں صدیقؓ سا گزرا ہو تو لاؤ دکھاؤ
تم نے فاروقؓ سا دیکھا ہو تو لاؤ دکھاؤ

(۱۰) کوئی عثمانؓ سا آیا ہو تو لاؤ دکھاؤ
کوئی حیدرؓ سا جو پایا ہو تو لاؤ دکھاؤ

(۱۱) ثانیٔ احمدِ بے میم تو کیا لاؤ گے
اُس کی اُمت کی مثالیں بھی نہیں پاؤ گے

آخر میں غم زدہ اور پریشاں حال اُمت مسلمہ کو تسلی و تسکین بھی دی ہے

(۱) غم نہ کر مسلم حیرت زدہ مُہر بلب
آشنا رنگ فنا سے نہیں تیرا مذہب

(۲) یہ حوادث ہیں ترے، تری ترقی کا سبب
تیرے حامی ہیں نبی. تیرا نگہبان ہے رب

(۳) کتنے اکثر بہت اس طرح کے اُٹھوائے گئے
ایسے دجال زمانے میں بہت آئے گئے

محمد یونس خالدی

آپ کا کلام بہت بلند ہے اور آپ کے پڑھنے کا انداز انتہائی دلکش، آپ نے کن کن اساتذہ فن کا مطالعہ کیا ہے۔ اور آج کل کن کن شعرا کے دواوین مطالعہ میں ہیں۔

یہ کسی ناقد اور بلند پایہ ادیب کے سوالات نہیں۔ بلکہ یہ سوالات حضرت جگر کے سوالات تھے جو انھوں نے ایک نومشق شاعر سے، ان کا کلام سننے کے بعد کئے وہ نومشق شاعر ایک بدنام صنف سخن کا شاعر تھا اور ... وہ بھی نوجوان۔ ظاہر ہے کہ اس نے کیا جواب دیا ہوگا۔ لیکن اسکا جواب بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ "میں نے میر و غالب کو پڑھا ہے۔ فیض و فراق مطالعہ میں ہیں۔ اختر شیرانی اور مجاز کو پڑھنا چاہتا ہوں"

لیکن اس کی گفتگو کا انداز بتلا رہا تھا، کہ اس کی ان تمام باتوں میں صداقت کا فقدان ہے۔ پھر بھی حضرت جگر نے اس کے ذوق کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ "اساتذہ فن میں مومن و آتش، مصحفی و ناسخ، امیر و داغ کو ضرور پڑھ ڈالئے۔ اصغر و حسرت فانی و عزیز سے بھی گریز نہ کیجئے۔ لیکن کلام میں سوز و اثر پیدا کرنے کے لئے خواجہ میر درد کا مطالعہ ضروری ہے"

کیا خواجہ میر درد بھی شاعر تھے، اور تھے تو کس دور کے ، اور کیا عزیز بارہ بنکوی کا دیوان چھپ چکا ہے، اور اس کا بھی پڑھنا ضروری ہے۔

یہ سوالات ایک شاعر کی زبان سے اور پھر ایک غزل گو شاعر کی زبان سے، کسی طرح پسندیدہ سوالات نہ تھے، حضرت جگر نے سوالات سننے کے بعد یہ اندازہ لگا لیا کہ یہاں نغمہ کے علاوہ جو کچھ ہے، اس کی حیثیت "حدیثِ دیگراں" سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس لئے یہ کہتے ہوئے کہ۔

خواجہ میر دردؔ، میرؔ و سوداؔ کے معاصر تھے اور ایک صاحب دل صاحب نسبت بزرگ تھے۔ حضرت عزیز سے مراد عزیز لکھنوی مرحوم ہیں"

' تاریخ ادب اردو کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔

یہ بات کوئی بہت بڑی بات نہیں، بلکہ انتقال سے چند ماہ قبل کا واقعہ ہے اس واقعہ سے جگر کے صحیح ذوقِ شعری کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی پتا چل جاتا ہے کہ جن اساتذہ فن کے مطالعہ کا مشورہ ایک نومشق شاعر کو دیا جا رہا تھا، وہ اساتذہ فن ان کے مطالعہ میں رہ چکے تھے۔ لیکن وہ اپنے دور آخر میں سب سے زیادہ متاثر حضرت خواجہ میر دردؔ سے تھے۔

خواجہ میر دردؔ ، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک مشہور شیخ طریقت اور صوفی شاعر تھے یہ بات دوسری ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد کی روایت کے پیشِ نظر میر تقی میر کے لفظوں میں وہ آدھے شاعر تھے۔ حالانکہ "نکات الشعرا" اس تہمت سے خالی ہے۔ بلکہ اس تذکرہ میں خواجہ میر درد کا تذکرہ جس انداز میں کیا گیا ہے، اس کے دیکھنے کے بعد جو رائے قائم کرنا پڑتی ہے، وہ اس سے مختلف ہے۔

خواجہ میر درد ناقدین فن کی رائے میں ایک صوفی شاعر تھے لیکن کوچہ حسن و عشق بھی ان کا دیکھا بھالا کوچہ تھا۔ اور مجاز نے حقیقت کی طرف رہنمائی کی تھی، اس حقیقت کے پیش نظر جگر کا ان سے متاثر ہونا ضروری تھا۔

جگر غزل کے شاعر تھے، غزل کی شہرت کوئی اچھی شہرت نہیں۔ اس کا شمار بدنام صنف سخن میں ہوتا ہے، لیکن یہی بدنام صنف سخن، ان کی زندگی کا اوڑھنا، اور بچھونا تھا۔ انھوں نے جو کچھ کہا وہ اسی بدنام صنف سخن میں کہا اور جو سرمایہ چھوڑا وہ غزل کی شکل میں غزل اور آبروئے غزل کا سرمایہ تھا غزل گو شعرا کی صف گو کافی طویل ہے، لیکن دنیائے غزل میں جن کی شکلیں جانی پہچانی نظر آتی ہیں۔ اور آوازوں سے بھی کان آشنا ہیں۔ ان کا شمار انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے، انھیں شمار ہونے والے شعرا میں ایک غزل گو شاعر حضرت جگر بھی تھے۔

جگر کا بظاہر تعلق "شعلہ طور" کے پیش نظر جرأت و رنگین اور مومن و آتش سے ہے، وہ میر و مصحفی سے بھی ہم آواز ہوتے دکھائی دیتے ہیں لیکن مزاج کسی طرح ہم آہنگی کے لئے تیار نہیں، البتہ دور متاخرین میں اگر کسی کا رنگ سخن ان کو متاثر کرتا ہے تو وہ حضرت داغ کا رنگ سخن تھا اور یہ تاثر فطری تاثر تھا۔ اور اسی فطری تاثر نے ان کو واردات قلبی کے نظم کرنے کے لئے مجبور کیا، ان واردات قلبی میں زندگی بھی تھی، اور زندگی کی اہم حقیقتیں بھی، عملی کوتاہیاں بھی تھیں اور کوتاہی عمل کی داستانیں بھی۔ ان داستانوں میں رندی و سرمستی سے لے کر عیاشی و ہوسناکی کی داستانوں تک کئی کی داستاں

ایسی نہ تھی، جو جگر کی غزل داستان میں نہ ہو، یہی وہ حقیقت تھی کہ جس نے ناقدینِ فن کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ

جگر شاعرِ رومان تھے۔ جگر حسن و عشق کے شاعر تھے، جگر کی شاعری سراپا مجاز کی شاعری تھی، جگر کی شاعری میں رندی و سرمستی کے علاوہ کچھ نہیں۔ جگر کی شاعری رندانہ شاعری تھی، جگر نے جو کچھ کہا وہ جرأت اور داغ کے رنگ میں کہا، جگر شراب، شراب جگر۔

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

لیکن جو ناقد بہت زیادہ محتاط نظر آتے ہیں، وہ محتاط ناقد یہ کہہ کر اپنا دامن بچا لے جاتے ہیں کہ "جگر شاعر تھے اور صرف شاعر" مگر اس کا کیا علاج، کہ مدہم سروں میں یہ آواز بھی سنائی دے جاتی ہے کہ جگر کیا تھے؟ جگر کچھ بھی نہ تھے! یہ بات دیانتداری پر مبنی ہے، یا بددیانتی پر، اس کا فیصلہ کوئی آسان نہیں، مگر یہاں دیکھنا یہ ہے کہ جن ناقدین نے مندرجہ بالا خیالات کا اظہار فرمایا ہے، انھوں نے تنقید کا کوئی حق بھی ادا کیا ہے یا نہیں؟ تو میں اپنے لفظوں میں بات کہنے کے بجائے پروفیسر رشید احمد صدیقی کے لفظوں میں کہنا چاہتا ہوں کہ

"یہاں میں فنِ تنقید پر کوئی بحث چھیڑنا نہیں چاہتا، لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے بعض ہونہار اور ذی استعداد نوجوان جن میں تنقید کی اعلیٰ صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ غالباً نادانستہ طور پر ہمارے بعض اچھے

شعرا کے ساتھ انصاف نہیں کرتے، سیاسی استیلا نے شرفائے ادب کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا۔"

یہی حال مذہب کے نام پر دوکانیں آراستہ کرنے والوں کا، ادب اور شاعری کو مذہبی جکڑ بندیوں میں جکڑنے والوں کا ہے، جگر کے تمام ناقد انہیں دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں، وہ جگر کے کلام کا مطالعہ خاص سیاسی نظریات کی عینک لگا کر کرتے ہیں یا کسی خاص مذہب فکر و عمل سے وابستہ ہو کر، اور یہی وجہ ہے کہ جگر پر اور جگر کی شاعری پر صحیح طریقہ سے روشنی نہیں پڑ پاتی۔

جگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاعر رومان تھے، رومان خواب بھی ہے اور تعبیر خواب بھی، خواب عشق مجازی کی لذت شناسی کا دوسرا نام ہے۔

وہ عشق مجازی کے لذت شناس تھے۔ اور معشوق مجازی کے عشووں اور غمزوں سے بھی واقف، وہ حسن کے پجاری تھے۔ اور حسن کے ادا شناس بھی، لیکن ان کے محبت کرنے کا انداز عام شاعرانہ روش سے مختلف تھا۔ وہ محبوب کے ظلم وستم کو پیار کی نظر سے دیکھتے تھے اور اس کی بے اعتنائیوں کا رونا رونا توہین محبت جانتے تھے۔ پھر اس کی شہادت صرف "شعلہ طور" سے پیش ہی نہیں کی جا سکتی، بلکہ شہادت میں "شعلہ طور" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ "شعلہ طور" جگر کی رومانی شاعری کے مجموعہ کا نام نہیں ہے۔ بلکہ جگر کی حیات معاشقہ کا کھلا ہوا باب، اور عشق و محبت کی شدید کیفیات کا ترجمان بھی ہے۔ اسی سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ ایک کامیاب عاشق تھے، اور محبوب پر قابو

پانے کا فن بھی جانتے تھے۔ محبت میں آنکھ مچولی کھیلنا، کبھی تڑپنا اور کبھی تڑپانا، ان کا حسین مشغلہ تھا، لیکن اسی کے ساتھ ہی ساتھ ان میں سپردگی کا جذبہ بھی تھا، اور یہی جذبہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ان کا عشق معراج کمال تک پہنچانے والا عشق تھا، اور جو عشق معراج کمال تک پہنچانے والا ہو۔ اس عشق کی راہ کا شناور اگر کوئی ہوتا ہے۔ تو وہ خواجہ میر درد اور اسی قبیل کے بزرگ شعرا کی زبان میں باتیں کرنے لگتا ہے۔ جگر کا "آتش گل" اسی حقیقت کا اعلان ہے۔ مگر یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کا لفظوں میں بیان بہت مشکل ہے اور ثابت کرنا دشوار، پھر جگر جیسے رومانی شاعر کے لئے! کیونکہ جگر کے متعلق یہ فیصلہ کیا جا چکا ہے، کہ وہ حسن و عشق کے شاعر تھے، اور ان کا عشق مجازی عشق تھا، حقیقت سے اس کا تعلق نہیں۔

پھر یہ بات بالکل ایسی بات ہے کہ خواجہ میر درد کی عشقیہ شاعری میں عشق مجاز کے بے شمار جلووں کی موجودگی میں رام بابو سکسینہ کہتے ہیں کہ

"خواجہ میر درد کے یہاں ہر شعر میں معشوق سے مراد معشوق حقیقی یا مرشد ہے"

اور ڈاکٹر سید اعجاز حسین کا یہ اعلان ہے کہ

"میر درد کی ایک یہ بھی خوبی قابل غور ہے کہ ان کے یہاں عشق حقیقی کا جلوہ ایسا غالب ہے کہ مجازی عشق کو کہیں جگہ نہیں ملتی"۔

لیکن اب عہد شباب کی سرمستیوں کی طرف یا ان کے رچے ہوئے جمالیاتی ذوق کی طرف ہلکے ہلکے اشارے کئے جانے لگے ہیں، اور اس باب میں اگر کسی کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ تو ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کو حاصل ہے اور انہیں

اشاروں کو سامنے رکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ

حقیقت خود کو منوا لیتی ہے۔ مانی نہیں جاتی

یہی حال حضرت جگر کی شاعری کا ہے۔ حضرت جگر کی شاعری کے مختلف دور ہیں۔ لیکن مختلف دوروں میں ایک دور ایسا بھی تھا، کہ جو دور مجاز سے حقیقت کی طرف رہنمائی کا دور تھا۔ اس دور کا کلام پڑھنے کے بعد نہ تو دل کی دھڑکن تیز ہوتی ہے اور نہ کسی سے نظریں ملانے کا اور نہ کسی کو سینے سے لگانے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ لیکن اس کے پڑھنے کے بعد قلوب انسانی کا متاثر ہونا ضروری ہے۔ یہ تاثر حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور بتلاتا ہے کہ جو دور جوانی میں خواب دیکھا تھا، یہ جو کچھ ہے، وہ اسی خواب کی تعبیر ہے۔

شاید یہ بات یوں نہ سمجھ میں آسکے، اچھا پھر ان اشعار کو پڑھ جائیے اور بتلائیے کہ یہ مجاز ہے یا حقیقت:۔

ہر حقیقت کو بانداز تماشا دیکھا — خوب دیکھا ترے جلوے کو مگر کیا دیکھا
ہم نے ایسا نہ کہیں دیکھنے والا دیکھا — جو یہ کہہ دے کہ ترا حسن سراپا دیکھا
دل آگاہ میں کیا کہئے جگر کیا دیکھا — لہریں لیتا ہوا اک قطرے میں دریا دیکھا
کوئی شائستہ و شایانِ غمِ دل نہ ملا — ہم نے جس بزم میں دیکھا اسے تنہا دیکھا

یادش بخیر جب وہ تصور میں آ گیا — شعر و شباب و حسن کا دریا بہا گیا
جب عشق اپنے مرکزِ اصلی میں آ گیا — خود بن گیا حسین دو عالم پہ چھا گیا

زہے وہ شوق جو پابند ایں و آں نہ رہا — خوشا وہ سجدہ جو محدود آستاں نہ رہا
حجاب عشق کو اے دل بہت غنیمت جان — رہے گا کیا جو یہ پردہ بھی درمیاں نہ رہا

ہم نے سینے سے لگایا، دل نہ اپنا بن سکا مسکرا کر تم نے دیکھا، دل تمہارا ہو گیا
میں نے جس بت پر نظر ڈالی جنون شوق میں دیکھتا کیا ہوں، وہ تیرا ہی سراپا ہو گیا

شش جہت آئینۂ حسن حقیقت ہے جگر
قیس دیوانہ تھا، محو روئے لیلیٰ ہو گیا

جنوں کم، جستجو کم، تشنگی کم نظر آئے نہ کیوں دریا بھی شبنم
بحمد اللہ تو ہے جس کا ہمدم کہاں اس قلب میں گنجائش غم
خوشا یہ نسبت حسن و محبت جہاں بیٹھے نظر آئے ہیں ہم
وہ اک حسن سراپا اللہ اللہ کہ جس کی ہر ادا عالم ہی عالم

مسرت زندگی کا دوسرا نام
مسرت کی تمنا مستقل غم

جسے سب لوگ حسن و عشق کی منزل سمجھتے ہیں بلند اس سے بھی ہم اپنا مقام دل سمجھتے ہیں
حقیقت میں ہو راز دوری منزل سمجھتے ہیں انھیں کو ہم سلوک عشق میں کامل سمجھتے ہیں
رعب جمال و جذب محبت تو دیکھنا اٹھتی نہیں نگاہ مگر دیکھتا ہوں میں
اللہ رے کمال خودی کی یہ وسعتیں میرا ہی سامنا ہے جدھر دیکھتا ہوں میں

جہاں تک میرا خیال ہے کہ مندرجہ بالا اشعار اس بات کی کھلی ہوئی غمازی کر رہے ہیں کہ ان اشعار میں فلسفۂ حسن و عشق، حقیقی فلسفہ حسن و عشق ہے لیکن یہ راہ مجازی کی کھولی ہوئی راہ ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے جو کچھ پایا وہ عشق مجازی ہی کی بدولت پایا۔ اس عشق مجازی نے کائنات سے محبت کرنے کی راہیں کھولیں اور کونین کو محبوب کی شکل میں لا کر کھڑا کر دیا

اور اس محبوب کو دیکھ کر جگر کی زبان پکار اٹھی کہ

جز عشق معتبر یہ کسی کو خبر نہیں ایسا بھی حسن ہے جو بقید نظر نہیں

لیکن جگر کو اس حسن کا احساس ایک بارگی نہیں ہو اتھا۔ بلکہ اس کے حصول کے لئے ان کو نہیں معلوم کون، کون سی ترکیبیں استعمال کرنا پڑی تھیں اور کیسی کیسی ریاضتوں اور مشقتوں سے دو چار ہوئے تھے۔ پھر راہ محبت میں ایک منزل ایسی بھی آتی ہے۔ جو منزل خود فراموشی کی منزل ہوتی ہے۔ جگر کی زندگی میں بھی خود فراموشی کی منزل آئی، اور جس منزل پہ پہنچنے کے بعد حقیقی منزل کا سراغ گم ہو گیا۔ اس دور میں جگر نے ہر ٹھہراؤ کو منزل سمجھا، لیکن نشان منزل نہ پا کر پھر آگے چل نکلے۔ آخر کار دست قدرت نے رہنمائی کی۔ اس رہنمائی کی بدولت جب جگر نے منزل حقیقی کو پا لیا، تو اعتراف شکست کے ساتھ حسن تام کی جلوہ آرائیوں کا اعتراف کرنا پڑا۔ اور جگر کو کہنا پڑا کہ

اللہ اللہ یہ مری ترک و طلب کی وسعتیں دفعتہ دفعتہ سامنے حسن تمام آ ہی گیا

اول، اول ہر قدم پر تھیں ہزاروں منزلیں آخر، آخر اک مقام بے مقام آ ہی گیا

اور جب یہ مقام بے مقام حسن تمام کے جلووں اور تابانیوں کی معیت میں راہ طلب کے مسافر کو حاصل ہو جاتا ہے، تو اس کا حال ہی دوسرا ہو تا ہے، اور پھر اس حال میں اس کو کہنا ہی پڑتا ہے کہ

خطرۂ موت، اب نہ فکر حیات نشہ ہی نشہ ہے خمار سے دور

پر تو حسن ذات سے نزدیک سایۂ زلف تابدار سے دور

اک حقیقت خیال سے برتر اک جہاں چشم روزگار سے دور

عشق ہے اس مقام پر کہ جہاں
حسن ہے نقص اعتبار سے دور

یہی وہ دلیل ہیں کہ جس کی بنیاد پر یہ رائے قائم کرنا پڑتی ہے کہ جگر نے مجاز کی راہ سے حقیقت کو پایا تھا، اور راہ حقیقت کی طرف اگر کسی شاعر کے کلام نے ان کی رہنمائی کی تھی، تو وہ خواجہ میر درد کا کلام تھا۔ یہ بات دوسری ہے کہ ان کے کلام میں کہیں خواجہ میر درد کی وہ حسین اور دلکش لے نظر نہیں آتی، بلکہ حضرت اصغر گونڈوی کے سوز جگر کی تپش محسوس ہوتی ہے۔

اصغر گونڈوی سے جگر کے روابط ڈھکے، چھپے روابط نہیں، مگر اصغر گونڈوی جس قبیل کے شاعر تھے اس کے بتلانے کی بھی ضرورت نہیں، ان کا کلام اس حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ اور ان کے یہاں جو کچھ ہے وہ خواجہ میر درد کا فیضان روحانی ہے، اور اسی لئے کہا جاسکتا ہے کہ کلام میں سوز و اثر پیدا کرنے کے لئے خواجہ میر درد کے کلام کا مطالعہ ضروری ہے، حضرت جگر کا یہ مشورہ صحیح مشورہ تھا اور اس مشورہ کا تعلق گفتار نہیں بلکہ کردار سے تھا، اور کردار کی کھلی ہوئی شہادت "آتش گل" ہے: "آتش گل" جگر کے کلام کا کوئی مجموعہ نہیں، بلکہ ان کی کتاب زندگی کا آخری باب ہے۔ اور اسی باب پر ان کی یہ خود نوشت سوانح عمری ختم ہوجاتی ہے۔ اور اس کو پڑھنے کے بعد یہ یقین کرلینا پڑتا ہے کہ جگر کا عشق، عشق حقیقی تھا، اس کا مجاز سے کوئی تعلق نہیں۔ اور یہ بات بالکل سچ ہے کہ ـــــ "یہ صحن چمن میں لگی ہوئی آگ اور اس کی خنک لپٹیں اس عشق حقیقی کی شہادت کے لئے کافی ہیں۔ جس میں پاک باز عاشق بھی ملے، اور بے پردہ محبوب بھی۔"

ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل

جگر کا نظریۂ حسن و تغزل

شعر کہنا شروع کرنے سے پہلے کسی شاعر کا کوئی مخصوص نظریہ شعر نہیں ہوا کرتا۔ لیکن جیسے جیسے مشق سخن آگے بڑھتی ہے اور شاعر کے احساس و تخیل کی کرنیں محیط عالم و جہاں تاب ہوتی جاتی ہیں شاعری کسی نہ کسی مخصوص نظریہ فکر کی طرف مائل ہونے لگتی ہے اور شاعر اپنا مخصوص نظریہ سخن قائم کرنے کی طرف شعوری یا لاشعوری طور پر قدم بڑھاتا ہے۔ ہمارے غزل گو شعرا کے یہاں صنف غزل میں اپنی فنی و فکری خصوصیات کے لحاظ سے یہ نظریہ سخن اور بھی قابل توجہ ہوتا ہے اور انسان کے واردات قلب و کیفیات دماغ کو سمجھنے میں معاون و مددگار ہوتا ہے۔ نظریہ سخن کے متعلق یوں سمجھئے کہ یہ ایک مخصوص ذہنی کیفیت ہوتی ہے کہ جس کی ترکیب و تکمیل میں شاعر کا ماحول فطری رجحانات اور طبعی انفرادیت کو خاص دخل ہوتا ہے اور اس فکری معیار کے سہارے شاعری آگے بڑھتی ہے اور قبول عام و ہر دل عزیزی حاصل کرتی ہے۔ یہ مخصوص نظریہ سخن ایک ایسا گوشہ عزلت و عافیت ہوتا ہے کہ جس میں پناہ گیر ہو کر شاعر ایک خاص لطف و سرشاری تسکین و آسائش، بے تکلفی و نشاط اندوزی محسوس کرتا ہے اور اپنے پسند کے موضوعات پر ترنم ریز ہوا

کرتا ہے۔ نکتہ آفرینیاں اور سحر طرازیاں اس کے کارنامے بن جاتی ہیں۔ اور انفرادیت رفتہ رفتہ بروئے کار آنے لگتی ہے۔ وہ اپنی ذہن میں اپنے تجربات و احساسات فکر و نظر کو نغموں میں مبدل کرتا رہتا ہے اور ایک کیف سرمدی کا حامل ہو کر ساری کائنات پر چھا جانے کی کوشش کرتا ہے حضرت جگر مرادآبادی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ انھوں نے عینک فروشی کرتے کرتے بصیرت افروزی کا کاروبار سنبھال لیا اور ایک ایسا نظریۂ حسن و تغزل تخلیق کیا کہ جس کی بدولت ہماری غزل از سر نو ہماری شاعری کی آبرو اور ہماری زندگی کی تہذیب بن گئی۔ انھوں نے اس صنف سخن میں نئے زاویے پیدا کر کے اس ورثہ کو جو انہیں اپنے سلف سے ملا تھا، بیش قیمت موتی پر بہار اور مزید ارتقا دیا اور آنے والی نسلوں کے لئے ایسے نقوش قدم چھوڑ گئے کہ جن سے بہت کچھ رہنمائی اور روشنائی کا کام لیا جا سکتا ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہیلائے آب و گل تو ہزاروں ہزار ہیں
مجنوں ہو جس کی روح وہ لیلیٰ ہی اور ہے

جس سے کہ مطمئن ہو مری فطرت بلند
شاید وہ حسن و عشق کی دنیا ہی اور ہے

چھپ کے پردوں سے اے دیکھنے والے یہ بتا
مجھ میں کیا بات نہیں جو مری تصویر میں ہے

مجھے تھا شکوۂ ہجراں کہ یہ ہوا محسوس
مرے قریب سے ہو کر وہ ناگہاں گزرے

محبت میں ہم تو جیئے ہیں جیئیں گے
وہ ہوں گے کوئی اور مر جانے والے

نغموں پہ مرے اور تو وہ کچھ نہ کہہ سکے
کچھ مسکرا کے پھول سے برسا کے رہ گئے

مجھ کو جو چاہو ناصحو کہہ لو
کچھ نہ کہنا اسے خدا کے لئے

مری نظر نے شب غم انھیں بھی دیکھ لیا — وہ بے شمار ستارے جو جگمگا نہ سکے
اب اس مقام عشق سے گزر رہا ہوں میں جگر — کہ ظلمتیں بھی ہیں جہاں تجلیاں لٹے ہوئے
نہ کہیں ہوں تو وہ کونسا ذرہ ہے جو لئے ہوئے — خود اپنی جگہ انجمن ناز نہیں ہے

یہ مقام عشق ہے وہ منزلے کہ دریں زماں میں لئے ہوئے
نہ یہ شاہد ہے نہ یہ مطرب ہے نہ یہ حاصل عینی خوشتم

جگر کے ذہن میں جو تصور حسن و محبت نظریہ سخن بنا اور ان کی شاعری نے جو اصول تغزل اپنائے ان کو مجمل طور پر الگ الگ پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ان کے نظریہ حسن و محبت کو سمجھنے کے لئے ان کے کلام کا گہرا مطالعہ ضروری ہے۔ دور اول کی شاعری میں وہ ہر قسم کے جذبات لطیف و تاثرات قلبی کو بیان کرنے میں ایک خاص لذت محسوس کرتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے مطالعہ فطرت و حسن متعلق سے ان کی دلچسپیاں بڑھتی جاتی ہیں ان کے کلام میں آفاقیت ماورائیت اور ما بعد یت آتی جاتی ہے اور بالآخر وہ اچھے شاعروں کی وہ سب امتیازی خصوصیات حاصل کر لیتے ہیں کہ جو بڑے شاعروں سے ان کو ممیز و ممتاز رکھتے ہوئے بھی ہر دل عزیز اور اچھا شاعر بنا دیتی ہیں۔

جگر کا خیال ہے کہ ذہنی کیفیتوں کو بیان کرنے اور اجمال میں تفصیلات پیش کرنے کے لئے غزل سے بہتر کوئی دوسری صنف سخن نہیں ہو سکتی اور اسی وجہ سے مدت العمر کے لئے انھوں نے غزل کو اور غزل نے ان کو اپنانے کی کوشش کی اور دونوں کامیاب رہے۔ انھوں نے جمالیات کے مطالعہ کو

کائنات حیات سمجھا اور اسی وجہ سے غزل کو مشغلۂ زندگی بنایا۔ ان کا کہنا ہے کہ حسن مجرد کے لامحدود انوار و پر تو اگر کامیابی کے ساتھ کسی شکل میں زیب قرطاس کئے جا سکتے ہیں تو وہ غزل اور صرف غزل میں ممکن ہے

جگر کو اس سے بڑی الجھن ہوتی ہے کہ جب کوئی حسین ان کے اشعار میں حسن و محبت کے تذکرے سن کر ان واقعات و معاملات کو اپنی ذات سے متعلق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ اس کی شخصی و ذاتی تعریف ہے۔ ان کے یہاں معیار حسن یہ نہیں ہے کہ اپنی پسند کی صورت کو حسین کہہ دیا جائے یا اپنی ناپسند شخصیت کو رقیب روسیاہ بنا دیا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ ہر طرف مادیت کی فرمانروائی اور زندگی کے ہر شعبہ میں افادیت و خودنمائی کی کارفرمائی نے ہماری معاشرت اور تہذیب کو بے راہ روی پر مجبور کر دیا ہے۔ یقین محکم کی غیر موجودگی اور اور حیات مابعد کی طرف سے بے نیازی نے دنیا اور دنیا کی زوال پذیر اور فانی قدروں کو غیر معمولی اہمیت دیدی ہے۔ یہی غیر متعین ذہنی کیفیت ہے۔ جس نے حسن و عشق کو بھی شخصی۔ وقتی اور ذاتی جذبات و احساسات میں محدود کر دیا ہے اور اپنے مرکز سے اس کے رشتے غیر مرئی طور پر ڈھیلے اور کمزور ہو گئے ہیں۔ زندگی کی سطحیت اور منافعت کوشی نے انسان کو انسانیت۔ خلافت اور امانت کے درجہ سے بہت نیچے گرا دیا ہے اور وہ پیکر محسوس کا شیدائی ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ اپنا عہد الست بھلا چکا ہے اور حسن مطلق سے اس کا وہ رابطہ اور تعلق نہیں رہا ہے کہ جس نے اس کو نیابت

کائنات اور مہ پروین کا امیر بنایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نظریں پست اور
اس کا آئینۂ دل زنگ آلود ہوگیا ہے۔ روحانیت و نورِ معرفت اس سے
کوسوں دور بھاگتا ہے اور حسنِ ازل و ذوقِ نظر اس سے بے التفاتی برت
رہا ہے۔ جگر کا خیال ہے کہ مادہ پرستی، جنسی مجبوری اور مکارۂ حیات سے
جب انسان کنارہ کش ہوجاتا ہے اور اس کے نظریۂ حسن و محبت میں
رفعتیں اور ماورائیت پروئے کار آجاتی ہے تو اس کی شاعرانہ صلاحیتیں
ابدیت و آفاقیت حاصل کرلیتی ہیں۔ اور علاجِ دردِ دل بن کر ہر کدومہ کے
احساسات پر حاوی ہوجاتی ہیں۔ اس کا طریق کار جانا بوجھا مسلک ہوتا ہے
اور اس سلسلہ میں وہ محسوس کرتا ہے کہ طلسم غزل ہی وہ سحر و اعجاز ہے
کہ جس کی وساطت سے وہ کیف سرمدی و آسائش ابدی کی دولت سے مستفیض
ہوسکتا ہے۔ حقیقت منتظر نگاہ شوق میں جلوہ سامانی کا سبب بنتی ہے اور
عشق خوش سودا جمال ہم نفسیں کا ضامن ہوکر طبیب حاذق بن جاتا ہے۔
جگر کے یہاں یہ تصور حسن و عشق بہت عام ہے اور ان کے کلام کے علاوہ
ان کی ذاتی اور شخصی زندگی میں بھی یہ نظریہ بہت لطافت و دلکشی پیدا
کردیتا ہے۔ جن لوگوں کو جگر سے قریب ہونے یا رہنے کا موقع ملا ہے وہ انکی
اس خصوصیت سے پوری طرح واقف ہیں اور بآسانی محسوس کرسکتے ہیں کہ
جگر کی فکر بلند حسن مجرد کی جلوہ ریزیوں سے کہاں تک فیض یاب ہے اور
وہ جلوہ طور کی انوار پاشیوں سے رازدارانہ انداز میں کس طرح سرگوشیوں
میں ہمہ وقت مصروف و گم گشتہ ہے۔

جگر کے نظریۂ حسن و محبت کے تدریجی ارتقا کے مطالعہ کے لئے ضروری ہے کہ ان کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے۔ دور اول کے نغمات میں ان کی محبت کسی قدر بشریت و ارضیت سے متاثر معلوم ہوتی ہے اور کبھی کبھی ان کے ذاتی تجربات و ناکام لمحات کی بھی ترجمانی کرتی ہے۔ مثال کے طور پر جلوۂ طور کے نغمات جگر سے کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں:-

جس نے بنا دیا مجھے وحشی خستہ حال سا
ہائے وہ شکل چاند سی ہائے وہ قد نہال سا

ہائے لبے وہ عتاب میں انکی ادائیں انکی شکل
آنکھیں بھی سرخ سرخ سی چہرہ بھی لال لال سا

ادھر دامن کسی کا جھاڑ کر محفل سے اٹھ جانا
ادھر نظروں میں ہر ہر چیز کا بیکار ہو جانا

اب تو آنکھیں کھول اور افسانۂ دل کہئے حبیب
جا بجا کھلتا ہے کوئی درد اندر سے تیرا مارا ہوا

داغ فرقت کے دہکتے ہوئے انگارے ہیں
ہاتھ لانا نہ مرے سینۂ سوزاں کے قریب

بجلیاں سانسے بدن میں زرد چہرہ دل اداس
جب گذرتے ہیں وہ میری خاک تربت دیکھ کر

جوانی آتے ہی اپنی قیامت کی بہار آئی
نظر بیگانہ وار اٹھی حیا مستانہ وار آئی

ویسے تو جگر محبت کے شاعر ہیں اور از دیاد محبت کے لئے وصل کے بجائے ہجر کو زیادہ کار آمد اور مفید سمجھتے ہیں۔ لیکن اپنے دور اول کے کلام میں وصل و ہجر دونوں کیفیتوں کے تذکرے بے محل نہیں سمجھتے اور محبت و محبوب دونوں کو موضوع سخن بناتے ہیں۔ مثلاً

شب وصل کیا مختصر ہو گئی
ذرا آنکھ جھپکی سحر ہو گئی

وہ گھڑی یاد ہی ہو جائے تو بہتر ہو جس گھڑی
نہ صبح وصل آئی اور نہ شام انتظار آئی

امید وصل دیدۂ حسرت اثر میں ہے
یعنی ہماری روح ہماری نظر میں ہے

دور دوم کے کلام میں ارضیت اور بشریت کسی قدر ماند پڑنے لگتی ہے اور خدرت احساس تخیلات جگر کو حسن تمام کی طرف متمائل کرنے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ دور دوم کا کچھ کلام ملاحظہ ہو:-

مجھ کو وصال و ہجر سے کیا واسطہ جگر   عاشق ہوں اک تبسم دیوانہ ساز کا

عشق کیا چیز ہے اک حشر در آغوش خیال   حسن کیا خواب ہے اک چشم تماشائی کا

چشم نظر پرست میں جس کا جہان تمام ہے   حسن تمام یار کا جلوۂ ناتمام ہے

حسن کی بارگاہ میں رکھئے سنبھال کر قدم   یہ وہ مقام ہے جہاں خواہش دل حرام ہے

بندگی جنون اور بے خودی ادب سرشت   حسن کی اصطلاح میں عشق اسی کا نام ہے

ابتدا عشق کی ہے فطرت انساں کی نمود   انتہا عشق کی تکمیل ہے انسانوں کی

اس دور کے کلام میں عشق و محبت کی ارضی اور بشری سطحی اور شخصی جنسی اور صحت مند کیفیات کی طرف بھی کلام جگر میں جا بجا اشارے ملتے ہیں اور انکی شاعری کو خواہشات دل و عذاب محبت سے مربوط و متعلق کر دیتے ہیں مثلاً

محبت کی پر پیچ راہوں نے مارا   تری آڑی ترچھی نگاہوں نے مارا

کہاں تک عذاب محبت اٹھائیں   بس اب وہ کہیں ہم انہیں بھول جائیں

دور سوم کے کلام میں جذبات جگر کی لطافت، اور ان کا حسن بیان مزید معنی خیز و پر کیف ہو جاتا ہے۔ وہ رموز عشق و محبت کا بیان اس انداز میں کرتے ہیں کہ آفاقیت و بشریت۔ ماورائیت و سطحیت۔ عرفانیت و ارضیت شیر و شکر ہو جاتی ہیں۔ اور ان کا کلام ایک ایسے مزیدار امتزاج کا حامل نظر آتا ہے کہ ہر دل میں جگہ کر لیتا ہے۔ اس دور میں شعلۂ طور کی

اے آنکہ زعشق می پرسی از من　　عشق است نہال برگزیدہ
بیخش بہ دل ازل نہفتہ　　شاخش بہ سرِ ابد رسیدہ
خوشا حیات عاشقاں کو موت بھی جب آئی ہے　　تو ساتھ اک حلقۂ پری وشاں لئے ہوئے
مرا کفر محبت اللہ اللہ　　شعاعیں پھوٹ نکلیں تیرگی سے
کیا قحط محبت ہے کہ اس دورِ ہوس میں　　دل باز بہت ہیں کوئی جانباز نہیں ہے
ہم نے تنہائیوں میں کیا کیا لطف　　ایک آوازِ بے صدا کے لئے
ہو جو ذوقِ جمالِ بے پایاں　　کیا نہیں چشمِ آشنا کے لئے
کیا کشش حسنِ بے پناہ میں ہے　　جو قدم ہے اسی کی راہ میں ہے
میں جہاں ہوں ترے خیال میں ہوں　　تو جہاں ہے مری نگاہ میں ہے
جب تجھے دیکھ کے کونین کی وسعت دیکھی　　حسن ہی حسن محبت ہی محبت دیکھی

اسی سلسلہ میں آتش گل کے چند اشعار پر مزید غور کر لیجئے اور جگر کی ژرف نگاہی کی داد دیجئے۔

جز مدعائے دوست کوئی مدعا نہیں　　یعنی مزاجِ عشق غرض آشنا نہیں
اے جلوۂ دوست تیرے قرباں　　دل سے ہو نگاہ تک چراغاں
بے غمِ عشق وہ بے دل آگاہ　　موت بھی جرم زندگی بھی گناہ
عشق نامحدود جب تک رہنما ہوتا نہیں　　زندگی سے زندگی کا حق ادا ہوتا نہیں
یہ مذہبِ مستی ہے جگر یاں عشق کی صحت لازم ہے　　کیا اس کی حیات و مرگ کہ جو بیمار جیا بیمار اٹھا
ترے عشق کی کرامت یہ اگر نہیں تو کیا ہے　　کبھی بے ادب نہ گزرا مرے پاس سے زمانہ
اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں　　فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں

اب لفظ و بیاں سب ختم ہوئے اب دیدہ و دل کا کام نہیں — اب عشق ہے خود پیغام اپنا اب عشق کا کچھ پیغام نہیں
اک شاہدِ معنی و صورت کے ملنے کی تمنا سب کو ہے — ہم اس کے وہ ملنے پہ ہیں فدا لیکن یہ مذاقِ عام نہیں

جز عشق معتبر یہ کسی کو خبر نہیں — ایسا بھی حسن ہے کہ جو قیدِ نظر نہیں
حسن کو سمجھا ہے کیا اے بوالہوس — حسنِ معنی بھی ہے صورت ہی نہیں
عشق کی بربادیوں کو رائگاں سمجھا تھا میں — بستیاں نکلیں جنھیں ویرانیاں سمجھا تھا میں
آتشِ عشق وہ جہنم ہے — جس میں فردوس کے نظارے ہیں
بیدار عزائم ہوتے ہیں اسرار نمایاں ہوتے ہیں — جتنے وہ ستم فرماتے ہیں سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں

جگر کے نظریہ حسن و محبت کا جو تدریجی ارتقا ادوارِ گذشتہ میں پیش کیا گیا اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کے ابتدائی کلام میں مظہر پرستی اور وصل و ہجر کی روئداد کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ حسنِ مطلق کی ازلیت و ابدیت کے اشارے کچھ ابتدائی کلام میں بھی موجود ہیں۔ اور اس دور میں بھی اپنی اعجاز نگاری اور حسن آفرینی کے لحاظ سے قابلِ توجہ ہیں۔ دورِ اول کے کلام میں وہ عشق و محبت کی تعریف اور انوارِ حسن کی تابانی اس انداز میں بیان کرتے ہیں :-

ہاں تجھیں نہ لگ جائے اے دردِ غمِ فرقت — دل آئینہ خانہ ہے آئینہ جمالوں کا
مرے سر پہ احسان ہے عشق کا — مرا رنگ ہی دوسرا ہو گیا
نمایاں ہیں چہرے سے آثارِ عشق — جگر آج سے باخدا ہو گیا
وصال و ہجر کے جھگڑوں سے فرصت ہی نہ دی دل نے — مآلِ عاشقی تھا روح کا بیدار ہو جانا
ذرہ ذرہ سے نمایاں شانِ قدرت دیکھ کر — کھل گئیں میری آنکھیں طلسمِ حسنِ فطرت دیکھ کر

ضیا باریاں دیدۂ دل سے نزدیک تر ہو جاتی ہیں اور ان کی نغمہ ریزیاں اور جلوہ پاشیوں کو پرمعنی اور عزیز تر بنا دیتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:—

ہر ذرہ ہے اک پیکرِ صد حسنِ حقیقت
ہستی کو جگر ہستیِ باطل نہ سمجھنا

محبت کیا ہے تاثیرِ محبت کس کو کہتے ہیں
ترا مجبور کر دینا مرا مجبور ہو جانا

اللہ ری مجبوریِ آدابِ محبت
گلشن میں رہے اور گلستاں نہیں دیکھا

لہو کی ہر اک بوند دل بن گئی
خوشا لذتِ کامیابِ محبت

یہاں تک جذب کر لوں کاش تیرے حسنِ کامل کو
تجھی کو سب پکار اٹھیں گزر جاؤں جدھر ہو کر

لطافت مانعِ نظارہ صورت سہی لیکن
دھڑکنا دل کا کہتا ہے وہ گزرے ہیں ادھر ہو کر

عشق کا پیغام مستیِ شوق کی روداد ہوں
زندگی جس سے پنپتی ہے میں وہ فریاد ہوں

ہر نفس سرمایہ دارِ عشقِ کامل ہے مرا
مرحبا دردے کہ حسنِ دوست کی روداد ہوں

تو رازِ محبت کو سمجھا ہی نہیں ورنہ
پابندیِ انساں ہے آزادیِ انساں ہے

حسن کی اک اک ادا پر جان و دل صدقے مگر
لطف کچھ دامن بچا کر ہی گزر جانے میں ہے

میں تری اس نظر کی رعنائیوں کے صدقے
جو شکل ہے حسیں ہے دوشیزہ ہے جواں ہے

حسن میں جب تک کہ یہ شانِ خود آرائی نہ تھی
عشق میں مستی تھی لیکن خوئے رسوائی نہ تھی

دورِ چہارم میں جگر کا نظریۂ حسن و محبت مزید آفاقیت و ازلیت اختیار کر لیتا ہے اور ان کی شاعری خالص محبت اور انبساط کی شاعری ہو جاتی ہے۔ محبوب کی ارضی اور جنسی دلکشی کے اثرات بہت ہلکے ہو جاتے ہیں اور شعلۂ طور ماسوا کو خاکستر کرنے میں مزید کامیابیاں حاصل کر لیتا ہے۔ اس دور کے واردات جگر سے کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں:—

عشق کو بے نقاب ہونا تھا آپ اپنا جواب ہونا تھا
ایک رنگین نقاب نے مارا حسن بن کر حجاب نے مارا
پرتو حسن ذات نے مارا مجھ کو میری صفات نے مارا
نگاہوں سے چھپ کر کہاں جایئے گا جہاں جایئے گا ہمیں پایئے گا
دونوں ہی جفا جو ہیں جگر عشق ہو یا حسن اک یار نے لوٹا مجھے اک یار نے مارا
کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آ ہی گیا

پوری غزل مرصع اور نظریہ حسن و محبت کی تشریحات سے بھرپور ہے اس میں جذب دل کی برکتوں کی بدولت محبوب کو ہمہ وقت پیش نظر رکھنے کے تذکرے بھی ہیں اور تصور میں وصال محبوب و دیدار حبیب کے دل افروز مناظر بھی۔ ذکر یار سے جو کیف و سرور ملتا یا مل سکتا ہے اس کی جھلک بھی موجود ہے اور مرتے دم تک فدائے حسن و عشق رہنے کا عہد و پیمان بھی، جنون محبت کے مشاغل سے دلچسپی کی تفصیلات بھی ہیں اور جوش پرستش جذب الفت کے مظاہرے بھی۔

'داغ جگر' اور 'شعلہ طور' میں جو شورش و التہاب محبت کسی قدر ارضی خصوصیات حامل ہوتے ہوئے حسن تغزل و بیان شوق کی جان تھا اور مختلف و متنوع جلوہ ہائے دلکش لیے ہوئے تھا 'آتش گل' میں بیشتر یک رنگی و بصیرت آموزی کا شمع فروزاں بن جاتا ہے اور اپنی گیرائی۔ رسائی اور نور افشانی میں بے مثل و لاجواب ثابت ہوتا ہے 'آتش گل' سے حسن و عشق کی تعریف اور عرفان محبت کی تشریح ملاحظہ ہو:-

داغ جگر میں درد جگر اور حسن فطرت کا ربط باہم اور احساس محبت کی شدت و نزاکت ملاحظہ ہو :-

راز جو سینۂ فطرت میں نہاں ہوتا ہے
سب سے پہلے دل شاعر میں عیاں ہوتا ہے

حسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے
اہل دل کے لئے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

وقت آتا ہے اک ایسا بھی محبت میں کہ جب
دل پہ احساس محبت بھی گراں ہوتا ہے

کلام جگر میں نظریہ حسن و محبت کی مزید تشریح اور عشق کی تعریف ملاحظہ ہو :-

ہائے وہ حسن کا انداز کہ جس وقت جگر
عشق کے بھیس میں ہوتا ہے نمایاں کوئی

عشق مرنے پہ بھی نہیں مٹتا
یہ تعلق ضرور رہتا ہے

دور جاکر دیکھئے نزدیک آکر دیکھئے
ہم سے ہو سکتا تو ہم ان کو برابر دیکھئے

اللہ اللہ عشق کی رعنائیاں
حسن خود لینے لگا انگڑائیاں

تیری نصیحتیں بجا یہ تو بتا کہ ناصحا
اور ہے عشق کے سوا مقصد حسن یار کیا

حسن سے عشق جدا ہے نہ جدا عشق سے حسن
کونسی شے ہے جو آغوش در آغوش نہیں

وہ بھی ہے اک مقام عشق جہاں
ہر تمنا گناہ ہوتی ہے

محبت کیا ہے تاثیر محبت کس کو کہتے ہیں
ترا مجبور کر دینا مرا مجبور ہو جانا

یہ کیا مقام عشق ہے ظالم کہ ان دنوں
اکثر ترے بغیر بھی آرام آ گیا

لطافت مانع نظارۂ صورت سہی لیکن
دھڑکنا دل کا کہتا ہے وہ کوئی ہے یہاں دھوکہ

ہنسی بکھر اڑنے لگی عشق کے افسانے کی
نقاب اٹھا دیں تو فضا زمانے کی

کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

قیامت کیا یہ اے حسن دو عالم ہوتی جاتی ہے کہ محفل تو وہی ہے دلکشی کم ہوتی جاتی ہے
فکر منزل ہے نہ ہوش جادۂ منزل مجھے جا رہا ہوں جس طرف لیجا رہا ہے دل مجھے
خود حسن استعارہ ہے جس کے جمال کا وہ جان حسن حسن سراپا ہی اور ہے
نہیں معلوم کس عالم میں حسن یار دیکھا تھا کوئی عالم ہو لیکن دل کی حیرانی نہیں جاتی

حسن و محبت کی لطافتوں کو جس لطف کے ساتھ جگر نے سمجھا اور جس اشارت و عبارت میں ادا کیا وہ آپ اپنی مثال ہے۔ انھوں نے تخلیق کائنات کا راز حقیقت و مجاز دونوں میں تلاش کیا اور حسب دل خواہ پا بھی لیا۔ ان کا کلام ان کے نظریہ حسن و محبت کا شاہد ہے اور تصور عشق و پرستش کا حامل۔ انھوں نے حسن کو جاودانی پایا اور اپنے کلام کو اس سے متعلق کر کے لازوال و غیر فانی بنا دیا۔ حسن و محبت کی آفاقی قدروں اور شعر و سخن کی اعجازی ایجازی خصوصیات کا جہاں کہیں اور جب کبھی تذکرہ کیا جائے گا جگر اور نغمات جگر کو کبھی نظر انداز نہ کیا جا سکے گا۔ انھوں نے محبت اور عاشقی کو اپنے اشعار میں کچھ اس طرح ہم آواز و دمساز کر دیا ہے کہ ایک کو دوسرے سے نہ الگ کیا جا سکتا ہے اور نہ بھلایا جا سکتا ہے۔

جگر کے نظریہ حسن و محبت کے بیان کے بعد اب ان کے نظریۂ تغزل کے متعلق کچھ مشاہدات پر غور کر لیجئے۔ یہ تو پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ جگر نے زندگی کے تجربات و تاثرات کو بیان کرنے کے لئے صنف غزل کا انتخاب کیا اور مدت العمر اس کے قائل اور شیدائی رہے۔ غزل کہنا جتنا آسان ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ جہاں مشق سخن کی ابتداء غزل سے کی جاتی ہے

وہاں فنی مرقع نگاری اور فکری مینا کاری کی انتہا بھی اس ہی پر ہوتی ہے۔
دو مصرعوں میں ایک وسیع و لطیف مفہوم کو پوری قدرت اور کامیابی
کے ساتھ مکمل طور پر بیان کر دینا اور لب و لہجہ کی نرمی اور الفاظ کی شیرینی و
نغمگی کا خیال رکھنا، خیالات کی لطافت و احساسات کی شدت کو برقرار رکھنا۔
اصطلاحات و علامات کے انتخاب میں غزل کی نازک مزاجی اور طبعی
خصوصیات کو پیش نظر رکھنا۔ اور ترنم و تغزل اور رمز و ایما کے ربط باہم
کی اہمیت کو نظر انداز نہ کرنا ہر موزوں طبع کے بس کی چیز نہیں ہے۔
نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند
عرصہ ہوا ڈاکٹر اقبال نے حضرت داغ کے انتقال پر غزل و تغزل کا مرثیہ
لکھا تھا کہ شاید اب اس انداز پر ہوبہو عشق کی تصویر کھینچنے کا سلسلہ ختم ہو جائے۔
لیکن جگر کے انداز تغزل اور حسن بیان نے ان اندیشوں کو غلط ثابت کر دکھایا۔ اور
باوجود اس کے کہ جگر نے اقبال کی شاعرانہ عظمت اور بڑائی کو کبھی تسلیم نہیں کیا لیکن
ایک اچھے شاعر کی طرح اس کو قابل اعتنا ضرور سمجھتے رہے۔ انھوں نے کتاب دل
کی وہ تفسیریں لکھیں اور خواب جوانی کی وہ تعبیریں بیان کیں کہ اقبال کے پرستاروں
کو بھی ان کا لوہا ماننا پڑا۔ ان کے کلام میں فکر نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں بھی موجود
ہیں۔ اور قلبی واردات کے نقشے بھی۔ حسن فطرت کے مناظر بھی ملتے ہیں اور عرفان
و محبت کے لطائف روحانی بھی۔ دل دوز نشتریت بھی ہے اور کافور ہبری کی
آتش بداماں بھی۔ ان کے انداز تغزل میں ایک بانکپن اور لذت ہے اور ان کے
لب و لہجہ میں ایک تاثیر اور جاذبیت وہ محسوسات ذہنی کو اس سوز و لطافت کے

ساتھ نظم کرتے ہیں کہ عوام و خواص ان کے انداز بیان کی دلفریبی کے قائل ہو جاتے ہیں اور علما و فضلا بھی ان کی شخصیت اور شاعری میں ایک حکمت آموزی محسوس کرنے لگتے ہیں۔

تسلیم حسن دوست کی معصومیاں مگر — شامل کوئی تو فتنۂ شام و سحر میں ہو

اٹھتی نہیں ہے آنکھ مگر اس کے روبرو — نادیدہ اک نگاہ کیے جا رہا ہوں میں

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر — جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی — وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے — کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

اگر شامل نہ در پردہ کسی کی آرزو ہوتی — تو پھر اے زندگی ظالم نہ میں ہوتا نہ تو ہوتی

جگر نے اپنی شاعری کو قبول عام سے قبول خاص کے درجے تک جس طرح پہنچایا اس کی ایک ابتدائی جھلک مولانا سید سلیمان ندوی کے ایک تبصرہ میں ملاحظہ ہو۔ شبلی منزل میں ۱۹۲۰ء کے ایک مشاعرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

تعارف کے بعد حاضرین کی نقادانہ نگاہیں ایک خاص تبسم کے ساتھ (نوجوان) شاعر کے چہرہ کی طرف اٹھتی ہیں۔ (حاضرین محفل میں مولانا مسعود علی ندوی۔ مولانا عبدالسلام ندوی۔ پروفیسر عبدالباری عثمانیہ یونیورسٹی وغیرہ وغیرہ موجود تھے) مگر اس نے ماحول سے بے پروا ہو کر ایک عجیب درد انگیز ترنم۔ مست لہجے اور سرشار انداز میں ایک غزل کا ترانہ چھیڑا۔ ایک دو شعر پڑھے تھے کہ سب کو سنبھل کر بیٹھ جانا پڑا۔ ذہن کی رو کو ظرافت سے متانت کی طرف پھیرنا پڑا۔ تبسم کی نگاہ میں تحیر پیدا ہوا۔ سامعین کے لبوں میں لرزش پیدا ہوئی۔ لرزش آواز میں اور آواز احسنت و

مرحبا کی صدائے تحسین میں بدل گئی اب تو شاعر کی نسبت جلدی جلدی رائیں بدلنا پڑیں اور انکار رفتہ رفتہ مگر تیزی کے ساتھ اعتراف کی صورت میں بدلنے لگا۔ اور تھوڑی دیر میں شبلی منزل کے چھوٹے سے ہال میں شاعر کے توجہ آفریں ترنم کے سوا ہر آواز ساکت اور ہر جنبش ساکن تھی۔"

جگر کی شاعری ویسے تو اپنے موضوعات کے لحاظ سے رندی و سرمستی، تصوف و حکمت آموزی، ترنم و موسیقی، مسائل حیات و کوائف عصر، معاملات عشق و مصائب الفت غرضکہ جلوہ ہائے رنگا رنگ پر مشتمل ہے۔ لیکن جس چیز نے ان کے کلام کو ہر دل عزیزی اور مقبولیت عطا کی وہ انکا خلوص اور مخصوص زاویہ نظر و نظریہ حسن و تغزل ہی ہے۔ چند برگزیدہ کلام پیش کیا جاتا ہے۔

دل میں کسی کے راہ کئے جا رہا ہوں میں — کتنا حسین گناہ کئے جا رہا ہوں میں

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز — کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

مستی حسن غم عشق پہ یوں چھائی ہو — دل سے جو موج غم اٹھے تری انگڑائی ہو

ہو گئی دل کو تری یاد سے اک نسبت خاص — اب تو شاید ہی میسر کبھی تنہائی ہو

صد عشرت نگاہ مسلسل خوشا نصیب — لیکن لطافت نگہ مختصر کہاں

دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد — اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

وہ ہزار دشمن جاں سہی مجھے غیر پھر بھی عزیز ہے — جسے خاک پا تری چھو گئی وہ برا بھی ہو تو برا نہیں

بیتاب ہو بجواب ہو معلوم نہیں کیوں — دل ماہی بے آب ہے معلوم نہیں کیوں

جھونکے نفس نفس میں خوشبو کے آرہے ہیں — شاید وہ آج خود ہی تشریف لا رہے ہیں

طبیعت ان دنوں بیگانۂ غم ہوتی جاتی ہے — مرے حصے کی گویا ہر خوشی کم ہوتی جاتی ہے

شبِ فراق ہو اور نیند آئی جاتی ہے کچھ اس میں ان کی توجہ بھی پائی جاتی ہے

جو پڑی دل پہ سہہ گئے لیکن ایک نازک سی بات نے مارا

اب ان کا کیا بھروسہ وہ آئیں یا نہ آئیں آ اے غمِ محبت تجھ کو گلے لگائیں

دل کو سکون روح کو آرام ہو گیا موت آگئی کہ دوست کا پیغام آگیا

مشہور مغربی شاعر کیٹس نے اپنی ایک سانٹ میں ایک یونانی قدیم وضع کے برتن پر نقاش کے ہوئے قلم اور رنگ آمیزیوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس نے معشوق کے حسن کو مصور اور مقید کر کے ابدی اور لازوال بنا دیا ہے۔ بالعموم امتدادِ زمانہ حسن کی ارضی لطافتوں کو ہلکا اور دھندلا کر دیا کرتا ہے۔ لیکن جب مصوری اور نقاشی جذبات و تاثرات کی ہم آہنگ اور شریک کار ہو جاتی ہے تو حسنِ فانی بھی غیر فانی اور لازوال ہو جاتا ہے اور شاہکارِ مصور سجود عالم و مظہر حسنِ مطلق بن جاتا ہے۔ شاعر اور اچھے شاعر کا منصب بھی اسی قبیل کی چیز ہے وہ اپنے فکر و فن اور سحر و اعجازِ نازک احساسات اور محاکات کی مدد سے گزرے ہوئے لمحات یا تاثرات کی یاد اس انداز میں اپنے کلام میں محفوظ و منضبط کر دیتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے سامانِ نشاط و سرمایہ انبساط بن جاتی ہے۔

حضرت جگر نے جس انداز سے اپنے نظریہ حسن و محبت اور ذوقِ تغزل کو اپنے کلام میں پیش کیا وہ آپ اپنی نظیر ہے۔ ان کے یہ لمحاتِ تفکر اور واردات قلب ایک آفاقی حسن اور کیفِ سرمدی کے حامل ہیں اور امتدادِ زمانہ کی چیرہ دستی ان نقوش کو کبھی دھندلا یا بے آب نہیں کر سکتی۔ ان کے اشعار مسکراتی ہوئی ترنم ریز زندۂ جاوید تصویریں ہیں جو ہر نظر ہو گیا۔ وہ اہلِ درد مند کے لئے دفترِ معرفت اور

سامان صد انبساط ہیں اور رہیں گی۔

ان کے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی — جس طرف دیکھا کیا دیکھا کیا

بھرے ہوئے نگاہوں میں حسن کے جلوے — یہ کیا جمال جہاں میں ہوں اور بہار نہ ہو

حسن کے ہر جمال میں پنہاں — میری رعنائی خیال بھی ہے

یاد تش بخیر جب وہ تصور میں آ گیا — شعر و شباب و حسن کا دریا بہا گیا

اپنا اپنی وسعت فکر و یقین کی بات ہے — جس نے جو عالم بنا ڈالا وہ اس کا ہو گیا

شش جہت آئینۂ حسن حقیقت ہے جگر — قیس دیوانہ تھا محو رو‌ئے لیلیٰ ہو گیا

یہ کون تصور میں ہنگام سحر آیا — محسوس ہوا جیسے خود عرش اتر آیا

تو محبت کو لازوال بنا — زندگی کو اگر نہیں ہے ثبات

جسے سب لوگ حسن و عشق کی منزل سمجھتے ہیں — بلند اس سے بھی ہم اپنا مقام دل سمجھتے ہیں

یہ تو نہیں کہ عرض غم در خور اعتنا نہیں — حسن کو لیکن اے جگر فرصت ماسوا نہیں

پیش نظر ہے حسن دوست حسن کے ماسوا نہیں — عشق میں مبتلا ہوں میں ترک میں مبتلا نہیں

مناسب اور مخصوص الفاظ و محاورات کا برمحل صرف بھی ہمارے تغزل بالخصوص دبستان لکھنؤ کی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔ کلام جگر میں اس خصوصیت کی کار فرمائی کے دو چار نمونے ملاحظہ ہوں۔

پردۂ حسن سے کب برق تڑپ کر نکلی — یاد کرنے کی طرح سے انہیں جب یاد کیا

جب نگاہیں اٹھ گئیں اللہ رے معراج شوق — دیکھتا کیا ہوں وہ جان انتظار آ ہی گیا

ہائے یہ حسن تصور کا فریب رنگ و بو — میں یہ سمجھا جیسے وہ جان بہار آ ہی گیا

یوں بھی تکمیل غم عشق ہوا کرتی ہے — اس کی قسمت میں ہوں میں جو مری قسمت میں نہیں

وہ خود تسکینِ خاطر کر رہے ہیں — مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے

لگا دے تیلیوں میں آگ بلبل — لیے بیٹھی ہے آدابِ قفس کیا

نہ ہو صورت نہ ہو معنیٰ نہ ہو پردہ نہ ہو جلوہ — بیک لحظہ بیک ساعت عیاں ہونا نہاں ہونا

جگر کے تغزل میں ترنم و موسیقی کا ایک خاص مقام ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے کہ جس نے 'کلامِ شاعر بزبانِ شاعر' کی اہمیت کو واضح تر کر دیا ہے اور جگر کے لیے ہماری قلبی گہرائیوں میں جگہ بنا دی ہے۔ جگر کی نغمہ ریزی و نے نوازی روحِ انسانی کا ایک عنصرِ لطیف بن جاتی ہے اور ان کے اشعار کو تاثر اور تاثیر کا طلسم بنا دیتی ہے۔ ان کو خود بھی اس کا شدید احساس ہے اور اپنی شاعری میں نغمگی کو وہ برابر کا شریک سمجھتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں:-

سنائے تھے لب نے سے کسی نے جو نغمے — لبِ جگر سے مکرر سنائے جاتے ہیں

تغزل و ترنم کے دو ایک نمونے مزید ملاحظہ ہوں:-

میرا جو حال ہو سو ہو برقِ نظر گرائے جا — میں یوں ہی نالہ کش رہوں تو یوں ہی مسکرائے جا

دل کے ہر اک گوشہ میں آگ سی اک لگائے جا — مطربِ آتشیں نوا ہاں اسی دھن میں گائے جا

مجھے دے رہے ہیں تسلیاں وہ ہر ایک تازہ پیام سے
کبھی آ کے منظرِ عام پر کبھی ہٹ کے منظرِ عام سے

جان کر منجملہ خاصانِ میخانہ مجھے — مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

جگر نے اپنے نظریہ حسن و تغزل کی طرف جا بجا اپنے کلام میں اشارے کیے ہیں۔ بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کوئی حسین حسین ہی ٹھہرتا نہیں جگر — باز آئے اس بلندیِ ذوقِ نظر سے ہم

اٹھ گیا کیا جگرؔ نغمہ سرا　　　شور برپا ہے غزل خوانوں میں

رند ہوں وہ کہ غزل بھی مری رندانہ ہے　　　معنی و لفظ نہیں بادہ و پیمانہ ہے

کچھ ایسے اب بھی ہیں رندانِ پاکباز جگرؔ　　　کہ جن کو بے مئے و ساغر پلائی جاتی ہے

اسے سمجھے نہ سمجھے کوئی لیکن واقعہ یہ ہے　　　کہ ترکِ مے کشی پر بھی رہی ہے مے کشی اپنی

میرا کمالِ شعر بس اتنا ہے اے جگرؔ　　　وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانہ پہ چھا گیا

تیرا خلوص دلبری جان نہ ڈال دے اگر　　　نالہ بھی میرا مضمحل نغمہ بھی میرا بے اثر

مرے شعر میں ہیں نزاکتیں مری نظم میں ہیں لطافتیں
مری فکر میں کہیں اے جگرؔ ادبِ کثیف کی جا نہیں

صرف نقالی ہے مغرب کی جگرؔ　　　شعر میں جب مشرقیت ہی نہیں

جگرؔ کا یہ نغمہ ہے اور سازِ مشرق　　　یہ مغرب زدوں کی کہانی نہیں ہے

اشعار بن کے نکلیں جو سینۂ جگرؔ سے　　　سب حسنِ یار کی تھیں بے ساختہ ادائیں

گلوں سے مستی چھلک رہی ہے سراپا بلبل بہک رہی ہے
مگر کسی گوشۂ چمن میں غزل کوئی اپنی گا رہے ہیں۔

تکلف سے تصنع سے بری ہے شاعری اپنی　　　حقیقت شعر میں جو ہو وہی ہے زندگی اپنی

جگرؔ رہ جائے بن کر آہ جو اک کاسۂ سائل　　　نہ ایسی شاعری اپنی نہ ایسی زندگی اپنی

گلا یہ گر اُن شعر سے پوچھے کوئی جگرؔ　　　سب کچھ تو ہے مگر یہ کمی کیوں اثر میں ہے

مری طبیعت کو حسنِ فطرت سے ربطِ باطن نہ جانے کیا ہے
مری نگاہیں کبھی نہ اٹھیں طہارتِ چشمِ تر سے پہلے

قصہ مختصر جگرؔ نے ایک ایسا نظریہ حسن و تغزل قائم کیا کہ جس کی بدولت

ہماری غزل نئے ساز و سوز سے آشنا ہو گئی۔ اور از سرِ نو ہماری شاعری کی آبرو اور ہماری تہذیب کی آئینہ دار بن گئی۔ جگر کی شاعری میں ایک غیر معمولی تاثیر اور موسیقیت ہے اور ان کے بیان مطالب میں دلکش بھولا پن۔ ان کے کلام میں معیاری خلوص اور صداقت ہے اور ان کے وجدان میں بے پناہ شدت و سرشاری۔ وہ فرسودہ اور مبتذل طرز سخن سے کنارہ کشی کرتے ہیں اور لطافت و رنگینی کو چارسو عام کر دینا چاہتے ہیں۔ نئی ترکیبیں حسن و محبت کی باتیں اور الفاظ کا صحیح انتخاب ان کے کلام کو مزیدار بنا دیتا ہے اور وہ بنوٹ و صناعی کے پھیر میں پڑ کر مفہوم کا خون کرنے کے گنا ہگار نہیں ہوتے۔ تغزل ان کے یہاں ایک آتشِ سیال ہے اور وہ بقول خود تنگ مینا نہ ہوتے ہوئے بھی پیر مغاں ساں لئے جاتے ہیں۔

ان کا انداز فکر خالص مشرقی ہے اور ان کی مزاجی عالی مشربی ان کی بلند خیالی اور انفرادیت کی ذمہ دار ہے۔ ان کا رومانی تصور حیات ان کی شاعری میں وہ گیرائی اور عظمت پیدا کر دیتا ہے کہ حسن مطلق بھی ان کی دیدہ وری اور اسرار فہمی کا شیدائی ہو جاتا ہے۔ ان کے یہاں صرف عشاق ہی کے جذبات و احساسات کی ترجمانی نہیں ملتی بلکہ محبوب کے تاثرات کا بھی پورا احترام ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ وہ حسن کے پرستار بھی ہیں اور راز شناس بھی۔ وہ زندگی سے دور رہ جانے کے قائل نہ ہوتے ہوئے بھی بیکر محسوس کے پھندے میں پھنسنے کے خطاوار نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں بیان عشق و محبت کا ایک پاکیزہ سلیقہ ملتا ہے اور وہ سستی جذباتیت کا شکار ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں حسن سر بازار ذلیل و بدنام نہیں ہوتا اور عشق کوچہ و برزن میں

رسوائیوں سے دامن کشاں رہتا ہے۔ ان کی غزلوں کے اکثر مطلعے حسن و محبت کے تذکرہ کو زینت سخن بناتے ہیں اور ان کا منفرد انداز فکر فلسفہ جمال و جذبہ انسانیت کو مرکز خیال و نظر رکھتا ہے۔ وہ ایک بلند شخصیت اور پرخلوص انسانیت کے مالک ہیں اور اپنے کلام کے توسط سے ان ہی کیفیات کو ہر طرف عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جگر اپنی نغمہ پردازی اور اعجاز نگاری کی بدولت صنف غزل کے شیدائی رہے اور صنف غزل اپنی فطری اخلاص پسندیوں کی وجہ سے جگر کی پرستار رہی۔ صنف غزل نے جگر میں وہ والہانہ عقیدت اور اداشناسی پائی کہ حسین حیات کے لئے جگر کی حلقہ بگوش ہوگئی اور ان کی زندگی میں اس طالب صادق کے علاوہ پھر کسی دوسرے سے دل نہیں لگایا۔۔۔ جگر کا بھی یہ حال رہا کہ انھوں نے معاصرانہ ادبی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے غزل اور تغزل کو نئی دل کشی لذت بخشی جان نوازی اور زندگی دینے کی ذمہ داری اپنے سرلی۔ اور عشق و محبت کی وہ سب لافانی اور آفاقی قدریں اپنے کلام میں سمونے اور جذب کر لینے کی کوشش کی کہ جو جان تغزل ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری اور زندگی کو عشق و محبت شرافت و انسانیت کا نمائندہ خصوصی بنا لیا اور اپنے انداز فکر و بیان محبت کے ہاتھوں جان جہان و زندۂ جاوید ہو گئے۔ انھوں نے غلط نہیں کہا تھا۔

جہاں از من و من زجان محبت · بجان محبت کہ جان جہانم
خوشا نسبت عشق لافانی تو · فنا گشتم و زندۂ جاودانم

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

جگر۔ ترجمان عہد

جگر مرادآبادی کو رئیس المتغزلین اور شہنشاہ تغزل تسلیم کیا گیا ہے ان کی غزلیں پاکیزہ حسن و عشق کا حسین پیکر ہیں جن میں سوز و گداز، درد و غم، خلوص و محبت، تڑپ اور کسک، شدّت جذبات اور رعنائی خیال کے ساتھ موجود ہے۔ اور حُسن اپنی تمام محشر سامانیوں کو لئے ہوئے جلوہ گر ہے۔ لیکن ان غزلوں میں صرف حسن و عشق اور اس کے تمام لوازمات ہی نہیں ہیں بلکہ ان میں اشاروں اشاروں میں حالات حاضرہ پر تبصرہ بھی ہو جگر نے مختلف حیثیتوں سے ان کی ترجمانی کی ہے۔ کہیں اپنے وطن کی حالت زار پر آنسو بہائے ہیں، کہیں آزادی و حریت کے جذبات بیدا کئے ہیں، کہیں رہبران قوم کی گمراہیوں اور خود غرضیوں کا ذکر کیا ہے۔ کہیں اپنے وطن پر اپنا حق ثابت کیا ہے۔ ان اشعار کو دیکھیے۔

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر، کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر

مجھے دیں نہ غیظ میں دھمکیاں، گریں لاکھ بار یہ بجلیاں
مری سلطنت یہی آشیاں مری ملکیت یہی چار پر

عجب انقلاب زمانہ ہے، مرا مختصر سا فسانہ ہے
یہی اب جو بار ہے دوش پر یہی سر تھا زانوئے یار پر

ہر نگہ پہ بند شیں ایک ایک نفس کی پرسشیں
زمانہ پر قیامت بن کے چھا جا

ہوشیار اے عشق وہ نازک مقام آ ہی گیا
بنا بیٹھا ہے طوفاں در قفس کیا

جسے ہوائے زمانہ کبھی بجھا نہ سکے
ارباب چمن سے نہیں پوچھو یہ چمن سے

قدم قدم پہ وہ اک شمع راہ پیدا کر
کہتے ہیں کسے نکہت بربادکا عالم

اس اک جرم پر اس دنیا میں برپا قیامت ہے
گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز

کہ ہم بیدار ہیں اور اپنا مستقبل سمجھتے ہیں
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جارہا ہوں میں

چمن میں بس کب مجھ کو ہوائے بوئے گل آئی
ملک کے جو در ملنے کے غم اٹھائے ہوئے

قفس ہی میری قسمت میں لکھا تھا جب بہار آئی
ہمیں بہت نہ ستاؤ کہ ہیں ستائے ہوئے

محبت کی منزل ہی شاید یہ نہیں ہے
خلوص شوق، نہ جوش عمل نہ درد وطن

کہ جب دیکھئے امتحاں اور بھی ہیں
یہ زندگی ہے خدایا کہ زندگی کا کفن

جو طوفانوں میں پلتے جارہے ہیں
کوئی مصلحت روک دیتی ہے ورنہ

وہی دنیا بدلتے جارہے ہیں
پلٹ دیں زمانے کو جی چاہتا ہے

غزلوں کے علاوہ ان کی نظمیں بھی اپنے عہد کی آئینہ دار ہیں، ان کے کلام کا مطالعہ اس حقیقت کو بخوبی ظاہر کر دیتا ہے کہ جگر صرف غزل گو ہی نہیں تھے بلکہ ان کے سینہ میں ایک ایسا دل بھی تھا جس میں قوم وطن کی محبت بھری ہوئی تھی، وہ اپنے وطن کو آزاد و خوشحال دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی خود دار طبیعت کو یہ بات سخت ناگوار تھی کہ ان سے وفا کا تقاضا کیا جائے جس ملک کو انھوں نے اپنے خون جگر سے سینچ کر سرسبز و شاداب بنایا۔ آزادی کے بعد اس ملک کو ان کا دسمجھا جائے اور دوریان آزادی انھیں بے وفا اور

غدار سمجھیں۔ کوئی انسان جسے اپنے وطن سے محبت ہے اور جو ایک حساس اور دردمند دل رکھتا ہے۔ اس ذلت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ پھر جگر جو فطرۃً زیادہ حساس تھے کیسے برداشت کرتے۔ ۴۷ء کی خوں آشامیوں نے ان کے قلب جگر کو پاش پاش کر دیا۔ وہ غزل خواں ہوتے ہوئے اور رہتے ہوئے بھی اس خوں ریزی اور تباہی کو برداشت نہ کر سکے اور پکار اٹھے۔

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہو آج کل

سازِ حیات سازِ شکستہ ہو ان دنوں
بزمِ خیال بزمِ بیاباں ہے آج کل

انسانیت اکہ جس سے عبارت ہے زندگی
انساں کے سائے سے بھی گریزاں ہو آج کل

دل کی جراحتوں کے کھلے ہیں حسین حسین
ور اس کا نام فصلِ بہاراں ہے آج کل

شائستگی کے بھیس میں روحِ درندگی
انسان کے لباس میں شیطاں ہو آج کل

وہ قومیت کہ جس سے ہے انسانیت ذلیل
ہندوستاں میں کس قدر ارزاں ہو آج کل

یہ آزادی جس نے انسانیت کو بہیمت اور درندگی سے بدل دیا جس میں حق و انصاف کے بجائے ظلم و بربریت کا دور دورہ ہو گیا اور صدیوں کے ساتھی ہندو و مسلماں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ آزادی نہیں بربادی ہے۔

ہے زخم کائنات جو ہندو ہے ان دنوں
ہے داغِ زندگی جو مسلماں ہے آج کل

افسانہ بن گئی ہیں وسیع الخیالیاں
کم ظرفیٔ مزاج نمایاں ہے آج کل

اسی کم ظرفیٔ مزاج نے آزادی کو پیکرِ بے روح بنا دیا۔ تعصب، تنگ نظری، اقربا پروری، اور جانبداری نے ہر جگہ اپنا سکہ جما لیا۔ ہمدردی و محبت ختم ہوئی۔ عدل و انصاف دریا برد کیا گیا۔ ظلم و تشدد کا بول بالا ہوا، عداوت

دشمنی کا راج ہوا، رہبر، رہزن بن گئے، دوست دشمن ہو گئے۔ جمہوریت آمریت میں بدل گئی۔

کہتے ہیں جس کو صورتِ آزادیٔ وطن　　در اصل ایک پیکرِ بے جاں ہے آج کل
کانٹے کسی کے حق میں کسی کو گُل و ثمر　　کیا خوب اہتمامِ گلستاں ہے آج کل
سرمایہ داروں کی طرفداریاں ہیں سب　　لیکن مفادِ عام کا عنواں ہے آج کل

سب سے زیادہ ظلم و زیادتی اُردو زبان اور اس کے نام لیواؤں پر ہوا جس زبان نے آزادی و حرّیت کا نعرہ لگایا۔ جس زبان نے ہندوستان کے کونے کونے میں، ایک ایک شخص سے غلامی و محکومی کے خلاف جذبات بیدار کئے۔ جس کے بولنے والے سب سے زیادہ آزادی کی دیوی کے پرستار رہتے۔ وہ زبان آزادی کے بعد موت کے گھاٹ اتار دی گئی۔ اس کا نام و نشان تک ختم کرنے کی باقاعدہ مہم چلائی گئی، اس کے نام لیواؤں کو غدار اور پھالنسی کا حقدار ثابت کیا گیا، اس ظلم و ستم کے خلاف ہر شاعر اور ادیب نے آواز اُٹھائی جگر کیوں خاموش رہتے کتنا بلیغ طنز اور تیز نشتر ہے۔

ہونے کو یوں تو روزنئی ہیں عنایتیں　　اُردو زباں پہ خاص کر احساں ہے آج کل

تاہم انھیں یہ بھی احساس تھا کہ رہنمایانِ قوم میں سے چند ایسے حضرات ضرور ہیں جن کے قدم نہیں ڈگمگائے اگرچہ تعصب کے متوالے ان کی باتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ اور ان کو خاطر میں نہیں لاتے

کچھ رہبرانِ قوم جو مخلص ہیں واقعی　　ان کا چراغ بھی تہ داماں ہے آج کل

لیکن زیادہ تر رہنمایانِ ہند ایسے ہی ہیں جو بظاہر بڑے ہمدرد اور غمگسار بنتے

ہیں مگر درحقیقت ان سے بڑھ کر غدار ملک اور آزادی کا دشمن کوئی دوسرا نہیں
اکبر مرحوم نے کہا تھا۔

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

جگر مرحوم بھی ان گندم نما جو فروشوں سے بے خبر نہیں تھے۔

ہندوستان میں خیر سے ان کی کمی نہیں — لب پر ہیں جو خلوص کا دفتر لئے ہوئے
دیتے ہیں بات بات پر انسانیت کا درس — دل میں ہزار دشنہ و نشتر لئے ہوئے
چہرے جنونِ حبِ وطن سے دھویں دھویں — سینے خیانتوں کا سمندر لئے ہوئے
ظاہر میں اک مجسمۂ امن و آشتی — باطن میں لاکھ فتنۂ و محشر لئے ہوئے
کہتے ہیں بھائی بھائی ہیں اہل وطن تمام — پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لئے ہوئے

موجودہ سیاست کا دارو مدار اسی پر ہے کہ زبان سے ہمدردی و دوستی کرو مگر عمل اس کے برعکس۔ مکر و فریب و دغا اور دروغ آج کی سیاست کے عناصر اربعہ ہیں، "مصلحت وقت" اگر حق و صداقت کے خلاف ہے تو اس سے دور رہنا اور اس کا ترک کر دینا ہی بہتر ہے۔ مگر ایماندار و دیانتدار سیاستدال سچائی پر مصلحت وقت کو قربان کر دیتے ہیں۔ حسرت مرحوم نے سچے پیشوا کی پہچان یہ بتائی کہ

حق سے بعذر مصلحت وقت جو کرے گریز
اس کو نہ پیشوا سمجھ اس پہ نہ اعتماد کر

اور جگر مرحوم نے بھی صاف صاف کہدیا کہ

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی
انھیں خبر کیا نہیں ہے اس کی، انھیں میں ہیں فتنہ کار اب بھی
مگر وہ ہیں وقت و مصلحت کے قدیم و تازہ شکار اب بھی
خود اپنی بدنیتی کے ہاتھوں برے نتائج بھگت رہے ہیں
صداقتوں سے، حقیقتوں سے، وہی ہے لیکن فرار اب بھی
زبان و دل میں نہ ربط صادق نہ باہمی وہ خلوص کامل
جو تھے غلامانہ زندگی میں وہی ہیں لیل و نہار اب بھی

جب دلوں کا یہ عالم ہو اور تعصب و تنگ نظری اس حد تک پہنچ گئی ہو کہ اچھے اور برے کی تمیز اٹھ جائے تو پھر ملک و قوم آزاد ہوتے ہوئے بھی کیوں نہ افلاس وادبار میں مبتلا رہے؟ اس سوزِ جگر کے ساتھ کہہ رہے ہیں

ہمیں ملا کر بھی خاک و خوں میں نہیں ہیں وہ مطمئن ابھی تک
ہماری خاک لحد کے ذرے ہیں ان کے دامن پہ بار اب بھی
گرانیاں اس طرف وہ ارزاں، ادھر یہ افلاس و تنگدستی
مگر حکومت کا ہے یہ عالم ذرا نہیں شرمسار اب بھی

یہی نہیں ہے بلکہ ظلم کرنے والوں کو ترقیاں ملتی ہیں۔ مظلوموں کی داد فریاد سننے والا کوئی نہیں، رشوت نے مختلف شکلیں اختیار کرلی ہیں، سفارش، تعلقات ذرائع و وسائل، رشوت ہی کی دوسری مگر اس سے زیادہ موثر صورتیں ہیں، غریبوں کی کوئی نہیں سنتا، وہ صلاحیت و قابلیت رکھتے ہوئے بھی محض اس لئے محروم

ہیں کہ نہ ان کے پاس رشوت دینے کے لیے رقم ہے، نہ کسی بڑے اور با اثر شخص کا وسیلہ یا ذریعہ۔ نااہلوں کی ترقیوں پر ترقیاں ہوتی ہیں، کیونکہ ان کے ذرائع و وسائل ہیں، لیکن جمہوریت اور عدل و انصاف کا ڈھنڈورہ پیٹنے والے مہاتما گاندھی کی دہائی دینے والے اب بھی غافل ہیں اور اپنی "نااہلیت" کو تسلیم نہیں کرتے۔

یہ رشوتوں کی، یہ سازشوں کی، یہ لفع اندوزیوں کی لعنت
یہ خود ہی انصاف سے یہ کہدیں نہیں وہ کچھ ذمہ دار اب بھی
سفارشیں ظالموں کے حق میں پیام رحمت بنی ہوئی ہیں
نہیں ہے شائستہ سماعت، دکھے دلوں کی پکار اب بھی
اسی کا ہے نام اگر ترقی تو اس ترقی سے باز آئے
کہ خونِ مخلوق سے خدا کی زمین ہے لالہ زار اب بھی

جگر اپنے وطن کی ترقی کے خواہاں ہیں وہ اسے دنیا میں باوقار دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے وہ مشورہ دیتے ہیں کہ

وسیع مسلک، رفیع فطرت، خلوص ایماں، خلوص نیت
انھیں فضائل پہ ہے وطن کے وقار کا انحصار اب بھی
خلوص نیت سے صرف اپنی ہی زندگی پر کریں توجہ
خلوص نیت کی منتظر ہے سعادتِ کردگار اب بھی

جگر نے سیاست اور ارباب سیاست کی پُر فریب چالوں سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔

بازیچۂ اربابِ سیاست سے گزر جا
اس کارگہِ مکر و ضلالت سے گزر جا
تا چند یہ توہینِ حقوقِ مدنیت
اُٹھ اور اس قعرِ مذلت سے گزر جا
سیدھی سی بس اک راہِ صداقت پہ چلا چل
پُر پیچ گزرگاہِ سیاست سے گزر جا
ہوتی ہو یوں ہی نشو و نما فکر و عمل کی
ہنستا ہوا ہر جبرِ حکومت سے گزر جا
انسان بن انسان! یہی ہے تری معراج
رنگ و وطن و قوم کی لعنت سے گزر جا

حالاتِ حاضرہ سے بد دل ہو کر جگر نعرۂ انقلاب بلند کرتے ہیں، اور بے خوف ہو کے کہتے ہیں کہ

اٹھو اٹھو کہ زندگی ہی زندگی پہ بار ہے
بڑھو بڑھو کہ چار سو پکار ہی پکار ہے
کہاں کے مطرب و غزل کہاں کے نغمۂ چمن
کہ زندگی تمام تر بساطِ کارزار ہے
غضب کی چھائی جا رہی ہیں ظلمتوں کی بدلیاں
ستم کہ زد میں آندھیوں کی شمعِ روزگار ہے

انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنی جرأتِ باغیانہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

کدھر ہے تو اے جرأتِ باغیانہ
بدل دے مقدر پلٹ دے زمانہ
شرافت کا معیار افراطِ دولت
صداقت کی معراج لفظی ترانہ
زبانوں پہ اصلاحِ قومی کے نعرے
گر طینتیں بیشتر مفسدانہ
غریبوں پہ جو کچھ گزرتی ہے گزرے
سمٹ آئے جیبوں میں لیکن خزانہ
تاریخ سے بھی آنکھ کھلتی نہیں ہے
ہر اقدام اب تک ہے نا منصفانہ

جگر نے ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو اعلانِ جمہوریت کے نام سے جو نظم لکھی اس میں ان کی سیاسی بصیرت نمایاں ہے۔ کاش ان کی یہ دعا قبول

اور تمنا پوری ہو جاتی۔

خدا کرے یہ دستور ساز گار آئے
جو بے قرار ہیں اب تک انھیں قرار آئے

خلوص و ہمتِ اہلِ چمن پہ ہے موقوف
کہ شاخِ خشک پہ ابھی پھر سے برگ و بار آئے

نمائشی ہی نہ ہو یہ نظامِ جمہوری
حقیقتاً بھی زمانے کو ساز گار آئے

خلوص و عدل و مساوات دل میں گھر کر لیں
نہ یہ کہ ذکر زباں پر ہی بار بار آئے

دلوں کی کھوٹ ہو جس کے ضمیر میں شامل
نہ آئی ہے وہ سیاست نہ ساز گار آئے

بنا دیا ہے محبت نے آگ کو گلزار
مگر جو آج کے انساں کو اعتبار آئے

نہ ہو جو عام مسرت محال ہے اے دوست
کہ زندگی کو کسی حال میں قرار آئے

سید احتشام حسین

جگر کی شاعری ـــ موثرات اور محرکات

یوں تو ہم ہر اچھے شاعر کو اس کی مخصوص آواز سے پہچانتے ہیں اور اس امتیازی لب و لہجہ کی روشنی میں اس کی انفرادیت کا سراغ لگاتے ہیں لیکن یہ آواز اور یہ لب و لہجہ ان عناصر کے پروردہ ہیں۔ ان کی واقفیت بھی شاعر کے دل و دماغ تک پہونچنے میں معین ہوتی ہے۔ ایک حیثیت سے یہ مسئلہ ادبی نہیں نفسیاتی ہے۔ لیکن شاعر کے سوانح حیات اور نفسیاتی محرکات بھی اس کی ادبی شخصیت کا جز ہیں بلکہ بعض ناقدوں کے نزدیک صرف انھیں کی روشنی میں ادبی شخصیت کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ شاعری جذبہ اور ذہن کی مظہر ہے اور شاعر وہی ہے جو اس کا کلام ہے ممکن ہے کہ یہ باتیں مکمل حقیقت نہ ہوں۔ اور اس طرح شاعری کا مطالعہ کس قدر میکانکی شکل اختیار کرے تاہم یہ واضح ہو کہ انسان کے جسمانی، روحانی، ذہنی اور جذباتی تجربات ہی اس کا وہ سرمایہ ہیں جنھیں وہ شعروادب میں اپنا کہہ کر پیش کر سکتا ہے اس لئے شاعری کا مطالعہ ان پر غور کئے بغیر ممکن بھی نہیں ہے۔ اس موقعہ پر یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ اپنے آخری تجزیہ میں اس ذہنی اور جذباتی مواد کی بنیاد انسان کی مادی زندگی اور اس کے روابط ہی قرار پائیں گے لیکن یہاں ان کی فلسفیانہ تفصیل پیش کرنا

مقصود نہیں ہے۔ بعض شاعرانہ تخلیقات میں یہ بنیاد واضح ہوگی بعض میں ڈھکی چھپی۔ چنانچہ غزل جیسی داخلی صنف شاعری میں اس کے وجود کا احساس چراغ تہہ داماں کی طرح روشنی اور گرمی سے ہوگا۔ جگر مرادآبادی صرف غزل گو ہیں اس لئے ان کے یہاں بھی اس مادی احساس کی جستجو داخلیت کے پردے کو چیر کر ہی کی جاسکے گی۔ جسے انفرادیت اور امتیازی رنگ کہا جاتا ہے وہ بھی قائم بالذات نہیں ہے بلکہ مختلف عناصر کی کیمیادی ترکیب کا نتیجہ ہیں۔ جگر کی تخیل ان کے جذبات، محرکات اور عوامل پر نظر ڈالنے والا ان کی شاعری سے بھی زیادہ لطف اندوز ہو سکے گا کیونکہ شاعر کے نہاں خانۂ دل تک پہونچنا خود اپنی جگہ پر آسودگی بخش ہوتا ہے۔

جگر ایک متوسط مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جس میں رسمی تعلیم اور شعر و سخن سے وابستگی کا پتہ چلتا ہے خود ان کی تعلیم ابتدائی تعلیم اپنے والد کے زیر سایہ ہوئی لیکن اس میں کوئی ترتیب یا تنظیم نہیں تھی بہت سے فطری شاعروں کی طرح خود جگر نے بھی رسمی تعلیم کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ گھر کے حالات بھی ایسے تھے کہ انھیں جلد ہی اپنا راستہ تلاش کرنے کے لئے گھر سے نکلنا پڑا! اور زندگی کے ان تجربات کا سلسلہ شروع ہوا۔ جن سے ذہنی۔ جسمانی اور جذباتی عمل اور ردعمل کا ذخیرہ یکجا ہونے لگا۔ شاعرانہ ذہن کے لئے یہ ذخیرہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اپنی پسند اور سوجھ بوجھ شاعرانہ صلاحیت۔ فنی احساس کے مطابق انھوں نے اس ذخیرے کو غزل کی اس ہیئت میں ڈھالنا شروع کردیا جو اس وقت مروج اور عام تھی۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں جب جگر نے

شاعری کے میدان میں قدم رکھا۔ ہندوستان میں واضح طور پر دو مختلف رنگ اردو شاعری میں نمایاں تھے۔ ان کو آسانی کے لئے قدیم و جدید کہہ دیا جاتا ہے حالانکہ کئی حیثیتوں سے دونوں ایک دوسرے میں پیوست تھے، بات اتنی زیادہ شاعری کی نہ تھی جتنا زندگی کے حقائق کی مختلف زاویوں سے تسلیم کرنے کی تھی۔ پھر بھی عام طور پر جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے ایک رنگ وہ تھا جو داغ، امیر، اسیر، بحر، قلق وغیرہ کی غزلوں میں اپنی جھلک دکھاتا تھا اور دوسرا وہ جس میں میر اور غالب کے رنگ کو اپنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ کہیں کہیں شعوری طور پر دونوں اسلوبوں کو ملانے کی کوشش بھی نظر آتی ہے اور بعض شعرا کے یہاں جرأت اور مومن کے اثرات بھی دکھائی دے جاتے ہیں اس طرح گو جادو داغ ہی کا چل رہا تھا لیکن اپنی اپنی پسند کے اعتبار سے غزلگو اپنی راہیں الگ بھی نکال رہے تھے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ چھاپ کسی کی ہو لیکن ایک فطری شاعر محض نقال ہو کر نہیں رہ سکتا۔ استادی شاگردی کا تعلق بھی بعض فن کو پیچیدہ راہوں میں روشنی دکھاتا ہے۔ اس لئے جگر چاہے داغ کے شاگرد رہوں (جس کے متعلق مجھے شک ہے) چاہے رسا کے یا کسی اور کے، انھوں نے تھوڑے دنوں میں اپنی راہ خود بنالی۔ یہ راہ تقریباً پندرہ بیس سال کے ریاض کے بعد بنی کیونکہ داغ جگر میں شاذونادر ہی ایسے اشعار ملتے ہیں جو خیال یا انداز بیان کی وجہ سے متوجہ کرتے ہوں۔ روایتی مضامین تقریباً روایتی اسلوب میں پیش کئے گئے ہیں۔ ایک ہلکی سی بے ساختگی کہیں کہیں ضرور نظر آجاتی ہے جو بعد میں ان کے رنگ کا جزو خاص بنی۔ اس زمانے میں ان کی زندگی

میں کہیں ٹھہراؤ نہ تھا۔ اس کی مخصوص سمت بھی نہ تھی، تجارت کے بہانے وہ "تماشائے اہل نظر" میں مصروف تھے، مشاعروں میں شریک ہوکر خواص اور عوام کی نگاہیں دیکھ رہے تھے اور کبھی کبھی ارباب ادب سے مل کر اپنی قدر و قیمت کا اندازہ لگا رہے تھے۔" رندی اور ہوسناکی" کے اس دور میں جب شاعری زندگی نہ تھی۔ قدر دانی اور محبت کے جزیرے بھی اُبھرتے دکھائی دئے جہاں جگر نے قدم جماکر زندگی اور ادب کو دیکھنے کی کوشش کی۔

چونکہ ابھی تک جگر کی مفصل سوانح عمری مرتب نہیں ہوئی ہے اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ اصغر گونڈوی سے ان کی پہلی ملاقات کب ہوئی، پہلی دفعہ وہ اعظم گڈھ کے حلقۂ علم و ادب میں کب پہونچے اور علی گڈھ یونیورسٹی سے ان کا رابطہ کب شروع ہوا۔ اندازہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۵ء کے درمیان میں ہوا۔ کیونکہ اگرچہ داغ جگر میں بعض مقامات پر اصغر کا ذکر آیا ہے لیکن ان کا اثر واضح نہیں ہے داغ جگر کے بعد کا کلام جو شعلہ طور میں تخیلات جگر (یعنی کلام دور دوم) کے عنوان سے شامل ہے اس میں البتہ ایسے اشعار نظر آتے ہیں۔

گذر سکے تو گذر جا بہ طرز بے خبری ۔۔۔ یہ کل جہاں ہے فریب تجلی نظری

میں بتاؤں تجھ کو یہ راز کیا؟ تو اسی پہ دام قیود ہے
میں جہاں ہوں نغمہ سرا وہاں نہ وجود ہے نہ شہود ہے

عقل باریک ہوتی جاتی ہے ۔۔۔ روح تاریک ہوئی جاتی ہے

حجاب چھٹ نہ گئی ہوں حقیقتیں باہم ۔۔۔ مجھے ہے سبب تو کشاکش نہ کفر و دیں میں رہی

فنائے عشق کیا ہو کارواں حد کا رواں ہونا ۔۔۔ یہاں تک منتشر ہونا کہ بے نام و نشاں ہونا

ان اشعار میں ذہن کا رخ بالکل بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ان اشعار کا جگر بنیادی طور پر نہ سہی صفائی طور پر اس جگر سے مختلف، ترقی یافتہ اور فکر انگیز ہے جو داغ جگر کی غزلوں کا مصنف تھا۔ اس زمانے میں انھیں اپنی غزلوں میں رندانہ سرمستی اور عارفانہ معنویت کا احساس ہوا یہ ان کے ذہن کا تعمیری دور ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس میں وہ اثرات نمایاں طور پر شامل ہیں جنھیں میں علی گڑھ، اعظم گڑھ اور اصغر کے اثرات سے تعبیر کرتا ہوں۔ اسی زمانے میں انھیں اپنے جوہر بھی نظر آئے، خود شناسی کی اس منزل میں فن کا دامن بھی ان کے ہاتھ میں آ گیا۔

عالم تمام میرا تماشا ہوا جگر میں آپ اپنے شعر کا جب قدرداں ہوا
بزم مشاعرہ ہے یا گلشن تخیل بلبل چہک رہا ہے یا حضرت جگر ہیں
زندہ ہوں کہ غزل بھی مری رندانہ معنی و لفظ نہیں بادہ و پیمانہ ہے
واہ کیا مست غزل تو نے پڑھی آج جگر ایک اک لفظ چھلکتا ہوا پیمانہ ہے

اس وقت جگر کی عمر تیس اور چالیس کے درمیان تھی۔ اصغر گونڈوی سلیمان ندوی، اقبال سہیل، مرزا احسان احمد، رشید احمد صدیقی اور دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی صحبت میں ان کے ذہن پر جلا ہو رہی تھی۔ ان کی رندانہ سرگشتگی اور لاابالی افتاد طبع کے باوجود اردو کے یہ اہم ادیب اور شاعر ان کی نازبرداری میں لگے ہوئے تھے اور ان کے گرد سنجیدگی اور فکر انگیزی کی ایسی فضا تیار کر رہے تھے جس میں ان کی تخیل اور فن کاری کو پروان چڑھنے اور پھلنے پھولنے کا موقع مل رہا تھا یہ اثرات تہذیب نفس اور ادراک فن

میں کن کن زاویوں سے جگر کے شعور کا جز بنے ان کی ناپ کا کوئی پیمانہ نہیں
ہو سکتا لیکن دونوں طرف اس اثر اندوزی اور اثر انگیزی کے اعترافات
ملتے ہیں۔ یہ بھی نظر انداز کرنے کی بات نہیں ہے کہ ان شاعروں اور ادیبوں
سے نہ جانے کتنے شاعر ملتے رہے ہوں گے لیکن تعلقات نے وہ صورت
نہیں اختیار کی جو جگر کے معاملہ میں پیدا ہوئی۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ
خود جگر کی شخصیت میں کوئی ایسا پرکشش پہلو موجود تھا جس نے ان کی رندی
اور آشفتہ مزاجی کے باوجود اصغر، سلیمان ندوی اور رشید احمد صدیقی
جیسی لیے دیئے رہنے والی شخصیتوں کو اپنی طرف کھینچا۔ نفسیاتی نقطۂ نظر
سے جگر کے ارتقائے ذہن کا مطالعہ کرنے والے کو ان تعلقات میں بہت سے
ایجابی اور سلبی عناصر ملیں گے۔ ان محترم دوستوں اور بزرگوں کی صحبت میں
جگر کو جدید فن غزل گوئی کے اسرار و رموز کا علم ہوا۔ حیات و کائنات پر
نظر ڈالنے کے طریقے ہاتھ آئے، نفس مذہب اور تزکیۂ باطن پر غور کرنے
کے راستے دکھائی دیئے۔ انہیں صحبتوں کے بعد سے جگر حسن و عشق کے
مسائل بیان کرنے میں تصوف کے رموز و علامات سے کام لینے لگے اور
مذہب و اخلاق کے متعلق ان خیالات کا اظہار کرنے لگے جو رندی و ہوسناکی
کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ ان کی بے خودی میں جس ہوشیاری
کی نمود ہو رہی تھی۔ وہ عالمانہ کتابوں کے مطالعہ کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ان زندہ
کتب خانوں سے زندہ اور گہرے روابط کا نتیجہ تھی۔ یہ کہنا تو مبالغہ نہ ہوگا کہ
ان صحبتوں میں انھوں نے فکر و فن کی دشواریوں پر عبور حاصل کر لیا یا ان پار

بیان کی غلطیوں سے ان کا کلام بالکل پاک ہو گیا لیکن یہ ضرور ہوا کہ ان میں ایک طرح کی خود اعتمادی پیدا ہو گئی اور وہ چاہے شعر و ادب کے متعلق ہو یا مذہب و اخلاق کے متعلق، اظہار خیال میں اپنی رائے پر بھروسہ کرنے لگے

انھیں باتوں کو پیش نظر رکھ کر میں نے اس دور کو ان کی زندگی کے تیسری دور سے منسوب کیا ہے۔ یہ اُن کے پختگی حاصل کرنے کا دور تھا۔ اس وقت تک وہ عشق و محبت کی راہ میں بھی بہت سا سفر طے کر چکے تھے اور زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھ چکے تھے۔ انھیں اس بات کا شعور بھی حاصل ہو گیا تھا کہ ان کی شاعری کے کس پہلو کو عام طور پر پسند کیا جاتا ہے اور وہ مشق و ریاضت سے اسی رنگ کو جلا دے رہے تھے۔ شعلہ طور کا دور چہارم اور آتش گل اسی شعور کا نتیجہ ہیں۔

اب اگر جگر کی شاعری کو ان اثرات کی روشنی میں دیکھا جائے تو بڑی آسانی سے اس فرق کا پتہ چلایا جا سکے گا جو داغ جگر اور آتش گل کے جگر میں ہے۔ جگر کے یہاں رندی و سرمستی، ایک باطنی صوفیانہ میلان، شعور فن میں اگر ملک کی عام ادبی اور سیاسی رفتار کے اثرات اور محرکات کو بھی شامل کر لیا جائے تو اس ہر دل عزیزی کا راز فوراً معلوم ہو جائے گا جو انھیں اپنی زندگی کے آخری پچیس تیس سالوں میں حاصل ہوئی۔ کیونکہ انھوں نے خارجی اثرات کو بھی فراخدلی سے قبول کر کے اپنی غزلوں میں جگہ دے دی اور اس طرح دی کہ وہ جگر کے اور غزل کے مزاج سے ہم آہنگ رہے۔

جگر پر آخری گہرا اثر تقسیم ہند کا پڑا جس کے واضح نقوش آتش گل میں

قدم قدم پر نظر آتے ہیں لیکن ان کی حیثیت بھی متغزلانہ ہے۔ یہ اثرات بھی غزل کے مزاج کو درہم برہم نہیں کر سکے بلکہ اسی کا جزو بن گئے۔ مختصر یہ کہ وہ چاہے اصغر کی صوفیانہ حسن پرستی ہو یا سلیمان ندوی کا علم، آسی سہیل اور احسان احمد کا لطیف احساس تغزل ہو یا مولانا عبدالغنی منگلوری کی پاک نفسی کا پرتو، شراب نوشی اور شاہد بازی ہو یا تغیرات زمانہ کا اثر ساری چیزیں جگر کی غزلوں میں گھل مل کر ان کا انفرادی رنگ بن گئی ہیں۔ اس انفرادیت کی تہیں کھولنے کے لیے ان تمام عناصر کا تجزیہ کرنا ضروری ہوگا۔

محمد حسین شمس علوی کاکوروی

جگر کی شاعری میں تصوف

تصوف نے اردو شاعری میں محبت کے چراغ جلائے ہیں۔ اس کی بدولت شاعری کی دنیا روحانیت اور انسانیت کی دنیا بنی۔ اسی کی بدولت شاعری میں پاکیزہ جذبات اور اعلیٰ خیالات کی فراوانی ہوئی۔ اسی لیے انسانیت کو عرش سے زیادہ عظمت و رفعت۔ اور فرشتوں سے زیادہ عبودیت معصومیت عطا ہوئی اردو شاعری اس نورانی اور روحانی خزانہ سے معمور ہے۔ شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس کے یہاں تصوف کا رنگ نہ پایا جاتا ہو اکثر شعرا کا بیشتر کلام صوفیانہ ہے مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد کی تو پوری شاعری تصوف ہے۔

جگر مرحوم بھی تصوف سے متاثر تھے۔ ان کے سینہ میں سوز و درد سے بھرا ہوا دل تھا۔ اس دل میں شعلۂ طور اور آتش گل کی لپک تھی۔ وہ شروع سے ہی یاد محبوب میں مضطر اور تلاش یار میں بے چین رہتے۔ یہ تڑپ، یہ سوز، یہ گداز، ان کے کلام میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ اسی تڑپ نے انھیں مجاز سے حقیقت تک پہونچایا۔ اور حسن مجازی کا یہ شیدائی، حسن حقیقی کا سچا پرستار بن گیا۔ یوں تو جگر مرحوم کے ابتدائی کلام میں بھی تصوف کی جھلک موجود ہے۔

لیکن اس زمانہ کا کلام حسن مجاز کی عشوہ طرازیوں اور نغمہ و رباب کی دلکش

صداؤں سے زیادہ متاثر ہے۔ اس وقت تک وہ شاعر حسن و شباب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ تصوف کا رنگ اصغر مرحوم کی ملاقات سے زیادہ تیز ہونے لگا۔ یہ ملاقات بالکل اتفاقی تھی، مگر اس ملاقات نے جگر کے دل کی دنیا ہی بدل دی۔ دنیا میں اکثر بڑے بڑے انقلاب اسی اتفاق کا نتیجہ ہوئے مولانا روم کی شمس تبریزؒ کی ملاقات بھی اتفاق ہی تھا، لیکن اس ملاقات نے مولانا روم کو مولانا روم ان کی مثنوی کو "ہست قرآن در زبان پہلوی" بنا دیا۔

اصغر کی ملاقات کے بعد جگر کا بھی یہی عالم ہوا۔ ان کے فیض صحبت نے جگر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ ان کا کلام، رعنائی و دلبربائی کے ساتھ ساتھ متصوفانہ خیالات کا مظہر ہوتا گیا اصغر نے جگر کے دل میں وہ روشنی دیکھی جو بندہ کو خدا سے قریب کرتی ہے۔ وہ سوز پایا جو فراق یار میں کرب نہیں حظ عطا کرتا ہے۔ کیونکہ

اک شاہد بے تابی اک پیکر محبوبی ہر درد میں شامل ہو ہر سانس میں پنہاں ہے

اس لئے فراق و وصال، بے معنی الفاظ ہیں، مجاز و حقیقت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

کیسا مجاز اور کیسی حقیقت اپنے ہی جلوے اپنے ہی سائے

جگر میں یہ کیفیت قاضی عبدالغنی منگلوری کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے کے بعد اور زیادہ بالکیف و پُر اثر ہوئی جب جگر کے قلب کا جائزہ لیا گیا اور اسے عشق الٰہی کا حامل پایا گیا تو وہ جگر کو قاضی صاحب کی خدمت میں لے گئے اور ان کے دست حق پرست پر بیعت کرا دی۔ قاضی صاحب نقشبندی مجددی

سلسلہ کے ایک بزرگ اور عقیدہ وحدت الشہود کے قائل تھے۔ جگر ان سے بے حد متاثر ہوئے۔ قاضی صاحب سے انھیں بے پناہ عقیدت و محبت ہو گئی اور وہ حافظ شیرازی کے اس مسلک پر عامل ہو گئے۔

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید

امیر خسرو کی طرح انھوں نے بھی اپنے پیر طریقت کی کج کلاہی کو اپنا کعبہ مقصود بنا لیا۔

من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

قاضی صاحب نے جگر کو جگر بنا دیا۔ ان کے ذہن و خیال میں تصور محبوب کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔

مرے خوش تصور ہوا، نقش جمیل ان کا دوری ہو نہ مجبوری آنا ہے نہ جانا ہے

جگر کو اپنے پیر سے بڑی عقیدت تھی ان کے کلام میں جا بجا یہ عقیدت، شدت کے ساتھ موجود ہے۔ وہ فنا فی الشیخ کا درجہ حاصل کر سکے یا نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ انھیں شیخ کی حضوری حاصل تھی۔

جگر کے یہاں مختلف النوع خیالات کا امتزاج پایا جاتا ہے ان کا تصوف وجدان و سرمستی اور عقلی و دانائی کا حسین پیکر ہے اس میں تصوف کی گہرائی و گیرائی کے ساتھ ساتھ وسعت و بلندی بھی موجود ہے وہ مسائل تصوف سے پورے طور پر باخبر معلوم ہوتے ہیں اور رمزیت و محبوبیت کا ہر راز جانتے ہیں۔ ہمہ اوست، وحدت الوجود عملی و نظری سیرت معروضی و موضوعی تصوریت۔ ان کے تصوف کے خاص موضوع ہیں۔ جن کو وہ وجدان و کیف

کے عالم میں بیان کرتے ہیں۔ ان کا انداز بیان والہانہ اور دلکش ہوتا ہے۔ جس میں موزونیت و موسیقیت اور تاثر کی فراوانی ہوتی ہے۔ ان کا نظریہ تصوف زیادہ تر مسئلہ وحدت الوجود پر منحصر ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے محی الدین ابن عربی کے فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور وہ اس سے خاص طور پر متاثر ہوئے تھے۔ اور یہ نظریہ انھوں نے ابن عربی کے فلسفہ سے حاصل کیا اور اسی سے انھوں نے عرفان و ایقان کی شمع روشن کی ان اشعار کو دیکھئے:۔

لفظ و معنی میں نہیں جلوۂ و صورت میں نہیں
عشق اک چیز ہے جو حرف و حکایت میں نہیں

یہ کیا کیا کہ عطا کرکے عشق لا محدود مجھے حریف مقابل بنا دیا تو نے

اس حوصلہ کی داد دیجئے۔

بہار لالہ و گل شوخی برق و شرر ہوکر وہ آئے سامنے لیکن حجابات نظر ہوکر
یہاں تک جذب کرلوں کاش تیرے حسن کامل کو تجھی سب پکاریں گو رجاؤں جدھر ہوکر
یہ حاصل سرمایۂ عرفاں طلبی ہے یعنی ہوس دید خود اک بے ادبی ہے
سراپا دیدہ ہوکر غرق موج نور ہو جانا جس آئینے پہ نظر کی تیرا جواب ہوا
اک شاید بے تابی اک پیکر مجبوبی ہر درد میں شامل ہے ہر سانس سے پنہاں ہے

کوئی شک نہیں کہ

جگر کے متصوفانہ خیالات میں گہرائی و گیرائی، اصغر کی صحبت سے آئی، لیکن روحانی بلندی و وسعت، قاضی صاحب کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے سے

ملی. ان کے کلام میں جو روحانیت و خود سپردگی ملتی ہے وہ انھیں بزرگوں کی صحبت کا فیض ہے۔ قاضی صاحب کی نگاہ حق شناس نے مست و سرشار جگر کو رند پاکباز بنادیا اور انھیں ہر شے میں جلوۂ محبوب نظر آنے لگا۔

ہر پردۂ ہستی میں جب تو متشکل ہے　　　حیران ہوں میں جلوہ پھر کون سا باطل ہے

احمد رفاعی کے الفاظ میں

جگر کا مسلک ہمہ اوست یا مسئلہ وحدت الوجود کے باب میں سراج یا درد وغیرہ سے الگ نہیں لیکن جہاں تک مشاہدۂ حق کا تعلق ہے ان کا نقطۂ نظر وہ نہیں جو بیشتر شعراء کا رہا ہے۔ جگر کے نزدیک مشاہدہ کی حقیقت اسی قدر ہے کہ مشاہدہ صرف اپنی ہی ذات کا ہوا کرتا ہے۔ جس حد یا جس جہت تک ہو سکے۔ اس موضوع پر جگر نے جا بجا نت نئے انداز سے اظہار خیال کیا ہے۔ اور اگر قدرے کاوش نظری کا ثبوت دیتے ہوئے تجزیہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ ایسے متعدد اشعار جن پر تصوف و معرفت کی پرچھائیاں سی پڑی ہوئی ہیں ان میں سے بیشتر شاعر کے اسی بنیادی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں۔ موقع و محل کا اقتضا ہے کہ چند اشعار یہاں بھی پیش کر دیے جائیں۔

اے قیس نظر حسن حقیقت سے خبردار　　　سایہ ہے اسے صاحب محمل نہ سمجھنا
خود اپنے عکس کو اپنے مقابل دیکھنے والے　　　ذرا آنکھیں تو کھول او نقش باطل دیکھنے والے
یہ محفل ہستی بھی کیا محفل ہستی ہے　　　جب کوئی اٹھا پردہ میں خود ہی نظر آیا
اللہ رے کمال خودی کی یہ وسعتیں　　　میرا ہی سامنا ہو جدھر دیکھتا ہوں میں
نقاب حسن دو عالم دکھائی جاتی ہے　　　مجھی کو میری تجلی دکھائی جاتی ہے

آئینہ خانۂ عالم میں کہیں کیا دیکھا　　تیرے دھوکے میں خود اپنا ہی تماشا دیکھا
جب عشق اپنے مرکزِ اصلی پہ آ گیا　　خود بن گیا حسین دو عالم پہ چھا گیا

جگر کے تصوف کو فلسفہ کے خشک اور خارزار وادی سے جس چیز نے بچا لیا وہ خود ان کا والہانہ انداز بیان ہے جو شعلوں سے کھیلتے ہوئے بھی اپنا دامن بچائے جاتا ہے۔

اس حسن برق وش کے دل سوختہ وہی ہیں　　شعلوں سے بھی جو کھیلیں دامن کو بھی بچائیں

وہ کیف و محبت سے اگر کبھی ہٹتا۔ ہوتے ہیں تو کوئی انھیں گدگداکر ان کے درد و کرب میں اضافہ کر دیتا ہے۔

خوشا وہ درد محبت نہ ہو وہ دل کہ جسے　　ذرا سکوں ہوا گدگدا دیا تو نے
جمال حسن کی ہلکی سی لہر دوڑا کر　　نفس نفس کو مرے جگمگا دیا تو نے
تجھ سے وحشی ترے غافل نہیں ہونے پاتے　　روز آکر کوئی زنجیر ہلا دیتا ہے

روزانہ گدگدانے اور زنجیر ہلانے ہی کی بدولت، جگر ہزاروں لغزشوں کے باوجود رفتہ رفتہ مقام بے مقام تک پہنچ گئے

اول اول ہر قدم پر تھیں ہزاروں لغزشیں　　آخر آخر اک مقام بے مقام آ ہی گیا

اور اس مقام بے مقام پہ پہنچ کر جگر کی عمر بھر کی قرار پا گئی۔

جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

گلہائے عقیدت

یادِ جگرؔ

قمر مرادآبادی

ہندوستان کا حافظؔ و خیامؔ اُٹھ گیا
مے بھی ہے میکدہ بھی مگر جام اُٹھ گیا

روشن تھی جس کے حُسنِ تغزل سے بزمِ شعر
وہ آخری چراغِ سرِ شام اُٹھ گیا

دورِ جہاں سے جس نے نہ کھائی کبھی شکست
اب وہ حریفِ گردشِ ایام اُٹھ گیا

"اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل"
پیغام دے کے صاحبِ پیغام اُٹھ گیا

"پلکوں کی اوٹ حشر کا ساماں کئے ہوئے"
محفل سے آج ساقیِ گلفام اُٹھ گیا

اس میکدے میں بیٹے کو پیتے رہیں گے سب
لذت شناسِ دُردِ تہِ جام اُٹھ گیا

اللہ رے عزم آ گئی منزل اُسی طرف
اُس رندِ "خوش نفس" کا جدھر گام اُٹھ گیا

"کاریگرانِ شعر سے کہہ دے کوئی جگرؔ"
بزمِ سخن سے شاعرِ الہام اُٹھ گیا

مستی میں اب حجابِ محبت اُٹھائے کون
تصویرِ زندگی کا حسین رُخ دکھائے کون

ذوقِ نیازِ عشق کو سب آزما چکے
لیکن غرورِ حُسن کو اب آزمائے کون

"اب کون ہے جو شیشۂ خالی سے پی سکے"
بے کیفیوں کو کیفِ مسلسل بنائے کون

جس لغزشِ جنوں پہ کریں رحمتیں بھی ناز
ایسی ادائے خاص سے اب ڈگمگائے کون

سوزِ جگر تو خاکِ زمیں نے دبا لیا
اب دیکھنا ہے "آتشِ گل" کو دبائے کون

نقشِ حیات دورِ جہاں نے مٹا دیا
اب دیکھنا ہے "داغِ جگر" کو مٹائے کون

ہر انجمن میں "شعلۂ طور" آئے گا نظر
دنیا سے اس صحیفۂ دل کو اٹھائے کون

عشق بیانِ خود کو کرے کون سحر طراز — اب حسن کی شکست کا عالم دکھائے کون

سب کی نظر پہ کرے کون اعتماد
اب حسنِ محوِ خواب کو یوں گدگدائے کون

مٹ کر غزل کو زندۂ جاوید کر گیا — دورِ خزاں سے رنگِ بہاراں نکھر گیا

اب ڈھونڈتے پھریں گے طلوعِ سحر کسے — جھونکا نسیم کا تھا اِدھر سے اُدھر گیا

گلشن میں اب وہ طوطیِ شیریں بیاں نہیں — چہرہ ہر ایک گل کا یہ سن کر اتر گیا

ہر شعر میں تھا جس کے محبت کا اک پیام — دنیائے شاعری کا وہ پیغامبر گیا

تاریخِ شاعری نے ورق اک الٹ دیا — جب یہ خبر سنی کہ جگر بھی گزر گیا

اک رنگ میں مجاز و حقیقت ملا دیئے — آیا تو بے خبر تھا مگر با خبر گیا

یوں اٹھ گیا وہ انجمنِ شعر سے قمر — جیسے کہ ایک دورِ زمانہ گزر گیا

[illegible] میں اپنے چھوڑ گیا [illegible] زندگی — آئینہ رہ گیا ہے اور آئینہ گر گیا

بیٹھے ہیں منتظرِ سحر دیکھتے رہے
اور آفتاب پاس سے ہو کر گزر گیا"

سخنِ جگر

عمر انصاری

غنچے ترے ہیں، پھول ترے ہیں، چمن ترا — رنگِ رخِ بہار ہے رنگِ سخن ترا

کیا پوچھنا نفاستِ تخئیل کا تری — ہے چاندنی اک اترا ہوا پیرہن ترا

آئینہ دارِ حسنِ عروسِ بہار تھا — منہ دیکھتے تھے گل دمِ فکرِ سخن ترا

جب عقل و آگہی سے کبھی نکلی نہ کوئی راہ — آیا جو کچھ بھی کام تو دیوانہ پن ترا
افسانہ کہکشاں کا سناتی ہے جب بھی رات — کرتی ہے یاد جذبۂ حُبِّ وطن ترا
مانا کہ محوِ خواب ہے زیرِ زمیں مگر — میلا نہ کر سکے گا زمانہ کفن ترا

ہے آبروئے شہرِ غزل تجھ سے آج بھی
سب کچھ گیا مگر نہ گیا بانکپن ترا

از عرشی ساقی صدر
شعبۂ اردو اسلامیہ کالج لکھنؤ

وفاتِ جگر مرادآبادی سے متاثر ہو کر

ایسے مطرب کی نغمہ سنجی کے — تھے مسیحا نفس، تمنائی
جس کی آواز روح افزا ہو — جس کی لے ہے ضامنِ شکیبائی
جس کی ہر موج، بن کے شعلۂ نور — کرے ہر شب میں انجم آرائی
جس کی سحر آفریں صداؤں سے — حُسن بن جائے خود ہی سودائی
لبِ جاں دوطرازہ سے جس نے — مشہدِ غم میں کی مسیحائی
ہوش جس کا جنوں کا آئینہ — جس کی مستی، حریفِ دانائی
جس نے دکھلائی آتشِ گل میں — شعلۂ طور کی سی رعنائی
جس کے سازِ غزل کے پردوں میں — ساری دنیائے حُسن کھنچ آئی
تھی اسی انتظار میں محفل — دفعتہً غیب سے صدا آئی

وہ غزل خوانِ زندگی نہ رہا
صدرِ بزمِ سخنوری نہ رہا

رئیس المتغزلین

عارف سیالکوٹی

عظمتِ شعر و اوجِ بامِ غزل
نکتہ داں فائز المرامِ غزل

"نازبردارِ نازنینِ سخن"
شانۂ کاکلِ کلامِ غزل

سالکِ جادۂ بہشت سواد
عارفِ رفعتِ مقامِ غزل

بے نیازِ غمِ جدید و قدیم
سرخوشِ بادۂ پیامِ غزل

تو طلبگارِ نالہ و شیون
تو خریدارِ ابتسامِ غزل

تو فروغِ بہارِ شعر و سخن
تو جمالِ مہِ تمامِ غزل

آخری رندِ دورِ جامِ غزل
تیرے دم سے تھا احترامِ غزل

تو نے بخشا غزل کو عزّ و وقار
صاحبِ تزک و احتشامِ غزل

تیرے دم سے غزل ہوئی مقبول
تجھ سے رنگینیٔ پیامِ غزل

شرحِ احساسِ غم برنگِ نشاط
وصفِ حسنِ ازل بنامِ غزل

حسن و شوخی لطافت و ندرت
اللہ اللہ یہ اہتمامِ غزل

اس ادا سے تو نغمہ بار ہوا
تجھکو کہنا پڑا امامِ غزل

"جلوۂ طور" اس طرح چمکا
پھر دمک اُٹھے صبح و شامِ غزل

بادۂ احمریں کے پردے میں
"آتشِ گل" سے پُر ہے جامِ غزل

قائدِ راہِ احتشامِ غزل
تجھ سے زندہ رہے گا نامِ غزل

مرگِ جگر

سحر مراد آبادی

بکھرے ہوئے ہیں نغمے ہر سو ترے چمن میں
جادو جگا گیا ہے دنیائے شعر و فن میں

تو جانِ شاعری تھا اے حافظِ زمانہ
تجھ سا ہوا نہ ہوگا اب کوئی انجمن میں

کیوں نالہ و فغاں میں نغمات ڈھل نہ جائیں
مرگِ جگر کا ماتم ہے چار سو وطن میں

اے شہنشاہِ تغزل آفتابِ شاعری
دورِ حاضر میں غزل کو تو نے بخشی زندگی

اے کہ تیرے شعر میں پنہاں ہے سوزِ عاشقی
تو نے بخشا شاعری کو اک سرودِ آگہی

اے امینِ حسنِ فطرت شاعرِ سحر البیان
تری فکرِ شعر میں پنہاں ہے کیفِ جاوداں

ترے سوزِ عشق کی تصویر ہے "داغِ جگر"
محفلِ حسنِ ادب تجھ سے ہوئی تابندہ تر

شعلہ ہائے طور بھڑکا کے غزل آرا ہوا
تو نے بخشی ہے ادب کو ایک راہِ ارتقا

تو نے بخشا ہے غزل کو اک نوکھا بانکپن
"آتشِ گل" سے دہک اٹھا ہے اردو کا چمن

گو تجھے دستِ اجل نے کر دیا ہم سے جدا
ہے ہمارے دیدہ و دل میں مگر جلوہ ترا

اے کہ تیری ذات تھی انسانیت کی شاہکار
تجھ پہ نازاں ہے ادب تجھ سے وطن کا ہے وقار

اے کہ تیری ذات تھی حسنِ شرافت کی امیں
تیرے حلم و خلق کا چرچا ہے ہر سو بالیقیں

اب کہاں سے لائے گا کوئی ترا حسنِ بیاں
تو محبت تھا سراپا نیز انساں اب کہاں

اب زمانے میں کہاں کوئی ترا نعم البدل
حافظِ دوراں تھا تو اے خاتمِ عہدِ غزل

سوزِ جگر

از
عبدالرشید خاں قمر لکھنوی

پیغام قیامت خبرِ مرگِ جگر ہے
تسکینِ دہ قلب و جگر ذاتِ جگر تھی

غم دیدہ و نم دیدہ زمانے کی نظر ہے
کل یادِ جگر باعثِ تسکینِ جگر تھی

ہر غنچہ و گل پر اثرِ برق و شرر ہے
جس ساز میں آوازِ جگر رقص کناں تھی

جس گل کو سمجھتے ہیں کہ پژمردہ نظر ہے
عرفانِ محبت ہو کہ ہو معرفتِ حسن

یا عالمِ ہوش پہ بجلی کا اثر ہے
اب مرگِ جگر سوزِ جگر داغِ جگر ہے

مرگِ جگر اے دوست بڑی سخت خبر ہے
اب یادِ جگر ہی سببِ دردِ جگر ہے

خاکسترِ گل اور تغزل پہ [illegible]
وہ ساز بھی بے اثر [illegible]

گلزارِ جگر میں [illegible]
اور اک شمع [illegible]

اور اک شمع بجھی

دلاور فگار، ایم اے

اور تاریک ہوا شامِ غزل کا سایہ
دلِ مایوس کا ایک اور سہارا ٹوٹا
اک قدح نوش اٹھا شعر کے میخانے سے
نالۂ بلبلِ شیدا سے چمن خالی ہے
جس کے نغمات نے تاریخ کا رُخ موڑ دیا

اور اک شمع بجھی، اور اندھیرا چھایا
نالۂ شعر سے ایک اور ستارا ٹوٹا
ایک عنوان جُدا ہو گیا افسانے سے
"حافظِ ہند" سے "شیرازِ سخن" خالی ہے
آج اُس "شاعرِ فطرت" نے قلم چھوڑ دیا

وہ چمن بندِ جہاں جس کو جگرؔ کہتے ہیں　　کر گیا عالمِ فانی سے سفر کہتے ہیں
اپنی محفل میں اب ایسا کوئی مے نوش نہیں　　"میکدہ ساز" تھا وہ "میکدہ بردوش" نہیں
محفلِ کیف میں اب کون قدم رکھے گا　　کون اب "مستِ نگاہی کا بھرم" رکھے گا!
کون اٹھائے گا رخِ شاہدِ فطرت سے حجاب　　کون دیکھے گا محبت کو بر افگندہ نقاب؟
کون دکھلائے گا ہر پہلوئے تصویرِ غزل　　کون سلجھائے گا اب زلفِ گرہ گیرِ غزل
کس سے پوچھیں کہ حدیثِ گل و بلبل کیا ہے؟　　کون سمجھائے کہ مفہومِ تغزل کیا ہے؟
اپنا ہمراز نہیں سبھی بہاریں کس کو!　　گل ہیں خاموش پکاریں تو پکاریں کس کو؟
کس کے اشعار پہ اب روحِ غزل جھومے گی؟　　منزلِ شعر و سخن کس کے قدم چومے گی؟
مستیِ بادۂ خیام اسے ڈھونڈھے گی!　　مدتوں گردشِ ایام اسے ڈھونڈھے گی؟
عارف و شعری و تمکین و فنا، راز و خمار　　اس کے فیضان سے ہے ایک زمانہ سرشار
دیکھیے اس کی یہ آواز کہاں تک پہونچے؟　　"میرا پیغام محبت ہے، جہاں تک پہونچے"

چمن "آتشِ گل" زرد نہیں ہو سکتا
شعلۂ "طور" کبھی سرد نہیں ہو سکتا

جگر کے غم میں تین آنسو

نشتر اکبرآبادی

●

اہلِ دل جھومیں گے اب کس کے حسیں اشعار پر
کون گائے گا غزل اب سازِ دل کے تار پر

●

حُسنِ معصوم کو روتا ہوا دیکھا نہ گیا
ہچکیاں لیتے ہوئے بیساختہ میں بول اٹھا
اے پری چہرہ حسیں پیکر۔ معصوم نظر
تیرے اس گریۂ پیہم سے خجل لعل و گہر
اس مری جرأتِ رندانہ سے ناراض نہ ہو
مجھ سے روتا ہوا دیکھا نہیں جاتا تجھ کو
یہ گزارش ہے کہ اے حسن کی تصویرِ الم
کون ہے کچھ تو بتا جس نے کیا تجھ پہ ستم؟
نام کیا ہے ترا۔ تو کون ہے کیوں روتی ہے؟
اتنے رونے سے کبھی تسکین نہیں ہوتی ہے
دیکھ یہ مرقدِ غالب نہ لرز جائے کہیں
تیرا نوشاہ نہ مرقد سے نکل آئے کہیں

●

ہچکیاں لیتی ہوئی۔ پونچھ کر آنسو بولی
آگیا ہوش میں طوفان زباں کیا کھولی
داستاں میری غم انگیز ہے۔ اصرار نہ کر
دشمنِ ہوش و جنوں خیز ہے اصرار نہ کر
میں ہوں شہزادیٔ اصنافِ سخن جانِ کلام
صبحِ بتخانہ پہ چھائی ہوئی میخانہ کی شام
جھک کر الفاظ و معانی مجھے کرتے ہیں سلام
فکر و جذبات و تخیل مرے در کے ہیں غلام
حافظ و سعدی و عطار کے پیمانوں میں
عرفی و جامی و تبریز کے میخانوں میں
مستیٔ چشم کا اک عکسِ حسیں تھا میرا
نورِ دل۔ نورِ نظر۔ نورِ جبیں تھا میرا
اہلِ دل۔ صاحبِ فن مجھکو "غزل" کہتے ہیں
یعنی اربابِ سخن مجھ کو "غزل" کہتے ہیں
ملکہ ہوں۔ بڑے ارمانوں کی پالی ہوں میں
وقت ہے۔ اب درِ غالب پہ سوالی ہوں میں

●

آج سے دو سو برس قبل۔ ولی کے گھر میں
میں نے اک اجنبی ماحول میں آنکھیں کھولیں
نیا لہجہ۔ نئی آواز۔ نیا طرزِ بیاں
ہندی و فارسی آمیختہ۔ سیدھی سی زباں
قائم و ضامن و مضمون نے بصد مہر و وفا
تربیت کی مری۔ تعلیم دی۔ پالا۔ پوسا
میر نے سر پہ رکھا ہاتھ لڑکپن میں مرے

فکر کے لعل و گہر بھر دئے دامن میں مرے
زندگی بھر رہا سودا کبھی۔ مرا سودائی
تیرگی ہو کے رہی۔ تیر سے شہرت پائی
لب نازک کو مرے نذر کئے برگ گلاب
نیم وا آنکھیں مری دیکھتے ہی چیخ اٹھا
نگہ مست میں ہے کیفیت موج شراب
میری پلکوں کو کیا تیز مثال نشتر
جب یہ چلتی تھی تو لگتی تھی دلوں پہ ٹھوکر
سادگی دے کے مجھے صاحب تاثیر کیا
اور مری زلف گرہ گیر کو زنجیر کیا
آنسوؤں کو غم و آلام کے گوہر دے کر
چستی بندش و مضمون کا زیور دے کر
ہاتھ میں قوت و تاثیر کا نشتر دے کر
حسن معنی کو مرے صاحب اعجاز کیا
جملہ اصناف سخن میں مجھے ممتاز کیا
مثنوی۔ بیت۔ قطعہ۔ نظم۔ رباعی۔ خمسہ
سب مرے سامنے آتے ہوئے شرماتے تھے
اور قصیدوں کا یہ عالم تھا کہ نادم ہو کر
سامنے سے مرے کترا کے نکل جاتے تھے

●

درد نے آ کے مجھے درد کی دولت بخشی
رنگ جرأت نے مرے قلب کو جرأت بخشی
اسی اثنا میں لگا دل پہ مرے قدر کا تیر
مل گیا تاج کی بستی میں میسر راہ نظیر
گاؤں گاؤں گئی اس دیس کے میلے دیکھے
بھنگ پی۔ ہولی۔ دوالی کے جھمیلے دیکھے

●

ذوق نے آ کے دیا حسن نظر ذوق سلیم
ہو گئی خیر سے دربار معلیٰ میں مقیم
پھر مری شاہ ظفر نے بھی بڑھائی توقیر
میری عصمت کے نگہدار بنے شاہ نصیر
شیفتہ نے بھی مرے ذوق کا ساماں کیا
آ کے مومن نے مجھے صاحب ایماں کیا

●

آخرش آ گیا جس کے تھے دل و جاں طالب
یعنی شہزادۂ اقلیم سخنداں غالب
اس کے آتے ہی نئے دور کا آغاز ہوا
کوچۂ دل کی طرف باب سخن باز ہوا

شعر و نغمہ رو رہے ہیں اپنے حالِ زار پر
"جان ہی دیدی جگرؔ نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا" (جگرؔ)

●

کر کے قرباں دین و ایماں ابروئے خمدار پر
ہوش کر ڈالے نچھاور شوخیٔ رفتار پر
دل بھی کر ڈالا تصدق کاکل و رخسار پر
"جان ہی دیدی جگرؔ نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا" (جگرؔ)

●

سر جھکا کر آستانِ سید الابرار پر
عرض کی مولیٰ کرم فرمائیں بادہ خوار پر
ڈالدی آخر مسیحا نے نظر بیمار پر
"جان ہی دیدی جگرؔ نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا" (جگرؔ)

شعلہ طور بجھا

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد"
(غالب)

میرے سینے پہ تھا غالب کا مصور دیواں
نصف شب بیت گئی تھی مجھے پڑھتے پڑھتے
"شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد"
مصرعۂ ثانی کو جب بار دگر دہرایا
آنکھیں جھکنے سی لگیں۔ نیند کا جھونکا آیا
نیند آتے ہی میں اک خواب کے آغوش میں تھا
کیف میں شعر کے گم ہو کے بھی کچھ ہوش میں تھا
آج الفاظ و معانی کی گذر گاہوں سے
فکر و تخیل کی محفل میں چلا آیا تھا
ڈھونڈتے ڈھونڈتے لیلئ سخن کو گویا
قیس ویرانے سے محمل میں چلا آیا تھا

●

میں نے دیکھا کہ ہوں۔ بائین مزارِ غالب
اور اسی شعر کے حسن نقش حسیں کی ملکہ
زندگی دی ہے جسے خامۂ چغتائی نے
حسن بخشا ہے جسے فکر کی رعنائی نے
مجھ سے کچھ دور۔ وہیں مرقد غالب کے قریں
ایک گوشے ہی میں استادہ ہے مغموم و حزیں
سرو قد سیمیں بدن۔ غنچہ دہن۔ زہرہ جبیں
استعارات و کنایات کا ملبوس حسیں
رخ پہ تلمیح و محاکات کا رنگیں آنچل
آنکھ میں صنعتِ تعلیل کا ہلکا کا جل
نیچی نظروں میں اشارات کا زندہ جادو
غم پوشیدہ سے دل تنگ۔ و پریشاں گیسو
جسم ایہام تناسب کی مجسم تصویر
آنکھ میں سرمۂ ناز اغ کی ہلکی سی لکیر
زلفِ شب رنگ پریشاں۔ نگہ ناز اداس
خونِ دل بہتا ہوا۔ دیدہ رخسار کے پاس

....

آ گیا موسمِ بالیدگیٔ فکر و خیال
پھر ہویدا ہوا چہرے پہ مرے حسن و جمال
چاہتا تھا مجھے لیجائے طرب خانہ میں
غم و آلام کے دیرینہ عزا خانے سے
گریۂ شبنم و خاکسترِ پروانہ سے
جام و مینا نئی ترکیب کے تیار کئے
پھر مجھے بزمِ روایات کے صنم خانے سے
لے گیا ندرتِ تخییل کے میخانے میں
جس میں تھی قلقلِ مینائے فصاحت کی صدا
ہر طرف چھائی ہوئی رنگِ بلاغت کی گھٹا
شعلۂ عشق سے کھینچی ہوئی مضمون کی شراب
جس میں شامل تھے محاکات کے رنگین گلاب
قطرے قطرے میں نہاں جذبۂ جذباتِ شباب
بھر کے خود صنعتِ تعلیل کے پیمانے میں
میری آنکھوں کی قسم کھا کے مجھے نذر کیا
وہی پیمانۂ اندازِ بیانِ حسنِ ادا
لگ گئی لب سے لگاتے ہی مجھے عمرِ دوام
جام پیتے ہی نکھر آیا - مرا حسن تمام
آ گیا زورِ بیان - زورِ سخن - زورِ کلام
ہو گئے شاہ و گدا سب مری چوکھٹ کے غلام
فقرہ و جملہ و ترکیب مری - میرا کلام
جو کہا میں نے - وہی ہو گیا مقبولِ عوام
میری شیرینیٔ گفتار سے حیران ہو کر
فارسی بھی مجھے کرنے لگی جھک جھک کے سلام

●

یک بیک ہو گیا افسردہ جوانی کا گلاب
مرگِ غالب سے ہوا ختم مرا عہدِ شباب
عشوہ و غمزہ و انداز و ادا - رعنائی
وہ مری عظمت و شہرت وہ مری یکتائی
اس کے مرتے ہی مرے پاس نہ رہنے پائی
رہ گئے شامِ الم - دیدۂ نم - تنہائی
اک زمانہ کو ہوا غم - مری پامالی کی
مرثیہ حالی نے لکھا مری بدحالی کی

●

ایسے عالم میں ترس کھا کے مری حالت پہ
لے کے حکمت چلا مجھ کو حقائق کے قریب
خوب سمجھایا مجھے فلسفۂ موت و حیات
یہ سبق مجھکو دیا بن کے محبت کا نقیب

"زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے - انھیں اجزا کا پریشاں ہونا"
مجھے لازم نہیں اس حال میں گریاں ہونا

●

داغ نے دے کر زباں مجھ کو بڑا کام کیا
پھر زمانہ میں نئے سر سے مرا نام کیا
رنگِ حسرت نے نئے سر سے جوانی بخشی
یعنی ٹھہرے ہوئے پانی کو روانی بخشی
محسن و اکبر و اصغر نے مجھے سمجھائے
معرفت کے نئے اسرارِ تصوف کے نکات
نورِ عرفاں سے چمکنے لگا ملبوسِ حیات
غنچۂ دل کو ملا گریۂ شبنم کا سبق
آکے فانی نے دیا فلسفۂ غم کا سبق
شاد و سیماب نے بھی میرے سنوارے گیسو
آرزو نے بھی کیا نذر مجھے دل کا لہو
کیفی و نجم نے بھی کی مری خاطر داری
یاس نے آکے سکھائی مجھے پختہ کاری
جوش و اقبال بھی کچھ دور ساتھ چلے
تابِ نظارۂ رخسارِ حسیں لا نہ سکے

میں نے دیکھا کہ نظر اُن کی طبیعت اُن کی
دوسری سمت ہو - اغیار کی شیدائی ہے
کبھی مجھ سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
میری خود دار طبیعت کو گوارا نہ ہوا
میں نے دانستہ سرِ راہ انھیں چھوڑ دیا

●

حسرت و اصغر و فانی کی امانت کا امین
ایک درویش صفت - عرش نظر - فرش نشیں
بادہ کش - جام بکف خاک بسر - دیوانہ
عزتِ جام و سبو - آبروئے میخانہ
پیکرِ مہر و وفا - صاحبِ دل - اہلِ نظر
زائرِ بابِ حرم - رند خوش انفاس جگر
سازِ دل سینۂ بیتاب میں - آواز میں لَے
ارنی وردِ زباں - زیرِ بغل شعلۂ طور
سادگی سے مری واقف - مری پرکاری سے
باخبر مری نزاکت سے طرح داری سے
دیکھ کر بجھتے ہوئے میرے شبستاں کے چراغ
دفعتاً آگیا - پروانہ صفت - میرے قریب
جاگ اٹھا سویا ہوا پھر مری شہرت کا نصیب

میری گفتار کو سنگیت کا اعجاز دیا
دل کے بجھتے ہوئے تاروں کا مجھے ساز دیا
پھر مجھے قلقلِ مینا کا ترنّم دے کر
لبِ نازک کو مرے موجِ تبسّم دے کر
گوشہ گوشہ میں وطن کے مجھے مشہور کیا
اسی ہندی کو جو ہے راج بھون کی دیوی
بندگی میری بجا لانے پر مجبور کیا
اب یہ عالم تھا کہ جس سمت چلی جاتی تھی
آفریں آفریں کہنے کی صدا آتی تھی
دادِ تحسین کے پھولوں کی ہوئی وہ بارش
کہ مجھے تنگیٔ داماں کا گلہ ہونے لگا
میر و غالب کی جدائی میں جو کھایا تھا کبھی
پھر وہی زخم مرے دل کا ہرا ہونے لگا

●

کیا خبر تھی کہ وہی ہمدم و دمساز مرا
راہ میں چھوڑ کر اک روز چلا جائے گا
جس سے ڈرتی تھی وہی روز پھر آئے گا
اس کے ہمراہ مری عزت و شہرت بھی گئی
نغمگی بھی گئی۔ پہلی سی لطافت بھی گئی
غالب و میر کی بخشی ہوئی دولت بھی گئی
حسرت و اصغر و فانی کی امانت بھی گئی
اب زمانہ میں کوئی ہمدم و دمساز نہیں
ایسا اک ساز ہوں جس میں کوئی آواز نہیں
ہمہ تن یاس ہوں محرومِ شکیبائی ہوں
روتی روتی درِ غالب پہ چلی آئی ہوں

●

روک کر اشکِ رواں قلب پہ قابو پا کر
میں آہستہ سے سمجھاتے ہوئے اس سے کہا
کشتیٔ دل ذرا جذبات کے طوفاں سے بچا
اک جگر ہی تو نہ تھا اہلِ سخن اور بھی ہیں
اہلِ دل اور بھی ہیں صاحبِ فن اور بھی ہیں
کیا اثر نے پائیں پیری و بائیں فنکاری
نہ دکھائے تجھے فردوسیہ نگاہی کے کمال؟
کیا نہیں نقش ترا آئینہ بردارِ جمال؟
طبعِ روشن سے فراق ہمہ داں کی نازاں
نہ بنا بدرِ تری عظمت و شہرت کا ہلال؟

●

منہ بناتے ہوئے جھنجھلا کے دیا اس نے جواب

کر دیا تو نے مرے سینۂ بریاں کو کباب
لکھنؤ میں رہوں۔ بولی بھی وہیں کی بولوں
یعنی بھولوں ہی سے الفاظ و معانی تولوں
دلی و آگرہ جانے کی اجازت ہی نہیں
شیر میں قند ملانے کی اجازت ہی نہیں
ان شرائط پہ اگر میرے قریب آتے ہیں
ورنہ تنقید کی تلوار اٹھا لاتے ہیں
میں تو بچپن سے جہاں گرد ہوں معذور نہیں
اس طرح قید میں رہنا مجھے منظور نہیں

●

فیض کہتے ہیں کہ ساتھی ہوں میں تیرا لیکن
سرخ پرچم مجھے ہاتھوں میں اٹھانا ہوگا
قید خانہ ہی نہیں ہنستے ہوئے گاتے ہوئے
ایک دن جنگ کے میدان میں جانا ہوگا

●

خوب فرمایا وہی رند بلا نوش فراق
کرتے رہتے ہیں جو پی پی کے مرے ساتھ مذاق
کبھی کہتے ہیں تری مانگ میں لے دوشیزہ
ایک ہی وقت میں افشاں بھی ہو سیندور بھی ہو
کبھی کہتے ہیں کہ اے حسن یہ جلوہ تیرا
ماسکو میں بھی درخشاں ہو سر طور بھی ہو
کبھی کہتے ہیں کہ تو کیٹس کی جیل بن جا
کبھی کہتے ہیں ذرا سا تو اٹھا بھیرویں گا
یہ حقیقت ہے کہ اس دور کی پیشانی پہ
علم و دانش کا چمکتا ہوا تارا ہے فراق
نیل و تسنیم و لبین۔ ڈان و دیلو۔ گنگ و جمن
جس میں بہتے ہیں سبھی مل کے وہ دھارا ہے فراق
میرا مطلوب بھی ہے۔ وہ محبوب بھی ہے
غم تو یہ ہے کہ وہ سالک بھی ہے مجذوب بھی ہے
کہتے کہتے جو کبھی جوش میں آ جاتا ہے
بارہا دائرۂ فن سے نکل جاتا ہے

●

مجھ کو امید اگر تھی بھی تو کچھ فیض سے تھی
وہ بھی وابستۂ گیسوئے سیاست نکلا
اس کی شہرت میں چھپا دست صحافت نکلا
وہ بھی اک عالمی تحریک کا سودائی ہے
کیا محبت کسی تحریک کو راس آئی ہے!
اتنا کہنا تھا کہ اک چیخ زباں سے نکلی

ہچکیاں بند ہوگئیں غش آگیا گرنے سی لگی
دفعتاً تربتِ غالب سے یہ آواز آئی
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
(غالب)
کھل گئیں چیخ کی آواز سے آنکھیں میری
سر اٹھایا تو یہ دیکھا کہ دھندلکا ہے ابھی
میرے غم خانہ میں ہے روشنی دھیمی دھیمی
دیکھتے دیکھتے ہی شمع نے دم توڑ دیا
پھر وہی شعر مرے دل کی زباں سے نکلا
"شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد"

جانِ غزل

جگر صاحب کے انتقال پر

از اعجاز خورشید کاشمیری

(رباعی)

صد نازش سلطانِ غزل کہتے ہیں — احباب تجھے جانِ غزل کہتے ہیں
اپنوں کا نہیں ذکر ہے بیگانے بھی — منجملۂ خاصانِ غزل کہتے ہیں

(قطعہ)

خاموش اس طرح سے ہوا جانِ شاعری — ہے تار تار جیب و گریبانِ شاعری
بزمِ سخن میں نغمہ سرائی میں کیا مزا — ویران ہوگیا ہے گلستانِ شاعری

قطعہ تاریخ وفات

پرنس معظم جاہ بہادر شجیع
حیدرآباد دکن

آج بھی ایک محبت کی نظر ہے دل میں
وہ نہیں ان کے تغزل کا اثر ہے دل میں
سال تاریخ کی جس وقت ہوئی فکر شجیع
آئی آواز کہ۔ اب داغ جگر ہے دل میں
۱۳۸۰ھ

قطعہ دیگر

کہتی ہے ہر کلی کہ ارادہ سفر کا ہے
انجام گل جو ہے وہ نتیجہ ثمر کا ہے
کل تک تو عندلیب غزل خواں چمن میں تھی
اب عالم بہار میں ماتم جگر کا ہے

قطعات تاریخ وفات

از
محمد اصطفا خاں اصطفا

حج و زیارت کر کے گئے
تھے جو جہاں میں شاعر ہند
سال وفات آصف لکھئے
حیف جگر اے حافظ ہند
۱۳ ھ ۸۰

باد صرصر کس کی رحلت کی خبر لائی ہے آج
کر دیا ہوش و خرد جس نے بیگانہ مجھے
ضبط گریہ غیر ممکن جب ہوا اور بھر آئے دل
کیوں نہ رونا آئے پھر بے اختیارانہ مجھے
غم جو دلبر ہے جگر کی دائمی فرقت کا ہے
غم نہیں اس کا کہے دنیا جو دیوانہ مجھے
آ رہی ہے ایک مدھم سی صدا یہ کان میں
مشورہ دیتے ہوں جیسے پیر میخانہ مجھے
سوز بلبل جس میں ہو لکھئے وہ تاریخ اصطفا
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے
۱۳۸۰ھ = ۱۳۲ + ۱۲۴۳

دار فانی سے وہ سدھار گئے خلد میں ہیں جگر نیک مزاج
شاعر بے مثال و سحر بیاں ان کو حاصل سخن کی تھی معراج
رحلت ان کی غزل کی رحلت ہے اب ترنم کا کون دے گا خراج
شعلۂ طور و آتش گل سرد الاماں اشکِ دیدۂ معراج
غم بھی ہے اور فکر شعر بھی ہے کیونکہ تاریخ کہنے کا ہے رواج
اصطفا روح سے یہ بولی حور
داد خلی جنتی جگر الحاج
۱۳۸۰ھ

تائب فرخندہ پے گشت بہ دل منفعل ریخت و برباد کرد بادۂ و جام صبو
جہد برائے نماز کرد ز قلب صمیم ساختہ از آب چشم تازہ بتازہ وضو
کرد ادا فرض حج حاضر دربار شد پاک ز دنیا گذشت از پئے این شست و شو
ہاتف غیبی بگفت فاش بگو اصطفا
سالِ وفاتِ جگر۔ محترم و نیک خو
۱۳۸۰ھ

بیادِ جگر

از ارشد صدیقی (بھوپال)

نیک و صالح خلیق و اہل خلوص صاحب ذوق و خوش مزاج و متین
حیف دنیا سے ہو گیا رخصت شاعر خوش بیان و مرد معین
۱۹۶۰ء

قطعہ تاریخ وفات

حضرت جگر مرادآبادی مرحوم

از احسن دریابادی

آہ اے خوشنوائے بزم طرب — بلبل گلستان شعر و ادب
آب ذاب و ضیائے حسن غزل — لمعۂ نور شمع بزم ادب
بر غزل جام بادۂ خوش رنگ — شعر تصویر حسن بنت عنب
تجکو حاصل ہوا مقام بلند — اے امام غزل اے روح ادب

نام لیوا رہیں گے تیرے جگر
شعلۂ طور و آتش گل اب

۱۳۸۰ھ

شفاعت علی صدیقی

داغِ جگر

۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کو نسیم سحر کے بے درد جھونکوں نے ہماری شاعری کی وہ شمع گُل کردی جو ایک دورِ رفتہ اور صحبتِ نشاط کی یادگار تھی یعنی سیرتی انسان دوستی اور اصول پرستی کے مجسمے علی سکندر جگر مرادآبادی ۷۰ سال کی عمر میں اپنے پیرو مرشد کے وطن گونڈہ میں وفات پاگئے۔ جگر کی وفات کے ساتھ نہ صرف شاعری کے ایک پورے دور کا خاتمہ ہوگیا بلکہ شرافت، غمگساری اور رفاقت کا دور بھی ختم ہوگیا اور ساتھ ہی غزل کا حسن، اس کی دلکشی و رعنائی۔ اس کی محبوبیت اور انفرادیت بھی ختم ہوگئی۔

جگر قدیم دبستانِ شاعری سے البتہ تھے لیکن جدید تقاضوں سے کبھی بے خبر نہیں رہے۔ انھوں نے قدیم و جدید میں جو خوشگوار اور دلکش توازن قائم کیا وہ اردو غزل کی آبرو ہے۔ ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیت خیالات کی پاکیزگی اور انداز بیان کی لطافت ہے۔ اسی دل آویز پیرایہ کی وجہ سے ان کے معمولی سے معمولی خیالات بھی دلکش بن جاتے ہیں۔ جگر نے اپنے احساسات کو آب و رنگِ شاعری میں اس طرح سمو کر پیش کیا ہے

کہ دل و نظر ان میں جذب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کے موضوعات سخن محض درد
اور لذت وصال ہی نہیں ہیں بلکہ انھوں نے حیات و کائنات کے وسیع
موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے اور کبھی شعریت کا دامن نہیں چھوڑا۔ وہ
ہمیشہ عمل اور سخت کوشی کے موید رہے اور ہر انقلاب کو حیات نو کا پیغام
سمجھتے رہے۔ انھوں نے ایسے پرآشوب زمانے میں جبکہ ماضی کے ادب
سے رشتہ توڑنے اور غزل کو ختم کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔
ادبی اور شعری روایات کا احترام ہی نہیں کیا بلکہ اسکی حفاظت بھی کی
اپنے دلنشیں و پراثر ترنم اور پاکیزہ تغزل سے یہ ثابت کر دیا کہ قدیم شعری
اور ادبی روایات سے ہی صحت مند اور تعمیری ادب کی تخلیق ہو سکتی ہے
جگر صاحب کو اپنے جیتے جی جو مقبولیت حاصل ہوئی اردو شاعری
کی تاریخ میں اس کی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں۔ انھیں رئیس المتغزلین
اور حافظ ہند کے خطابات دیئے گئے۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو
نے ساہتیہ اکیڈمی کے صدر کی حیثیت سے انھیں ان کی بہترین تصنیف
آتش گل پر اکیڈمی ایوارڈ دیا۔ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے انھیں ڈاکٹریٹ
کی اعزازی ڈگری دی حکومت ہند اور حکومت یوپی نے ان کی ادبی
خدمات کے صلے میں وظیفے مقرر کئے یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات پر پورے
ملک میں صف ماتم بچھ گئی۔ ان کا سوگ جس طرح اردو والوں کے علاوہ
دوسری زبانوں سے تعلق رکھنے والوں نے ملک گیر پیمانے پر منایا اس
سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کی عظمت اور ان کے فن کا اعتراف

کتنا ہمہ گیر اور بے پناہ تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے اردو اخبارات رسائل اور ادیبوں کے لئے تو یہ سانحہ عظیم تھا ہی دوسری زبانوں میں شائع ہونے والے اخباروں اور رسالوں نے بھی جگر کے انتقال کو ایک بہت بڑا سانحہ قرار دیا۔ ادیبوں، شاعروں اور دوسری مشہور ہستیوں نے جگر صاحب کو جو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے اسکے اقتباس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارا ادب ایک بہت بڑے فن کار سے اور ہمارا معاشرہ ایک بہت بڑی ہستی سے محروم ہو گیا ہے۔

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

جگر مراد آبادی کی وفات سے اُردو ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہونچا ہے۔ وہ میرے لئے بڑے شاعر ہی نہیں بڑے اُردو نواز بھی تھے۔ اُردو سے انھیں دلی محبت اور لگاؤ تھا۔ اُردو کے باب میں میں نے انھیں کبھی کسی سے ہٹتا نہیں دیکھا۔ وہ بڑے شریف النفس تھے اور کوئی ایسی بات سننا گوارا نہیں کرتے تھے جس سے ان کی عزت نفس کو ٹھیس پہونچتی ہو۔ وہ بڑے غزل گو تھے، صاحب فکر بھی اور خوش فکر بھی۔

تقسیم سے پہلے بھی گاہے گاہے انجمن کی امداد کرتے رہتے تھے جب کبھی دہلی آتے تھے تو سو دو سو روپئے انجمن کو ضرور دے جاتے تھے۔ تقسیم کے بعد بھی انھوں نے یہ روایت ترک نہیں کی۔ یہاں بھی انھوں نے انجمن کو کچھ نہ کچھ ضرور دیا۔ کراچی سے واپس جانے لگے تو مجھ سے ایک بار پھر ملنے کے لئے آتے۔ یہاں انجمن ترقی اردو کالج کے میدان میں

انھوں نے ایک بار مشاعرہ بھی کروایا تھا۔ یہ ۱۹۵۸ء کا ذکر ہے۔ اس مشاعرے کی تمام آمدنی انجمن ترقی اُردو کانپور کو دے دی تھی۔ یہ بہت بڑا ایثار تھا اور ایسے ایثار سے وہ کبھی گریز نہ کرتے تھے۔

جگر صاحب کی وفات سے ایک بڑا شاعر ہی نہیں بلکہ ایک قابل قدر انسان بھی ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی۔

جگر صاحب ان چار سرآمد اُردو شعراء میں تنہا رہ گئے تھے جن کو بیسویں صدی کے ایوان غزل گوئی کے چار ستون کہا جاتا ہے یعنی حسرت، فانی اصغر، جگر۔ کیسے مستحکم یہ ستون تھے جن پر جدید غزل کی خوبصورت عمارت قائم ہے۔ باوجود ان تہلکوں اور زلزلوں کے جو اسے پیش آتے رہے۔

جگر صاحب اپنی سیرت، وشخصیت کے اعتبار سے اپنے کلام سے بھی زیادہ دل آویز اور قابل احترام تھے یہ اس لئے کہنا پڑا کہ شاید بعض احباب اس سے مختلف رائے رکھتے ہوں کہ شاعر کو اس کی شخصیت سے جدا رکھا جاسکتا ہے۔

جگر صاحب کے سانحہ رحلت سے فی الوقت شعر و شاعری کا چرچا اچھا نہیں لگتا لیکن کیا کروں احباب نہیں مانتے۔ موت کی طرح احباب سے بھی کو کسی کو رستگاری ہے، اردو غزل گوئی ترقی کرتی رہیگی تاہم یہ کہ جگر صاحب نے غزل کو جو چیزیں دی ہیں وہ شائستگی کے عہد میں کبھی نظرانداز نہ کی جاسکیں گی۔

آل احمد سرور۔

آخر موجودہ دور کے سب سے محبوب اور محترم شاعر جگر مرادآبادی بھی چل بسے۔ ادھر کئی سال سے وہ بیمار تھے۔ کچھ دنوں سے زندگی سے بالکل مایوس ہو گئے تھے مگر اردو شاعری کے ہر پرستار اور ان کے ہر جاننے والے کی دعا یہی تھی کہ وہ ابھی اور زندہ رہیں اور لیلائے غزل کے گیسو کو اور سنواریں۔ جگر صاحب شباب کے ہیجان کے شاعر نہیں تھے وہ چوٹ کھایا ہوا دل اور لالہ کا تخیل رکھتے تھے چند سال پہلے ان لوگوں سے جو یہ سمجھتے تھے کہ جگر کی شاعری کی کشش شباب اور شراب کے ساتھ ختم ہو گئی۔ کہہ چلے تھے۔

گداز عشق نہیں کم جو میں جواں نہ رہا
وہی ہے آگ مگر آگ میں دھواں نہ رہا

وہ بڑے سچے اور اچھے شاعر۔ بڑے صاف دل اور پاک باطن انسان اور بڑے مخلص اور بے ریا دوست تھے۔ ان کی مقبولیت میں جہاں ان کی شاعری کی عظمت کا حصہ ہے وہاں ان کی شخصیت کی بلندی کا بھی۔ وہ سچی مذہبیت رکھتے تھے لیکن کٹھ ملا نہیں تھے تنگ نظری اور تعصب جہاں بھی ہو انھیں ناپسند تھا۔ وہ اپنے وطن ہندوستان سے بڑی محبت کرتے تھے اور جب بھی انھوں نے "درجنوں" کی بعض لغزشوں کا ذکر کیا ہے بڑے درد سے کیا ہے۔

شاعر ہم سے رخصت ہو گیا مگر اس کی شاعری زندہ رہے گی۔ زندگی

کے اونچ نیچ ہیں۔ امید و بیم کی دھوپ چھاؤں میں، تنہائی کے سکون میں یا بھری محفل کے شور میں اکثر یاد آئے گی اور مسرت اور بصیرت کا خوشگوار عالم کرتی رہیگی۔

علامہ نیاز فتحپوری۔

جگر کا انتقال ایک بڑا سانحہ ہے۔ نہ صرف دنیائے شعر و سخن کا بلکہ جامع بشریت کا بھی ممکن ہے شاعر ہونے کی حیثیت سے ان کی جگہ آئندہ پر ہو سکے۔ لیکن انسانی شاعر ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ خالی رہے گی۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب

افسوس اردو غزل کی وہ روشن شمع جو ایک مدت سے جھونکے کھاتی اور سنبھلی چلی آرہی تھی آخر گل ہو گئی۔ اور محفل کی بہت کچھ رونق اپنے ساتھ لیتی گئی۔ جگر صاحب اپنی خصوصیات میں منفرد تھے معلوم نہیں اردو کو ایسا غزل گو پھر کبھی ملے گا یا نہیں۔

سید علی عباس حسینی

آہ جس منحوس گھڑی کا ڈر تھا وہ آخر آ پہونچی۔ حضرت جگر مرادآبادی کو آج وہ ابدی نیند آہی گئی جس کا برسوں سے دھڑکا لگا تھا۔

ایسے سوئے کہ پھر خبر نہ ہوئی

ان کی موت اردو شاعری کے لئے اور مخصوص طور پر غزلیات شاعری کیلئے ایک عظیم سانحہ ہے۔ اسلئے کہ غزل ہماری اصناف شاعری میں جتنی مقبول ہے اتنی مطعون بھی ہے اور کسی صاحب کمال کا پوری عمر غزل ہی کی زلف و کاکل سنوارنے میں صرف کر دینا بڑا حوصلہ چاہتا ہے۔ جناب جگر نے اسی حوصلے

سے کام لیا اور حق یہ ہے کہ انھوں نے غزل گویوں کی محفل میں اپنے لئے صدر نشینوں میں جگہ بنالی۔ ان کی غزل صرف داخلی کیفیات ہی کی مظہر نہیں بلکہ اس میں خارجی حالات، حوادث کے صاف صاف اثرات موجود ہیں ... افسوس کہ آج اس درد بھرے دل کی حرکت ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی اور ہمارے لئے غزل گوئی کی دنیا سونی ہوگئی۔

وہ کیا گئے سبا گلستاں لئے ہوئے
ہر پھول ہے جراحت پنہاں لئے ہوئے

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

جگر مرادآبادی اس صدی کے سب سے بڑے غزل گو شاعر تھے غالب کے بعد کوئی شاعر اس گیرائی کو نہ پہنچ سکا۔ جہاں تک جگر کا نظریہ پہنچ جاتی تھی۔ سادگی اور پرکاری ان کے شعر کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ توقع نہیں کہ آئندہ کوئی شاعر اس رنگ اور ڈھنگ کا اردو زبان میں پیدا ہو۔

مالک رام

جگر کی ایک خصوصیت قابل تعریف ہے۔ انھوں نے غزل کے سوائے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ اگر کچھ اور کہتے تو اس میں اس حد تک کامیاب نہ ہوتے۔ چونکہ ان کی استاد طبع تھی ہی غزل کے مناسب حال اس لئے ان کا کسی اور صنف سخن پر توجہ کرنا گویا اپنی صلاحیتوں کے غلط استعمال کے مترادف ہوتا۔ ان کا اپنے آپ کو غزل کر لینا ان کے لئے بھی اچھا رہا اور غزل کے لئے بھی۔ اس میں شک نہیں کہ اردو میں غزل اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود

یہ زبان بظاہر اب اس میں کوئی جدت اور تازگی ممکن نہیں کیوں کہ کون سا
وہ مضمون یا موضوع ہے جسے مفسرین بیان نہ کر گئے ہوں پس اس لحاظ
سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جگر کا کلام بھی وہی پرانے رنگ کی چیز ہے لیکن اسکے
باوجود اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان کا اسلوب اور لب و لہجہ اور کیں بل
خاص ان کی اپنی چیز ہے اور چونکہ زمانے کا مذاق بدل گیا ہے خود غزل کی
ہیئت زبان اور اس کے موضوع بلکہ مقصد تک سے متعلق نئے نئے تجربے
ہونے لگے ہیں اس لئے اب یہ توقع کرنا کہ پھر کوئی جگر کا سا غزل گو شاعر پیدا
ہوگا امید موہوم سے زیادہ نہیں۔

پنڈت آنند نرائن ملا

مجھے اور کوئی شاعر ایسا نظر نہیں آتا جو متواتر چالیس سال تک عوام
و خواص میں ان سے بڑھ کر مقبول رہا ہو۔

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی

وہ ایک اچھے شاعر اور اچھے انسان تھے۔ مرحوم بڑے غیور اور
خوددار تھے۔

جوش ملیح آبادی

میرے پرانے خلوت و جلوت کے گنے چنے دو چار ساتھیوں میں جگر
ایک بڑی محبوب شخصیت کے مالک تھے۔ سو وہ بھی مجھ سوختہ جاں سے منہ پھیر کر
چلے گئے۔ میں بدبخت کس سے کہوں کہ راتوں کے اندھیرے میں کتنے
بچھڑے ہوؤں کے چہرے میرا تعاقب کیا کرتے ہیں۔ ہائے ان چہروں میں اب

میرے دوست جگر کا چہرہ بھی شامل ہو کر مجھے اپنی جانب پکار رہا ہے۔

یاد جمیلی دھوپ گلابی سا یا دہتا ہے سحاب ابدیت چھایا

خوش آؤ کہ منتظر ہے بزم ارواح

آیا، یار ان رفتہ! آیا! آیا!

پروفیسر مجنوں گورکھپوری

جگر کی موت میرے لئے ایک ایسا سانحہ ہے جس پر رسمی اور عارضی تعزیتی خیالات کا اظہار کرنا ماتمی جلسوں میں شریک ہونا میری سکت سے باہر ہے۔ اس وقت میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ نہ صرف اپنی نسل کا بہت بڑا شاعر جو بہت بڑی روایتی عظمت کا حامل تھا۔ دنیا سے اٹھ گیا ہے بلکہ میرے ایک رفیق سفر نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے ظاہر ہے کہ اس احساس کے ہوتے ہوئے تعزیت کی رسم ادا نہیں کی جا سکتی۔

اس وقت اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ گزشتہ تیس سال کے اندر شاید ہی کوئی نیا شاعر پیدا ہوا جس نے شعوری یا غیر شعوری طور پر جگر سے اثر قبول نہ کیا ہو۔ کم سے کم غزل گو شاعروں کو تو اس سے انکار کی مجال نہیں ہو سکتی۔ جگر کی شاعری میں اور جو کچھ بھی پایا جاتا ہو کہہ سکتے کہ فکر و احساس اور اسلوب اظہار کے لحاظ سے وہ ایسی شاعری ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ جگر کی شخصیت ان کی شاعری کی فکر کی کائنات، ان کی شاعری کا اسلوب ان تینوں کی سب سے زیادہ ممتاز خصوصیت خلوص اور صداقت ہے۔ وہ جیسے تھے ویسی ہی ان کی شاعری تھی۔ اور وہ بڑے شریف النفس انسان

ئے۔ ایسے شریف النفس انسان کم اپنے مخالف اور اپنے معترض کو بھی بڑی
رافت اور فراخدلی کے ساتھ گلے لگا سکتے تھے۔ اور کہیں سے ریا یا نمائش
شائبہ نہیں ہوتا۔

ایسے لوگ دنیا میں کم پیدا ہوتے ہیں جو اپنی شخصیت اور اپنے
ن کا گہرا اور پائیدار اثر اپنی زندگی میں دوسروں پر ڈال سکیں۔ یہی
خصوصیات تھیں جنھوں نے جگر کو ان کی زندگی ہی میں بجائے خود ایک
روایت بنا دیا۔ ایسی روایت جو اردو شاعری کے کسی دور مستقبل میں بھلائی
جا سکے گی۔

ڈاکٹر عبد العلیم

علی سکندر مرگئے اس لیے کہ وہ معمولی انسان تھے اور ہر انسان فانی
ہے لیکن جگر مراد آبادی کبھی نہیں مرسکتے اس لئے کہ وہ سچے شاعر ہیں اور سچائی
رہے۔ جگر کی شاعری دل کی آواز ہے، اس میں سوز بھی ہے اور ساز بھی۔
دکھی ہے اور گداز بھی۔ اس میں آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔
ں میں عشق کی سرمستی بھی ہے اور حسن کا جمال بھی اس میں محبت کی سرگوشی
ی ہے اور دکھے ہوئے دل کی پکار بھی جس شاعر کے کلام میں یہ سب
م ہو وہ کیسے مرسکتا ہے۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

جگر صاحب کے انتقال سے نہ صرف ایک باکمال شاعر بلکہ ایک اچھا انسان اٹھ گیا۔ انھیں قریب و دور سے بارہا دیکھنے کا موقع ملا۔ عام طور پر شاعرانہ ذہن میں اخلاقی قدروں کا احساس بہت کمزور ہوتا ہے، جگر صاحب کی شخصیت اس کے برعکس تھی، وہ سراپا شاعر تھے۔ بلکہ ایک طرح سے شاعری بسر کی، لیکن ان کی انسانیت اور معصومیت ہر زمانے اور ہر دور میں قائم رہی۔ شاعر اور بچے کی فطری مناسبت کا احساس انھیں کی صحبت میں ہوتا تھا۔ کھوئی ہوئی سی متحیر آنکھیں بے ساختہ کھلکھلاہٹ خلوص، بے ریائی، شہریاروں سے اکڑ اور خاکساروں سے نیازمندی وضع داری، خلوص و عوام پسند طبیعت غرض کہ ایک ایسی شخصیت تھی جس کی مہک کو ملنے والا چند لمحوں میں محسوس کرنے لگتا تھا۔

جگر صاحب انسانیت اور شعریت دونوں کا مجسمہ تھے اچھا شاعر بننے کے لئے ایک اچھے انسان ہونے کی شرط، رشید احمد صدیقی صاحب نے شاید، انھیں کی مثال سامنے رکھ کر لگائی تھی۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا بڑا راز ان کی مخصوص سج دھج، طرز ادا اور ترنم تھا۔ ان کی معصوم اور دلکش شخصیت نے انھیں اپنے عہد کا محبوب ترین شاعر بنا دیا تھا ان کی عظمت کو اس پیمانے سے بھی ناپا جا سکتا ہے کہ دورِ جدید میں کتنوں نے جگر بننے کی کوشش کی اس لحاظ سے شعر کی دنیا میں وہ ایک وضع تھے۔ ایک اسلوب تھے ایک اسٹائل تھے۔

خواجہ مسعود علی ذوقی

محض یہ کہنا کہ جگر کی موت نے ہمارے شعر و ادب میں ایسا زبردست خلا پیدا کر دیا ہے جس کا پر ہونا آسان نہیں یا یہ کہ ان کے انتقال نے ہم سے ایک عظیم شاعر چھین لیا ایک رسمی سی بات ہوگی حقیقت یہ ہے کہ ان کی وفات نے ہماری ادبی اور ثقافتی زندگی پر جتنی کاری ضرب لگائی ہے اس کا پورا پورا اندازہ کرنا ابھی ذرا مشکل ہے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جگر کے ساتھ خلق و شرافت، خلوص و محبت اور رحمت و شفقت کی وہ مشرقی خوبیاں بھی ایک بڑی حد تک اٹھ گئیں جن کا وہ ایک دلکش اور درخشاں نمونہ تھے اور جو آج کل کے لوگوں کا ذکر کر چھوڑیئے خود ان کی نسل کے حضرات میں بھی اب خال خال ہی نظر آتی ہیں۔

جگر کتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی بڑے انسان بھی تھے۔ ان کی وفات شعر و ادب ہی کا ناقابل تلافی نقصان نہیں ہے بلکہ انسانیت کے حق میں بھی ایک سانحہ عظیم ہے۔

جب میں جگر کے ساتھ اپنی عقیدت اور شیفتگی کو محسوس کرتا ہوں اور ان کی اس بے کراں شفقت و محبت کو یاد کرتا ہوں جو لگ بھگ تیس سال کی ہی دوستی میں ان سے میں نے پائی، تو میرا دل فرط غم سے امنڈنے لگتا ہے لیکن جب سوچتا ہوں کہ جگر نے بھرپور زندگی پائی مصیبت و راحت عسرت و عشرت کے سب رنگ دیکھے۔ اس چمن میں پھولوں ہی سے دامن ہی بھرا بلکہ کانٹوں سے بھی پیار کیا۔ اپنی شیریں اور دلکش شخصیت سے

سے نہ جانے کتنے کڑوے کسیلے مزاجوں کی در پردہ اصلاح کی اور اپنے چراغ سے نہ جانے کتنے چراغ روشن کئے۔ تو میری روح مسرت اور طمانیت کے احساس سے معمور ہو جاتی ہے، اور جگر ہی کا یہ سادہ لیکن خوبصورت شعر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے۔

آنسوؤں کی کمی نہیں لیکن
کچھ سبب تھا کہ آنکھ تر نہ ہوئی

خلیل الرحمن اعظمی

جگر صاحب کے انتقال کی خبر سن کر نہ جانے کیوں مجھ پر یہ اثر ہوا کہ وہ جوانی کے عالم میں مر گئے۔ ان کی شاعری اور شخصیت میں کچھ ایسی سرشاری اور والہانہ پن تھا کہ کبھی ذہن میں یہ بات نہ آئی کہ وہ بوڑھے یا بزرگ ہیں۔ انھیں جب بھی قریب سے دیکھا اور ان کے اشعار سنے ہمیشہ انھیں کا یہ مصرعہ تصور میں گونجتا رہا۔ ع

کہ جیسے حافظ شیراز جھومتو ر آئے

جگر کی شاعری پر پہلے بھی لکھا جا چکا ہے اب بھی بہت کچھ لکھا جائے گا ان کے شاعرانہ مرتبے کے تعین میں تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن اردو میں کم ایسے شاعر گزرے ہوں گے جن کی شخصیت میں ایسی دلکشی اور محبوبیت ہو۔ وہ سراپا شاعر تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جتنی لطافتوں اور رعنائیوں کا تصور لفظ شاعری سے وابستہ ہے۔ جگر اس کی مجسم تصویر تھے۔ پچھلے پچاس سال میں اردو شاعروں کی کئی نسلوں نے جگر

اپنا آئیڈیل سمجھا اور اس میں شک نہیں کہ نوجوان شعراء نے جگر کے شاعرانہ لاابالی پن اور رندی کا جتنا اثر قبول کیا شاید ہی کسی اردو شاعر کو یہ حیثیت حاصل حاصل رہی ہو غالباً اسی لئے ایک زمانے میں مجنوں گورکھپوری نے انھیں اُردو شاعری کے لئے بہت بڑا خطرہ کہا تھا اور ان کے مزاج کا ایک خاصہ اس کی گواہی شاید وہ حضرات دے سکیں جنھوں نے جگر کو دونوں عالم میں دیکھا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ترک شراب کے بعد جگر کی شخصیت یا شاعری ویسی نہ رہی جیسی پہلے تھی میں ان سے متفق نہیں ہوں البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ جگر کی تقلید میں جن شعراء نے شراب کو شاعری کا لازمی جزو سمجھا۔ انھیں شراب نہ تو اچھا رند بنا سکی نہ سچا شاعر جگر جب شراب پیتے تھے اس وقت بھی اچھے اور نیک انسان تھے۔ اور جب ترک شراب کے بعد انھوں نے حج کا شرف حاصل کیا اس وقت بھی ان کی شخصیت کا رند برقرار رہا۔ یہ بات میں بڑے اعتماد کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ آخر وقت تک جگر کی شاعری پھیکا پن نہیں آیا۔ ان کی آواز دوسرے شعراء کی طرح عمر ڈھلنے کے بعد پتلی نہیں ہوئی وہ ستر سال کی عمر کو پہونچ کر بھی ہمارے لئے تبرک نہیں ہے۔ جگر اپنی عمر کی کسی منزل میں زمانہ ماضی کے شاعر نہیں سمجھے گئے۔ ان کی موت کے بعد ایسا لگتا ہے اُردو زبان نے اپنا ایک جوان بیٹا کھو دیا ہے۔

سید احتشام حسین

جگر کی شاعری نئی تخلیق کے مدارج طے کر کے لطیف احساسات کو جگاتی اور محبت کے خوابیدہ تاروں کو چھیڑ کر نیا نغمہ پیدا کرتی ہے۔ محبت کے تاثر

میں جو غنائیت پوشیدہ ہے وہ جگر کے یہاں الفاظ میں سرایت کر گئی ہے
ان کے الفاظ کے انتخاب۔ تراکیب اور بندش سے نغمہ پیدا ہوتا ہے افسوس
کہ اردو کا ایک نغمہ گر نہ رہا۔ اس کی آواز کا جادو اب دیکھنے میں نہ آئے گا۔
لیکن وہ نغمے جو اس نے اپنے اشعار کو سونپ دیئے ہیں وہ زندہ رہیں گے اور
محبت کرنے والوں کے دلوں کی دھڑکن بنتے رہیں گے۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔

جگر کی موت ایک عظیم شاعر کی موت نہیں بلکہ ایک عظیم انسان کی موت بھی ہے۔

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

جگر اپنے کلام کی مست کن کیفیات کی بدولت آبروئے غزل بن گئے۔ جگر
نے دنیائے غزل کا مزاج بدلا۔ اس کو نیا انداز اور نیا رخ عطا کیا۔ نئی زبان اور
نیا دل عطا کیا۔ بے پناہ موسیقیت اور روانی عطا کی۔ اسی لئے اگر یہ کہا جائے۔
تو بیجا نہ ہوگا کہ جگر کے بغیر دنیائے غزل سونی نظر آنے لگی ہے۔

سید سجاد ظہیر

جگر مراد آبادی کی وفات سے اردو شاعری موجودہ دور کے اپنے سب
سے ہر دلعزیز اور مقبول شاعر سے محروم ہو گئی ہے۔ لیکن جگر اپنی غزلوں کے
دیوان میں اپنی روح کا لطیف ترین اور شیریں ترین ترنم ہمارے لئے چھوڑ
گئے ہیں۔ ان کے نغمے اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اردو زبان
اور اس کے بولنے والے زندہ ہیں۔

مخدوم محی الدین۔

آج تک کوئی سچا مرا نہیں تو میں یہ کیسے یقین کر لوں کہ جگر مر گئے۔ کارل مارکس نے کہا ہے کہ شاعر لا فانی ہوتے ہیں۔ جگر جسم سپرد خاک ہو گیا۔ وہ اب جسمانی اعتبار سے ہم میں نہیں ہیں۔ مگر وہ ہمیشہ ہمارے ہونٹوں پر اور ہمارے دلوں میں زندہ جاوید رہیں گے۔

مولانا حفظ الرحمٰن

ہندوستان نہ صرف ایک ممتاز شاعر سے محروم ہو گیا بلکہ نغمہ و کیف کے ساتھ ساتھ سوز دروں کے حامل ایک ایسے شب بیدار سے محروم ہو گیا جو نبض شناسی فطرت بھی تھا اور خلق و مروت اور انسانیت کا مجسمہ بھی جس کی زندگی کی ابتدا مجاز سے ہوئی اور اختتام حقیقت کے اعلیٰ ترین مقامات پر۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

میں جگر صاحب کی غیر معمولی صلاحیت۔ غزل گوئی کو بہت عظیم سمجھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ہم اپنی عقیدت کے تعلق کو ان سے بہتر طور پر قائم کریں۔ اور ان کی غزل میں زندگی کا ہر جذبہ ہر خیال اور ہر احساس اس طرح ابھر کر آیا ہے کہ ان کا ادب زندگی سے جدا نہیں۔

فراق گورکھپوری

ان کے کچھ اشعار میری تنہا ملکیت بن گئے ہیں کیونکہ جگر کے کسی مجموعہ میں وہ اشعار نہیں ہیں۔ سناؤں ۔؟

تاثیر محبت کی اشتد رسے مجبوری ہر دوری میں اک قربت، ہر قرب میں اک دوری
خود اپنے لئے بلبل تجویز قفس کر لے در پھر بھی جو کھل جائے صیاد کی مجبوری

ہر ذرہ عالم پر حاوی ہیں صفات اس کے
سب کہنے کی باتیں مختاری و مجبوری

جگر کی موت کا مجھ پر وہ اثر ہوا ہے کہ جینے سے طبیعت بھر گئی۔

امرت لال ناگر

وہ اُنیسویں صدی کے آخری مہاکوی تھے۔ میں اس مہاکوی کے حضور میں اپنے سر کو عقیدت سے جھکاتا ہوں۔

یشپال

جگر صاحب ہمارے ممتاز شاعروں میں سے تھے۔ میں ہندستان کے اس بڑے شاعر کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔

ہندوستان اور پاکستان سے اردو، ہندی، انگریزی اور دوسری زبانوں میں شائع ہونے والے رسالوں اور اخباروں نے بھی جگر مرادآبادی کی رحلت پر اداریئے لکھے خاص نمبر نکالے اور ان کی وفات کو ایک ایسا سانحہ قرار دیا جو دنیائے ادب کو ایک عرصے تک اشکبار رکھے گا۔ ان اخبار اور رسالوں نے ان کی شخصیت اور فن پر بہت کچھ لکھا اور اب بھی اس کا سلسلہ جاری ہے۔ ان میں سے ہم اُردو کے صرف چند اخبار اور رسالوں کی آرائے پیش کر رہے ہیں۔

صدق جدید

جگر ۔ اپنے مخصوص رنگ تغزل میں فرد تھے اور اب ان کے بعد رنگ تغزل کے استاد کہا چاہیئے کہ بس دو ہی چار باقی رہ گئے ہیں ۔ ۔ ۔ مرحوم بڑے پختہ مسلمان بھی تھے ۔۔۔ سالہا سال سے بڑے مخلص اور دیندار مسلمان تھے اور اس کا ایک کھلا ہوا ثمرہ یہ دیکھنے میں آیا کہ نماز جنازہ نہ صرف جمعہ کے نمازیوں کے جم غفیر نے ادا کی بلکہ نماز جنازہ بار بار ہوئی ۔ وقت موعود کا احساس کچھ پہلے سے ہو گیا تھا ۔ اللّٰھُمَّ اغفر لہ وارحمہ ۔

قومی آواز ۔ لکھنؤ

شہنشاہ تغزل جگر مراد آبادی کے سانحہ وفات نے جو آج صبح وقوع پذیر ہوا ۔ اردو شاعری اور ادب کو ناقابل برداشت دھچکا پہونچایا ، وہ دلنشیں اور پُر اثر آواز جو نصف صدی سے زیادہ تک مشاعروں اور ادبی صحبتوں کیلئے سرمایہ حیات ثابت ہوتی رہی ، وہ پاکیزہ اور طاہر خیالات جو سیکڑوں ہزاروں گم کردہ راہ رہروان شاعری کے رہبر بنتے رہے اور وہ جاذب اور مخلص شخصیت جو جانے والوں اور شناساؤں کے لئے ہر موقعہ اور ہر مہم میں باعث تقویت بنی رہی آج جگر صاحب کی وفات کے ساتھ یہ سب باتیں ایک حسرتناک یادگار میں تبدیل ہو گئیں ۔

جگر صاحب اُردو کے بہت عظیم شاعر تھے اور اس کے ساتھ جو حُسن قبول ان کی شاعری کو ان کی زندگی میں نصیب ہوا اس کی کوئی اور نظیر نہیں ملتی ۔ جو عوام میں ، اہل دل میں ، اہل ہوس میں ، اعلیٰ ادبی محفلوں میں اور شعر و شاعری کے سطحی قسم

اجتماعوں میں ہر جگہ جگر مرادآبادی کی تشریف آوری کے لئے ہمیشہ آنکھیں بچھائی گئیں اور بڑے پیمانے پر ہونے والے مشاعرے خواہ ہندوستان و پاکستان کے طول و عرض میں کہیں بھی منعقد کئے جائیں اس وقت تک معیار پر پورے نہیں اترتے تھے جب تک جگر صاحب اس میں شریک نہ ہوں۔

جگر صاحب بڑے شاعر اور بڑے انسان تھے انھوں نے زندگی بھر تغزل کو یعنی کاروبار و معاملات عشق کو اپنا وظیفہ حیات بنائے رکھا، اور ایسے نازک کام کو جس نفاست، تقدس اور احترام کے ساتھ انھوں نے انجام دیا اس کا شاہد اس کا سارا کلام ہے جس میں حسن و عشق کے تمام پہلوؤں اور تمام کیفیتوں پر اظہار خیال کے باوجود پاکبازانہ سنجیدگی کی لہر ہر ہر شعر پر نظر آتی ہے۔

جگر صاحب کو قریب سے دیکھنے والے ان کی شخصیت اور ان کے کردار میں بھی اس نفاست اور اسی پاکیزگی کے اعتراف پر اپنے کو مجبور پاتے تھے۔

جگر صاحب کا بے پناہ اخلاص اور انکا جذبۂ ہمدردی تھا جو ملنے والوں کو ان کی شاعری کی طرف کشاں کشاں لے آتا تھا۔

افسوس صد افسوس، ایسا شاعر اور ایسا انسان ہمارے درمیان سے اٹھ گیا اور ایسے زمانے میں رخصت ہوا جب زمانہ ایسے نادر انسانوں کو پیش کرنے سے قاصر ہو چکا ہے۔

جگر صاحب رخصت ہو گئے اور ان کے ساتھ ایک پورے دور کا خاتمہ ہو گیا شاعری کے دور کا بھی اور شرافت، غم گساری اور رفاقت کے دور کا بھی۔

بہار رفتہ میری پھر نہ آئی اے جگر والیں چمن میں ہر خزاں کے بعد لیکن اک بہار آئی

ندیم بھوپال

آج کے دور میں ادیبوں، شاعروں اور پڑھے لکھے آدمیوں کی کمی نہیں ہے لیکن ان کی شخصیتوں میں یہ حلقہ کشش نہیں ہے کہ ایک بار جو اس کے دائرہ میں آگیا باہر نکلنا دشوار ہو گیا اس کی وجہ صاف ہے کہ ان کی شخصیت ایک زرِ جاپان ہے۔ یہ بڑے آدمی بس دور سے ہی نظر آتے ہیں۔ قریب سے جب ان کی "بڑائی کا خول" اترتا ہے تو لوگ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ جس کو تاج محل اور قطب مینار سمجھ رہے تھے تو اندر سے نہایت کریہہ المنظر نکلا اور اس طرح اس کی عظمت اور بڑائی کا محل مسمار ہو کر رہ جاتا ہے۔

ہمارے نزدیک ایک بڑا آدمی وہ ہے جس کی جلوت اور خلوت کی زندگی میں کوئی فرق نہ ہو اور جو ان مشہور و معلوم سچائیوں پر جن کو ہر عالم و عامی جانتا ہے عمل پیرا ہو۔ جگر مرحوم اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ اس کسوٹی پر جب آپ عظمتِ انسانی کے دوسرے مدعیوں کو پرکھیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ دوسروں کے مقابلہ میں جگر صاحب کی شخصیت کتنی قد آور ہے۔ جگر صاحب کی ساری عظمت کا راز اسی میں مضمر ہے کہ وہ دنیا کی چند مشہور و معلوم سچائیوں پر عمل کرتے تھے۔

نئی نسل کے لئے جگر صاحب کی شخصیت کے اس پہلو میں بہت کچھ سامانِ عبرت موجود ہے۔ انھوں نے ایک راہ عمل متعین کر دی ہے جس پر چل کر بڑا آدمی بنا جا سکتا ہے۔ جگر صاحب کی خوبیوں اور کمزوریوں کا جائزہ اس مختصر سے مضمون میں لینا ممکن ہی ہے اس کے لئے کافی وسعت کی ضرورت ہے۔ مستقبل کے لوگ اس میدان میں اپنے اشہبِ فکر و قلم کی جولانیاں دکھائیں گے۔

آج لگائے نام کا تذکرہ بہت سننے میں آتا ہے جگر صاحب اس داستان کا بھی عنوان تھے۔ ان سے محبت کرنے والوں میں ہر مکتب خیال کے افراد شامل ہیں لیکن کیا مجال ہے کہ کسی کو جگر صاحب سے ذرا بھی تکدر ہوا ہو۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جگر صاحب نے مدت العمر اپنے آپ کو ادب کی سیاست اور نظریاتی کش مکش سے علیحدہ رکھا۔ جو محسوس کیا وہ کہا، اصول اور نظریاتی اختلافات میں ذاتیات اور نفس کی آلودگیوں کو نہیں آنے دیا اس لئے ان سے شکایت نہیں ہوئی اس معاملہ میں حضرت جگر صاحب کی اس معاملہ میں تقلید کی جائے تو بہت سی پیچیدگیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے لیکن ایسا وہی کر سکتا ہے جو سراپا خیر ہو جس کا اخلاق اور مجسم محبت ہو جگر صاحب شہنشاہ متغزلین ہی نہیں تھے عظیم انسان بھی تھے اور ان کی شاعری بھی آب و رنگ لئے ہوئے۔ غزل کی سب سے بڑی خصوصیت معنوی داخلیت ہے اور جگر صاحب کے یہاں یہ خصوصیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے پہلے اسے داخلیت کی بھٹی میں تپا لیا ہے۔

جگر صاحب کی غزل ہمیشہ اپنا جادو جگاتی رہے گی۔ کیونکہ اس میں جذبہ کی شدت کے ساتھ وہ فنکارانہ خلوص بھی شامل ہے جس کے بغیر کوئی تخلیق فن پارہ نہیں ہوتی۔

احمد ت کدنشم

اگر یہ کہا جائے کہ جگر کی موت اردو شاعری کے اس انقلابی دور کی موت ہے جس میں اردو غزل گوئی کو پہلی بار نکھرنے کا موقع ملا تو غلط نہ ہوگا۔ جگر نے اردو شاعری کے دامن کو گلہائے رنگارنگ سے بھر دیئے ہیں زندگی بھر وہ ترنم

شعر و ادب کی خدمت کی اور ۷۰ سال کی عمر تک پہونچنے کے بعد انتقال فرمایا۔
گذشتہ دس بارہ سال اردو زبان و ادب پر بڑے بھاری گذرے ہیں۔
ان برسوں میں ہم سے حسرت موہانی، سیماب اکبرآبادی۔ آرزو لکھنوی، رضائی
وحشت کلکتوی۔ مجاز لکھنوی اور اس پایہ کے دیگر شعرا ایک ایک جدا ہوئے
اور اب اس دور کے آخری شاعر جس پر اردو غزل گوئی بجا طور پر فخر کرتی تھی، ہم سے
رخصت ہوئے۔ آج بزم شعر و ادب سونی ہے۔ دل غم و اندوہ سے چور ہے۔
ابھی کل ہی کی بات ہے کہ اس عظیم شاعر کے کلام کو سن کر لوگوں پر وجد کا عالم
طاری ہو جاتا تھا اور آج وہ خاموش ہے۔

اجمل بجلی۔

عام طور پر حضرت جگر مرادآبادی کو لوگ اردو کے ایک کامیاب اور
بلند پایہ شاعر، اور اس دور کے نابغہ غزل کی حیثیت سے یاد کریں گے اور یہ
ٹھیک بھی ہے کیونکہ ان کے کلام نے اس دور میں ہزاروں دلوں کو مسخر کیا اور
شعر گوئی میں اپنا سکہ جما دیا۔ یہ خوشی اور مسرت کی بات ہے کہ آزاد ہندوستان نے
سرکاری طور پر بھی اپنے اس شاعر کی قدر کی اور انھیں ساہتیہ اکاڈمی کے ممتاز ترین
انعامات سے نوازا مگر جن لوگوں کو جگر مرحوم کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا
وہ انھیں محض ایک شاعر کی حیثیت سے یاد نہیں رکھیں بلکہ ان کی وہ بہت
سی انسانی خوبیاں اور مشرقی اور اسلامی تہذیب کا وہ نمونہ جو ان کی فقیرانہ
زندگی میں پایا جاتا تھا مدتوں یاد رہے گا۔
جگر مرحوم کی زندگی مختلف ادوار سے گذری شاعری اور شوق سخن تو انہیں

زندگی کے ہر دور میں غالب رہا۔ مگر اس زندگی کی بابت یقین کے ساتھ بیرونی نظر سے دیکھنے والے بھی یہ کہہ سکیں گے کہ و للآخرۃ خیرلک من الاولیٰ کا قرآنی ارشاد پوری طرح صادق آتا تھا۔

ہمارے زمانے کے دوسرے ممتاز شعراء کی طرح اور ان کا دور پر ہم نظر ڈالیں گے تو حضرت مرحوم کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان پر تصوف کا پورا غلبہ تھا اور اس نسبت سے جو اگر خوش قسمتی سے کسی حد تک بھی کسی انسان کو حاصل ہو جائے تو اس کی زندگی میں جو حقیقی قدریں ہیں اور جن کے سرا و دیکھ لکھی ہے۔ بہت ہی بے وزن اور بے حقیقت ہے یہ زندگی بھی مالا مال تھی۔

اس لحاظ سے جگر مرحوم کا ہم میں سے اٹھ جانا صرف ایک بلند پایہ شاعر کی موت نہیں بلکہ ایک بہت اچھے اور بلند مرتبت انسان کی بھی موت ہے جو اپنی نغمہ سرائی سے ہمارے لئے تھوڑی دیر کے لئے لطف و تفریح کا سامان مہیا نہیں کرتا تھا۔ بلکہ ہمیں زندگی کی وہ ہستی بہا اقدار اور ہمارے مذہب، ہماری تہذیب اور ہماری ثقافت کے وہ اصول پہلو یاد دلاتا تھا۔ جن سے ہمارا رشتہ ہمیشہ قایم رہنا چاہیئے۔

قدرتی طور پر جگر مرحوم کے اُٹھ جانے سے اُردو داں طبقہ اور اردو شاعری کے دلدادہ سوگوار ہوں گے مگر اس سوگ میں ہمیں جگر کی ادبی حیثیت کے ساتھ ساتھ ان کے ایک بلند پایہ انسان اس دور کے ایک صوفی اور فقیر کی جو حیثیت تھی وہ بھی یاد رکھنی چاہیئے۔

جگر کا نام اُردو ادب میں پرانے اُستادوں کی طرح اور اس دور کے اُردو

غزل خواں شعراء میں سے حسرت مرحوم کی طرح ہمیشہ یاد رہے گا۔

انقلاب بمبئی۔

جگر مرحوم اپنے رنگ میں تنہا ہے اور تنہا گئے ان کی سرمستی و مدہوشی اور موسیقیت و تسنگی ان کا خاص وصف تھا۔ بارگاہِ حسن ہو یا نزل عشق دونوں ہی میں ان کی یہ انفرادیت صاف نظر آتی ہے۔ مرحوم مرادآباد میں پیدا ہوئے اصغر مرحوم سے وابستہ ہو کر الہ آباد میں مدتوں رہے اور مشرقی یو۔پی کے شہر گونڈہ میں پیوند خاک ہوئے۔ اعظم گڈھ سے ان کی ادبی اور شعری زندگی کو بڑی وابستگی رہی جسے آخری دور تک نباہتے رہے وہ اُردو کے مسلم غزل گو شاعر ہی نہیں تھے بلکہ شہنشاہِ غزل تھے۔ جب حج کو تشریف لے گئے تو مکہ مکرمہ کے اخبارات اور مجلۃ الحج نے ان کو اسی خصوصیت سے متعارف کرایا اور ان ہی اوصاف سے ان کا استقبال کیا۔

بے باک سہارنپور

جگر مرحوم نے شاعری کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد شاعری کے مقاصد کو ہر مرحلے پر ملحوظ رکھا اور انھوں نے بجا طور پر یہ محسوس کیا کہ شاعری اگر محض شاعری ہی ہے اور وہ انسانی سوسائٹی کی تعمیر و تہذیب میں کوئی نمایاں خدمت انجام نہیں دے سکتی تو وہ یقیناً گمراہی اور ضلالت پرستی ہے اور یہی وہ شاعری ہے جسے قرآنی زبان میں طغیان و ضلالت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جگر مرحوم کے ہر دور کا کلام انسانی اعلیٰ قدروں اور محبت و اخلاق کے پاکیزہ تقاضوں ہی کا ترجمان ہے اور انھوں نے ہمیشہ اپنے کلام کی وضاحت و تشریح میں اپنی زندگی اور اپنی بلند کرداری کا آئینہ

پیش کیا ہے انہیں قدرت کی طرف سے انسان دوستی، دردمندی و دل سوزی
اور عام بندگانِ خدا کی غمخواری و غمگساری کی جو دولت ودیعت کی گئی تھی۔ وہ
ان کے کلام ہی کے ذریعہ نہیں بلکہ براہِ راست ان کی زندگی اور ذاتی کردار کی
وساطت سے بھی عالمِ انسانی میں تقسیم ہوتی رہی۔ شاعروں میں بغض و حسد، کمتری و
برتری کے احساسات اور غرور و پندار کے امراض عموماً ہوتے ہیں، اور یہ اسی
شاعری کے ثمرات ہیں جسے ضلالت و گمراہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن جگر صاحب
شاعری کے جس بلند مقام پر متمکن تھے اور انھوں نے شعر و ادب کو انسانی قدر و
منزلت کے جس آئینہ میں دیکھا تھا یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی فطرت کی پاکیزگی
خود بھی ان اخلاقی امراض سے محفوظ رہی اور اسی پاکیزگی کا فیضان تھا کہ ان
کے ہمعصر شعرا بھی، انہیں بغض و حسد کے تیروں کا نشانہ بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکے
جتنی عظیم ان کی قلندرانہ فیاضی تھی، اتنا ہی اس کا احترام و اعتراف تھا اور
ہر مجلس و مقام پر ان کی امتیازی حیثیت کو قدر و عقیدت کی نظروں سے دیکھا
جاتا تھا۔

سندلیش۔ جموں

جگر مرحوم اپنے کلام میں نفاست، موسیقیت اور تخیل کو اس جابکدستی سے
سموتے تھے کہ بقول کسے۔ ع

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے

اور یہی جگر کا طرۂ امتیاز تھا یہی چیز انہیں اپنے ہمعصروں سے ممتاز کرتی ہے
حضرت جگر مرادآبادی کی ان خدماتِ حسنہ کے پیش نظر ملک کے مختلف حصوں

مرحوم کے لواحقین کے لئے فنڈ جمع کرنے کے اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ ملک کے دوسرے حصوں کے شانہ بشانہ ریاست جموں و کشمیر میں بھی اس ضمن میں بہت کچھ کیا جا رہا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت جگر مراد آبادی ایک خود دار شخصیت تھے انھوں نے تمام عمر کسی کے سامنے دست طلب دراز نہیں کیا وہ اپنے پیچھے کوئی اثاثہ نہیں چھوڑ گئے۔ چنانچہ اس ملک کے دوسرے حصوں کے علاوہ جموں و کشمیر میں بھی یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ ان کے لواحقین کو محسوس نہ ہونے پائے کہ جگر اس دنیا سے اٹھ گئے ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر میں ادب نواز حضرات کی کمی نہیں۔ چنانچہ مشاعروں ادبی اجتماعوں اور دیگر ذرائع کے ذریعہ حضرت جگر کے لواحقین کے لئے فنڈ جمع کئے جا رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ریاست کے وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد بھی اس معاملہ میں ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے۔ اور یقین کیا جانا چاہیئے کہ جلد ہی ایک رقم خطیر ریاست سے جگر کے لواحقین کو ارسال کی جائے گی۔

نگارش۔ کراچی

شہنشاہِ تغزل علی سکندر جگر مراد آبادی ۹ ستمبر کو اپنے عارضی مسکن گونڈہ میں ستر سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ وہ دلنشیں اور پر اثر آواز جو نصف صدی سے زیادہ تک مشاعروں اور ادبی صحبتوں کے لئے سرمایۂ حیات ثابت ہوتی رہی۔ وہ پاکیزہ خیالات جو سیکڑوں ہزاروں گم کردہ راہروانِ شاعری کے رہبر بنتے رہے اور وہ جاذب و مخلص شخصیت جو جاننے والوں اور شناساؤں کیلئے پر موقعہ اور مہم میں باعث تقویت بنی رہی آج جگر صاحب کی وفات

کے ساتھ یہ سب باتیں ایک حسرت ناک یادگار میں تبدیل ہو گئیں۔

جگر کیا گئے غزل کی آبرو جاتی رہی۔ اب اس کو حسن و جمال اور رعنائی کون عطا کرے گا۔ اب اس کو دیار محبت کی دلکشیاں کون دے گا۔ جگر نہیں گئے غزل کا حسن گیا اور اس کی آبرو گئی۔ اس کی دلکشی و رعنائی گئی اس کی محبوبیت و انفرادیت ختم ہو گئی۔ اب "میخانۂ غزل" سونا ہو گیا۔ ساقی نہ رہا تو کون جام و پیمانہ عطا کرے گا۔ وہ ننگِ میخانہ ہوتے ہوئے بھی پیرِ میخانہ تھے ان کا یہ اعتراف حقیقت پر مبنی تھا کہ

ننگِ میخانہ تھا میں ساقی نے یہ کیا کر دیا
پینے والے کہہ اٹھے یا پیرِ میخانہ مجھے

جگر رخصت ہو گئے اور ان کے ساتھ ایک پورے دور کا خاتمہ ہو گیا شاعری کے دور کا بھی اور شرافت غم گساری اور رفاقت کے دور کا بھی۔

لیل و نہار (لاہور)

رئیس المتغزلین حضرت علی سکندر جگر مرادآبادی ۹ ستمبر کی صبح کو ستر برس کی عمر میں گونڈہ میں انتقال کر گئے۔

..... حضرت جگر بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ تہذیب و شرافت مشرقیت، وضعداری، اخلاق اور مروت کے بھی پتلے تھے ...... ان کی جوانی عبادت تھی، گہری مذہبیت، پرخلوص سادہ اور دلدوز طبیعت لمند مشربی رنگینی اور ان رنگوں کی دھوپ چھاؤں سے .... واقعہ یہ ہے کہ بہت سے ہمعصر شعراء کی طرح ان کی پیشانی نہ کسی ریاست کے آستانہ پر جھکی نہ کسی لیڈر

کے آگے۔ وہ سیاسی آدمی نہیں تھے اور انہیں ارباب سیاست کی دنیا بڑی پرفریب اور پست معلوم ہوتی ہے۔ جگر گہری مذہبیت رکھتے ہیں۔ مذہبیت نے جگر میں رعونت نہیں انکسار پیدا کیا ہے۔

تعمیر (سرینگر)

کشمیر کے ساتھ جگر صاحب کو ایک نسبت خاص تھی ۱۹۵۶ء کے جشن کشمیر میں وہ آخری بار وارد کشمیر ہوئے اور یہاں کی ادبی محفلوں کو اپنے دم قدم سے ایسی رونق بخشی کہ ان کی یاد کافی مدت تک دلوں کو گرماتی رہے گی۔

کشمیریوں کے لئے جگر صاحب کی موت کتنا اُدرح فرسا سانحہ ہے اُس کا اندازہ وزیراعظم جناب بخشی غلام محمد اور وزیر تعلیم و اطلاعات جناب میر غلام محمد راجپوری کے تعزیتی بیانات سے ہو سکتا ہے۔ جناب بخشی غلام محمد نے جگر صاحب کی موت کو ناقابل تلافی بتایا ہے اور کہا ہے کہ ان کی حیثیت کا شاعر شاید کئی صدیوں تک پیدا نہ ہو سکے۔ راجپوری صاحب نے جگر کی شاعری کو ہندوستانی نوجوانوں کے شباب اور نغمات کا ترجمان بتایا ہے اور کہا ہے کہ جگر کی مقبولیت کا راز یہ ہے کہ انھوں نے اپنے فن کو عوام سے الگ تھلگ نہ کیا اور اپنا فنی معیار بلند رکھتے ہوئے عوامی مذاق کو تسکین کرتے رہے۔

شاعر بمبئی

موت اک دام گرفتاری تازہ ہے جگر
یہ نہ سمجھو کہ غم عشق نے آزاد کیا

کئی سال سے حضرت جگر مراد آبادی عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔ کئی بار ان کی حالت نازک ہوئی کئی بار شورِ فکر و تشویش اُٹھا، مگر پرستارانِ جگر اور اُردو کی خوش قسمتی سے وہ نازک گھڑیاں ٹل گئیں اور بالآخر وہی ہوا جس کے تصور سے اکثر روح لرز جایا کرتی تھی۔

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کو صبح ۷۰ سال کی عمر میں عشقیہ شاعری کے آخری امام حضرت جگر مراد آبادی نے داعیِ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ وہ ادھر بہت دن سے علاج کے سلسلے میں لکھنؤ میں مقیم تھے لیکن ان کی موت گونڈہ ہی میں واقع ہوئی جہاں انھوں نے " مدت میں وہ پھر تازہ ملاقات کا عالم " والی تاریخی غزل کہی تھی۔ وہی گونڈہ جس کے ذرہ ذرہ سے اُنہیں عشق تھا اور جس کی خاک کو حسرت تھی کہ اُن کا تپیدہ دل اسی میں مدفون ہو۔ اُن کے قلب کی وہ دھڑکنیں جو عشقیہ شاعری کی دھڑکنیں بنیں، کہیں اور پیوندِ زمیں نہ ہوں۔ گونڈہ کی سرزمین کی یہ آرزو پوری ہوئی لیکن لاکھوں پرستارانِ جگر کی آرزوؤں کی پامالی کے بعد۔ اُن کی نمازِ جنازہ اُن کے مکان کے سامنے جلالی مسجد میں ادا کی گئی اور تکیہ جیون شاہ میں اُنھیں دفن کیا گیا۔ ان کی موت کی اطلاع نے ہند و پاک کے گوشہ گوشہ میں صفِ ماتم بچھا دی۔ عوام و خواص میں رنج و غم کے اتنے گہرے جذبات پیدا ہوئے جو اس سے پہلے کم ہی دیکھنے میں آئے۔ ہند و پاک کے ریڈیو اسٹیشنوں نے ان کی موت کی اطلاع دی۔ ہندوستان کے اکثر ریڈیو اسٹیشنوں نے خصوصی پروگرام

رکھے گئے۔ مختلف زبانوں کے اخبارات نے بھی اُن کے انتقال کی خبریں شائع کیں اُردو کے اخبارات و رسائل میں یہ سلسلہ جاری ہے۔ پے در پے تعزیتی جلسے منعقد ہو رہے ہیں۔

مرحوم اُردو کے محبوب و مقبول ترین شاعر تھے۔ اُنہیں ان کی زندگی ہی میں جتنا نوازا گیا، اُس کی مثال نہیں ملتی۔ حکومت ہند اور حکومت یوپی سے وظیفے ملتے تھے۔ عنقریب اُن کی "گولڈن جوبلی" منائی جانے والی تھی۔

جگر مرحوم کی شخصیت میں بلا کی جاذبیت تھی۔ اُن کا اول و آخر عشق تھا ان کی شاعری جذب و کیف و مستی سے بھرپور تھی۔ ترنم، گرمی، تڑپ، سپردگی اور والہانہ پن ان کا اپنا حصہ تھا۔ احساس کی جو شدت اُن کے یہاں پائی جاتی ہے وہ عشقیہ شاعری میں کم ملتی ہے۔ وہ اپنی تمام رعنائیاں اپنے ساتھ لے گئے۔ اُن کے روح نواز ترنم اور اُن کی بے نیازانہ شخصیت سے اُردو والے محروم ہو گئے۔ جگر مرحوم نے اپنے آخری دورِ زندگی کو جس طرح بدلا، اپنی شخصیت میں جو توانائی، یکسوئی اور پاکیزگی پیدا کی وہ حد درجہ قابل احترام ہے۔ جگر مرحوم کی عظمت کے نقوش بہت گہرے ہیں۔ کون جانتا تھا کہ ایک رندِ لاابالی اُردو غزل کا آبرو بن جائے گا۔ اُن کی شخصیت اور اُن کے فکر و فن پر کہنے کی بہت سی باتیں ہیں۔ جو کہی جائیں گی لیکن مرحوم کی محبوبیت اور اُن کی یاد کے نقوش کبھی کم اور دُھندلے نہیں ہوں گے۔ اُن کی آواز تادیر ہر ادبی محفل میں گونجتی ہوئی محسوس ہوگی اور اُن کی کمی کا احساس دلوں میں نشتر توڑتا رہے گا۔

الجمعیتہ (دہلی)

تغزل کے امام حضرت جگر مرادآبادی کچھ عرصہ علیل رہ کر اس دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے۔ آج سارا ملک ان کی جدائی سے سوگوار ہے بڑے بڑے شاعر ادیب علماء اور مفکرین ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں جو جاتا ہے اسکی جگہ ہمیشہ کے لئے خالی ہو جاتی ہے اور جانے والوں کا حال یہ ہے کہ وہ مڑ کر بھی نہیں دیکھتے انھوں لا یرجعون وہ رخت سفر نہیں باندھتے بلکہ اپنی مسافری کو ختم کرتے ہیں اور اپنے اصلی وطن میں پہونچ جاتے ہیں ایک جگہ کیا حالی شبلی اکبر آبادی، اصغر گونڈوی، حسرت موہانی، علامہ اقبال۔ اور دوسرے قومی اور بین الاقوامی شعرا ایک ایک کر کے اُٹھ گئے اور قوم ان کا بدل پیدا نہ کر سکی۔

حضرت جگر شاعر ہی نہ تھے شاعری کی دنیا کے ایک عظیم پیامبر تھے تغزل ان کی شاعری کا زرمیدہ عنوان تھا اور تغزل بھی وہ جس پر خود تغزل کو ناز ہے اور جس کے بعد یا تو نری شاعری ہے یا شاعری کے پردہ میں کاریگری وہ ایک خوددار اور غیور شاعر تھے قدرت نے انھیں بے شمار خوبیاں انہیں فیاضی کے ساتھ بخشی دوستوں کے دوست تھے۔ مردم شناس تھے اخلاق اور انسانیت کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ اور ساتھ ہی ایسے سچے راسخ العقیدہ مسلمان بھی جن کے ایمان پر رشک آتا ہے شروع میں خواہ کچھ رہے ہوں درمیانی زندگی خواہ کسی رنگ میں گذری ہو مگر آخری عمر کا ایک بڑا حصہ زہد و ریاضت اور یاد الٰہی کی نذر ہوا دختِ رز کو چھوڑا تو آخر تک نام نہ لیا۔ مرتے مر گئے مگر اپنی نئی شاہراہ سے منحرف نہ ہوئے کہتے ہیں شاعری اور مے ناب میں چولی دامن کا ساتھ ہے مگر

جگر کی آخری زندگی نے جو خاص طویل ہے اس مفروضہ کو جھٹلا دیا ہے۔ پاکبازی اور متقیانہ دور کی شاعری میں رنگ دلی کے اعتبار سے فرق نہ آیا۔ اور ہر چند چھوٹے کے بعد ہاتف غیبی نے ساتھ نہیں چھوڑا۔ خدا غریق رحمت کرے۔ انا کسٹ شاعروں سے ان کی کبھی نہیں بنی آپ کا ایمان تھا جس کا اظہار بھی کرتے رہتے تھے جو شاعر حالق فطرت سے بیگانہ رہے اس کی شاعری میں کبھی حسن پیدا نہیں ہو سکتا۔ ایسے شاعر کی شاعری انقلابی تو ہو سکتی ہے مگر حسن و جمال کی مظہر نہیں ہو سکتی وہ جس نے ذرہ ذرہ کو جمال بخشا اور جس نے پھولوں کو چٹک اور تاروں کو چمک دی اسی سے شاعری میں جمال پیدا ہوتا ہے اسکے بغیر ہر شاعری اکھڑی کہلائے گی اور دل کی تسلی کے لئے انقلابی کہا جائے گا

حضرت جگر ان شعرا کے لیے ایک بہترین مثال تھے جو مشاعروں ہی کو مآل زندگی سمجھتے ہیں صرف مشاعروں ہی میں جبرہ افروز ہونا چاہتے ہیں شاعری میں کمال حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ نو آموز شاعر کسی نغمہ گو اور معیاری شاعر کو پیش نظر رکھیں اور اس عزم کے ساتھ شاعری کریں کہ یا تو وہ اپنے معیاری شاعر کا مرتبہ حاصل کریں گے یا پھر شاعری سے ہمیشہ کے لیے دستبردار ہو جائیں گے۔ ہمارے خیال میں جگر معیاری شاعری کے لئے بہترین نمونہ بن سکتے ہیں۔ کیوں کہ وہ ایک تو آخری دور کے شاعر تھے دوسرے ان کی شاعری حال اور ماضی کا سنگم تھی۔ اس میں ترقی یافتہ شاعری کے اجزا زیادہ تر شامل تھے۔ مگر اس میں ماضی کے حسن کو بھی سمو دیا گیا تھا۔

مئے دو آتشہ

جگر میری نظر میں

(پروفیسر رشید احمد صدیقی)

غزل جتنی بدنام ہے، اتنی ہی مجھے عزیز ہے۔ شاعری کا نام آتے ہی میرا ذہن غزل کی طرف مائل ہوتا ہے۔ غزل کو میں فن نہیں، اپنی شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے دونوں کو سمت رفتار ایک دوسرے سے حاصل ہوئی ہے، اس پر نہ ہنسنا چاہیئے نہ رونا، اس کا احترام کرنا چاہیئے۔

ہندوستان میں جن دیسی بدیسی زبانوں، مولویوں یا روایات کی بڑی مان دان ہے۔ یا رہی ہے، اردو ان کی غزل ہے، غزل، شاعری نہیں تہذیب بھی ہے۔ وہ تہذیب جو دوسری تہذیبوں کی نفی نہیں کرتی بلکہ ان کی تصدیق بھی کرتی ہے اور تنقیح بھی کبھی کبھی تزکیہ بھی۔ غزل کے اصلاحی اور ابتدائی مفہوم پر اب زور دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ فن ہو روایت ہو، مذہب و اخلاق ہو ان کا رشتہ اپنے ماسبق سے ضرور ہوتا ہے لیکن ان کا احترام کسی اور بنا پر کیا جاتا ہے۔ غزل کی اہمیت کا انحصار اس پر بالکل نہیں ہے کہ اس میں یا اس کے وسیلہ سے عورتوں سے گفتگو کی گئی یا کی جاتی ہے۔ اس کا احترام اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس سے گفتگو کرنی آجاتی ہے۔ اردو ادب میں ہر طرح کے شاعر گذرے ہیں

ان کی شاعری کا مقصد و محور بھی جداگانہ رہا ہے لیکن ہماری شاعری میں اثر کا جادو تو غزل ہی سے جگایا گیا ہے ۔

غزل میں ہمارے یہاں بے راہروی بھی ملتی ہے، ہر طرح کی بے راہروی اور جی بھر کے بے راہروی، یہ غزل کا قصور نہیں ہے۔ اس راہرو کا قصور ہے جو اپنی کم نگہی یا کم ظرفی سے رہگذر کے فریب کو منزل مقصود سمجھ لیتا ہے۔ ادنیٰ درجہ کے لوگوں نے زندگی کی بڑی قدروں کی اسی طرح بے حرمتی کی ہے۔ غزل کو بُرا بتانا یا اُسے ادنیٰ درجہ کی شاعری قرار دینا پڑھے لکھے سمجھدار لوگوں کے نزدیک اب ہنسی کی بات سمجھی جاتی ہے۔

صنف شاعری کے اعتبار سے میں غزل کو سب سے اونچا درجہ نہیں دیتا اور نہ اچھے سے اچھے غزل گو کو سب سے بڑا شاعر ماننا ضروری سمجھتا ہوں۔ غزل ساری شاعری بھی نہیں۔ شاعر کا درجہ اصناف سخن سے متعین بھی نہیں ہوتا۔ شاعری میں کسی مخصوص زندگی، ذہن اور زمانہ کی عکاسی، ترجمانی یا تلاش و طلب بھی خواہ مخواہ سی بات ہے۔ شاعری دنیا کی مادری زبان ہے، بڑی شاعری وہ ہے جہاں انسان اپنی منزلت محسوس کرے، نہ کہ رنج و راحت، عذاب و ثواب یا ارض و جاپان !۔

میں شاعری میں تجربات کا قائل ہوں، تجربات میں شاعری کا نہیں، تجربہ کو تجربہ ہی سمجھتا ہوں۔ الہام نہیں، میں ایسے تجربہ کو لاطائل اور خطرناک سمجھتا ہوں جہاں نتائج کے پرکھنے کی نہ ہمت ہو نہ توفیق، نہ نیت۔ تجربہ کرنا جتنا آسان ہے اس سے کہیں زیادہ مشکل اس تجربہ سے صحیح نتیجہ اخذ کرنا ہوتا ہے۔

اپنی کوشش پر فخر کرنا جتنا آسان ہے اتنا ہی اپنی حماقت کو تسلیم کرنا دشوار۔ انسانی تاریخ میں جگہ جگہ اسکی مثالیں ملیں گی نیں اور زندگی دونوں میں جان تجربہ سے آتی ہے، جو تجربہ سے بھاگے یا تجربہ میں پھنس کر رہ گئے، ان کا مستقبل کوئی نہیں، بذات خود میں مستقبل کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں، میں تو ماضی کے مستقبل اور مستقبل کے ماضی کا زیادہ قائل ہوں مستقبل کا میں یوں بھی عاشق نہیں ہوں کہ میں نے اس کا منتظر بالعموم ایسے ہی لوگوں کو پایا جو اپنے مستقبل کیلئے زیادہ فکر مند ہوتے ہیں بہ نسبت کسی دوسرے کے۔

میں شاعری میں اس لئے تجربہ کا قائل نہیں ہوں کہ غزل یا ہم آپ واجب القتل ہیں، بلکہ اس لئے کہ جو لوگ غزل سے دلچسپی نہیں رکھتے یا اس کو کافی نہیں سمجھتے ان کے لئے شاعری کے دروازے بند نہ ہو جائیں، شاعری اصناف سخن میں کبھی قید ہوئی نہ ہو سکتی ہے، زندگی کے بدل جانے سے شاعری کی وضع قطع، موضوع، اسلوب و انداز کا بدل جانا بھی کوئی قیامت نہیں۔ ایسا ہوتا رہا ہے، ہونا چاہیئے اور ہو کر رہے گا وضع قطع اور موضوع بھی شاعری کا نہیں ہے شاعری کو وضع قطع میں محدود کر دینا ازم ہے اور موضوع میں مقید کرنا پروپیگنڈا، مجھے دونوں میں سے کسی ایک پر بھی فخر نہیں۔

سائنس اور نفسیات نے ہمارے ذہن و فکر کو نئی وادیوں اور نئے زاویوں سے آشنا کیا ہے۔ ان کا کام بھی یہی ہے۔ نئی حقیقتیں برابر سامنے آرہی ہیں جنھوں نے جانی پہچانی حقیقتوں کو کہیں زیادہ اجاگر کر دیا ہے کہیں ان کو پیچھے ڈھکیل دیا ہے اور کہیں بالکل ختم کر دیا ہے۔ ادب، شاعری شعوری

زندگی، غرض ہر جگہ یہ اثرات نمایاں ہیں مصوری اور شاعری کا نیا انداز دیکھ کر
ہم طرح طرح سے بدکتے ہیں، یہ بدکنا صحیح نہیں ہے۔ ہم نے حُسن کو اپنی پسند یا ناپسند
کی بابند کا سا لیا ہے لیکن نہ حُسن مقید محدود ہے نہ انسان کی پسند و ناپسند اسلئے پسند و ناپسند
کے معاملے میں احتیاط نہ انصاف کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے، کائنات کا حقیر ترین
جز بھی اتنا ہی حسین عظیم، ناقابل فہم یا ناقابل تسخیر ہے۔ جتنا کہ یہ پورا کارخانہ
قدرت اس لئے جز و کل کا تصور اعتباری ہے حقیقی نہیں۔ کائنات حُسن بھی ہے۔ اور
اور قانون بھی۔ اس حسن اور قانون کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ ہم ایسا نہیں
کرتے۔ ہم تو اپنی پسند کی عورت کو حُسن اور اپنی پسند کی لعنت کو قانون سمجھتے ہیں۔
حقیقی اور بڑی شاعری شاعر کا انفرادی، یگانہ اور لازوال کارنامہ
ہوتا ہے برخلاف سائنس کے کارناموں کے جو مشترکہ محنت اور تحقیقات کا نتیجہ
ہوتے ہیں۔ ایٹم بم بنانے میں معلوم نہیں کتنے سائنسدان اور سائنس کے کارپرداز
شریک رہے ہوں گے لیکن اقبال کی نظم "تنہائی"، "مسجد قرطبہ" یا ساقی نامہ" صرف
اقبال کے کارنامے ہیں۔ میرا مقصد یہاں سائنس کی اہمیت و عظمت سے انکار
نہیں ہے صرف شاعر کا منصب جتانا ہے۔

تیس سال کے اندر دو ایسی بھیانک جنگوں کا وقوع میں آنا جن کی مثال
تاریخ میں نہ ملتی ہو، زندگی کے طور طریقوں کو مسخ یا منقلب کر دینے کے لئے کافی
ہے۔ جب زندگی اس طرح زیر و زبر ہو چکی ہو تو شعر و ادب کے زیر و زبر ہو جانے
میں کیا شبہ ہو سکتا ہے، اب یہ ہمارے عالی دماغ اور بڑے لکھنے والوں کا فرض
ہے کہ وہ بتائیں کہ ہم کس مصیبت یا فریب میں مبتلا ہیں کہیں ایسا تو نہیں ہے

ہم گرفتار توان جنگوں کے عواقب کے ہوں لیکن سمجھتے یا سمجھاتے ہوں کہ خود زندگی
بیر ہے ان عواقب سے ۔

مصیبت کو دور کرنا جتنا مشکل ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ سہل منفعت بخش
رذلیل مشغلہ اس مصیبت سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہوتا ہے، غلہ پیدا کرنے
ے زیادہ منفعت بخش مشغلہ غلہ کی سیہ بازاری ہے کسی قوم یا شعر و ادب کا مطالعہ[1]
ن نقطۂ نظر سے کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ قوم یا اُس کا شعر و ادب
رلت یا ذلت کے کس درجہ پر ہے۔ ہم میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو یہ سمجھتے ہیں
. ادب اور زندگی کی حرمت سے کیا حاصل۔ جب ان دونوں کے بیچ کھانے
ں نفع ہی نفع ہو صنعتی تہذیب اور معاشی بحران میں ایسا ہونا تعجب کی بات نہیں
سبب اس کا ہے کہ صنعتی تہذیب اور معاشی بحران کو انسانیت کا تقاضا یا مقصد
تہذیب کا محور و منتہا قرار دیا جائے ۔

دُنیا کتنی ہی تیزی سے آگے کیوں نہ بڑھ رہی ہو انسان کا ذہن ہمیشہ
ں سے آگے ہوتا ہے۔

انسانی ذہن اپنے کارنامے پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ وہ ان
رناموں میں نہ کبھی پناہ لیتا ہے نہ ان کو پناہ دینے کی خواہ مخواہ کوشش
رتا ہے۔ اچھے بُرے کارنامے اپنی حفاظت خود کرتے ہیں فطرت ذخیرہ اندوز

---

[1] اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں   کہ ہے سرپنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا
س شعر کو آپ غالب کا کارنامہ سمجھیں یا نہ سمجھیں، یہاں اس کا یاد آجانا میرا کارنامہ ضرور ہے۔

کو بالکل نہیں لیکن نوع کا ضرور احترام کرتی ہے۔ اسکے برخلاف آرٹ اور ادب
نوع (اصناف) کا احترام بالکل نہیں کرتے۔ افراد (آرٹسٹ اور ادیب) کا
کرتے ہیں، کرنے پر مجبور ہیں۔ فن ہو یا زندگی، افراد ہی کے مرکب پر سوار ہو کر آگے
بڑھتی ہے۔ ان کے لئے کوئی اور مرکب اب تک دریافت نہیں ہو سکا ہے،
قدیم ہو یا جدید، اپنے اظہار یا اقتدار کے لئے فرد کا محتاج ہے۔ کسی اور کا
نہیں۔ فرد کی اہمیت سے انکار کرنا جہالت بھی ہے ظلم بھی۔

جگر صاحب کو میں نے ہر حال میں دیکھا اور پایا ہے، جب وہ آپے میں
نہ رہتے جب بھی اور ہوش و حواس میں ہوتے جب بھی۔ میں نے ان کو اصغر صاحب
مرحوم کے یہاں مودب دوزانو بیٹھے دیکھا ہے، اور ایسی مجلس میں بھی جہاں تبختر و
تمکنت باثروت و اقتدار کی کارفرمائی ہوتی۔ شاگردوں اور عقیدتمندوں
کے حلقے میں بھی پایا اور ان لوگوں کی صحبت میں بھی دیکھا جو خود جگر صاحب کی
شاعری اور شخصیت پر بڑی بیباکی اور آزادی سے اظہار خیال کرتے، وہ ہمیشہ
جگر صاحب ہی ملے۔ سب سے زیادہ نڈر اور بیباک میں نے ان کو بددماغ روسار
اور امراء کی صحبتوں میں پایا۔ دوسری طرف کم لوگ ایسے دیکھے جو خوردوں کی
دلنوازی اور دوستوں و بزرگوں کی تکریم میں جگر صاحب سے آگے ہوں۔

مجھے وہ زمانہ خوب یاد ہے جب جگر صاحب پر شراب کا بدترین تسلط تھا۔
اکثر و بیشتر وہ آپے میں نہ ہوتے عزیز اور عقیدتمند ان کو قدم قدم پر سنبھالتے
ہوتے، اس حال میں بھی ان کی زبان سے کبھی ایسا فقرہ نہ نکلتا یا کوئی ایسا
فعل سرزد ہوتا جس سے خود ان کو یا ان کے دوستوں کو شرمندگی اٹھانا پڑتی،

شراب اور شاعری سے بے نقاب کرنے والی کم کوئی چیز ہوگی۔ جگر صاحب کو ان دونوں نے بھی کھول کر بے نقاب کیا، برہنگی کہیں نظر نہ آئی، رکھ رکھاؤ ہر جگہ موجود، غالب نے کسی ایسے ہی موقع پر کہا ہوگا ؎

پیمانہ برآں لب زدہ آمست کہ غالبؔ ۔۔۔ در بے خودی انداز گفتار ندانند

جگر صاحب کو میں نے شاعری پر بحث کرتے بھی سنا ہے، وہ شاعری پر بحث نہیں کر سکتے، اپنی پسند یا ناپسند کے اشعار پر وجد کر لیتے یا جھگڑ لیتے ہیں۔ وہ اقبالؔ کی شاعری کے کچھ بہت زیادہ قائل نہیں ہیں، فانی بھی نہ تھے۔ جگر اور فانی دونوں کا شاعری کا نقطۂ نظر شخصی شاعرانہ ہے، غزل گوئی میں ہوتا بھی کچھ ایسا ہی ہے، شاعری شخصی بھی ہوتی ہے آفاقی بھی، میں دونوں کا قائل ہوں لیکن سر اسی کے آگے جھکاتا ہوں جس کے یہاں دونوں میں تمیز کرنا دشوار ہو جائے، جگر صاحب اقبال کے قائل ہوں یا نہیں لیکن جہاں وہ جہت سے گذر کر جہاں میں داخل ہوتے ہیں وہاں اقبال سے ان کو مفر نہیں ہوتا۔ اقبال سے کس اردو شاعر کو اب مفر ہے۔

جگر کی شاعری نے بعض تنقید نگاروں کو بڑی دلچسپ مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے، وہ کبھی غزل کی مذمت کر کے جگر کی مذمت کرتے ہیں اور کبھی کسی شاعر کی مذمت کر کے جگر کی تعریف! مثلاً فلاں شاعر فلاں شاعر جیسا ہے، یا نہیں اس لئے وہ اچھا یا برا ہے، مثلاً یہ انداز گفتگو!

جگر داغ کے قبیلہ کے ہیں۔ فانی اور اصغر یا غالب سے کوئی نسبت نہیں رکھتے۔ ... جگر سے وہ ذہنیت شروع ہو جاتی ہے جو نئے دور

کی اصل روح ہے ..... جگر کے لہجے میں جو خود باختگی اور تڑپ ہوتی ہے۔ اس کا داغ اور داغ کے مدرسۂ شاعری میں کہیں پتہ نہیں اور نہ ہو سکتا تھا .... جگر کی شاعری میں جو رومانی دردمندی ہے وہ کچھ ہمارے ہی دور کی چیز ہے ..... جگر کی شاعری بہت سطحی شاعری ہے۔ نامرادی اور بے چارگی کے احساس نے ان کے یہاں کچھ نئے عنوان کی نرمیاں ضرور پیدا کر دی ہیں لیکن ادبی درجہ کا بوس و کنار اور سستے قسم کی لذتوں کی ہوس دوسرے شاعروں کی طرح ان کے یہاں بھی ملتی ہے .... البتہ جگر کے کلام میں ایک تلملاہٹ پائی جاتی ہے جو ان لذتوں کے میسر نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے جس کو انھوں نے اپنے لئے لذت بنا لیا ہے ...جگر کی شاعری میں نفسیاتی مزاحم اور جذباتی رکاوٹوں کا کہیں پتہ نہیں ہے ..... جگر عشقیہ زندگی کے عارضی لمحات کے شاعر ہیں۔ شاعری کی نوجوان نسل نے جگر سے وہ بیباک معصومیت اور باغیانہ اور سرفروشانہ صداقت از سر نو پائی جس کی کسی زمانے میں سعدی کا سا معلم اخلاق قسم کھا چکا ہے اور جو نوجوانوں سے جا چکی ہے ..... داغ سے جو ترکہ جگر نے پایا ہے وہ عشق کی آزمودہ کاری ہے ..... جگر کے اشعار میں کسی قسم کی گہرائیاں نہیں ہوتیں ان کے یہاں ایک تھما ہوا ایک جذباتی ہیجان ضرور ہوتا ہے جس کو ہم اکثر کیف سمجھ لیتے ہیں ... جگر کو حکمت و اخلاق سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔ کائنات اور

انسانی زندگی کے اسرار و رموز سوچنے سمجھنے کی ان کی اندر تاب ہے نہ ان کو اس کی فکر کہ وہ زندگی کی ان گہرائیوں اور بلندیوں کا جائزہ لیں ..... جگر کی رسائی فکر و احساس کا دائرہ بہت تنگ ہے اور ان کے یہاں موضوع کے اعتبار سے زیادہ تنوع بھی نہیں۔ اس لحاظ سے وہ اپنے معاصرین مثلاً عزیز، فانی، اصغر وغیرہ کے مرتبہ کو نہیں پہونچتے۔۔ جگر کے اشعار میں جو نیاپن ہے اس کا تعلق دراصل انداز و اسلوب سے زیادہ ہے فکر و احساس سے کم ہے وغیرہ۔

یہ باتیں اور اس طرح کی باتیں جگر کے کلام پر صادق آتی ہوں یا نہیں نقاد کے ذہنی اضطراب و انتشار کی غمازی ضرور کرتی ہیں۔ جگر ہی کی شاعری پر نہیں، اردو شاعری پر بھی ہمارے اکثر نقاد اظہار خیال کرتے ہیں تو بالعموم ان کے سامنے یا تو اقبال کی شاعری ہوتی ہے یا ترقی پسند نظریے، اقبال کی شاعری اور ترقی پسند نظریے دونوں اپنی اپنی جگہ مسلم، لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ہر شاعر انہیں دو حلقوں میں اسیر ہو، بالخصوص غزل گو! لیکن اس سے اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ذہنوں پر اقبال کی کیسی مضبوط گرفت ہے یا ہماری نیتوں پر ترقی پسندی کے نظریے کس درجہ مسلط ہیں۔

یہاں میں فن تنقید پر کوئی بحث چھیڑنا نہیں چاہتا لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے بعض ہونہار اور ذی استعداد نوجوان جن میں تنقید کی اعلیٰ صلاحیتیں پوشیدہ ہیں، غالباً نادانستہ طور پر ہمارے بعض اچھے شعرا

سے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ سیاسی استیلا نے شرفائے ادب کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا ہے، آرٹ اور ادب کے خدمت گزاروں کو سیاسی نظریوں سے اتنا سرشار نہ ہونا چاہیئے کہ وہ ادب کے صحیح خدوخال اور صالح تقاضوں کو فراموش کر جائیں یا ان کو مسخ کرنے کی کوشش کریں۔

شاعر، ادیب، آرٹسٹ، نہ زمانے کے پابند ہوتے ہیں، نہ زندگی کے، نہ نقاد کے، زمانہ زندگی اور نقاد تینوں شاعر، ادیب اور آرٹسٹ کے منتظر ہوتے ہیں، زمانہ ان کا رُسد ہوتا ہے وہ زمانے کے پابند نہیں ہوتے وہ اپنے ارادوں کے غلام نہیں ہوتے بلکہ ارادوں کو اپنی ضرورت تسلیم کر ولتے ہیں، اگر شاعر اپنے ماحول کا پابند یا نقاد کی حکم برداری پر مجبور ہو تو شاعری، ادب ادب اور زندگی سے تازہ کاری جو عین زندگی ہے، جاتی رہے۔ زندگی کا انسانی تصور، شرف و منزلت کی زندگی کا تصور ہے، مرض و ماحول کا نہیں میں یہ نہیں کہتا کہ جب ہر چہار طرف آگ لگ رہی ہو تو شاعر بانسری بجاتے رہنے میں حق بجانب ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ کہنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا کہ اگر بعض مواقع پر بانسری بجانا شاعر کو زیب نہیں دیتا تو ہر موقع پر نقاد کا بھی بانسری بجانا کوئی قابل تعریف بات نہیں ہے۔

جس طرح ملاؤں نے خدا کے آداب و اخلاق، وضع و قطع، پسند ناپسند اور علم و عمل کی مکمل ترجمانی اپنے ذمہ لے لی ہے اور ہمہ وقت یہ بتانے پر آمادۂ فساد رہتے ہیں کہ خدا نے یہ کیا ہے، یہ کرنا چاہتا ہے اور یہ کرے گا، اسی طرح بعض نقاد مارنے مرنے پر تیار رہتے ہیں کہ زندگی یہ ہے، ادب وہ ہے، آپ جبت پسند

ہیں، ہیں ترقی پسند، اگر خدا اتنا ہی ہے اور ویسا ہی ہے جیسا کہ مُلّا بتاتے ہیں اور زندگی اور ادب وہی ہے اور اتنا ہی ہے جتنا کہ ترقی پسند بتاتے ہیں تو ان کو ملاؤں سے ناتا جوڑ لینا چاہیئے۔

تنقید نہ یزداں کا فن ہے نہ اہرمن کا، وہ انسان کا فن ہے اور انسان کے بہترین کارناموں کے پرکھنے کا فن۔ ظاہر ہے بہترین کارناموں کے پرکھنے کیلئے انتہائی دیانت ودانشمندی اور احترام سے کام لینا پڑے گا۔ ترقی پسندی کے ساتھ انصاف پسندی بھی ہونی چاہیئے، تنقید نگار نہ تو پولیس کی مانند روزنامچہ تصنیف کرتا ہے نہ شانہ نشین فرشتوں کے مانند اعمالنامے مرتب کرتا ہے، یہ کیسی تنقید ہے کہ امت تو زید کی ہے، پیغمبر عمرو کا، خدا بکر کا اور جنت و دوزخ خالد کی! ہر امت کا حشر اسی کے پیغمبر کے ساتھ اور اسی کے خدا کے سامنے ہوتا آیا ہے، یہ کہاں کی تنقید ہے کہ اکبر الہ آبادی ناکام رہے اسلئے سرسید کامیاب رہے اور سرسید ناکامیاب رہے اس لئے کہ کانگرس کامیاب رہی اور کانگرس اسلئے کامیاب رہی کہ چین پر روس کا قبضہ ہوگیا اور روس ناکامیاب رہے گا اسلئے کہ رشید صدیقی جگر صاحب پر کچھ فرماتے ہیں، میں اپنے اکثر نقادوں سے کہوں گا۔

"دلی بنہی بخوب ما طعنہ مزن بزشتِ ما"

غزل پر حکم لگانے سے پہلے ہمارے تنقید نگاروں کو یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ غزل ایک طرف نو مشقوں کے لئے مشق کی حیثیت رکھتی ہے تو دوسری طرف استادوں کی استادی کا معیار بھی متعین کرتی ہے، شاعری بالخصوص غزل میں خالص احساس و فکر اور خالص انداز و اسلوب کا میں قائل نہیں،

ایک کو میں مرض سمجھتا ہوں دوسرے کو بیشترا بازی گری، ہم اور ہمارے شعرا اس طرح کی باتوں میں مدتوں مبتلا رہ چکے ہیں، بایں ہمہ میں انداز و اسلوب کو بہت عزیز رکھتا ہوں بکلیۃ نئی بات شاذ و نادر ہی کہی جاتی ہے، بات پُرانی ہوتی ہے اسلوب بیان اس کو نیا کر دیتا ہے کوئی بات دل نشیں اور دیرپا نہیں ہوسکتی، اگر وہ صحیح اسلوب سے مناسب اسپرٹ میں نہ کہی جائے۔ اسلوب موزوں نہ ہو تو گفتنی ناگفتنی بن جاتی ہے اور موزوں ہو تو ناگفتنی گفتنی۔ آج تک شعر و ادب میں جو افراتفری ملتی ہے اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ لکھنے والے مناسب اسلوب اور اسپرٹ کو کام میں نہیں لاتے۔ مثلاً جسے ہم عریانی، فحاشی یا بدمذاقی کہتے ہیں۔ وہ دراصل مناسب اسلوب اور اسپرٹ کا فقدان ہے بات کرنی آتی ہو تو بات کبھی نہیں بگڑتی۔

ایک ہی بات ہزاروں آدمی ہزاروں سال سے کہتے آئے ہیں اور کوئی خاص اثر نہیں ہوتا لیکن اُسی بات کو شاعر اس طرح کہہ دیتا ہے کہ وہ زبان زد ہو جاتی ہے اور کہاوت بن جاتی ہے۔ سب سے بہترا سالیب ضرب الامثال میں ملتے ہیں سہل ممتنع کا یہی مفہوم ہے، گالیاں، کوسنے، دعائیں، کہاوتیں بہت بڑے شعراء کے شاہکار ہیں۔

خارجی حالات و حوادث سے موجودہ غزل گویوں میں جگر سے زیادہ براہ راست متاثر ہونے والا شاذ ہی کوئی اور ہو۔ جگر میں یہ بات آج سے نہیں مدتوں سے ہے، انھوں نے ہر بڑے حادثہ کا اظہار اپنے کلام میں اکثر کیا ہے۔ کچھ دنوں سے ان کے کلام میں تاثرات کی یہ دریں لہر زیادہ نمایاں

ہوگئی ہے۔ غزل میں یہ چیز شروع تو حسرت سے ہوئی تھی لیکن جگر کے یہاں زیادہ گہری اور بنیادی پائی جاتی ہے حسرت کے یہاں اس کی حیثیت جزئی سی ہے جگر کے یہاں یہ قلب کی دھڑکن بن کر نمایاں ہوتی ہے۔ میرے نزدیک یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری شخصیت کو یا شخصیت شاعری کو پست یا بلند کرتی ہے شاعری اور پروپگنڈے کا فرق بھی یہیں ظاہر ہوجاتا ہے

حسرت اور جگر دونوں اصلاً حسن و عشق کے شاعر ہیں لیکن ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ ایک محبوب کی موجودگی میں اور دوسرا محبوب کی دُوری پر غزلخواں ہوتا ہے، محبوب کی موجودگی وصال کی محرک ہوتی ہے دُوری محبت کی، جگر محبت کے شاعر ہیں حسرت محبوب کے! جگر دوری نا مہجوری کی عظمت کے قائل ہیں، کم سواد شاعروں کے خلاف وہ ہر قیمت پر وصل کے خریدار نہیں ہوتے، جگر متاع اور قیمت کے نازک اور گراں بہا رشتہ کو خوب سمجھتے ہیں اور اسے نباہتے ہیں۔ ان کے عشق میں خواہ مخواہ کی فدویت یا فگندگی نہیں ہے غالب نے سب سے پہلے نہایت واضح طور پر عاشقی کی سطح کو اونچا کیا۔ تہذیب رسم عاشقی حسرت کے یہاں غالب ہی سے آئی ہے، جسے جگر نے تادیب رسم عاشقی تک پہونچا دیا۔ اب تو یہ روایت چلی آتی تھی کہ شعراء عاشق کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنے پر پورا زور صرف کردیا کرتے تھے۔ جگر کے یہاں محبوب کے جذبات و احساسات کی بھی ترجمانی ملتی ہے۔

شاعر (عاشق) وصالِ محبوب کی خواہش کا اظہار کرے گا تو اس کا بہت زیادہ امکان ہے کہ وہ تہذیب سے گر جائے، لیکن جب بھی وہ محبوب کے

جذبات کی ترجمانی کرے گا، احتیاط و احترام کے دائرہ سے قدم باہر نہ نکال سکے گا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو خود اپنی نظر سے گر جائے گا، جگر عشق کے غلبہ میں محبوب کی عفت کو کبھی نہیں فراموش کرتے اردو کے عام شعرا کے یہاں محبوب کا کردار کچھ زیادہ بلند یا دل پسند نہیں ہے۔ ہندی شاعری کی روایت یہ ہے کہ اظہار عشق عورت (بیوی) کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور اکثر درد مجبوری کا اظہار ہوتا ہے، طلب وصال کا نہیں، یہی سبب ہے کہ اس طرح کی شاعری کا دائرہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو، اس کی پاکدامنی مسلم ہے۔ اردو شاعری میں عورتوں کی طرف سے مردوں نے ریختی میں جن باتوں کا اظہار کیا ہے وہ اتنی شاعری نہیں ہے جتنی کہ ذہنی اوباشی۔ ریختی کے جواز میں بھی کچھ نہ کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن وہ جس بات کی غمازی کرتی ہے وہ اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے ہمارے عام شعراء کے محبوب سے دوستی کرنے کی خواہش ہم میں آپ میں مشکل سے پیدا ہوگی۔ جگر کے محبوب کو ہر شخص اپنانا چاہے گا، اردو شاعری کو یہ زاویہ جگر نے دیا۔

جگر کو اصغر سے بڑی گہری عقیدت ہے لیکن شاعری میں وہ اصغر سے بالکل علیحدہ ہیں۔ اصغر سے ان کا شغف شخصی ہے شاعرانہ نہیں جس طرح حالی کا غالب سے تھا۔ اصغر کے یہاں تخیل زیادہ، جذبہ کم ہے۔ جگر کے یہاں جذبہ کی شدت ہے اسی لئے تخیل کی کمی اصغر کی شاعری حسن کی شاعری ہے جگر کی عشق کی حسرت کی محبوب کی۔ اصغر کے یہاں تصوف کا عمل دخل بنیادی نہیں ہے۔ اونچے درجہ کی ریاضیات و طبیعات کے مانند، اونچے درجہ

کی حسن کی شاعری تصوف معلوم ہونے لگتی ہے۔ اصغر نے اپنی حسن کار شاعری یا شاعرانہ حسن کاری میں تصوف سے کام لیا ہے لیکن صرف اس حد تک جس حد تک ان کا تصوف ان کے مقصد کے لئے کار آمد ہو سکتا تھا۔ اردو شاعری میں تصوف کو معتقدات کے دائرے سے نکال کر حسن کار و حسن آفریں اصغر نے بنایا۔ اصغر نے اپنی شاعری کا مدار تصوف پر رکھا نہ کہ تصوف کا شاعری پر جس طرح اقبال نے اپنی شاعری کا مدار فلسفہ پر رکھا، فلسفہ کا شاعری پر نہیں۔ اصغر نے بیعت کسی کی کی ہو، مرید وہ اپنی طبع حسن شناس و حسن شعار کے تھے۔

حسرت کے یہاں زبان و بیان کی ایسی بیساختگی ملتی ہے کہ ان کے الفاظ اور تراکیب کی غرابت یا اچانک پن بھی مزہ دے جاتی ہے۔ اکثر یہ غرابت ہی ان کا نشان دیتی ہے۔ بچوں کی مانند وہ اس درجہ معصوم اور بے تکلف ہیں کہ ان کا جا بجا کھل کھیلنا اور زیادہ بھلا معلوم ہونے لگتا ہے۔ سیدھی سادی بات کو بغیر کسی فلسفہ یا فسوں نیت کے مزے سے کہنا اور بس کہہ ڈالنا حسرت کا حصہ ہے۔ وہ بات کہہ کر تو خوش ہوتے ہی ہیں لیکن اس احساس سے اور زیادہ خوش ہو جاتے ہیں کہ ان کی باتوں سے دوسرے ان سے بھی زیادہ خوش ہوئے۔ برخلاف دوسرے کم سواد شعراء کے جو بات اس طرح کہیں گے گویا دنیا میں وہی اس بات کے کہنے کے لئے بھیجے گئے تھے اور اگر ہم آپ اُسے نہ سمجھیں یا اُس کی قدر نہ کریں تو اللہ کے غضب یا ان کے ادب سے ڈریں۔ غزل میں تو ازن حسرت نے پیدا کیا!

داغ کا رنگ اُردو شاعری سے نہ جائے گا اس لئے کہ وہ کوئی رنگ نہیں ہے بلکہ ہماری شاعری اور ہماری زندگی کے بنیادی رنگوں میں سے ہے۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں زندگی اور زمانے سے ساز باز کرتا ہمارے دلوں کو اپنی شوخی اور شرارت سے چھوتا چھیڑتا رہے گا۔ داغ کا یہ رنگ حسرت کے یہاں بڑے پسندیدہ انداز میں جلوہ گر ہے۔ لیکن مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ ہماری زندگی سے شوخی اور شرارت رخصت ہو رہی ہے جس زندگی میں تلخی اور نفرت راہ پا چکی ہو وہاں شوخی اور شرارت کا کہاں گذر! غزل گو آج بھی پیدا ہو رہے ہیں لیکن نہیں پیدا ہوتا ہے تو حسرت کا نام لیوا۔ یہ ترددکی بات ہے۔

میرا خیال ہے کہ جگر کی شاعری سے شراب کو جتنا نفع پہونچا۔ اتنا شراب سے جگر کی شاعری کو نہیں پہونچا۔ شراب پی کر شاعری نہیں کی جاتی جس طرح آج کل کے سپاہی شراب پی کر فوجی باجہ کی گت پر محاذ جنگ پر لڑنے مرنے جاتے ہیں۔ در اصل شخصیت شراب ہوتی ہے۔ جہاں سے شاعری نشہ بن کر برآمد ہوتی ہے جس طرح سے سایۂ تاک میں ہوتی ہے پرامومج شراب! شراب نشہ نہیں پیدا کرتی نشہ شراب پیدا کرتا ہے۔ جگر میں جو اضطراب و ہیجان ہے وہ شراب کا نہیں ہے دریا با وجود خروش موجے دارد" جو لوگ یہ بتاتے ہیں کہ شراب چھوڑ دینے سے جگر کی شاعری کا تار و پود ڈھیلا ہو گیا۔ وہ در اصل جگر کے شراب پینے یا ترک کر دینے کے واقعات پر نظر رکھتے ہیں۔ جگر کی شاعری پر غور نہیں کرتے یہی مغالطہ اُن لوگوں کو ہے جو حالی کے بارہ میں کہتے ہیں۔ کہ غزل ترک کر کے حالی شاعر نہ رہے شاعری سخن نہیں شخصیت ہوتی ہے، حالی کی غزلوں کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ

ہ غزل پر اکتفا کرتے، حالی کی غزلوں پر ان کی بعد کی نظموں کی بڑی واضح
پرچھائیں ملتی ہے۔ جگر کی شاعری دیکھ کر مجھے اکثر محسوس ہوا کہ یہ شخص شراب
ترک کئے بغیر نہ رہے گا۔ جگر نے شراب کی بنیاد شاعری پر رکھی ہے، شاعری کی
بنیاد شراب پر نہیں رکھی۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ شاعر کو اپنے تصور یا مسلک کی
بنیاد شاعری پر رکھنا چاہیئے۔ اپنی شاعری کو کسی تصور یا مسلک پر نہ رکھنا چاہیئے۔

مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ جگر جدید اردو غزل میں ایک نیا
مقدر تھے جس کی تکمیل ہو چکی اور یہ مقدر کچھ بہت مہتم بالشان مقدر نہ تھا۔
بیسویں صدی میں اردو غزل کا مقدر حسرت، فانی، اصغر و جگر چاروں کے
کلام پر مشتمل تھا، انیسویں صدی کے خاتمہ پر ہماری غزل کو ہمارے تمدن
کے ساتھ نئے حالات اور نئے مطالبات کے گلشن اور گلخن سے گذرنا پڑا اور
غزل ان چار دبستانوں میں جلوہ گر ہوئی جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔
بیسویں صدی کے نصف تک پہنچتے پہنچتے ان دبستانوں میں سے اصغر
اور فانی معرض خطا میں آگئے۔ حسرت کے بارہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ
ان کے پیروان معنوی بھی معدوم ہونے لگے ہیں۔ اب صرف جگر رہ گئے ہیں۔
بذات خود مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ بحرانی و ہیجانی دور میں
غزل جگر ہی کے سہارے آگے بڑھے گی، جگر کی شاعری میں وہ عناصر ہیں
جو اس دور کے آشوب و آزمائش میں غزل کو تب و تاب دیتے رہیں گے۔

جگر کی شاعری

(آل احمد سرور)

جگر ایک رومانی شاعر ہیں۔ رومان کسی نہ کسی حقیقت کو ہی خوابوں میں پیش کرتا ہے۔ جگر کے یہاں بھی خواب اور حقیقت کی دھوپ چھاؤں نظر آتی ہے۔ جگر نے ساری عمر حسن اور عشق کے نغمے گائے ہیں۔ حسن و عشق کا تصور ان کے یہاں باوجود اپنی لطافت اپنے دھندلکے، اپنے جلووں اور اس کے پردوں کے ایک زندہ اور حقیقی تصور ہے۔ ان کا عشق رومانی ہے۔ وہ حسن کو ایک قدر مطلق مانتے ہیں مگر ان کے یہاں حسن ایک ماورائی پرچھائیں نہیں۔ ایک زندہ تابندہ حقیقت ہے۔
جگر کے حسن کا تصور اصغر کے تصور سے مختلف ہے اگرچہ دونوں میں کچھ مناسبت پائی جاتی ہے۔ صوفی حسن کے ایک مجرد تصور سے عشق کرتا ہے۔ اسے ساری کائنات میں ایک ہی حسن کے مظاہر نظر آتے ہیں۔ جگر بھی اس تصور سے کھیلتے ہیں مگر ان کے یہاں حسن کے ارضی و مجازی پہلو اتنے نمایاں ہیں کہ یہ روشن پرچھائیں ایک مجسم شعلہ بن جاتی ہے۔ جگر کے یہاں حسن کا تصور اصغر سے زیادہ حسرت کی یاد دلاتا ہے۔ حسرت نے حقیقت میں رومان تلاش کیا۔ جگر نے حقیقت کو رومان بنا لیا۔
دونوں قدیم بھی ہیں اور جدید بھی۔ حسرت اور جگر باغی نہیں ہیں وہ بیزار بھی نہیں ہیں۔ انھوں نے زندگی اور حسن کو جیسا پایا ہے۔ بے نقاب کیا ہے۔ حسرت کے یہاں

زیادہ گہرائی اس لئے نظر آتی ہے کہ اس میں نفسیاتی حقائق زیادہ ہیں۔ جگر آج سے دس سال پہلے اس گہرائی تک نہ پہونچ سکے تھے۔ مگر ایک عرصے کی طوفانی اور جذباتی زندگی کے بعد ان کے یہاں ایک ٹھہراؤ آیا۔ انھوں نے سنجیدگی کے ساتھ اپنے سرمایہ کا جائزہ لیا وہ اصغر کے اور قریب جانا چاہتے تھے مگر ان کی افتاد طبع نے انھیں حسرت کے قریب کر دیا۔ چنانچہ اس نئے مجموعہ میں، جو ایک طرح جگر کے عالم ہوش کا کلام ہے جگر کی شخصیت شاعری میں گہرائی اور حقیقت نظر آتی ہے اس کی وجہ سے اس کی رومانیت وقیع ہو گئی ہے اور ان کا ادبی مرتبہ مستحکم اس اجمال کی تفصیل ضروری ہے۔

جگر کی زندگی خاصی رنگین، دلچسپ اور پرکیف رہی ہے۔ ان کی پوری زندگی اس لئے صحت مند کہی جا سکتی ہے کہ اس میں سود و زیاں کا وہ پیمانہ تھا جو عام لوگوں کو دنیوی کامیابی اور خوشحالی اور متوسط طبقے کے مشینی چکر کی طرف لے جاتا ہے۔ ان میں اپنے جذبات و میلانات کے لئے یہ ظاہری قربانیاں کرنے کی جرات تھی ان کی جرات دیوانگی تھی۔ ان کے یہاں ساقی و صہبا دونوں سے گہری وابستگی ملتی ہے۔ ان کی رندی ان کی ادبی زندگی کا ایک لازمی جزو ہے اس سے ان کی شخصیت میں ایک صداقت پیدا ہو گئی ہے جو بعض بزرگوں کی رعونت اور مریض پابندیوں کے مقابلے میں زیادہ فطری اور دلکش ہے رندی اور منافقت میں ازلی بیر ہے۔ جگر منافق نہیں ہیں۔ وہ اپنے ماضی پر شرمندہ بھی نہیں ہیں صرف وہ ماضی کو پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ انھوں نے عشق کیا ہے اور اس عشق کی آنچ میں جلنے اور پگھلنے سے ان کی آواز میں لے اور ان کی شخصیت میں گداز

پیدا ہو گیا ہے۔ ان کے عشق نے انھیں اس دنیا کے حسن اور حسینوں سے عشق کرنا سکھایا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس مجازی حسن میں انھیں گھر سے ابتدائی نقوش کی وجہ سے ایک حسن حقیقی کی جھلک نظر آتی ہے۔ جگر جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں وہ ہندوستان کے مسلمان شرفا کا وہ متوسط طبقہ ہے جو اب روز بروز بکھرتا جا رہا ہے اور موجودہ دور کی ہوش ربا تلخیوں کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس طبقے کو ماضی سے محبت، تہذیب و شرافت کی پرستش، ایک مذہبی تصور، چند اخلاقی قدریں، ایک مبہم سی انسان دوستی، ورثے میں ملی تھیں۔ جگر انھیں قدروں پر پلے بڑھے، جوان ہوئے تو شباب کے تقاضے اور فطرت کے مطالبے انھیں بہا لے گئے۔ چنانچہ اس دور میں ان کی زندگی کے دو رخ تھے۔ جذباتی طور پر وہ شاعری اور رندی کے پجاری تھے۔ ذہنی طور پر وہ اپنی چند قدروں کے دلدادہ ہیں جنھیں سہولت کے لئے مشرقیت کہہ لیجئے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم ہوش میں بظاہر وہ اپنی زندگی کے بڑے بھرپور اور جاندار حصے سے بغاوت کرتے اور اپنی ذہنی قدروں کی طرف لوٹتے نظر آتے ہیں۔ سطحی نظر سے دیکھا جائے تو جگر کی رندانہ شاعری کے مقابلے میں ان کی موجودہ شاعری بے جان اور پھیکی نظر آتی ہے لیکن انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کی رندی و ہوش دونوں کی بنیادی خصوصیات کو تلاش کیا جائے اور ان میں جو وحدت ہے اُسے نمایاں کیا جائے۔ جگر کے یہاں یہ وحدت موجود ہے اس کے احساس کے بعد ان کی موجودہ شاعری کا صحیح مقام نظر آجاتا ہے اور ان کے عالم مستی اور عالم ہوش دونوں ایک ارتقائی سلسلے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔

جگر کے نزدیک زندگی کی سب سے بڑی حقیقت جمال ہے۔ اُن کے کلام میں اس جمال کے مختلف نام ہیں۔ زندگی میں جمال کی مصوّری اور فلسفۂ جمال کی پرستش میں فرق ہے۔ جمال کا احساس اچھی چیز ہے۔ جمال کی ایک قدرِ مطلق کی حیثیت سے پرستش زیادہ سے زیادہ ایک خواب کی پرستش ہے جس کا شرمندۂ تعبیر ہونا بہت مشکل ہے۔ جگر کے مزاج میں وہ فلسفیانہ گہرائی، وہ وحدتِ ذہنی، وہ سنجیدہ فکر نہیں ہے جو مثلاً غالب اور اقبال کے کلام میں ہے۔ اس لئے جگر کو غالب یا اقبال کے معیار پر پرکھنا غلط ہوگا، وہ میر و مومن، داغ و حسرت کے دبستان کے شاعر ہیں۔ ان سب شعراء کے یہاں ایک ایسی شدید جاذبیت ملتی ہے کہ وہ ان کی زندگی بن جاتی ہے۔ مگر اس جاذبیت کو فلسفہ نہ سمجھنا چاہئے مزاج قرار دینا چاہیئے یعنی جگر مزاج کے اعتبار سے جمال پرست ہیں۔ وہ حسن کے پجاری ہیں اور حسن کے ادا شناس۔ ان کے عشق نے انھیں زندگی کے ہر قسم کے کامیاب اور ناکامیاب تجربات دیئے ہیں ان کی ناکامیوں نے انھیں فانی کی قنوطیت کی طرف مائل نہیں کیا۔ ان کی کامرانیوں نے انھیں داغ کی شوخی و شرارت کے ڈھلان پر جانے سے بھی روکا وہ صرف عاشق نہیں ہیں عاشق شاعر ہیں۔ لطیف اشعار کی پرچھائیوں میں زندگی کی بعض کثافتیں، مقدس اور نورانی پیکر اختیار کر لیتی ہیں ـــــ ان لطافتوں کی آب و تاب انھیں کثافتوں کی وجہ سے ہے مگر یہاں ایک کو اچھا اور دوسرے کو بُرا کہنے کے بجائے دونوں کے رشتے کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ جگر کے عشق میں ایک تندرست انسان کی صحت مند جنسی کشش ہے، مگر یہ مریض عشق نہیں ہے

ان کی رومانیت ایک جذباتی تخیل پرست اور سطحی الحس انسان کی رومانیت
ہے جسن اُن کے نزدیک محض جلوہ یا محض پردہ، محض سیاہ، شفاف یا محض لالۂ
گل اور برق و باد نہیں ہے، یہ سب کچھ ہے اور اس سے کچھ زیادہ جگر
ایک پیکر جمیل کو محض قاتل ہی نہیں سمجھتے پیکر لطیف بھی مانتے ہیں۔ وہ بانیٔ
بیداد کے رنگ رخ میں مظلوم کی فریاد کا عالم دیکھ سکتے ہیں وہ حسن کو اس
وقت کامل سمجھتے ہیں جب اُس میں عشق کی گستاخ نگاہی شامل ہو جائے۔
ان کا محبوب قدیم اُردو شعراء کا بیرحم، سنگ دل ترک ستم پیشہ نہیں ہے۔ وہ
سینے میں دل اور پہلو میں جذبات رکھتا ہے، وہ ظلم بھی کرتا ہے اور رحم بھی
بجلیاں بھی گراتا ہے اور پھول بھی برساتا ہے۔ شوخ بھی ہے اور شرمیلا
بھی، آفتاب بھی ہے اور ماہتاب بھی۔ اسی وجہ سے جگر کے یہاں محبت
بھی محض ایک دکھ کی داستان، ایک طویل سلسلۂ ہجران ایک لامتناہی غم
نہیں ہے، اس میں چاہنے اور چاہے جانے کی لذت ہے یہ شاخ گل بھی ہے
اور تلوار بھی۔ یہ ان کی خوشی پر اپنے غم کو نثار کر دینے کا نام ہے۔ اس کا
عالم اسی دنیا کا عالم ہے مگر اس سے کچھ زیادہ بھی کبھی اس میں ایک ایسا
وقت آتا ہے جب آنسو خشک ہو جاتے ہیں مگر طغیانی نہیں جاتی۔ کبھی صبح
و شام ہی نہیں معلوم ہوتے، کبھی کائنات ایک ساغر سرشار نظر آتی ہے
اور زندگی ایک نشۂ پیہم۔ جگر کا محبت کا یہ تصور رومانی ہوتے ہوئے بھی صحت مند،
دقیق اور لطیف ہے۔ یہ ہمارے تہذیبی تصور کا ایک جز ہے اس کے مطالعے سے
زندگی اور کائنات کی وسعتیں کم نہیں ہوتیں۔ نہ زندگی بسر کرنے کا حوصلہ کم ہوتا ہے۔

زندگی اس کی وجہ سے ایک قابل قدر چیز ہو جاتی ہے۔ جگر کے حسن و عشق میں روایت
کا احترام موجود ہے۔ مگر یہ تصور محض ایک روایت نہیں ہے ان کا زندگی ہے،
یہ شوخ ہوتے ہوئے بازاری نہیں ہے۔ یہ اخلاقی قدروں کو سمیٹ لیتا ہے مگر
چند پند اور منتخب الحکایات کی خشکی سے بچتا ہے۔ یہ لطیف بھی ہے اور جاندار
بھی۔ اس میں مفکرانہ سنجیدگی کم ہے مگر جذبات کی گہرائی نے اسے وہ تیز نشتر عطا
کیا ہے کہ اس کا اثر دیر تک زائل نہیں ہوتا۔

مفکرانہ سنجیدگی اور جذباتی سیلاب دونوں سے غزل میں کام لیا گیا ہے لیکن
یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ غزل کا آرٹ دوسری چیز کے لئے زیادہ موزوں ہے۔
غالب سے پہلے غزل میں تغزل، حدیث حلبریا یا ساغر سرشار کا ذکر زیادہ تھا۔
غالب نے اردو شاعری کو ایک ذہن دیا اور غزل کی رمزیت کو کائنات
کے رموز و اسرار سے آشنا کیا۔ غالب سے غزل کو فائدہ بھی ہوا۔ مگر غزل کی پوری
تاریخ پر نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ غزل کی اصلی روایت میر کی روایت ہے
یہاں یہ مسئلہ اہم نہیں ہے کہ خود غزل موجودہ دور کے مزاج کی عکاسی اور اس کی ذہنی
قیادت کے لئے کس قدر موزوں ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غزل کی تاریخ
اس کی روایات، اس کے مختلف موڑ، اس کے رنگ و آہنگ کیا ظاہر کرتے ہیں
اس سلسلے میں مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ غزل ہماری صدیوں کی تہذیب
کی سب سے اچھی نمائندگی کرتی ہے، غزل کے اشارے، غزل میں کھو جانے اور کچھ
پا جانے کے انداز، غزل کی لطیف اور دھندلی فضائیں، اس کی نفاست
اور بہتے ہوئے پانی کی روانی ایک کلچر اور تہذیب کی پختگی کی علامت ہیں غزل

کو نیم وحشیانہ صنفِ شعر کہنے والے تہذیبوں کے سائنٹیفک اور تاریخی تصور سے
ناواقف ہیں مجھے یہاں یہ کہنا نہیں ہے کہ ہماری گزشتہ تہذیب موجودہ تہذیب
و تمدن سے بہتر یا بدتر ہے مجھے تو صرف یہ یاد دلانا ہے کہ غزل ہماری جاتی ہوئی
کلچر کا عطر اور روح ہے اور اُس کلچر کی سب سے اچھی نمائندگی کرتی ہے ۔ یہ تہذیب
جن قدروں کی علمبردار ہے غزل میں سب کی سب آگئی ہیں۔ اس کلچر کا فروغ
اس خوشحال طبقے کی یاد دلاتا ہے جو زندگی کے مسائل کو اشاروں اشاروں
میں بیان کرتا ہے اور جس کے سامنے زندگی کے سخت سے سخت مسائل لطیف
اور نازک ہو کر آتے ہیں۔ حسن و عشق یہاں محض علامات نہیں ہیں، زندگی ہیں ۔
اگرچہ زندگی کے ایک چھوٹے سے گوشے سے متعلق ہیں ۔ یہاں شعر و شاعری کا مقصد
نہیں ہے اور اگر ہے تو ذہن کو آسودگی اور تازگی دینا، یہاں زندگی احتساب
کا تذکرہ ۔ شعر و شاعری کی دُنیا میں اپنے لئے وہ آزادی تلاش کرتا ہے جو زندگی
میں بعض مذہبی بندشوں کی وجہ سے نہیں ملتی ۔ یہ تہذیب مذہب کی بعض قدروں
کا احترام کرتی ہے، مگر مذہبی نہیں ۔ اس نے اسلام کے ساتھ کچھ کم کھلنڈرا پن
نہیں کیا ہے اور دیر و کلیسا کو محض یوں ہی نہیں برتا ہے ۔ اگر بے لاگ اور
سائنٹیفک نظر دیکھا جائے کہ غزل میں ہماری ہندوستانی تہذیب و تمدن
کی صدیوں کی داستان ملتی ہے یہ تہذیب ایران و تو ران سے بعض نام اور
علامات لیتی ہے ، اور کیوں نہ لیتی جب وہاں کے لالہ زاروں کے پھولوں سے
بھی یہ اپنے نگار خانوں کو سجاتی رہی تھی۔ مگر یہ ہے ہندوستانی اور ہندوستان
کی آب و ہوا اس کے مزاج اس کی قومی خصوصیات کی علمبردار ۔ اس غزل اور

اس کی نمائندہ تہذیب کے لئے موجودہ مغربی اور سائنٹیفک تہذیب یقیناً ایک خطرہ ہے لیکن اس وجہ سے ہمیں موجودہ غزل گو شعرا کی روایات اور ان کے مخصوص طرزِ فکر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ جگر کی شاعری کے مطالعے کے وقت پہلے یہ سوالات رکھنے چاہئیں کہ غزل انتشارِ خیال اور پراگندگی کو ترقی دیتی ہے، یا غزل واضح اور روشن خیالات سے دور رہتی ہے، پہلے یہ سوچنا چاہیئے کہ جگر کے یہاں کوئی منفرد کارنامہ، کوئی انوکھی آواز، کوئی اہم نقش ایسا بھی ہے جو ان سے پہلے یا تو نہ ہو، یا ان کی وجہ سے روشن ہو گیا ہو اس کے بعد اس نقش کی رنگینی اور حُسن اور شاعری میں اس کی اہمیت کا سوال آئے گا۔ جگر کا تغزل غزل کا جانا پہچانا تغزل ہے۔ حالی یا اقبال کے تجربات جگر کی شاعری میں ڈھونڈنے کی زیادہ گنجائش نہیں۔ جگر جس ماحول اور طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ داغ، امیر اللہ تسلیم اور رسا کا ماحول ہے یہ اپنی روایات کا احترام کرتا ہے، مگر اپنے زمانے کی زندگی اور اس کے حُسن کا اداشناس بھی ہے۔ یہ صوفیوں کی طرح دُنیا کو تج دینا چاہتا ہے اور نہ حکیموں اور فلسفیوں کی طرح پہیلیاں بجھاتا ہے۔ یہ حسن اور جمال کا اس وجہ سے اور بھی دلدادہ ہے کہ اس میں ذہنی تسکین کا سارا سامان موجود ہے۔ جگر کی شاعری کا مطالعہ میر، مومن، حسرت، داغ کی روشنی میں کرنا چاہئے لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جگر کی آواز اس بھری دنیا میں صرف ایک ہلکی سی آواز بازگشت نہیں نہیں ہے، اپنی لے اور اپنا زیروبم بھی رکھتی ہے۔

جگر کی مقبولیت اور شہرت کو عام طور سے نقادوں نے تسلیم کیا ہے

اُن کے تغزل، ان کی رندی و سرمستی، ان کے لطف اشارات اور دلکش کنایے
ان کی حُسن پرستی اور حُسن کاری سے کسی کو انکار نہیں لیکن نگار کے نقادوں نے اُن کے
یہاں دعوتِ فکر کم اور دعوتِ کام و دہن زیادہ پائی ہے۔ مجنوں نے انھیں مشاعرے
کا شاعر بتایا ہے اور ان کی شاعری کو ہلکی پھلکی جذباتی شاعری قرار دیا ہے یہاں
یہ کہنا ضروری ہے کہ ان اشخاص نے غزل کے فن اور مزاج، اس کی تاریخ اور
اس کی روایات کو نظرانداز کیا ہے۔ کوئی بھی ادبی صنف تجربات کے لئے
اپنا دامن وسیع رکھنے کے باوجود اپنی روائت اور تاریخ سے بے نیاز نہیں
ہو سکتی۔ غزل میں فکر کے لئے گنجائش ہے مگر اُسے جذبہ بن کر آنا چاہیئے اور
میرا خیال یہ ہے کہ اچھی اور سچی شاعری میں بھی فکر سے کام نہیں چلتا، اُسے
جذباتی گرمی چاہیئے۔ غزل میں غالبؔ نے سب سے پہلے فکر کو جگہ دی مگر
غزل میں اس مفکرانہ سنجیدگی کی گنجائش نہیں ہے جو نظم کے لئے موزوں ہے،
غالبؔ، حالیؔ اور اقبالؔ کے چند تجربات کے باوجود اچھی غزل میں لطیف
اشارے ضروری ہیں۔ غزل پرچھائیوں سے روشن ہے، اُسے دن کی دھوپ
پسند نہیں۔ ہماری شاعری کی صحت مند روش اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ
آزاد اور حالیؔ کے بعد سے ہمارے یہاں نظم کے ذریعے سے سنجیدہ مقصدی
شاعری کی گئی ہے۔ نظم کی تعمیر، اُس کا ربط و تسلسل اس کی آزاد فضا، بڑے
سے بڑے اور گہرے سے گہرے خیال کو تفصیل سے بیان کرنے کی صلاحیت
رکھتے ہیں۔ غزل کے اشارات، اُس کی چلتی پھرتی تصویریں، ہماری معلومات
میں اضافہ نہیں کر سکتیں، ہمارے جذبات میں گرمی و لطافت پیدا کر سکتی ہیں

نگار کے نقاد کا خیال ہے کہ مستقبل کی زندگی غزل کی آواز پر آواز دے گی
میں اتنا خوش فہم نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ غزل کے آرٹ کو آپ تھوڑا بہت
بدل سکتے ہیں مگر اسے نظم نہیں بنا سکتے نہ بنانا چاہیئے۔ ہاں غزل کے اثر سے
نظموں میں تاثیر اور تسلسل کا خون کر سکتے ہیں۔ اقبال کی بہت سی مشہور نظموں
میں یہ اثر موجود ہے "شمع و شاعر" جو بانگ درا کی مشہور نظموں میں
ہے۔ اس اثر کو اچھی طرح ظاہر کرتی ہے خضر راہ سے اقبال نے صحیح معنی
میں نظم کہنی سیکھی۔ جوش کی نظموں میں اب بھی غزل کے اثرات ملتے ہیں۔ وہ
مربوط اور مسلسل خیالات پیش نہیں کرتے مختلف تصویروں کی کثرت سے
ذہن پر ایک مجموعی اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کی کئی اچھی نظموں میں ایک ہی خیال
کو مختلف پہلوؤں یا مختلف تشبیہوں یا استعاروں سے ادا کیا گیا ہے خیال
میں ترقی یا جامعیت نہیں ہے۔ اقبال یا جوش کی مثال اس لئے دی گئی کہ
غزل اور نظم دونوں میں ایک ہی فن تلاش نہیں کرنا چاہیئے۔ غزل کا آرٹ
ایک مخصوص تہذیب میں پختہ ہوا ہے۔ اس آرٹ کے لئے ایک روشن مستقبل
کی پیشین گوئی کرنا، اس مستقبل کے روشن ہونے کی اچھی دلیل نہیں ہے۔ اور
نہ پیشین گوئی کی عادت اچھی چیز ہے۔ فانی اور جگر جب غزل اور نظم میں فرق
کرتے ہیں اور غزل کہنے والے کو شاعر اور نظم کے پرستار کو ناظم کہتے ہیں تو
وہ دونوں کے بنیادی فرق کو واضح کرنے میں غلطی نہیں کرتے، غلطی وہ غزل
کے شاعر کو ترجیح دینے میں کرتے ہیں۔ نظم کہنے والا غزل گو شاعر سے کسی طرح کم
درجے کا شاعر نہیں ہے بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ اپنے جدید ذہن اور
نئے ادبی شعور کی وجہ سے غزل سے بہتر، جامع اور ترقی یافتہ صنف کا علمبردار ہے

غزل کے ذریعے سے ہم موجودہ نسلوں کی ذہنی عکاسی تو کر سکتے ہیں مگر اس کی قیادت نہیں کر سکتے۔ نظم اس ذہنی قیادت کے لئے زیادہ موزوں ہے ادب کو ہم زندگی کا آئینہ ہی نہیں کہتے زندگی کو سدھارنے اور سنوارنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ہم شاعری کو پیمبری مانتے ہیں۔ غزل میں یہ پیمبری ممکن نہیں، اس کے لئے نظم کی وسعتیں اور گہرائیاں زیادہ موزوں ہیں غزل کے شاعر پر یہ بوجھ رکھا جائے تو یہ اُسے نہیں اُٹھا سکے گا۔ وہ بعض مخصوص لمحات میں بعض اشارات کے ذریعے سے اس پیمبری تک پہونچ سکتا ہے مگر اُس کا آرٹ اُسے زیادہ دیر تک اس بلندی پر نہیں رہنے دے گا۔ غزل کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک اچھا آئینہ ہے۔ آئینہ کی اہمیت سے انکار کرنا بھی کفر ہے اور آئینے کو انجمن سمجھنا بھی۔

اس لئے جگر کی شاعری میں اگر دعوتِ فکر کم ہے تو اس وجہ سے کہ وہ غزل کے شاعر ہیں، وہ اپنی غزلوں کی وجہ سے زندہ رہیں گے اپنی نظموں کی وجہ سے نہیں، ان کے مزاج میں اور نظم کے فن میں مناسبت نہیں ہے اسی وجہ سے ان کی نظموں میں غزل کی خوبیاں اور خامیاں ملتی ہیں۔ نظم کی خوبیاں اور خامیاں نہیں ملتیں۔ دعوتِ فکر نے فانی کی یاسیات کو قنوطیت بنا دیا۔ میر نے اس فکر سے اپنا دامن بچایا۔ اسی وجہ سے میر فانی کا سا مہذب شعور نہ رکھتے ہوئے بھی فانی سے بڑے شاعر ہیں اور جگر کی غزل، فانی کی گہرائی، اُن کی انفرادیت، ان کی نشتریت کو نہ پہونچتے ہوئے بھی، ہمارے لئے زیادہ صحت مند، رنگین، دلکش اور رجا ندار ہے۔ فانی کی طرح جگر نے کبھی موت کو امین نہیں سمجھا، انھوں نے

کبھی شبِ غم کی پرستاری نہیں کی۔ انھیں زہرِ غم سے کبھی محبت نہیں ہوئی، عرفانِ غم سے ہوئی، اصغر کی لطافت ان کی روحِ نشاط، ان کا انبساط ذہنی جو ہمیں اس دنیا اور اس کی لطیف مادیت سے الگ کرتا ہے جگر کی بس کی بات نہیں جگر جب اصغر کی تقلید کرتے ہیں تو وہ اپنی عظمت کو نہیں سمجھتے، اصغر کی لطافت تک پہونچنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لئے ایک رچے ہوئے مہذب شعور کے علاوہ تھوڑے سے ماورائی اندازِ نظر کی بھی ضرورت ہے جگر کی شاعری پڑھے لکھے عوام کی سمجھ میں آسکتی ہے اُن کے جذبات کی دھڑکن اس میں موجود ہے ان کی داستانِ حیات کے نقوش اس میں بکھرے پڑے ہیں ان کی محرومیوں اور کامرانیوں، ان کے عیش و غم سے اس میں زندگی آئی ہے۔ جگر کے یہاں جو لذتیت ہے وہ داغ سے زیادہ مہذب ہے اور مومن سے کم نقاب پوش۔ اس میں لذت پرستی کی تلقین نہیں ملتی، زندگی اور اُس کے حُسن کی چاشنی ہے۔ مجنوں نے جس کو ہلکی پھلکی جذباتی شاعری کہا ہے اس میں وزن کم سہی مگر لطافت کی کمی نہیں۔ غزل دراصل فنِ لطیف ہی ہے جگر کے یہاں جو رنگ مشاعرہ یا رنگ محفل ہے اُسے بھی میں بُری چیز نہیں سمجھتا، ترقی پسندوں کے ایک بہت بڑے مشاعرے میں جو دسمبر ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ میں ہوا تھا۔ جگر کی ایک غزل کے سامنے دوسرے شعرا کی نظمیں اور غزلیں بلا وجہ ماند نہیں پڑ گئی تھیں۔

اس غزل کا مطلع یہ ہے ؎

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

اس غزل میں جسے نظم سمجھا گیا ہے جگر نے ایک زندہ احساس کا ثبوت

دیا ہے، عمر کی پختگی اور جذباتی طوفانوں کے تھپیڑوں نے جگر کو زوال نہیں سکھایا، اُسے زندگی کے دکھ درد سے قریب کر دیا، اُن کے غم میں غم زمانہ آگیا۔ یہ معمولی بات نہیں ہے۔

جگر جدید نہیں ہیں وہ ایک معنی میں ابدی (A G E L E S S) ہیں اس کا مطلب نہیں کہ جگر کی قدریں ابدی ہیں یا میں ابدی قدروں کا قائل ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جگر جن جذبات کو متاثر کرتے ہیں، جن تاروں کو چھیڑتے ہیں جو نغمہ الاپتے ہیں اس کی نغمگی بڑی دیرپا اور پائیدار چیز ہے۔ میں اس بات کو ایک مثال سے واضح کر دوں۔ فراق کی غزل جدید ہے۔ اس میں جدید ذہن کی کارفرمائی ملتی ہے۔ اس سے غزل میں ایک خوش گوار اضافہ ہوا ہے، جو موجودہ دور اس کی اُلجھنوں اور اس کی منزلوں کو جانتے اور سمجھتے ہیں وہ غزل کو ایک نیا احساس بھی دیتے ہیں مگر ان کے یہاں اُتار چڑھاؤ بہت ہے، پست و بلند ان کے یہاں زیادہ ہیں۔ ہمواری کم ہے، مگر تغزل کے لحاظ سے جگر اُن سے بہتر ہیں۔ فراق نے غزل کو جدید ذہن دیا، جدید ذہن کو خوشگوار اور ہم آہنگ، جادو نہیں دیا۔ جگر کے یہاں ایک ہم آہنگی اور رچی ہوئی کیفیت ملتی ہے۔ جو جدید نہ سہی۔ مہذب، حساس اور بیدار ہے۔ فراق کی زبان میں وہ روانی نہیں ہے، وہ نکھری اور ستھری کیفیت نہیں ہے۔ وہ والہانہ پن نہیں ہے جو جگر میں ہے۔ ان کے یہاں وہ ہمواری بھی نہیں ہے جو مثلاً جذبی، مجاز، فیض کی غزلوں میں ملتی ہے۔ جدید اور قدیم کی خوشگوار آمیزش غزل میں معمولی کام نہیں ہے۔ اس میں خون جگر پینا پڑتا ہے۔ غزل میں فراق کی

اہمیت مسلم ہے مگر وہ دھلی دھلائی چاندنی جو جگر کے اشعار میں ہے فراق کے یہاں نہیں۔

جگر کے یہاں تغزل اور سرمستی کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں، لیکن تغزل اور سرمستی تو دوسروں کے یہاں بھی ہے۔ آخر جگر کی انفرادیت کیا ہے۔ جگر کی اپنی آواز کون سی ہے، وہ تھرتھراہٹ، وہ لے کیا ہے جسے ہم ہزاروں آہٹوں اور کروٹوں میں پہچان لیں؟ جگر نے عشق کی انانیت اور خودداری پر بار بار زور دیا ہے۔ جگر کے یہاں کبھی کبھار عاشق خود محبوب بن گیا ہے یہ دراصل ذہن کا وہ جادو ہے، تخیل کا وہ طلسم ہے جس میں کبھی کبھار عاشق اور شاعر اسیر ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے اشعار کافی ہیں۔ مگر یہ جگر کا بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ جگر کے یہاں عشق کی نفسیات بھی ملتی ہیں توجہ بے نہایت اور نظر کم تسکین ہے اور تسکین نہیں، آرام ہے اور آرام نہیں۔ وہ آنسو جو نظر نہیں آتے۔ جگر کی داستانیں عام انسانی تجربے کے ساتھ روحِ انسانی کے مخصوص کیفیات سے بھی آشنا ثابت کرتے ہیں پھر بھی جگر کے اصلی رنگ کو سمجھنے کیلئے ان کے یہ چند اشعار دیکھئے:۔

حسن کے ہر جمال میں پنہاں میری رعنائی خیال بھی ہے

نازک سی توجہ میں اشارات کے دفتر ہلکے سے تبسم میں کنایات کا عالم

تو محبت کو لا زوال بنا زندگی کو اگر نہیں ہے ثبات

اے کمالِ سخن کے دیوانے ماورائے سخن بھی ہے ایک بات

اُٹھتی نہیں ہے آنکھ مگر اس کے روبرو نادیدہ اک نگاہ کئے جا رہا ہوں میں
حسین و سادہ ہے کس درجہ فطرتِ شاعر ہنستے تو غنچہ و گل، رو پڑے تو شبنم ہے

اللہ رے بے بسی کہ غم روزگار بھی بیٹھا ہوں تیرے غم کے برابر لئے ہوئے
ہشیار اے نگاہ ستم آشنائے دوست دل بھی ہے اک لطیف سا نشتر لئے ہوئے

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

اللہ اللہ ہستی شاعر قلب غنچے کا، آنکھ شبنم کی

جگر کی شاعری یہی ہے۔ جگر نے اُردو غزل کی ساری صالح روایات کو جذب کرکے انھیں ایک لطیف تبسم اور دلکش رمز بنا دیا ہے۔ اس کی معنویت، رمزیت اور تاثیر میر، مومن، داغ، حسرت سے آشنا ہوئے بغیر واضح نہیں ہوتی، مگر ان روایات کے ساتھ اور ان کے باوجود ایک نئی صحت مند شگفتہ اور پرکیف اشاریت رکھتی ہے جو اُس کی اپنی ہے، حسرت و جگر سے غزل کو وہ سرمستی واپس مل گئی جو زندگی کی الجھنوں میں کھو گئی تھی۔ وہ کیف و انبساط پھر ہاتھ آگیا جو زندگی کی روح ہے اور جس کی وجہ سے زندگی روشن اور گوارا ہے۔ جگر داغ و حسرت دونوں سے زیادہ مہذب اور لطیف تغزل رکھتے ہیں۔ حسرت کی شاعری میں زندگی ہے جگر کی زندگی میں شاعری۔ جگر کے یہاں محبت کا تصور ایک پاکیزہ اور لطیف تصور ہے مگر وہ تصور زندگی سے دور نہیں لے جاتا۔ زندگی کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے، جگر کا جنون، حوصلہ اور

جلوہ جلوہ دکھاتا ہے۔ جگر کے شبستانوں میں محبوب کے لطف و کرم سے روشنی ہے جگر نے خود بھی محبت کی ہے اور ان سے محبت بھی کی گئی ہے۔ جگر کے لطیف اشتر دل سے لطف اُٹھانے کے لئے اردو شاعری کی رمزیت اور اشاریت کا علم ضروری ہے جگر کے رومانی تصور سے حقیقت رنگین ہو جاتی ہے۔ وہ زندگی کو ہاں کہتے ہیں نہیں نہیں کہتے ان کے تصورات، اور ان کی مشرقیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا مگر سب سے زیادہ اہم ان کی مہذب زندگی ہے۔

اس زندگی کی وجہ سے دیر و حرم کے بجائے وہ مے کدے میں پناہ لیتے ہیں اسی کی وجہ سے وہ اپنے دور کے اہم واقعات سے متاثر ہوتے ہیں اور بنگال، چھیر، تقسیم ہند کے بعد ملک کے فسادات اور ہندوستان میں موجودہ حکومت کے قول و فعل میں تضاد سے کڑھتے ہیں۔ یہ معمولی بات نہیں ہے کہ غزل کا شاعر، ملک کے ان حالات سے متاثر ہوا ہے۔ ان کا یہ شعر لیڈروں نہیں ہے ترقی کے وعدوں اور رفعت کی زندگی پر بڑی اچھی طنز ہے ۔

زمانہ گرم رفتار ترقی ہوتا جاتا ہے   مگر اک چشم شاعر ہے کہ پرنم ہوتی جاتی ہے

وہ جب دیکھتے ہیں کہ دلوں کی جراحتوں کے چمن کھلے ہوئے ہیں تو فریاد کئے بغیر نہیں رہ سکتے، وہ ملک میں تنگ نظری، منافقت، تعصب، جہالت سے بیزار ہیں۔ یہ شبنمی آنکھ شعلے نہیں پیدا کر سکتی، اسے نفرت عزیز نہیں، یہ گلشن پرست ہے اور کانٹوں سے بھی نباہ کرنا جانتی ہے یہ یاروں کی یاد ہے اور اس کا مسلک محبت ہے۔ یہ اپنی بہاروں سے مایوس نہیں ہے اسی وجہ

سے اس کا اشارہ یہ ہے ۔

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

اسی محبت اور دردمندی نے ان سے کہلوایا ہے

یہی زمیں ترا مسکن یہی ترا مدفن — اسی زمیں سے تو مہر و ماہ پیدا کر

میں وہ صاف صاف کہدوں جو ہے فرق مجھ میں تجھ میں
ترا درد درد تنہا، مرا غم غم زمانہ

جنوں کی بے سر و سامانیوں پر رنج نہ کر
اگر جنوں ہے سلامت، ہزار با دامن

کھلا باب زنداں تو کیا اس سے حاصل
کہ خود زندگی بن گئی قید خانہ

جگر گذشتہ دس سال میں اپنے قبۂ نور میں بند نہیں رہے ، انھوں نے اس زندگی کے نور و نار کو بھی دیکھا ہے ، اس کی گرمی اور روشنی ، اس کی تلخی اور بے مہری کو بھی محسوس کیا ۔ جگر کا دل صحیح جگہ پر ہے اگر ان کو اپنے مخصوص دائرے کے علاوہ دوسرے ارباب فکر و نظر سے ملنے کا موقع ملتا اگر وہ گونڈے کے سرد بے رنگ ماحول کے بجائے کسی بڑے شہر کے رواں دواں علمی و ادبی ماحول میں ہوتے ۔ اگر موجودہ تحریکات کے اثر کو شاعر کی طرح قبول کرنے کے بجائے ایک انسان کی حیثیت سے قبول کرتے تو ان کے ذہن کو اور جلا ہوتی ۔ ان کے یہاں ان کے دور کی روح اور زیادہ

جھلکتی نئی نسلوں کو وہ اور زیادہ سمجھتے اور نئی نسلیں انھیں اور اپنے سے قریب پاتیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ جگر کے لطیف اشاروں اور حدیث دلبری میں ہماری موجودہ زندگی کے نقش و نگار ملتے ہیں۔ ان کی محبت شاخ گل بھی ہے اور تلوار بھی۔

میں نے جگر کے اشعار کا زیادہ انتخاب کرنے سے قصداً احتراز کیا ہے اس مقدمے کا مقصد جگر کی شاعری کے مقام اور اہمیت کا تعین ہے لیکن آخر میں ان نشتروں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جو اردو غزل کے ہر سخت اور کسی مختصر انتخاب میں بھی جگہ پا سکتے ہیں۔

گداز عشق نہیں جو میں جواں نہ رہا وہی ہے آگ، مگر آگ میں دھواں نہ رہا
لہو آتا نہیں کچھ کہ مژہ تک نہ آئے گی بہار اب کی برس کیا

جب کوئی حسیں ہوتا ہے سرگرم نوازش
اس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد

کیا لطف کہ میں اپنا پتہ آپ بتاؤں
کیجے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

بیٹھے ہیں بزم دوست میں گم شدگان حسن دوست
عشق ہے اور طلب نہیں نغمہ ہے اور صدا نہیں

اٹھتی نہیں نگاہ مگر ان کے روبرو نادیدہ اک نگاہ کیے جا رہا ہوں میں
یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں
بے کیف دل ہے اور جیے جا رہا ہوں میں خالی ہے شیشہ اور پیے جا رہا ہوں میں

وہ دل کہاں ہے کہ اب جسے پیار کیجیے مجبوریاں ہیں، ساتھ دیئے جا رہا ہوں میں

یہ حسن ہے کیا، یہ عشق ہے کیا، کس کو ہے خبر اسکی لیکن
بے جام ظہور بادہ نہیں، بے بادہ فروغ جام نہیں

صد عشرت نگاہ مسلسل خوشا نصیب لیکن لطافت نگہ مختصر کہاں

جو ہیں خاص حیثیت و حیراغ محبت وہ آنسو نہیں ہیں نظر آنے والے

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گذرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

لاکھ آفتاب پاس سے ہو کر گذر گئے
بیٹھے ہم انتظار سحر دیکھتے رہے

تیرے بغیر رونق دیوار و در کہاں شام و سحر کا نام ہے، شام و سحر کہاں

مدت ہوا کہ رسم محبت بدل گئی دامن سے اب معاملہ چشم تر کہاں

وہ ہزار دشمن جاں سہی، مجھے پھر بھی غیر عزیز ہے
جسے خاک پا تیری چھو گئی، وہ بُرا بھی ہو تو برا نہیں

رشید صاحب کا قول ہے کہ کوئی نامعقول انسان معقول شاعر نہیں ہو سکتا بات صحیح ہے لیکن سارا پھیر معقولیت اور نامعقولیت کے تعین کا ہے رشید صاحب معقول اور نامعقول کا ذرا شخصی اور محدود اور بند ھا ٹکا تصور رکھتے ہیں۔ میں اسے اضافی سمجھتا ہوں۔ ممکن ہے کوئی شخص بڑا معقول ہو، مگر نامعقول باتیں کہتا ہو، یا وہ خود نامعقول ہو لیکن اس کی شاعری میں معقولیت ہو۔
بہر حال جگر صاحب ایک پاکیزہ شخصیت، ایک حساس دل، ایک دردمند

نگاہ رکھتے ہیں ان کی شاعری میں خلوص ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعے کے بعد زندگی کا نشہ کچھ بڑھ جاتا ہے۔ یہ کائنات کچھ اور حسین ہو جاتی ہے، یہ حُسن ان کی شخصیت، اور صداقت کی یک رنگی سے آیا ہے۔ جگر کے یہاں جو کچھ ہے وہ خونِ جگر سے لکھا گیا ہے۔ یہاں خلوص بھی ہے۔ والہانہ پن یا سپردگی بھی اور ایک آب و تاب بھی۔ جگر کا یہ والہانہ پن معمولی چیز نہیں۔ ہم اس میں ڈوب کر کونین کی بعض قابل قدر نعمتوں سے آشنا ہوتے ہیں۔ جگر کا عشق کا تصور اگرچہ اقبال کے تصور کی گہرائی نہیں رکھتا مگر لطافت میں اقبال سے کم نہیں۔ جگر نے غزل کی لطافت کو قائم رکھا ہے اور اس لطافت سے اُردو شاعری کے کیف و انبساط کو بڑھایا ہے۔ جگر کے یہاں زندگی محض رُوح نشاط نہیں ہے، خود نشاط ہے۔ ہماری جدید شاعری زندگی کے اس نشاط کو بعض حقائق کی وجہ سے کھوتی جا رہی ہے۔ اور اسی وجہ سے جگر کے یہاں زندگی اور اُس کے حُسن کے ساتھ یہ والہانہ شغف، ایک صحت مند علامت ہے۔ اُردو شاعری کو اس کی آج بھی ضرورت ہے۔ اور یہ ضرورت ہمیشہ رہے گی۔

جگر مراد آبادی

میں اور میرا فن

ہندوستان میں ناقدین کا گروہ اس قدر پست و گمراہ و کور چشم بن چکا ہے کہ اسے کھلے کھلے اور ابتدائی امور ضروری تک کی خبر نہیں، کیا اس کا پہلا فرض نہیں کہ وہ ممالک کی آب و ہوا کے ماتحت مشرق و مغرب کے مزاج کا صحیح تعین کر لینے کے بعد آگے قدم اٹھائے لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ دیانہیں ہے غلامانہ ذہنیت کا یہ عالم ہے کہ مشرق کی ہر چیز کی تنقید مغربی نقطۂ نگاہ سے کی جاتی ہے یہاں تک کہ اسناد و دلائل میں بھی ہمارے ناقدین کی تمام و کمال توجہ مغرب ہی کی جانب منعطف رہتی ہے میں نے اپنے مشہور دوست کی زبانی (جنہیں میں اپنی جگہ صرف ناظم سمجھتا ہوں) جب یہ سنا کہ "حالات و واقعات نئے نئے ہیں۔ زندگی نئی نئی شاہراہوں سے گزر رہی ہے۔ اس لئے ہمارے شعر و ادب کو نئے نئے خیالات، نئی نئی دنیا پیش کرنی چاہیئے" تو میری حیرت کی انتہا نہ رہ گئی میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر فی الحقیقت ایسا ہی ہے تو وہ اپنے شعر و ادب کے تمام دفتر میں سے صرف ایک شعر ایسا پیش کریں۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکے، اس لئے کہ دراصل بنیادی طور پر دنیا میں نہ کوئی خیال نیا ہے نہ کوئی جذبہ، لیکن ان کی زبان سے ایسا جملہ کیوں ادا ہوا۔ آپ خود اندازہ کر لیجئے

انہیں دوست کے متعلق ایک لطیفہ اور سن لیجئے۔ مغرب کے بعد ان کے یہاں
آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے میں بھی ایک دن آن پھنسا دور پہ دور چل
رہا تھا۔ غزل کے خلاف جملے کسے جا رہے تھے۔ میں نے چاہا کہ ان کی کیفیتوں کو
مکدر نہ ہونے دوں لیکن حاضرین کی نگاہوں کے مطالبات آخر رنگ لا کر رہے۔
میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ زندگی کے حقائق پیش کرتے ہیں۔ لیکن
غزل گو شعرا کی دنیا محض "حسن و عشق" زندگی صرف حسن و جمال عشق و محبت
تک محدود نہیں۔ تو میں صرف ایک جملے کا جواب چاہتا ہوں۔ یعنی یہ کہ آپ
زندگی تو پیش کرتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کس کی زندگی اپنی یا دوسرے
کی؟ فرمانے لگے کیا معنی؟ اب مجھ میں تاب سخن باقی نہیں رہ گئی تھی۔ میں
نے کہا اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر آپ اپنی زندگی اور اس کے تاثرات پیش
کرتے ہیں تو آپ بھانڈ، بہروپیے یا آج کل کے الفاظ میں "ایکٹر"۔ اسی
ذیل میں یہ عبرت ناک واقعہ بھی سن لیجئے۔ "گونڈہ" میں یوم ادب کے سلسلہ
میں ذوقی صاحب کے تعلقات خاص کے ماتحت سوشلسٹ شعرا کا ہجوم تھا۔
میں وہاں موجود نہ تھا۔ اب جو حالات سامنے آ رہے ہیں وہ نہایت دلچسپ
بھی ہیں اور افسوسناک بھی۔ ان تمام سوشلسٹ حضرات نے مشاعرے کے
سلسلے میں چار دن قیام فرما کر تین سو ساڑھے تین سو روپے کی شراب سے
شغل کیا۔ خدا جانے کہاں کہاں سے بہکا اور اڑا چلا جا رہا ہوں۔ لیکن خیر،
ان بے ربطیوں میں بھی خلوص و محبت کوئی نہ کوئی راہ پیدا کر ہی لیتے ہیں۔
شاعروں کو اور خصوصاً شاعروں کی بہنات کو ہر اعتبار پہ مخرب اخلاق

اور ملک و قوم کے لئے مہلک تصور کرتا ہوں۔ میرا نظریہ ہے کہ تمام فنون لطیفہ اپنے اپنے مدارج کے اعتبار پر لذت رکھتے ہیں۔ اور یہ راز لذت کے بعد زیادہ حصول لذت کی طلب قدرتی امر ہے۔ نتیجے کے طور پر تو اسے عمل کا ان لذتوں اور نشہ آور کیفیتوں میں محو مستغرق ہو جانا لازم و ملزوم ۔

میرا خیال ہے کہ ہر "لذت" کا تعلق پستی اور عمومیت سے ہے۔ اعلیٰ وارفع بلند و بالا مقاصد ہمیشہ محنت و جانفشانی چاہتے ہیں۔ مذہبی حضرات کہتے ہیں کہ عقبیٰ میں "پل صراط" سے گزرنا ہوگا حالانکہ میرے نزدیک زندگی اور دنیا کا ہر شعبہ پُل صراط سے کم نہیں ۔

میں مشاعروں میں جن مجبوریوں کے ماتحت شریک ہو جاتا ہوں ۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے اگرچہ تو اُئے عمل میں بیداری پیدا ہو چکی ہے۔ لیکن ابھی تک اپنی اصلی حالت پر نہیں آ سکے۔ یہی سبب ہے کہ میں اپنی اس اخلاقی کمزوری کا حق ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بعض غیر حق و غیر مستحق امور کے متعلق بھی اپنے احباب کے اصرار کو رد نہیں کر سکتا۔ ان کی نزاکت طبع کا احساس اس حد تک ہے کہ اس حد تک ہونا نہیں چاہیئے۔ آہستہ آہستہ ترقی کر رہا ہوں ۔ انشاءاللہ وہ دن بھی قریب آنے والا ہے جب میں مشاعروں کی شرکت اپنے اوپر حرام سمجھ لوں گا۔

ہندوستان کے گوشے گوشے میں مشاعروں کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ اور ہر مقام سے احباب کا اصرار ہوتا ہے کہ مشاعرے میں شرکت کروں میری عمر اور صحت دونوں اس قابل نہیں رہ گئے ہیں کہ ان اذیت آفریں ہنگاموں میں جان کھپاتا پھروں۔ اسی لئے میں نے اپنے اوپر چند شرائط عائد کر رکھی

ہیں۔ اور ان پر سختی سے قائم ہوں۔ استثنا کی گنجائش کیوں کر روا رکھی جا سکتی ہے اس لئے کہ ایک استثنیٰ کے معنی یہ ہوں گے کہ دیانت کے ساتھ مجھے دوسرے احباب کو استثنا سے محروم نہ رکھنا چاہیئے اب آپ ہی انصاف فرمائیں گے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

ایک الزام مجھ پر عام طور پر عائد کیا جاتا ہے۔ اور وہ "ادب فروشی" کا حالانکہ میں نے خود اپنے مجموعہ کلام سے بھی برائے نام ہی فائدہ اٹھایا ہے میں اپنے شعر و ادب کی عظمت محسوس کرتا ہوں۔ کیا اس کی قیمت چند روپے ہو سکتے ہیں۔ شرائط میں سے "پچاس روپے اور سکنڈ کلاس کا کرایہ" کیا یہ شعر و ادب کی قیمت ہو سکتے اور کیا شاعر اپنی صحت و آرام کا کوئی حق نہیں رکھتا۔

(ضیاء الاسلام کے نام ایک خط سے اقتباس)

جگر مراد آبادی

تبصرہ باقیات فانی

ایسی حالت میں کہ کلام فانی زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکا، پروفیسر
رشید احمد صدیقی کا معرکۃ الآرا مقدمہ پریس سے باہر آنے والا ہے میرے خاص
احباب اور خود میری طبیعت مجبور کرتی ہے کہ میں اپنے ان خیالات کا کسی نہ کسی
طرح اظہار کر دوں جو میرے دل و دماغ میں فانی اور کلام فانی کے متعلق جاری
وساری ہیں اسلئے میں سب سے پیشتر ناظرین کی خدمت میں اس قدر عرض کر دینا
ضروری خیال کرتا ہوں کہ وہ میرے اس مضمون میں اگر کسی تفصیل و تشریح کی تلاش
کریں گے تو غالباً ان کو اپنی اس طلب و تشنگی کے لئے کوئی سامان سیرابی نظر
نہ آئے گا۔ کلام فانی کی خصوصیات، موصوف کے نازک و لطیف جذبات
واحساسات کی توضیح و تشریح کے لئے ایک دفتر درکار ہے، جب جناب رشید
جیسی باکمال و جامع ہستی ۲ ، صفحات لکھنے پر بھی مطمئن نہیں تو کیا توقع کی جا سکتی
ہے کہ محض ایک "شاعر ناقد" کے فرائض بھی صرف چند صفحات کے دائرہ میں
رہ کر ادا کر دے۔

میرے سامنے سوائے اس ایک راہ کے کوئی راہ باقی نہ تھی کہ جا بجا
اشارات و کنایات سے کام لے کر تا امکان اپنا مافی الضمیر ادا کر دوں۔ مجبوراً

یہی طریقہ اختیار کیا اور یہ سمجھ کر ایک گونہ مطمئن بھی ہوں کہ کلام فانی سے جو حضرات محفوظ ہو سکتے ہیں ان کے لئے درحقیقت اس کی بھی ضرورت نہ تھی۔

شاعر جس کے قوائے ظاہری و باطنی نے مناسب ماحول میں تربیت پائی ہے۔ صحیح معنوں میں شاعر ہے ایسا شاعر دنیائے مشاہدات و محسوسات سے لیکر عالم کیف و وجدانیت تک ہر ہر ارتعاش و سکون سے کبھی حواس اور ہوش میں کبھی مطلق بیخبر ہو کر متاثر ہوتا رہتا ہے بعض اوقات یہ تمام تاثرات یکایک کلام موزوں بن کر اس کے لبوں پر رقص کرنے لگتے ہیں اور کبھی کبھی رموز فطرت کا خزانہ وار دل اس کے ان تاثرات کو جمع کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک ایسا وقت آجاتا ہے جب اس کا روکنا دشوار ہو جاتا ہے اور شاعر از خود رفتہ ہو کر اپنی بلند مقامیوں کو بھول جاتا ہے اسے ایک ایسی طاقت جسے وہ اپنی اصطلاح میں کبھی حسن کہتا ہے کبھی عشق پستی کی طرف ڈھکیل دیتی ہے۔ اس وقت شاعر صرف شاعر رہ جاتا ہے۔ عارف رومی نے اس حقیقت کی طرف کس بلیغ پیرایہ میں اشارہ کیا ہے۔ ؎

چوں بعشق آیم خجل باشم ازاں

عروج و نزول، نزول و عروج یہ عجیب متضاد حقیقتیں ہیں جن کو اگر نمایاں طور پر اور اجتماعی صورت میں دیکھنا ہے تو شاعر کا کلام اس کی صدہا مثالیں پیش کر سکتا ہے جیسا کہ میں نے کہا ایک طرف شعر نتیجہ ہے شاعر کی ایسی پستی کا جس سے بسا اوقات وہ خود بھی غافل و بیخبر رہتا ہے دوسری طرف یہی پستی ہے جو آن واحد میں نفوش انسانیہ کو عرش کی رفعتوں سے بھی اونچا اچھال

دیتی ہے۔ جب سننے والا فضا ءِ شعری سے ہٹ کر غور کرتا ہے اسے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ ابھی تھوڑی دیر پیشتر جس عالم میں تھا وہ اسے اپنے وہم و خیال میں نہیں لا سکتا تھا۔

یہ ضروری نہیں کہ شاعر فطرت سے اکتساب اثر ایک ہی طریقہ اور ایک ہی قاعدہ و قانون کے تحت میں کرتا رہے، وہ صرف اپنے تاثرات مخفیہ کے تحت ہر شے کو دیکھتا ہے کبھی وہ پھولوں کی رنگینی و رعنائی میں خار زار ہولناک مشاہدہ کرتا ہے کبھی اس کو ایک ایک کانٹا فردوس بدامن نظر آتا ہے۔ وہ کائنات عالم کے ہر انقلاب خفی و جلی کا مطالعہ کرتا ہے لیکن ان نگاہوں سے جن کی وسعتیں لامحدود ہیں، الفاظ بے جان الفاظ اس کے سرمدی نغموں میں روح بیداری پیدا نہیں کر سکتے۔ بلکہ خود اس کے نغمہ الفاظ میں روح بھر دیتے ہیں۔

غالباً مذاق سلیم کی اس سے زیادہ کوئی توہین نہیں ہو سکتی کہ بعض حضرات شاعری کو آرٹ کہنے کے باوجود بھی اس کو مفید صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں اور مفید و غیر مفید معلوم کرنے کا معیار بھی انھیں حضرات کی ایجادات و اختراع کا رہین منت ہے، میں آرٹ کی تعریف میں صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ وہ آرٹ ہے شاعری شراب کو، نہ شراب معرفت کہنا چاہتا ہوں اور نہ خوشہ انگور کا حاصل، اس کا انحصار سننے والے کے ذوق و وجدان پر ہی چھوڑ دینا میرے نزدیک سب سے زیادہ محفوظ طریقہ ہے۔ جن حضرات کا یہ نظریہ ہے کہ شعر و شاعری کی تمام لطافتیں اور ان کا مقصود حقیقی صرف مادیات میں

یں حسب دلخواہ تغیر و انقلاب پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں ہیں ان کی خدمت میں گذارش کروں گا کہ وہ صحیح معنوں میں نہ (آرٹ) ہی سمجھتے ہیں نہ (آرٹسٹ) کو بہت ممکن ہے کہ ان حضرات میں سے کچھ ایسے بھی ہوں جنھیں روحانی مطالبات کا بھی علم ہو لیکن غالباً وہ اس حصہ روح سے بالکل بے خبر ہیں جس کا خلاصہ صرف بیداری اور اضطراب ہے میں یہ یقین کر لینے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہو سکتا تھا شاعری اور صرف شاعری سے دُنیا کی سلطنتوں میں عظیم الشان انقلابات و تغیرات رونما ہوئے اگر ہم اوراق تاریخ کو آج کی نظر سے نہ دیکھیں اور یہ ہم اسباب و علل کو بھی جمع کر سکیں تو یقیناً یہ نظریہ از خود باطل ثابت ہو گا۔ لیکن باوجود اس کے بھی کہ شاعر کا کوئی محدود دائرہ نہیں ہوتا اس کا کلام اعلیٰ اخلاقی معیار سے کبھی گرا نہ ہونا چاہئے۔

آپ کو کسی کے کلام میں اگر اس کے خلاف کچھ نظر آئے تو اس میں شاعری کا قصور نہیں بلکہ خود شاعر کی اخلاقی پستیاں اور سوسائٹی کے اثرات شامل ہیں جو کبھی پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ جناب فانی کا کلام اس قسم کے تمام معائب سے پاک ہے لیکن یہ کہ انھوں نے اپنا مقصد پہلے سے معین کر لیا ہے۔ ایسا بھی نہیں۔

تمام حقیقتیں جب عالم کیف و حال میں آتی ہیں دو صورتوں سے خالی نہیں ہوتیں یا تو شاعر ان سے اکتساب غم کرے گا یا اکتساب مسرت، غم و مسرت کے علاوہ جو چیز ہے مجھے اس کی اصلیت و حقیقت سے انکار نہیں لیکن در اصل وہ انہیں دونوں حقیقتوں کی ایک لطیف ترین امتزاجی کیفیت

کا آوازن صحیح ہے جناب اصغر صاحب نے کیا خوب فرمایا ہے ؎
مادرا اٹھایا رنگ نشاط دیکھا آئے نہیں ہیں یوں ہی انداز بے حسی کے
شاعر کی استعداد فطری اس کے حالات فطری کی مناسبت سے جس رنگ کو چاہے
اختیار کرلے، میرا یہ مطلب نہیں کہ شاعر ایک قسم کے جذبہ سے متاثر ہو کر دوسرے
جذبات کو یک قلم فراموش کر دیتا ہے بلکہ میرا مقصد صرف اس قدر ہے کہ خود
شاعر کی باطنی استعداد جس رنگ کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے ہمیشہ وہی
جنس اس کی شاعری کا نمایاں اور کامیاب رُخ ہوا کرتا ہے، کیفیات واحساسات
و طریقۂ ادا بھی ایک ضروری چیز ہے، وہی ایک بات، واعظ کہتا ہے لیکن بے اثر
رہ وہی بات جب شاعر کی زبان سے ادا ہوتی ہے تو سُننے والا بیتاب
ہے۔ یہ کیا ہے صرف شعر کے انداز بیان کی گھاتیں؛ اسلوب جب تک
حقیقیں محض مسائل کی صورت میں بیان کی جائیں گی ہمیشہ شاعری ناکامیاب
رہے گی لیکن جب ان کو بادہ و ساغر حسن و عشق، نیاز و ناز کی چاشنی دیکر پیش کیا
جائے گا۔ دل میں اتر جائیں گی اور روح کو بالیدہ کر دیں گی۔ غالب نے اسی لئے
کہا تھا ؎ "بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر"

جناب ثاقب ان تمام خصوصیات کے اعتبار سے صحیح معنوں میں شاعر ہیں، وہ از
سرتاپا شعریت میں ڈوبے ہوئے ہیں، ان کے واقعات زندگی حسن و عشق کی،
واردات اور لذات سے بھرے ہوئے ہیں، وہ اپنے سینہ میں ایک ایسا پُرگداز
قلب رکھتے ہیں جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے ؎

"ہر لحظہ و ہر ساعت دنیائے دگر دارد"

یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں جوش و اصلیت کے ساتھ ساتھ غم کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ ان کا انداز اپنے معاصرین سے بالکل جداگانہ ہے وہ سیدھی سی بات بھی اس ٹیڑھ اور بانکپن سے کہتے ہیں جو صرف انہیں کا حصہ ہے کبھی وہ تقابل و تضاد سے ایک ایسی لطیف بات پیدا کر دیتے ہیں جو ذہن میں نہیں آ سکتی تھی۔ کبھی اتنی دور سے مصرعہ لگاتے ہیں کہ سننے والا حیران ہو جاتا ہے، ان کے انداز بیان میں ایک خصوصیت سب سے زیادہ واضح نظر آتی ہے۔ وہ شعر میں کبھی ایسا پورا مفہوم ادا کر دینے کے عادی نہیں بلکہ صرف الفاظ کے ذریعہ سے کچھ اشارات کر دیتے ہیں، سننے والا سمجھے اور تڑپتا رہے۔

تصنع و نقالی آج کل کے اکثر مشہور اساتذہ کا شیوہ خاص ہے لیکن جناب فانی کو ان سے سخت نفرت ہے۔ ان کے پورے کلام میں شاید ہی کوئی ایسی مثال مل سکے۔ میری نظر میں تو اب تک آلودہ تصنیت نہ ہو سکیں مختصراً یہ کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں حال کہتے ہیں۔ کلام فانی میں یہ خصوصیتیں اس شدت سے پائی جاتی ہیں کہ ان کے کلام کا کوئی حصہ اس لطف و اثر سے خالی نہیں۔

میں نے اکثر حضرات کو فخریہ یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ وہ غالب، مومن، میر و درد کی تقلید کرتے ہیں، حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس سے زیادہ شعر کی تباہی کوئی توہین خیال میں بھی نہیں آ سکتی ہو۔ یہ حضرات بزعم خود اپنے ان الفاظ ... عادی ہے یہ مطلب نکال کر خوش ہو لیتے ہیں کہ اس طرح ان کا غالب و مومن یا میر بن جانا ان کے لئے معراج کمال ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ خود ان کی

اپنی کوئی ہستی باقی نہیں رہ جاتی حقیقتاً یہ صرف اس ہستی کا کمال ہے جس کی تقلید کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اور جو ان مختلف پردوں سے (اگر صحیح معنوں میں یہ پردے بھی کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں) آواز بلند کرتا آپ اگر خالی الذہن ہو کر دیکھیں گے تو غالباً آپ کو یہ مان لینا پڑے گا کہ فانی کے معاصرین میں سے بہت کم ایسی ہستیاں ہیں جو خود اپنا کوئی مستقل وجود رکھتی ہیں ورنہ عام طور پر الفاظی و ریب نگاری کے سوا اور کچھ نہیں۔ فانی۔ اپنی ایک مستقل ہستی رکھتے ہیں۔ وہ کسی کے رنگ و تقلید کے مرہون منت نہیں یا بالفاظ دیگر وہ صرف تلمیذ الرحمن ہیں، ان کا خود ایک رنگ ہے، انھوں نے کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے کا ننگ گوارا نہیں کیا۔

یہ صحیح ہے کہ ان کے کلام میں غالب و مومن کا انداز بیان، اور بلندی تخیل میر کا درد اور گداز پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا امتزاج ہے جو تکلف و تصنع سے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ از خود پیدا ہو گیا ہے۔ اور اس طرح گویا جناب فانی ایک مستقل رنگ کے مالک ہیں، ان کے کلام میں شوخی و رنگینی مستی و بیخبری بھی پائی جاتی ہے لیکن واقعہ یہ انداز حضرت اصغر گونڈوی کے لئے مخصوص ہو گیا ہے جناب اصغر کی طرح حضرت فانی کا بھی ایک بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے رنگ خاص میں بڑی سے بڑی حقیقت کو اس سادگی و پرکاری کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ بسا اوقات اہل نظر بھی اس سے گذر جاتے ہیں۔ جذبات کی مصوری کا تخیل کی بلندی واقعات و واردات کی نزاکتوں کے ساتھ کامیاب طور پر بہت کم کی جا سکتی ہے، لیکن جناب فانی میں یہ کمال بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

جگر مرادآبادی

تبصرہ شاخ نبات

سلسلۂ ارتقا کہہ لیجئے یا محض دائرہ حرکت، لیکن اس میں شک نہیں کہ دنیا آج انتہائی سرعت کے ساتھ تغیر پذیر ہے۔ اور ہر شعبۂ حیات نقطۂ اجمال سے ہٹ کر تفصیل و تشریح کی طرف گامزن ہے، ساتھ ہی ساتھ فطرت انسانی بھی نازک تر ہوتی جا رہی ہے، تمدن و معاشرت کی ہنگامہ آرائیوں نے سرمایۂ امن و اعتماد، اطمینان و فرصت اس حد تک ہم سے چھین لیا ہے روحانی مطالبات کی ادائیگی فرض تو درکنار، مادی ضروریات کا بھی پورا پورا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔

ان حالات کے ماتحت "اظہار خیال" زیادہ سے زیادہ مختصر پیرایۂ بیان میں اور تا امکان جامع اشارات کے ساتھ کیا جاسکتا ہے اور وہ بھی اپنے ذاتی اعتماد کی بنیاد پر، قریب ترین محاسن حالیہ کے متعلق مستقبل کا معاملہ بقول ڈاکٹر اقبال یہ ہے ؏ محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی ؟!

صورتوں کی اختلافات کی بنا پر مزاجی و معنوی اختلافات لازمی و بدیہی ہیں، اس لئے مذاق طبیعت کی باہمی یکسانیت و یک رنگی طلسم و وہم سے زیادہ کچھ نہیں، ایک صاحب الرائے، صاحب البصیرت، صاحب الاجتہاد و

اور منفرد شخصیت اپنی ہی دنیائے فکر و نظر کے ماتحت اپنا زاویۂ نگاہ جدید اصول و نظریات کی صورت میں (جو ضروری نہیں کہ نظریہ و اصول نیا ہو ہی نہیں سکتا) پیش کرتی ہے، اور اپنی ہی دنیائے خیال کی مناسبت سے دلایل و براہین کا سرمایہ بہم پہنچاتی ہے اور چاہتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد انسانی اس کی ہم نوا اور ہم خیال بن جائے یا بالفاظ دیگر اپنی ذاتی انفرادیت و شخصیت کو اس کی انفرادیت و شخصیت میں محو و فنا کر دے، گویا یہ ایک باطنی عدم اتحادی اور ایک کرب نامرادی ہے۔ جو دوسروں کی تصدیق و تائید، تغلیط و تردید کا منتظر و محتاج رہتا ہے اور ان کی موافقت و مخالفت سے تسکین بے قرار، یا بیقراری تسکین کرنا چاہتا ہے، میں نے اعتراف و انکار دونوں صورتوں کو ایک ہی فائدے کے لئے استعمال کیا ہے لیکن اصل یہ ہے کہ اعتراف و انکار کا راز استیلا و تسلط ہی کی ہمہ گیریوں اور کرشمہ کاریوں میں مضمر ہے۔ اور اس اعتراف و انکار کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ حقیقت کاملہ اگرچہ وہ نقطۂ اتصال ہے جسے اصطلاح صوفیہ میں مقام جمع الجمع کہا جاتا ہے جہاں نہ مجالِ بحث ہے نہ محلِ اختلاف لیکن جزوی حیثیت سے اس کی شاخیں یا حقایقِ منتشرہ تمام تر مختلف، متضاد، اور لا انتہا واقع ہوئے ہیں۔

ان صداقتوں کو سامنے رکھ کر کسی طرح دعوا نہیں کیا جا سکتا کہ افکار طالب کے متعلق جو کچھ نقد و نظر کی صورت میں پیش کیا جائے گا یا شعر و ادب کے ذیل میں جو مباحث سامنے آئیں گے۔ ان کا فیصلہ ایک ایسا منیطہ ہو سکے گا جس کے متعلق اختلاف ہی نہ کیا جا سکے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ میں نے ذاتی طور

پر جس حد تک شعر و ادب کو سمجھا ہے، یا طالب و کلام طالب کے بارے میں جو میری اپنی رائے ہے اسے دیانت کے ساتھ پیش کر دینا میرا فرض ہے، اس سے زیادہ کا نہ مجھے ادّعا نہ اصرار کہ میری اس پیش کش کو حسنِ قبول ہی بخشا جائے وما توفیقی الا باللہ،

شعر حقیقتاً شاعر کی ذہنیت کا ایک سایہ ہوتا ہے اور اس کے تواسے تاثرہ کا ایک نقش مرئی اس لئے اگرچہ شعر و ادب کے تجزیات سے بھی شاعر کی حقیقی استعداد بھی بے نقاب کی جا سکتی ہے لیکن بحالات موجودہ یہ طریقہ خطرات پیہم کے اُلجھے ہوئے سلسلے سے کم نہیں۔ تکلفات و تصنعات کی آمیزش سے قدرتِ فن و مہارت نے وہ وہ کمالات کر دکھائے ہیں کہ اصل و نقل میں امتیاز قائم کرنا تو درکنار اکثر و بیشتر اصل پر نقل اور نقل پر اصل کا یقین ہو جاتا ہے اس لئے ان مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کا محفوظ و مناسب طریقہ یہ ہی ہو سکتا ہے کہ شاعر کے شعر و ادب سے تو اس کا مرکزِ خیال pitch of thoughts اور مزاج شعری دریافت کیا جائے اور شاعر کی عملی و ذہنی زندگی سے وجدانِ عشقی یا وجدان تعقلی کے ماتحت اس کے شعر و ادب کو جانچا جائے کہ ہستیٔ شاعر ہی ان تاثرات کا مصدرِ اولین ہوا کرتی ہے۔ میں نے جناب طالب کا کلام خود ان کی زبان سے سُنا ہے، اپنی نگاہوں سے دیکھا ہے، اور باوقات مختلف خلوت و جلوت میں ان کی فطرت کا مطالعہ بھی کیا ہے، اس لئے سو فیصدی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اغلاط نتائج میں دھوکہ نہیں کھایا۔ اور جو کچھ آئندہ صفحات

میں پیش کروں گا، اسی علم و اعتماد کے بھروسے پر،
شاعر کی تعریف کیا ہے؟ شعر کسے کہتے ہیں؟ جناب طالب کی ذہنیت
و استعداد شعری نزاکتوں سے کہاں تک مناسبت و مطابقت رکھتی ہے،
اور ان کی زندگی و ادب و ادب میں کس حد تک کس قسم کا توازن و امتزاج
پایا جاتا ہے؟

ان سوالات کے جواب میں اپنے نتائج فکر یہ حاضر کئے دیتا ہوں۔
شعر کی مختصر اور جامع ترین تعریف، شاعر کا ذاتی تاثر و وجدان ہے، جو اس کی
فطری استعداد عشق و جمال اور وسعت ظرف کی مناسبت سے کبھی بے قصد
و بے ارادہ اور اکثر متخیلہ کی تحریکات سے صورتِ شعری اختیار کر لیتا ہے،
اس "صورتِ شعری" اور "نغمہ" میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ خواہ موزونیت و
مناسبت عام طور پر تسلیم کی جائے یا نہ کی جائے، اس لئے کہ موزونیت اور اجمالی
تاثر و وجدان دو جداگانہ چیزیں نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ عوام کا معیار
تنقید وہاں تک نہ پہونچ سکے، شاعر کے اسی تاثر و وجدان سے شاعر
کی انفرادیت و شخصیت بنتی ہے، اور اسی انفرادیت و شخصیت کے ماتحت
جو چیز ہوگی اسے جدت و ندرت سے تعبیر کیا جائے گا، اس موقع پر شاعر
کے متعلق اپنے اُن خیالات کا اعادہ کئے بغیر چارہ کار نہیں پاتا، جنھیں منیجر
صاحب جامعہ ملیہ دہلی کی تحریک پر "مقدمہ انتخاب داغ" میں سپرد کر چکا
ہوں، وہو ہٰذا

شاعر کا دل شدید الاحساس ہوتا ہے، لاجونتی کی طرح، معصوم و نازک

دماغ سریع الفکر بجلی کی مثال بیک خرام و تیز رو، نگاہ مجسم شوق، رند تشنہ لب کی مانند بے قرار و مضطرب -

شاعر ہمہ محبت و ہمہ اعتراف ہوتا ہے، وسیع المشرب، رفیع الخیال رنگین مذاق و سادہ مزاج، بے نیاز و آزاد، قومیت و وطنیت کے حدود سے بھی بلند تر، بظاہر عام انسانوں کی طرح وہ بھی حوادث کدۂ عالم سے گھبرا اٹھتا ہے، اکثر شکوہ سنج بھی نظر آتا ہے وہ بعض حقایق کو قبول کرنا چاہتا ہے، اور بعض کو رد، لیکن ابھی ابھی جن واقعات و واردات سے وہ بیزار اور دلگیر نظر آتا تھا، دوسری ساعت میں انھیں واقعات و واردات کا آرزومند بھی،

مختصر یہ کہ شاعر حسن و عشق کی وجدانی و واردا تی دنیا میں رہ کر صرف اپنے ہنگامی تاثرات کا پابند ہوا کرتا ہے، وہ جہاں کہیں آمادۂ اختلاف نظر آتا ہے ا محض وقتی و اعتباری سمجھنا چاہیئے۔

عام حیثیت سے تمام فنون لطیفہ، اور خصوصیت کے ساتھ شعر و نغمہ اپنے اندر انتہائی قوت پرواز رکھتے ہیں، اور دوسرے قلوب کو بھی اُڑا لے جانے کی استعداد، یہ کافی دلیل ہے اس حقیقت و واقعیت کی کہ در اصل فنون لطیفہ کا بیش از بیش تعلق عالم روحانیات سے ہوتا ہے، اور کم از کم دنیائے مادیات سے، اس لئے فنون لطیفہ کو مادی فواید کے لئے آلہ کار بنا لینے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے کسی شاخ گل سے تلوار، یا کسی آوزیدہ لب سے تیر و تفنگ کا کام لینا،

شاعر، فلسفی، پیغمبر اور سائنٹسٹ میں جو کچھ مابہ الامتیاز فرق ہے، وہ صرف اس قدر کہ پیغمبر عالم مادیات و روحانیات دونوں کا راز داں ہوتا ہے، وہ بالفعل کبھی شاعر نہیں ہوتا، بالقوی ہو تو ہو، یہ ہی سبب ہے کہ تمام تر صحف آسمانی اگرچہ اپنے اندر انتہائی جاذبیت رکھتے ہیں۔ لیکن شاعر کا دیوان بن کر سامنے نہیں آسکے۔

شاعر تا امکان دنیائے مادیات کو ٹھکرا دینا چاہتا ہے، اور چونکہ قدرت کے عطیات کی توہین خود قدرت کی توہین ہے اس لئے جس حیثیت سے توہین کی جاتی ہے اسی مناسبت سے اس کی زندگی کو بھی سزا ناکام و نامراد بنا دیا جاتا ہے، شاعر صرف روحانی یا ذہنی سرمستیوں میں ڈوب جانا چاہتا ہے، اسے غرق شراب ہو کر بس کرنا نہیں آتا، بیچارہ فلسفی اور سائنٹسٹ شراب کی صرف ذہنی و مادی تحلیل ہی پر اکتفا کر جاتا ہے، یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ شاعر ہر چیز کا مطالعہ محض جسمانی و روحانی نقطۂ نظر سے کرتا ہے، اور فلسفی یا سائنٹسٹ کوشش یہ ہی اس سے کوئی وابستگی معنوی ہو،

جناب طالب، سلیم الفطرت، وسیع المشرب، لطیف الخیال، انسان واقع ہوئے ہیں، متاثر ہونے والا دل و دماغ رکھتے ہیں، رنگینی و رعنائی کے ساتھ ساتھ بہت سادہ مزاج، تکلفات و تصنعات سے بڑی حد تک کنارہ کش، اگرچہ مجھے تفصیلی طور پر معلوم نہیں لیکن یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی زندگی نازدار حسن و عشق بھی رہی ہے،

جناب طالب کے تمام تر کلام میں ان کی یہ تمام صفاتی خصوصیات دیکھ

بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں، اور ان کے بیشتر رشحات فکر سے یہ صداقتیں بالکل واضح و نمایاں نظر آتی ہیں، انھوں نے شعر و ادب کو حسن و عشق کی نازک نازک واردات، لطیف لطیف جذبات و محاکات، نفسیات و خیالات تک محدود رکھا ہے ان کے کلام میں حکیمانہ حقائق و معارف بھی ہیں لیکن بیش از بیش چاشنیٔ حسن و عشق اور رنگین پیرایۂ بیان کے ساتھ، خشک مسائل کی صورت میں اگر ہیں بھی تو برائے نام،

نظم نگاری کو میں ایک مستقل فن کی صورت میں نہیں دیکھ سکتا، بلکہ اس قسم کی جملہ اصناف سخن کو مشرقی کلچر کے منافی سمجھتا ہوں، اور مغربی ذہنیت کی تقلیدِ محض، یا حکومت کے اثرات استیلا و تسلط، جنھوں نے دراصل ہماری داخلی شاعری کا رخ قطعًا خارجی شاعری کی طرف پھیر دیا ہے، تاہم چونکہ یہ بلا عام ہو چکی ہے اور اب اسے کسی طرح روکا نہیں جاسکتا، اس لئے ہمارا حکیمانہ اور ادیبانہ فرض یہ ہی رہ جاتا ہے کہ اسے قبول و اختیار تو کیا جائے، لیکن ایسی شکل میں کہ مشرقی و مغربی مذاق ادب میں یک گونہ امتزاج بھی پیدا ہو جائے اور روحِ مشرقیت بھی زندہ و باقی، واضح و نمایاں رہے۔

جنابِ طالب کی فطرت صالحہ نے یقینًا اس راز کو سمجھا، عام رجحانات کے مطابق اگرچہ انھوں نے بھی نظمیات کی طرف کافی توجہ صرف کی ہے، لیکن وہ بھٹکنے نہیں پائے، اور کسی جگہ مشرقی خصوصیات کو مجروح نہیں ہونے دیا ان کے کلام میں جہاں کہیں مغربی خیالات ہیں، مشرقی رنگ انشا میں ڈوبے ہوئے اور جس انداز بیان میں مغربیت آگئی ہے اس میں روح جذبات مشرقی

خصوصیات کی حامل، یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ مغربی خیالات کو محض خشک ترجمہ کی صورت دی گئی ہے۔ یا بغیر تاثر و وجدان کے انھیں قبول کر لیا گیا ہے۔

یہ بھی جناب طالبؔ کی قادر الکلامی و خوش مذاقی کی دلیل ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو قومی لیڈر کی حیثیت سے کبھی پیش نہیں کیا، اور نہ کبھی ناصح مشفق کی صورت میں سامنے آئے، کہ ایک سچے شاعر کی دنیا اس دنیا سے کہیں زیادہ وسیع و بلند ہے۔ میں سرے سے قومی شاعری کو بُرا نہیں سمجھتا، بلکہ جہاں تک چیزوں کا ان کے صحیح محل و مقام تک تعلق ہے۔ ان میں سے ہر ایک چیز کو اپنی جگہ لازمی و ضروری سمجھتا ہوں۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ فطرت کی جانب سے شاعر پر یہ فرض رہبری بھی عائد ہوتا ہے یا نہیں؟ اور ایسا شاعر جو اپنے آپ کو قوم و ملک کی ترقیات و انقلابات کا بہت بڑا ذمہ دار بتاتا ہے، کہاں تک اپنے اندر صداقتِ عملی رکھتا ہے، اور کس حد تک اس کے کردار و گفتار میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے، کہ دراصل یہی چیزیں عملی انقلاب پیدا کرنے کی طاقت و اہلیت رکھتی ہیں، کیا کبھی ممکن بھی ہوا ہے یا ہو سکتا ہے کہ خواہ زندگی میں عمل کی صداقت موجود نہ ہو، لیکن محض چند رنگین و لطیف، نازک و دل کش، یا پیش پا افتادہ، فلسفیانہ موشگافیوں کے ذریعہ قوم و ملک کو قعرِ مذلت سے اُچھال کر معراجِ کمال تک پہونچا دیا جائے؟

یہ محل نہیں کہ اس موضوع پر کسی بسیط نقد و نظر کا آغاز کیا جائے، اس لئے صرف اتنے ہی اشارات کے بعد جنابِ طالبؔ کی سلیم الفطرتی کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ انھوں نے اس عام ہڑبونگ سے خود کو محفوظ رکھا، اور جو کچھ

کہا، حال کہا، اپنے حدود میں کہا، اور اکثر و بیشتر مقامات پر بے پناہ کہا۔

جناب طالب کے کلام کا جائزہ لے جائیے، شاید ہی کہیں ناصحانہ ورہبرانہ پندار و انداز کے ساتھ انھوں نے اپنی نمایش کی ہو، ان کے کلام میں حکیمانہ مضامین بھی ہیں۔ لیکن وہ دفتر نصائح کھولنے نہیں بیٹھ جاتے، بلکہ خود متکیف و متاثر ہو جاتے ہیں۔ اور ان کا یہ ہی تکیف و تاثر شعر بن کر نمایاں ہو جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جناب طالب نے فطرت انسانی اور کائنات کا مطالعہ بہت ہی حاضر نگاہ اور توجہ سے کیا ہے، انھوں نے خوب سمجھ لیا کہ اس مصیبت عظمیٰ کو کبھی برداشت نہیں کیا جا سکتا کہ جب دیکھئے ایک اچھا خاصا انسان قومی شاعر کی صورت میں لیڈر بن کر ناصح مشفق کے فرایض انجام دے رہا ہے،

اخلاقی مضامین ہوں یا حکیمانہ غوامض، معاملات حسن و عشق ہوں، یا محاکات وجذبات غرض انھوں نے صرف امکانات و قیاسات، یا تقلید و تائید کی بنا پر کچھ نہیں کہا، بلکہ سوچ سمجھ کر محسوس کر کے، بصیرت و فراست کے ماتحت، ان کے کلام میں لفظی و معنوی نغمگی بھی ہے، زور بیان بھی، اختراع و تنوع بھی ہے جدت و ندرت بھی، اس لئے ان کی انفرادیت و شخصیت کا اعتراف کرنا ہر صاحب انصاف کا فرض ہے، ان کے شعر و ادب میں ان کی زندگی محسوس طور پر پائی جاتی ہے، اور زندگی ہی ہوا کرتی ہے جو شاعر کے کلام کو زندۂ جاوید بنا دیتی ہے،

شاعر کی شاعرانہ لغزشوں کو نمایاں کرنا بھی ایک ناقد کے فرایض میں

داخل ہے، لیکن اس فرض کا حق ادا کرنے کے لئے دنیا بھری پڑی ہے، میرے نزدیک تو معائب کی تلاش و جستجو بھی معائب سے کم نہیں، تاہم باولِ ناخواستہ چند اشارات پیش کئے دیتا ہوں:۔

طالب ہی پر موقوف نہیں، کون انسان ہے جسے دعوائے یکتائی و بے عیبی ہو سکتا ہے اور بجز انبیائے معصومین کے کس کی زندگی ہو سکتی ہے جس کا کوئی نہ کوئی رُخ کمزور نہ ہو؟

جناب طالب وہبی ملکۂ شعری لے کر آئے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ مبدءِ فیض سے کسی کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا۔ دورِ حاضر میں عام طور پر طریقۂ شاگردی و اُستادی نہایت خطرناک حد تک پہونچ چکا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل سے قطع نظر کر کے دیکھئے تو اُستاد جو کچھ اصلاح کر سکتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ لفظی و معنوی حد تک، خود شاگرد کی فطری استعداد و مزاج کو تبدیل کرنا اس کے اختیار سے باہر ہے، موجودہ زمانے میں خصوصیت کے ساتھ گروہ اساتذہ اخلاقی معیار سے قطعاً گر چکا ہے، نہ صرف علمی حیثیت سے بلکہ ذہنی اعتبار پر بھی، عام طور پر گروہ بندی۔ حصولِ داد۔ اور حصولِ داد کے ماتحت تمام لغو ترین حرکات ——— یہ ہی چیزیں ہیں جو اساتذہ کی فطرتِ ثانی بنی ہوئی ہیں، اور یہ ہی مجرمانہ جراثیم ہیں جو وہ اپنے شاگردوں میں بھی منتقل کرتے رہتے ہیں۔ اندریں حالات اگر جنابِ طالب نے اپنے آپ کو اس ابتلاءِ امتحان میں ڈال دینا پسند نہیں کیا اور اس کمی کی وجہ سے ان کے کلام میں چند لفظی اسقام باقی رہ گئے تو میں انھیں قابل

مبارکباد سمجھتا ہوں نہ کہ لائق تعزیر. بیشک بعض بعض مقامات پر ان سے لفظی لغزشیں ہوئی ہیں لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیائے نقد و نظر لفظی مباحث اور کہتی دور سے کہیں آگے نکل چکی ہے، اور اب جو چیز اہم رہ گئی ہے وہ صرف معنویت، شعریت، اور نغمگی،

میں دیکھتا ہوں کہ ان میں سے کسی حیثیت سے بھی ان کے کلام میں کوئی کمی نہیں ہے۔ دوسرا اعتراض جو ان کے کلام پر کیا جاسکتا ہے وہ ان کی تشائم قسم کی شاعرانہ خصوصیت ہے۔ دراصل مسرور یا مغموم جذبات کا تعلق خود شاعر کی استعدادِ مزاجی اور حالات و واقعات سے ہوا کرتا ہے نہ کہ دوسروں کے جذبات و واردات یا مصالح ملکی و ملی سے، حالات کے تحت شاعر کا مزاج بن چکا ہے وہ اکثر و بیشتر ہر چیز کو اسی اسپرٹ کے زیر اثر قبول کرے گا، مسرت و غم دونوں عطیات فطرت ہیں اور دونوں دو مختلف اسپرٹ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ دیکھنا یہ نہیں کہ شاعر مغموم جذبات پیش کرتا ہے یا مسرور، بلکہ دیکھنا یہ چاہیئے کہ شاعر نے جو کچھ کہا ہے محسوس کرکے کہا ہے یا نہیں۔

جناب طالب حقیقتاً درد مند طبیعت رکھتے ہیں، سوز و گداز ان کی سرشت ہے، کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ اپنی انتہائے طبیعت کے خلاف بہک سکیں؟۔

مجھے ذاتی طور پر طالب کے کلام میں اگر کوئی کمی محسوس ہوئی تو یہ کہ ان کی دنیائے عشق و محبت کا مرکز اکثر و بیشتر "حسن مجاز" ہے اور حسن مجاز ہی کی جزئیات و تفصیلات، یقیناً یہ اک قسم کی کمی ہے، لیکن یہ کمی اس تکمیل سے کہیں زیادہ قابل ستائش و پذیرائی ہے جس کی بنیاد محض نقالی اور قدرت

نقلی پر قائم ہو، دور حاضر میں یہ فریب اس قدر عام ہو گیا ہے کہ الاماں! جسے دیکھیے وہ فلسفہ و منطق لئے بیٹھا ہے!! اقوام عالم کے مسائل حل کر رہا ہے! حالانکہ وہ ان میں سے کسی ایک کا بھی صحیح معنوں میں رازدار نہیں۔

جناب طالب کے لئے یہ فخر کم نہیں کہ ان کا کلام ان کے سچے جذبات کا آئینہ دار ہے۔ انھوں نے نہ اپنے نفس کو دھوکا دیا ہے نہ دوسروں کو حقیقت و صداقت، لنغگی و تاثر، مصوری و فلسفہ وغیرہ یہ تمام محاسن ان کے کلام میں بھرے پڑے ہیں، اور جہاں جہاں حکیمانہ حقایق و معارف ہیں وہ بھی وجدانِ تعقل کے ماتحت۔ مجھے حصۂ نظم کی طرف پوری توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا، لیکن اکثر مقامات پر بے اختیار دل تڑپ تڑپ گیا ہے، ندرت و جدّت کے ساتھ مصوری و محاکات کی بیشتر مثالیں بے پناہ ہیں، حسب ذیل نظمیں جن کا علیحدہ علیحدہ عنوان مخصوص سیاست پیش کر دیا گیا ہے، خاص طور پر جاذب توجہ ہیں۔

نظائر و بصائر کے ماتحت "خدا کیا ہے" "بارگاہ حسن" "حسن و عشق"

واردات و جذبات کے ماتحت "تعزیر شباب" "کہاں جا رہے ہو" "آجا"

فطرت و محاکات کے ماتحت "دیہاتی لڑکی" "وہ جاگے" "فاختہ" "معصوم کلیسا"

مناظر و مصوری کے ماتحت "برسات" "بسنت" "ساون کی اندھیری راتوں میں" وغیرہ

کاہلی کے مشاغل فرصت نہیں دیتے کہ جناب طالب کے کلام کی صوری و معنوی خوبیاں ایک ایک کرکے پیش کر سکوں، اور مجھے یہ عام روش پسند بھی نہیں کہ ہر شعر پر عمل جراحی کرکے اس کے محاسن کو برباد کیا جائے، اور ان معنوی نزاکتوں کا خون روا رکھا جائے جو کسی تشریح و تفصیل یا لفظ و بیان کا

بار نہیں اُٹھا سکتیں، اس لئے چند خاص خاص عنوانات کے ماتحت کلام طالب کا جستہ جستہ انتخاب پیش کر دینا ہی کافی سمجھتا ہوں، ملاحظہ کیجئے کس قدر بلند پایہ اشعار ہیں:۔

الٰہیات

جمالِ یار تو منت کش حجاب نہ تھا
نقاب پردۂ ادراک تھا نقاب نہ تھا

بصائر و حکمت

نہاں ہیں سینکڑوں سورج حقیر ذروں میں
بلند کر کے نظر دیکھ مطمحِ نظری

رباعی

مدہوش خیال کس طرح بہکا ہے
دنیا کو پسِ نقاب کیا سمجھا ہے

نفسیاتِ عشق

آپ کے تسکین دلانے سے تو بڑھتی ہے خلش
آپ جب بے چین ہوتے ہیں ٹھہر جاتا ہے دل

جذبات و واردات

اِدھر بھی تم اُدھر بھی تم یہاں بھی تم وہاں بھی تم
یہ تم نے کیا قیامت کی نگاہوں سے نہاں ہو کر

فطرت و محاکات

شوخ کلیوں کا جو منہ چوم رہی ہیں کرنیں
عرقِ شرم جھلک اٹھا ہے شبنم بن کر

زبان و محاورات

وہ سامنے نگاہیں چرائے جاتے ہیں
یہ آج کل کے مسیحا بنائے جاتے ہیں

شوخیٔ بیان

نیچی نظریں ہوں زباں بند ہو غیروں کو سلام
ان کی محفل سے تو وہ آئیں گے آداب مجھے

(از رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی)

تقریظ گلبانگ حرم

بُنیادی طور پر دُنیا میں نہ کوئی نیا جذبہ ہے اور نہ کوئی نیا خیال محض شاعر کی انفرادیت انداز بیان کے ساتھ ساتھ جذبہ خیال کو بھی نئی صورت میں پیش کردیتی ہے اگر شاعر نے تنہا اپنی جدت سے کہا ہے تو شعر میں اس کی صوری یکتائی کی طرح اُسکے باطنی تاثرات کا ہونا بھی لازمی ہے، بصورت دیگر محض مشق و مہارت، اور قافیہ و ردیف کی مدد سے اگر دوسروں کے خیالات و جذبات کو نظم کردیا گیا ہے، وہ کتنا ہی کامیاب نہ ہو، شعر کہلائے جانے کا مستحق نہ ہوگا، بلکہ اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو صرف ایک ناکامیاب نقالی۔

شاعر کے شعر و ادب میں اُس کی زندگی کا پایا جانا بھی لازمی ہے۔ اس کے علاوہ شاعر کی ذہنیت اور اس کی استعداد کو بھی پاکیزہ اور بلند ہونا چاہیئے، اس لئے کہ اگر شاعر نے اپنی انفرادیت کا حق ادا کیا ہے تو اس کے کلام میں اُسی کی ذہنیت و استعداد کا پرتو ہوگا۔ اس صورت میں اگر شاعر پاکیزہ نفس وسیع النظر ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع معلومات بھی رکھتا ہے، تو اس کے کلام میں اُس کی تمام مزاجی خصوصیات کی جھلک نمایاں طور پر موجود ہوگی۔

حمید صاحب کو قدرت نے شاعر پیدا کیا ہے، وہ استعداد عشق و جمال کے

ماتحت شدید الاحساس انسان ہیں۔ صادق اور پاکیزہ اخلاق وجذبات کے مالک ہیں، ان کی ہستی سراپا خلوص ومحبت اور مجسم سوز وگداز ہے۔

موصوف سے میرے تعلقات بیحد مخلصانہ ہیں۔ میں نے انھیں خلوت وجلوت میں دیکھا ہے، ایک زمانہ تک تجربہ اور مشاہدے کے بعد میں جس نتیجہ پر پہونچا ہوں اس کے متعلق اشارہ کرچکا ہوں، اور اسی قدر کافی ہے۔

یہی ان کی مزاجی خصوصیات ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں، صداقت وواقعیت اور سوز وگداز کے ساتھ ساتھ اُن کے کلام میں بیحد سادگی پائی جاتی ہے، ایسی سادگی جس پر ہزار ہا رنگینیاں نثار کی جاسکیں، سب سے اہم بات جو مجھے محسوس ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ موصوف کی زندگی اور ان کے کلام میں تضاد مطلق نہیں پایا جاتا، بہ الفاظ دیگر گویا ان کی زندگی ان کی شاعری ہے اور شاعری ان کی زندگی۔

جناب حمید صاحب مجازمیں بھی کہتے ہیں اور حمد ونعت میں بھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس درجہ کا سوز وگداز اور درد واثر ان کے نعتیہ کلام میں پایا جاتا ہے۔ اُن کی عشقیہ شاعری میں اُس حد تک اس کی افراط نہیں، اور ایسا ہونا بھی چاہیئے جناب حمید صحیح طور پر مذہبی انسان ہیں، اور میں ذاتی واقفیت کی بنا پر ان کی یہ جامع اور اشرف تعریف کرسکتا ہوں کہ وہ بڑی حد تک سچے مسلمان ہیں، اور ایک مسلمان کو جو استغراق اور شیفتگی وفریفتگی سرکار رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم سے ہونا چاہیئے وہ ان میں وسیع درجے تک موجود ہے اگر اس استغراق اور جذب کا درجہ بلند نہ ہوتا۔ تو ان کی دُنیا ﴿۵﴾ بے سروسامانی اور اسکی مجبوریاں

اُن کو اس کی ہرگز اجازت نہ دے سکتی تھیں، کہ وہ ایک ہی بار نہیں، بلکہ دس بار اُس ارضِ پاک پر جا کر سجدے کر سکتے جس پر عرش و کرسی کو بجا طور سے رشک آتا ہے اور جس ارضِ پاک کو سربلند کرنے والے کی ذات اقدس کو عرصۂ شہود میں لانے پر خود خالق و مالکِ ارض و سما فخر کرتا ہے۔

حمید صاحب کے کلام میں جو خلوص و محبت اور کیف و تاثیر موجود ہے، اس سے اس بات کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف درکِ حقیقت سے بہرہ مند ہیں بلکہ اپنی ذات میں گم شدہ حقیقت ہونے تک کا امکان رکھتے ہیں۔ اُن کی رُوح حسنِ حقیقی کی تلاش میں سرگرم کار رہتی ہے۔ اور ان کا دل نشۂ عشق میں سرشار، اور اب اُن کی حاضری بھی حاضری ہے اور غیر حاضری بھی حاضری بن چکی ہے۔

موصوف کو دیارِ حبیبؐ سے حد درجہ عشق ہے، بارگاہ مدینۃ الرسولؐ کی یاد، اور گنبدِ خضرا کا تصور ان کی زندگی کا سہارا ہے، ذکر حریم رسالت اُن کیلئے خلاصۂ ایمان و باعثِ حیاتِ جسم و جان ہے لیکن اُن کی فطرتِ صالحہ "با محمدؐ ہوشیار" کی رازدار ہے، اسلئے اُن کے پورے کلام میں ایک شعر بھی ایسا نہیں مل سکے گا جس میں حدودِ ادب کا پوری طرح احترام ملحوظ نہ رکھا گیا ہو۔

مجھے مکمل یقین ہے کہ ناظرین حضرت حمید کے کلام کو سندِ قبولیت عطا فرمائیں گے اور بڑی سی بڑی حد تک میری رائے کی تصدیق کریں گے۔

دُعا کرتا ہوں کہ خدا عزّ و جل موصوف کے افکار کو دائمی زندگی عطا فرمائے، اور انھیں بھی تا دیر زندہ و سلامت، بامراد و مسرور رکھے۔ آمین یا ربّ العالمین!

(از رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی)

پیش لفظ گلگونہ

حضرت تسکین میرے بہت ہی مخلص، بے تکلف اور قریب تر دوست ہیں ان کا مجموعۂ کلام "گلگونہ" کے نام سے زیر طباعت ہے۔ میں ان کے کلام سے متعلق اپنے تاثرات محض بہ بنائے دوستی نہیں پیش کر رہا ہوں۔ بلکہ حقیقتاً خود ان کے کلام کی خصوصیات کا بھی بہت بڑا تقاضا ہے۔

موصوف کے مجموعۂ کلام کو کئی ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے "ابتدائی و مشقی دور" "وسطی و عبوری دور" اور "بالغ تر شعوری و فکری دور" ہو سکتا تھا کہ تسکین صاحب اپنے کلام کا بہترین حصہ پیش کر دیتے لیکن اگر ایسا ہوتا تو یہ اُن کے دیانت دارانہ فرض کے قطعاً خلاف ہوتا۔

ایک غیر طرفدار، بلند فکر اور خوش مذاق ناقد کا فرض ہے، کہ ہر دور سے متعلق اسی مناسبت سے کلام کا جائزہ لے اور فیصلہ کرے۔

میرا "مذاق شعری" عیب بیں مطلق نہیں، اگرچہ مجھے اعتماد ہے کہ اگر میں صرف نقاد کی حیثیت سے کلام کا جائزہ لینے پر آمادہ ہو جاؤں تو کوئی حسن اور کوئی عیب مجھ سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔

حضرت تسکین صحیح معنوں میں غزل گو شاعر ہیں "رومانی مزاج" "تدرست

سے لیکر چلے ہیں" حالات ، بھی اسی کی مناسبت سے وارد ہوئے یا ہوتے رہے اس لئے " غزل " ہی کے سلسلے میں ان کے محاسن شعری پر ایک اجمالی تبصرہ پیش کرنا کافی ہوگا۔ بیتیک " نعت " میں بھی وہ ایک بلند درجہ رکھتے ہیں ، اور جو کچھ کہا بہت محتاط ، نہایت با ادب ، اور ایک صاحب کیف و حال شاعر کی حیثیت سے ۔

" غزل " کا مزاج نہایت لطیف و نازک ہوتا ہے ، اسکی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ لطافت و نزاکتِ مزاج اور اختصار و ایجاز کے باوجود ہر موضوع اس کے زیر سایہ آجاتا ہے ، اور اپنے تمام محاسن اور قوت کے ساتھ ۔

میرا عقیدہ ہے کہ حُسن ذاتی صرف اجمال میں ہوتا ہے تفصیل حُسن ذات کی نہیں ، بلکہ حُسن صفات کی حامل بے شک ہوسکتی ہے ، اور ہوتی ہے ۔ مجھے نظم کی کسی صنف سے بھی نہ اختلاف ہے اور نہ انکار ، بشرطیکہ نظم ادبی حیثیت کے علاوہ علمی معیار پر بھی کامل اُترتی ہو ، لیکن ساتھ ہی پوری دیانت کے ساتھ تمام اصناف سخن میں " غزل " ہی کو میں ایک شریف ترین اور پاکیزہ ترین صنف تصور کرتا ہوں ، اس کے معنی یہ نہ سمجھئے کہ غزل کے علاوہ اور تمام اصناف سخن غیر شریف ہوتے ہیں ۔

موجودہ دور میں حضرت تسکین غزل کے صحیح معنوں میں اہل اور رازدار ہیں غزل کے مزاج سے وہ کسی مقام پر نہیں ہٹتے ۔ اگرچہ ان کا کلام نہ صرف لطیف و نازک جذبات و احساسات کا حامل ہوتا ہے ، بلکہ اس میں علمی و تخیلی فکری و نظری مسائل بھی بیش از بیش آجاتے ہیں

تسکین صاحب مزاجاً مخلص، صادق اور پاکیزہ اخلاق انسان ہیں، اس طرح لغزشوں کے ساتھ جو حقیقتہً مقتضائے انسانیت ہیں، اور اپنی جگہ ایک طرح کا حُسن بھی رکھتی ہیں، اور جن کی طرف خود موصوف نے اپنے چند اشعار میں اشارہ کیا ہے۔

مثلاً یہ شعر:- ؎

رہِ عشق میں کوئی کتنا ہی سنبھلے
مگر کچھ نہ کچھ لغزشیں ہیں ضروری

یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ شاعر کا کلام اُس کی پوری زندگی کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے، بشرطیکہ گہری اور بے لاگ ""نقد و نظر" سے کام لیا جائے۔ حضرت تسکین کے پورے کلام سے ان کی شرافتِ نفس اور پاکیزگی طبیعت واضح اور نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ وہ محض رسمی و تقلیدی طور پر حُسن و عشق کے مسائل پیش نہیں کرتے، بلکہ وہ ان مراحل سے شریفانہ زندگی کے ساتھ گذرے بھی ہیں یہی سبب ہے کہ موصوف کے کلام میں بہت سے محاسن کے ساتھ زندگی کی حرارت بھی پائی جاتی ہے۔

اب میری عدیم الفرصتی آگے کچھ لکھنے یا کہنے کی مطلق اجازت نہیں دیتی

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

انتخاب غزلیات شعلہ طور

عشق کو بے نقاب ہونا تھا — آپ اپنا جواب ہونا تھا
تیری آنکھوں کا کچھ قصور نہیں — ہاں مجھی کو خراب ہونا تھا
مست جام شراب خاک ہوئے — غرق جام شراب ہونا تھا
ہم نے ناکامیوں کو ڈھونڈھ لیا — آخرش کامیاب ہونا تھا
ہائے وہ لمحہ سکوں کہ جسے — محشر اضطراب ہونا تھا
نگہ یار خود تڑپ اٹھتی — شرط اوّل خراب ہونا تھا

ایک رنگیں نقاب نے مارا — حسن بن کر حجاب نے مارا
جلوۂ آفتاب کیا کہیئے — سایۂ آفتاب نے مارا
چھپتے ہیں اور چھپا نہیں جاتا — اس ادائے حجاب نے مارا
زندگی تھی حجاب کے دم تک — برہمیٔ حجاب نے مارا
میں ترا عکس ہوں کہ تو میرا — اس سوال و جواب نے مارا
بچ رہا جو تری تجلی سے — اس کو تیرے حجاب نے مارا

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

ستم یار کی دہائی ہے ‏ ‏ نگہ التفات نے مارا
موت کیا؟ ایک لفظ بے معنی ‏ ‏ جس کو مارا حیات نے مارا
شکوۂ موت کیا کریں کہ جگر ‏ ‏ آرزوئے حیات نے مارا

عشق کی یہ نمود مبہم کیا ‏ ‏ ہو تمھیں تم اگر تو پھر ہم کیا
جز ترے کچھ نظر نہیں آتا ‏ ‏ آرزو بن گئی مجسم کیا
تیرا ملنا تیرا نہیں ملنا ‏ ‏ اور جنت ہے کیا جہنم کیا
عشق خاموش کے مزے ہیں جگر ‏ ‏ جوش فریاد و شور ماتم کیا

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا ‏ ‏ دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آ ہی گیا
جب نگاہیں اٹھ گئیں اللہ ری معراج شوق ‏ ‏ دیکھتا کیا ہوں وہ جان انتظار آ ہی گیا
ہائے یہ حسن تصور کا فریب رنگ و بو ‏ ‏ میں یہ سمجھا جیسے وہ جان بہار آ ہی گیا
اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں ‏ ‏ در حقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آ ہی گیا
دل نے اک نالہ کیا آج اس طرح دیوانہ وار ‏ ‏ بال بکھرائے کوئی مستانہ وار آ ہی گیا
جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر ‏ ‏ عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

کس نظر سے آج وہ دیکھا گیا ‏ ‏ دل مرا ڈوبا کیا اچھلا کیا
تو نے سو سو رنگ سے پردہ کیا ‏ ‏ دیکھنے والا تجھے دیکھا کیا
وہ بھی نکلی اک شعاع برق حسن ‏ ‏ میں جسے اپنی نظر سمجھا کیا
لذت ناکامیابی الاماں ‏ ‏ تو نے ہر امروز کو فردا کیا
اب نظر کو بھی نہیں دم بھر قرار ‏ ‏ اس نے بھی انداز دل پیدا کیا
ان کے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی ‏ ‏ جس طرف دیکھا کیا دیکھا کیا

مجھ سے قائم ہیں جنوں کی عظمتیں　　میں نے صحرا کو جگر صحرا کیا

عشق کا سحر کامیاب ہوا　　میں ترا تو مرا جواب ہوا

جذبۂ شوق کامیاب ہوا　　آج مجھ سے انہیں حجاب ہوا

عین قربت بھی عین فرقت بھی　　ہائے وہ قطرہ جو حباب ہوا

ہر دل میں غم عشق ہے اقرار در اقرار　　ہر لب پہ ہے افسانہ در افسانہ کسی کا

نگاہوں سے چھپ کر کہاں جائیے گا　　جہاں جائیے گا، ہمیں پائیے گا

ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگ محفل　　کسے دیکھ کر آپ شرمائیے گا

سلام اس پہ کہ جس نے اٹھائے پردۂ دل　　مجھی میں رہ کے مجھی میں سما کے لوٹ لیا

اب تو یہ بھی نہیں رہا احساس　　درد ہوتا ہے یا نہیں ہوتا

وہ بھی ہوتا ہے ایک وقت کہ جب　　ماسوا، ماسوا نہیں ہوتا

یہ عشق وہ بلا ہے کہ حسن ازل کو بھی　　تخلیق کائنات پہ مجبور کر دیا

ان کو بھی ناز فتح اگر ہو تو بات ہو　　مجھکو تو ہر شکست نے مجبور کر دیا

اوج پہ جمال ان کا جوش پہ شباب ان کا　　عہد ماہتاب ان کا دور آفتاب ان کا

ہاں نگاہ شوق وہ اٹھی نقاب　　آفتاب آمد دلیل آفتاب

لکھ چکے خط، جا چکا خط کا جواب　　اضطراب در اضطراب در اضطراب

کچھ کہوں تو کیا کہوں کس سے کہوں　　میں ہی خود اپنا سوال اپنا جواب

ان لبوں کی جاں نوازی دیکھنا　　منہ سے بول اٹھنے کو ہے جام شراب

مختصر ہے شرح ہستی اے جگر

زندگی ہے خواب اجل تعبیر خواب

میرا جنون شوق وہ عرض وفا کے بعد وہ خان احتیاط تری ہر ادا کے بعد
تیری خبر نہیں مگر اتنی تو ہے خبر تو ابتدا سے پہلے ہے تو انتہا کے بعد

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہو فصل بہار پر

تمہیں یہی خبر ہی جو تم کہہ گئے ہو خود اپنی اداؤں سے مسرور ہو کر
تجاہل، تغافل، تبسم، تکلم یہاں تک تو پہنچے وہ مجبور ہو کر

بہار اپنی جگہ پر سدا بہار رہے یہ چاہتا ہے تو تجزیۂ بہار نہ کر
تاراج کرتی ہے خانہ ویرانی ایسے خانہ خراب ہیں ہم لوگ
اللہ اللہ تمہارے درد دل اب نہیں تم جو بجائے درد دل

مسجد میں معتکف ہیں بیکار ہی تو زاہد وہ دور زندگی ہے آئیں چلیں چلائیں
اک جام آخری تو پینا ہے اور ساقی اب دست شوق کانپیں یا پاؤں لڑکھڑائیں

کہاں کی دید اور کس کا عرفاں جو اس گم ہیں نظر پریشاں
جو ایک پردہ اٹھا رہے ہیں تو لاکھ پردے گرا رہے ہیں

نظر نظر انتہائے مبہم ادا ادا شکوۂ مجسم
فدا جو بن کر بگڑ رہے ہیں وہ کیا کیا بنا رہے ہیں

محبت اثر کرتی ہے چپکے چپکے محبت کی خاموش چنگاریاں ہیں
قدم ڈگمگائے نظر بہکی بہکی جوانی کا عالم ہے سرشاریاں ہیں
خطاؤں سے پہلے پشیمانیاں ہیں محبت کی معصوم نادانیاں ہیں
وہ بیکدہ اور سجدوں پہ سجدے تجھے یاد کیا کفر سامانیاں ہیں

شروع راہِ محبت ارے معاذ اللہ
یہ حال ہے کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

یہ نازِ حسن تو دیکھو کہ دل کو تڑپا کر
نظر ملاتے نہیں مسکرائے جاتے ہیں

مری طلب بھی اسی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

الٰہی ترکِ محبت بھی کیا محبت ہے
بھلاتے ہیں انھیں وہ یاد آئے جاتے ہیں

اللہ اللہ تیرے غم کی وسعتیں
کوئی عالم درد سے خالی نہیں

جنونِ محبت یہاں تک تو پہنچا
کہ ترکِ محبت کیا جاتا ہوں

اللہ اللہ عشق کی رعنائیاں
حسن خود لینے لگا انگڑائیاں

کوئی دیکھے تو حریمِ شوق میں
خلوتوں کی انجمن آرائیاں

خود بڑھے آتے ہیں وہ میری طرف
کوئی دیکھے تو میری پسپائیاں

اب کہاں انساں جسے انساں کہیں
چلتی پھرتی دیکھ لو پرچھائیاں

اللہ اللہ اعتبارات نظر
اور پھر ان سب کی بے بنیادیاں

نہ صورت نہ معنی نہ پیدا نہ پنہاں
یہ کس حسن میں گم ہوا جا رہا ہوں

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے میخانے میں
خلد شیشے میں ہے فردوس ہے پیمانے میں

حرم و دیر میں رندوں کا ٹھکانا ہی نہ تھا
وہ تو کہئے کہ اماں مل گئی میخانے میں

ہجومِ مے نے ترا اے شیخ بھرم کھول دیا
تو تو مسجد میں ہے نیت تری میخانے میں

آ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

جس قدر افسانۂ ہستی کو دہراتا ہوں میں
اور بھی بیگانۂ ہستی ہوا جاتا ہوں میں

میری ہستی شوقِ پیہم میری فطرت اضطراب
کوئی منزل ہو مگر گزرا چلا جاتا ہوں میں

دل مجسم شعر و نغمہ وہ سراپا رنگ و بو
کیا فضائیں ہیں کہ جن میں حل ہوا جاتا ہوں میں

جسم محدود، روح لامحدود پھر یہ اک ربطِ باہمی کیا ہے
ہم نہیں جانتے محبت ہیں رنج کیا چیز ہے خوشی کیا ہے
اک نفس خلد اک نفس دوزخ کوئی پوچھے یہ زندگی کیا ہے

معراجِ شوق کہیے یا حاصلِ تصور جس سمت دیکھتا ہوں تو مسکرا رہا ہے
ان کی وہ آمد آمد اپنا بیاں یہ عالم اک رنگ آ رہا ہے اک رنگ جا رہا ہے

مجھے دے رہے ہیں تسلیاں وہ ہر اک تازہ پیام سے
کبھی آ کے منظرِ عام پر کبھی ہٹ کے منظرِ عام سے

ہر ستم ہے کرم کے پردے میں اس ستم کی کوئی مثال بھی ہے
حسن کے ہر جمال میں پنہاں میری رعنائیٔ خیال بھی ہے

کیا خاک سیر کیجئے دنیائے رنگ و بو کی مہلت نہ آرزو کی فرصت نہ جستجو کی
یہ حد آخری ہے عاشق کی جستجو کی بن بن کے مٹ رہی ہے ہر شکل آرزو کی

ستم کشانِ محبت سے کوئی پوچھے تو امید پر ہے بھروسہ امید ہی کیا ہے

ہر جلوہ ہے بجائے خود اک دعوتِ نگاہ کیا کیجئے جو تیری تمنا نہ کیجئے
تفسیرِ عشق و حسن جگر مصلحت نہیں افشائے راز قطرہ و دریا نہ کیجئے

یہ کیا مجال کہ ہم ترکِ التجا کرتے دہن کو سی بھی جو لیتے نظر کو کیا کرتے
حجاب نے انہیں رکھا حجاب میں ورنہ جب آتے سامنے اپنا ہی سامنا کرتے

میں عشق بے نیاز ہوں تم حسن بے پناہ میرا جواب ہے نہ تمہارا جواب ہے
میخانہ ہے اسی کا یہ دنیا اسی کی ہے جس تشنہ لب کے ہاتھ میں جامِ شراب ہے
وہ لاکھ سامنے ہوں مگر اس کا کیا علاج دل مانتا نہیں کہ نظر کامیاب ہے

میری نگاہ شوق بھی کچھ کم نہیں مگر — پھر بھی ترا شباب ترا ہی شباب ہے

جس رنگ میں دیکھو اسے وہ پردہ نشیں ہے — اور اس پہ یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں ہے

وہ زلفیں دوش پہ بکھری ہوئی ہیں — جہان آرزو تھرا رہا ہے

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں — محبت کا زمانہ آ رہا ہے

وہ خود تسکین خاطر کر رہے ہیں — مگر دل ہو کے ڈوبا جا رہا ہے

ازل ہی سے چمن بند محبت — یہی نیرنگیاں دکھلا رہا ہے

کلی کوئی جہاں پر کھل رہی ہے — وہیں اک پھول بھی مرجھا رہا ہے

طبیعت ہے کہ ٹھہری جا رہی ہے — زمانہ ہے کہ گزرا جا رہا ہے

اک نظر دل کی سمت دیکھ تو لو — کیسی دنیا تباہ ہوتی ہے

سانس لیتا ہوں دم الجھتا ہے — بات کرتا ہوں آہ ہوتی ہے

وہ بھی ہو اک مقام عشق جہاں — ہر تمنا گناہ ہوتی ہے

حاصل حسن و عشق اسے سمجھو — وہ جو پہلی نگاہ ہوتی ہے

مست و بیخود و عاقل و ہشیار جو چاہے کرے

شوخیٔ طرز تپاک یار جو چاہے کرے

زہے جان گرامی فدا بایں نسبت — کہ میری ذات سے اپنا بنا دیا تو نے

حرف و حکایت تمام دیدہ و دل — اس اہتمام پہ بھی شرح عاشقی نہ ہوئی

صبا یہ ان سے ہمارا پیام کہہ دینا — گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی

ادھر سے بھی ہے سوا کچھ ادھر کی مجبوری — کہ ہم نے آہ تو کی ان سے آہ بھی نہ ہوئی

تھے ہم بھی جگر جلوہ گاہ جاناں میں — وہ پوچھتے ہی رہے ہم سے بات بھی نہ ہوئی

کچھ اس ادا سے آج وہ پہلو نشیں رہے
جب تک ہمارے پاس رہے ہم نہیں رہے

اللہ ری چشم یار کی معجز بیانیاں
ہر اک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے

تیری نظروں کے تصدق تری آنکھوں کے نثار — انھیں پیمانوں سے ساقی رہیں میخانوں کی
سب جسے کہتے ہیں ارمانوں کا پورا ہونا — میرے نزدیک یہی موت ہے ارمانوں کی

ایک لفظ محبت کا ادنیٰ یہ فسانہ ہے — سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے
کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے — ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے
خود حسن و شباب ان کا کیا کم ہے رقیب اپنا — جب دیکھیے اب وہ ہیں آئینہ ہے شانہ ہے
یہ حسن و جمال ان کا یہ عشق و شباب اپنا — جینے کی تمنا ہے، مرنے کا زمانہ ہے
اشکوں کے تبسم میں آہوں کے ترنم میں — معصوم محبت کا معصوم فسانہ ہے

ایک منظر ہے کہ آنکھوں میں کھنچا آتا ہے
ایک دنیا ہے کہ روپوش ہوئی جاتی ہے

عشق ہی خود عشق کا انعام ہے — واہ کیا آغاز کیا انجام ہے
حسن ہے نغمہ ہے مے ہے جام ہے — اب کہاں اے گردش ایام ہے
پینے والے ایک ہی دو ہوں تو ہوں — مفت سارا میکدہ بدنام ہے
وہ سراپا ناز ان کا کیا جگر — مجھ سے شکوہ گردش ایام ہے
ہوشیار اے شکوہ سنج زندگی — زندگی انعام ہی انعام ہے
ہوشیار اے کامیاب زندگی — زندگی ناکامیوں کا نام ہے

درد بڑھ کر فغاں نہ ہو جائے یہ زمیں آسماں نہ ہو جائے

مجاز ہو کہ حقیقت یہاں تو حال یہ ہے تیرے حضور سے اٹھے تیرے حضور آئے

عاشقی امتیاز کیا جانے فرق ناز و نیاز کیا جانے
نگہ شوق کی ہے سب تحریک حسن تمہید ناز کیا جانے
ہم سمجھتے ہیں راز رامش و رنگ زاہد پاک باز کیا جانے
ہائے گل کاریاں محبت کی دامن پاک باز کیا جانے

دل گیا رونق حیات گئی غم گیا ساری کائنات گئی
دن کا کیا ذکر تیرہ بختوں میں ایک رات آئی ایک رات گئی
تیری باتوں سے آج تو زاہد وہ جو تھی خواہش نجات گئی
انکے بہلائے بھی نہ بہلا دل رائگاں سعیٔ التفات گئی
مرگ عاشق تو کچھ نہیں لیکن ایک مسیحا نفس کی بات گئی

عشق ہی تنہا نہیں شوریدہ سر میرے لئے حسن بھی بیتاب ہے اور کس قدر میرے لئے
وہ مرا ساغر کیف ہونا پشیمانی کے ساتھ ابر رحمت کا وہ اٹھنا جھوم کر میرے لئے
میں تو ہر حالت میں خوش ہوں لیکن اسکا کیا علاج
ڈبڈبا آتی ہیں وہ آنکھیں جگر میرے لئے

رضی احمد

شرارے از آتشِ گل

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل　　ہم وہ نہیں ہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا
دل بن گیا نگاہ، نگاہ بن گئی زباں　　آج اک سکوتِ شوق قیامت ہی ڈھا گیا

تم نے نظریں پھیر لیں تو کیا ہوا　　دل میں اک نشتر اترتا ہی رہا
نہیں، کہ دل مرا وقفِ غمِ نہاں نہ رہا　　مگر وہ شیوۂ زمزمۂ بیاں نہ رہا

جب کوئی ذکرِ گردشِ ایام آ گیا　　بے اختیار لب پہ ترا نام آ گیا
دیوانگی ہو، عقل ہو، امید ہو کہ یاس　　اپنا وہی ہے وقت پہ جو کام آ گیا
دل کو نہ پوچھ معرکۂ حسن و عشق میں　　کیا جانیے غریب کہاں کام آ گیا

اپنی اپنی وسعتِ فکر و یقیں کی بات ہے　　جس نے جو عالم بنا ڈالا وہ اس کا ہو گیا
ہم نے سینے سے لگایا دل نہ اپنا بن سکا　　مسکرا کر تم نے دیکھا، دل تمہارا ہو گیا

ہر نگہ پر بندشیں، ایک ایک نفس کی ترشیں　　ہوشیار اے عشق وہ نازک مقام آ ہی گیا
صحبتِ رنداں سے واعظ کچھ نہ حاصل کر سکا　　بہکا بہکا سا مگر طرزِ کلام آ ہی گیا

محبت سرخروئی جاں سپاری ۔۔۔ محبت میں خیال بیش و کم کیا
زمانے پر قیامت بن کے چھا جا ۔۔۔ بنا بیٹھا ہے طوفاں دیدۂ نم کیا

اس جانِ تغافل نے پھر یاد کیا شاید ۔۔۔ پھر عہدِ محبت کا ہر نقش اُبھر آیا
میں نے انہیں تاریک فضاؤں میں بھی اکثر ۔۔۔ دیکھے ہیں برستے ہوئے انوارِ محبت

تو محبت کو لازوال بنا ۔۔۔ زندگی کو اگر نہیں ہے ثبات
ہم نے دیکھے ہیں جاگتے ہوئے دل ۔۔۔ ہم سے پوچھو ستم کے احسانات

وہ دل کہاں ہے اب کہ جسے پیار کیجئے
مجبوریاں ہیں ساتھ دیئے جا رہا ہوں میں
پہلے شرابِ زیست تھی اب زیست ہے شراب
کوئی پلا رہا ہے، پیئے جا رہا ہوں میں

جب کوئی حسیں ہوتا ہے سرگرمِ نوازش ۔۔۔ اس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد
کیا جانئے کیا ہو گیا اربابِ جنوں کو ۔۔۔ مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد

جسے ہوائے زمانہ کبھی بجھا نہ سکے ۔۔۔ قدم قدم پہ وہ اک شمع راہ پیدا کر
یہی زمیں ترا مسکن، یہی ترا مدفن ۔۔۔ اسی زمیں سے تو مہر و ماہ پیدا کر

شعبدۂ ہا درد الاماں، گردشِ دہر الحذر — بھٹکے ہوئے سے قافلے سہمی ہوئی سی رہگذر
عرضِ نیاز عشق کا چاہیے اور کیا صلہ — میں نے کہا بچشمِ تر، اس نے سنا بچشمِ نم

پہروں سے دھڑکنے کی بھی آتی نہیں آواز — کیا جانئے کیا ہے دلِ ناشاد کا عالم
منصور تو سر دے کے سبک ہو گیا لیکن — جلاد سے پوچھے کوئی جلاد کا عالم

عرق آلود چہرۂ تاباں — شبنم و آفتاب کا عالم
زانوئے شوق پر وہ پچھلے پہر — نرگسِ نیم خواب کا عالم
دلِ مطرب سمجھ سکے شاید — ایک شکستہ رباب کا عالم

خطا کیوں کر نہ ہوتی عاقبت سوز — کہ جنت ہی نہ تھی معراجِ آدم

مخصوص کس کے واسطے ہے رحمتِ تمام — پوچھیں گے ایک دن کسی پارسا سے ہم
یہ کون چھا گیا دل و دیدہ پر کہ آج — اپنی نظر میں آپ ہیں ناآشنا سے ہم

فردِ عمل سیاہ کئے جا رہا ہوں میں — رحمت کو بے پناہ کئے جا رہا ہوں میں
گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز — کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں
یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر — جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

میرا مقامِ عشق مقامِ فنا نہیں — دنیائے زندگی ہے جدھر دیکھتا ہوں میں

یہ شرمگیں نگاہ، یہ انکارِ مضمحل — پھر کیا ہے اعتراف محبت اگر نہیں

مرا ذوق بھی، مرا شوق بھی ہے بلند سطحِ عوام سے
ترا ہجر بھی، ترا وصل بھی مرے دردِ دل کی دوا نہیں

وہ ہزار دشمنِ جاں سہی، مجھے غیر پھر بھی عزیز ہے
جسے خاکِ پا تری چھو گئی، وہ بُرا بھی ہو تو بُرا نہیں

حوصِ شوق، نہ جوشِ عمل نہ دردِ وطن   یہ زندگی ہے خدایا کہ زندگی کا کفن

یہ تو نے کہا کیا اے ناداں، فیاضیٔ قدرت عام نہیں
تو فکر و نظر تو پیدا کر، کیا چیز ہے جو انعام نہیں

زاہد نے کچھ اس انداز سے پی، ساقی کی نگاہیں پڑنے لگیں
مے کش یہی اب تک سمجھے تھے، شائستہ دورِ جام نہیں

یہ حسن ہے کیا؟ یہ عشق ہے کیا؟ کس کو ہے خبر اس کی لیکن
بے جام ظہورِ بادہ نہیں بے بادہ فروغِ جام نہیں

سینہ آہن بھی تھا جس سے گداز   اب دلوں میں وہ حرارت ہی نہیں
آدمی کے پاس سب کچھ ہے مگر   ایک تنہا آدمیت ہی نہیں

تیرے بغیر رونقِ دیوار و در کہاں   شام و سحر کا نام ہے شام و سحر کہاں
مانا کہ محتسب بھی بڑا باشعور ہے   لیکن اسے نزاکتِ غم کی خبر کہاں
ہر چند کائنات دو عالم میں اے جگر   انسان بھی ایک چیز ہے انساں مگر کہاں

آدمی کو آدمی سے بُعد، وہ بھی کس قدر زندگی کو زندگی کا راز داں سمجھا تھا میں

لالہ و گل سے تجھ کو کیا نسبت نامکمل سے استعارے ہیں
وہ ہمیں ہیں کہ جن کے ہاتھوں نے گیسوئے زندگی سنوارے ہیں

بیدار عزائم ہوتے ہیں، اسرار نمایاں ہوتے ہیں
جتنے وہ ستم فرماتے ہیں، سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں
جو حق کی خاطر جیتے ہیں، مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر
جب وقت شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں

تسخیر مہر و ماہ مبارک تجھے مگر دل میں نہیں اگر تو کہیں روشنی نہیں
کیا جانئے یہ کون سا عالم ہے اے جگر دل مضطرب ہے اور کوئی بات بھی نہیں

خیر مزاج حسن کی یارب تیز بہت ہے دل کی دھڑکن
آہ کہ جانے تجھ بن کب سے روح ہے لاشہ جسم ہے مدفن
عمریں بیتیں، صدیاں گذریں ہے وہی اب تک عقل کا بچپن
تجھ سا حسین اور خون محبت وہم ہے شاید سرخیٔ دامن
دل کہ مجسم آئینہ ساماں اور وہ ظالم آئینہ دشمن

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں
بے فائدہ الم نہیں، بیکار غم نہیں توفیق دے خدا تو یہ نعمت بھی کم نہیں
زاہد کچھ اور ہو نہ ہو میخانے میں مگر کیا کم یہ ہے کہ فتنۂ دیر و حرم نہیں

کیا قیامت ہے کہ اس دور ترقی میں جگرؔ آدمی سے آدمی کا حق ادا ہوتا نہیں

ابھی نہ روک نگاہوں کو پیر میخانہ کہ زندگی ہے ابھی زندگی سے بیگانہ
سحر ہوا وہ بڑھے ہاتھ سوئے میخانہ بنام شاہد نوخیز و پیرے خانہ
ستم بھی ڈھائے کسی نے تو اس توجہ سے کہ بن گیا دل صد پارہ آئینہ خانہ
خود اپنی آگ میں جلتی ہے شمع جلنے دو پرائی آگ میں جلنا ہے کار پروانہ
نظر نظر متبسم، اگرچہ بے پروا نفس نفس متوجہ، اگرچہ بیگانہ

حیا میں وہ معصوم سی اک شرارت شرارت میں موہوم سا اک فسانہ
طبیعت شگفتہ مگر کھوئی کھوئی ہر انداز دل کش مگر والہانہ
کبھی روئے زیبا پہ غصے کی لہریں کہ جیسے کوئی بجلیوں کا خزانہ
تجھے حادثات پیہم سے بھی کیا ملے گا زاہد ترا دل اگر ہو زندہ تو نفس بھی تازیانہ

سحر ہونے کو ہے، بیدار شبنم ہوتی جاتی ہے
خوشی منجملۂ اسباب ماتم ہوتی جاتی ہے

وہی ہے خانہ و صہبا، وہی ساغر، وہی شیشہ
مگر آواز نوشا نوش مدھم ہوتی جاتی ہے
وہی ہیں شاہد و ساقی، مگر دل بجھتا جاتا ہے
وہی ہے شمع لیکن روشنی کم ہوتی جاتی ہے
وہی ہے زندگی لیکن جگر یہ حال ہے اپنا
کہ جیسے زندگی سے زندگی کم ہوتی جاتی ہے

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ
یہ صاف ہی نہ کہدوں جو ہے فرق مجھ میں تجھ میں
ترا درد درد تنہا، مرا غم غم زمانہ
ے دل کے لوٹنے پر ہے کسی کو ناز کیا کیا
تجھے اے جگر مبارک یہ شکست فاتحانہ

نہ گرم رفتار ترقی ہوتا جاتا ہے مگر اک چشم شاعر ہے کہ پرنم ہوتی جاتی ہے
ہائے احساس محبت اے معاذاللہ کہ اب اک اک گھڑی ایک ایک عالم ہوتی جاتی ہے
وہ وہ کر گلے مل مل کر رخصت ہوتے جاتے ہیں
مری آنکھوں سے یارب روشنی کم ہوتی جاتی ہے

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

وہ یوں دل سے گذرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

حبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گذرتا ہے
ہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

کلف سے تصنع سے بری ہے شاعری اپنی — حقیقت شعر میں جو ہے، وہی ہے زندگی اپنی
ہاں انکا مزاج اپنا غم ان کا زندگی اپنی — حیات حسن ہے گویا حیات عاشقی اپنی
لمرو جائے بنکر آہ اک کاسۂ سائل — نہ ایسی شاعری اپنی، نہ ایسی زندگی اپنی

یرا ملنا تو ممکن تھا مگر اے شان محبوبی
رے نزدیک تو ہیں مذاق جستجو ہوتی

ندگی ہے نام جہد و جنگ کا — موت کیا ہے بھول جانا چاہیئے
ہ کون ہے جو سر منزل پہونچ سکا — دھندلے سے کچھ نشان نظر آکے رہ گئے
جز حسن منفعل متبسم ہے زیر لب — یک قطرہ اشک زینت مژگاں کئے ہوئے
ہیں پہ عشق کی تہمت لگائی جاتی ہے — مگر یہ شرم جو چہرے پہ چھائی جاتی ہے
دا کرے کہ حقیقت میں زندگی بنجائے — وہ زندگی جو زباں تک ہی پائی جاتی ہے
نگار کے دل سے نہ بچ کے چل زاہد — یہیں کہیں تیری جنت بھی پائی جاتی ہے

خدا وہ دردِ محبت ہر ایک کو بخشے — کہ جس میں روح کی تسکین پائی جاتی ہے
وہ میکدہ ہے تری انجمن خدا رکھے — جہاں خیال سے پہلے پلائی جاتی ہے
ترے حضور یہ کیا وارداتِ قلب ہے آج
کہ جیسے چاند پہ بدلی سی چھائی جاتی ہے
وہ چیز کہتے ہیں فردوسِ گم شدہ جس کو — کبھی کبھی تری آنکھوں میں پائی جاتی ہے

ستاتے نہیں وہ تو ان کی طرف سے — خود اپنے ستانے کو جی چاہتا ہے
کوئی مصلحت روک دیتی ہے ورنہ — پلٹ دیں زمانے کو جی چاہتا ہے
حسیں تیری آنکھیں حسیں تیرے آنسو — یہیں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے

لاکھ آفتاب پاس سے ہو کر گزر گئے — بیٹھے ہم انتظارِ سحر دیکھتے رہے۔

سنا ہے حشر میں ہر آنکھ اسے بے پردہ دیکھے گی
مجھے ڈر ہے نہ توہینِ جمالِ یار ہو جائے
یہی ہے زندگی تو زندگی سے خودکشی اچھی
کہ انساں عالمِ انسانیت پر بار ہو جائے
اک ایسی شان پیدا کر کہ باطل تھرتھرا اٹھے
نظر تلوار بن جائے نفس جھنکار ہو جائے

محبت صلح بھی پیکار بھی ہے ۔ یہ شاخِ گل بھی ہے تلوار بھی ہے
ادائے عشق ادائے یار بھی ہے بہت سادہ بہت پرکار بھی ہے
نجرد ادائے سبکساران ساحل یہ ساحل ہی کبھی منجدھار بھی ہے

کس کا خیال کون سی منزل نظر میں ہے صدیاں گزر گئیں کہ زمانہ سفر میں ہے
چہرے پہ پھر بھی ہے تبسم نظر میں ہے اب کیا کسی کو بتائیں قلب و جگر میں ہے
صیاد کی نظر میں وہ نشتر سے کم نہیں اک لرزشِ خفی جو مرے بال و پر میں ہے

حسن نے جب شکست کھائی ہے عشق کی جان پر بن آئی ہے

نہ کوئی خلد نہ زاہد کوئی جہنم ہے خود اپنی اپنی نظر اپنا اپنا عالم ہے
حسین و سادہ ہے کس درجہ فطرت شاعر ہنسے تو غنچہ و گل رو پڑے تو شبنم ہے

مرحبا یہ بیباکیِ جوانانِ وطن تیغ پُر خم ہے مگر ہاتھ میں آزادوں کے

راز جو سینۂ فطرت میں نہاں ہوتا ہے سب سے پہلے دل شاعر پہ عیاں ہوتا ہے
ناز جس خاک وطن پر تھا مجھے آہ جگر اسی جنت پہ جہنم کا گماں ہوتا ہے

حسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے اہل دل کیلئے سرمایۂ جاں ہوتا ہے
ہائے وہ وقت کہ جب حسن پہ آتا ہے شباب اف وہ ہنگام کہ جب عشق جواں ہوتا ہے

ا کوہے درد محبت میں بتانے والے دل سا ہمدرد زمانے میں کہاں ہوتا ہے

وقت آتا ہے اک ایسا بھی محبت میں کہ جب
دل پہ احساس محبت بھی گراں ہوتا ہے

ہد رُخ کہاں، جلوہ گہہ ناز کہاں خاک مصرف ابھی خاک کی تعمیر میں ہے

ب کچھ لٹا کے راہ محبت میں اہل دل خوش ہیں کہ جیسے دولت کونین پا گئے
ن چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز تھا وہ آگئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے

ں تو ہونے کو گلستاں بھی ہے، ویرانہ بھی
دیکھنا یہ ہے کہ ہم میں کوئی دیوانہ بھی ہے

نظروں سے دیکھنے والے دیکھنا زخم دل کی گہرائی
کر منجملہ خاصان مے خانہ مجھے مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے
گل، موج و دریا انجم و خورشید و ماہ اک تعلق سب سے ہے لیکن رقیبانہ مجھے

کچھ وقت ایسا گردش ایام سے زندگی شرمارہی ہے زندگی کے نام سے
محفل کا تو کیا کہنا، مگر اے بزم نشیں رنگ محفل کہہ رہا ہے دل ہیں بے آرام سے
میخانہ میں تقسیم ہوتے ہیں جگر زہر کے ساغر شراب زندگی کے نام سے

جہلِ خرد نے یہ دن دکھائے گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے
جھوٹی ہے ہر ایک مسرت روح اگر تسکین نہ پائے
کارِ زمانہ جتنا جتنا بنتا جائے بگڑتا جائے

زندگی آج بھی دلکش ہے انہیں کے دم سے
حسن اک خواب سہی عشق اک افسانہ سہی
تشنہ لب ہاتھ پہ کیوں ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
کچھ نہیں ہے تو شکستِ خم و خمخانہ سہی

قفس کی نازک تیلیوں کی بھی کچھ حقیقت ہے ہم صفیرو
مگر الجھنا پڑے گا شاید، خود اپنے ہی بال و پر سے پہلے

ہر مقام محبت بہت ہی دلکش تھا
مگر ہم اہلِ محبت کشاں کشاں گذرے
خطا معاف، زمانے سے بدگماں ہو کر
تری وفا پہ بھی کیا کیا ہمیں گماں گذرے
رہِ وفا میں اک ایسا مقام بھی آیا
کہ ہم خود اپنی طرف سے بھی بدگماں گذرے
بہت حسین مناظر بھی، حسنِ فطرت کے
نہ جانے آج طبیعت پہ کیوں گراں گذرے

مرا تو فرض چمن بندیٔ جہاں ہے فقط
مری بلا سے، بہار آئے یا خزاں گذرے

بھری بہار میں تاراجیٔ چمن مت پوچھ
خدا کرے نہ پھر آنکھوں سے وہ سماں گذرے

کبھی کبھی تو اسی ایک مشت خاک کے گرد
طواف کرتے ہوئے ہفت آسماں گذرے

بہت حسین سہی صحبتیں گلوں کی مگر
وہ زندگی ہے جو کانٹوں کے درمیاں گذرے

ارے غضب ارے ستم، وہ اک نگاہ سحر فن
جھکے اگر تو بت کدہ، اٹھے اگر تو بت شکن

دل بھی وہی ہے غم بھی وہی، پھر یہ کیا کہ آج
ہر اشک ہے تبسم پنہاں لئے ہوئے

ؤں سے وہ معصوم محبت کی تراوش — چہرے پہ وہ مشکوک خیالات کا عالم
زک سے ترنم میں اشارات کے دفتر — ہلکے سے تبسم میں کنایات کا عالم
عارض پہ نور وہ کیف نگہ شوق — جیسے کہ دم صبح مناجات کا عالم
رمائی لجائی وہ حسن کی دنیا — وہ بہکی ہوئی بہکی ہوئی رات کا عالم

افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سرِ راہ
بے گور و کفن خاک بسر دیکھ رہا ہوں
تعمیر کے پردے میں یہ اندازِ حکومت
تخریب بہ عنوان بہ دگر دیکھ رہا ہوں

چہرے جنوں حبِ وطن سے دھوئیں دھوئیں
سینے جفا شتوں کا سمندر لیے ہوئے
کہتے ہیں بھائی بھائی ہیں اہلِ وطن تمام
پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لیے ہوئے

آنکھیں تمام مشہدِ عشق و جمال ہیں
سینہ تمام گنجِ شہیداں ہے آج کل
ہے زخم کا نشان جو ہندو ہے ان دنوں
ہے داغ زندگی جو مسلماں ہے آج کل
ہونے کو یوں تو روز نئی ہیں عنایتیں
اردو زباں پہ خاص کرم ہاں ہے آج کل

دھرتی مہاتما وہی شہیدِ امن و آشتی
پریم جس کی زندگی خلوص جس کا پیرہن

کوئی یہ جھکے سے ان سے پوچھے کہاں گئے آپ کے وہ وعدے
بکھر رہا ہے لہو غریبوں کا دستِ سرمایہ دار اب بھی
اسی کا نام ہے اگر ترقی تو ایسی ترقی سے باز آئے
کہ خونِ مخلوق سے خدا کی زمین ہے لالہ زار اب بھی

وہ وقت ہے کہ علمِ حق ہے علمِ شیطنت میں گم
وہ وقت ہے کہ آدمی کا آدمی شکار ہے

شرافت کا معیار، افراط دولت صداقت کی معراج، لفظی ترانہ
غریبوں پہ جو کچھ گذرتی ہے گذرے سمٹ آئے جیبوں میں لیکن خزانہ

خدا کرے یہ دستور ساز گار آئے جو بیقرار رہیں اب تک انہیں قرار آئے

یہ میکدے کی، یہ ساقی گری کی ہے توہین کوئی ہو جام بکف، کوئی شرمسار آئے
نظام خلق و مروت کبھی جو بر سر ہو نگاہ لطف و محبت بڑھے سنوار آئے
نمائشی ہی نہ ہو، یہ نظام جمہوری
حقیقۃً بھی زمانے کو ساز گار آئے

سلامت تو، ترا میخانہ، تری انجمن ساقی
مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمت دار و رسن ساقی
وہی انساں، جسے سرتاج مخلوقات ہونا تھا
وہی اب سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی
نمود صبح کاذب ہی دلیل صبح صادق ہے
افق سے زندگی کی دیکھ وہ ابھری کرن ساقی

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کا ادبی و تحقیقی و تنقیدی شاہکار

حالی بحیثیت شاعر

مشاہیر ادب کی نظر میں

بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق :-

حالی بحیثیت شاعر میری نظر سے گزری۔ مولانا حالی کی شاعری کا اس سے بہتر
مطالعہ کسی اور کتاب میں نہیں ملتا اسلئے یہ کتاب میرے نزدیک اردو کے تنقیدی لٹریچر میں ایک اہم اضافہ

علامہ نیاز فتحپوری :-

حالی پر اس وقت تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن جامعیت کے لحاظ سے شجاعت صاحب کا یہ مقالہ
بجائے خود بڑی ضخیم تالیف ہے۔ یقیناً قدر اول کی حیثیت رکھتا ہے۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب :-

شجاعت علی صاحب کا یہ کارنامہ ایسا ہے جس پر وہ بجا طور سے فخر کر سکتے ہیں۔ اپنے موضوع
پر یہ سب سے زیادہ جامع کتاب ہے جس کے لئے فاضل مصنف شکریہ کے مستحق ہیں اور مبارکباد کے بھی

بڑی تقطیع ۳۹۲ صفحات قیمت ـــ

ملنے کا پتہ :- ادارۂ فروغ اردو۔ امین آباد پارک لکھنؤ

(فارم ۴ قاعدہ ۸ دیکھیے)

فروغ اردو

ملکیت کے بارے میں بیان

اخباروں کے رجسٹریشن (مرکزی) قواعد ۱۹۵۶ء کے قاعدہ ۸ کے ماتحت حکومت ہند کی وزارت اطلاعات و نشریات کا مطلوبہ بیان متعلق ملکیت و دیگر تفصیلات

مقام اشاعت	لکھنؤ
وقفہ اشاعت	ماہانہ
پرنٹر و پبلشر	سید انصار حسین
قومیت	ہندوستانی
پتہ	مقبرہ عالیہ گولہ گنج لکھنؤ
ایڈیٹر کا نام	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	نصیر منزل کوچہ میر جان لکھنؤ
مالک	سید انصار حسین
پتہ	اقبال منزل مقبرہ عالیہ گولہ گنج لکھنؤ

میں سید انصار حسین اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات جہاں تک میری اطلاعات کا تعلق ہے صحیح ہیں۔

۲۵ر فروری ۱۹۶۱ء

پرنٹر و پبلشر سید انصار حسین